وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد دہم

سورۃ النمل، سورۃ القصص، سورۃ العنکبوت

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

(جلد دہم۔ مشتمل بر سورۃ النمل، سورۃ القصص، سورۃ العنکبوت)

Tafsir-e-Kabir (The Grand Exegesis)

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 10
(Sūrah an-Naml, al-Qaṣaṣ, al-ʻAnkabūt)

(Complete Set – Volumes 1-15)

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ’اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔‘ قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ ’اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔‘ آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرمادیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب وطباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوْرَۃُ النَّمْلِ

سورۂ نمل

مَكِيَّةٌ وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ أَرْبَعٌ وَتِسْعُونَ اٰيَةً وَسَبْعَةُ رُكُوعَاتٍ

یہ سورۃ مکی ہے۔اور بسم اللہ سمیت اس کی چورانوے (۹۴) آیتیں اور سات (۷) رکوع ہیں۔

وقت تنزیل اس سورۃ کو ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ نے مکی قرار دیا ہے اور باقی مسلمان علماء بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہیریؔ نے بھی اسے مکی ہی قرار دیا ہے (فتح البیان۔تفسیر القرآن از ویری)۔

قریبی تعلق اس سورۃ کا سورۂ شعراء سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۂ شعراء کے آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ مومن غالب آئیں گے اور کفار خدا تعالیٰ کی قدیم سنت کے مطابق تباہ ہوں گے مگر چونکہ مضمون کفار کی تباہی کا تھا سورۃ کا سارا زور اس قانون الٰہی کی تفصیل میں تھا کہ کفار ہمیشہ تباہ ہوتے چلے آئے ہیں اب کیوں تباہ نہ ہوں گے۔ سورۂ نمل میں اس مضمون کے دوسرے مخفی پہلو کو زیادہ واضح کیا گیا ہے کہ مومن باوجود کمزور ہونے کے ترقی پاتے رہے ہیں۔کفار کی تباہی کا ذکر بے شک سورۃ کے آخر میں کیا گیا ہے لیکن زیادہ زور اس سورۃ میں اس اصول پر ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی آواز سن کر عقیدۂ ذہنی اور فکری اور اخلاق اور نظام الٰہی کو قبول کرتے رہے ہیں وہ ہمیشہ عزت پاتے رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی عارضی نہ ہوگی بلکہ ایک لمبے عرصہ تک وہ ترقی کرتے چلے جائیں گے اور بنی اسرائیل کی طرح صرف اپنے ہی ملک کے بادشاہ نہیں ہوں گے بلکہ غیر ملکوں کے بھی بادشاہ ہوں گے۔

اس سورۃ کا سورۂ شعراء سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ سورۂ شعراء کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لوگ اس نبی کو شاعر کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر شیطان نازل ہوتا ہے حالانکہ شیطان جھوٹ بولنے والے اور گنہگار پر نازل ہوا کرتا ہے۔اور پھر شیطانوں کا طریق یہ ہے کہ وہ خدائی تعلیمات کو سن کر انہیں لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔لیکن ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔یعنی آسمانی تعلیموں میں جھوٹ ملا دیتے ہیں۔اس لئے وہ تعلیمات نتیجہ خیز نہیں ہوتیں اور شعراء جو کہ شیطانوں کی پیروی کرتے ہیں ان کے پیچھے صرف گمراہ لوگ چلتے ہیں کیونکہ وہ کسی مقصد کو لے کر کھڑے نہیں ہوتے صرف دلچسپ باتیں کرنے کا انہیں شوق ہوتا ہے۔کیا تُو دیکھتا نہیں کہ

وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔

اب اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس سورۃ کی آیتیں ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو ہمیشہ پڑھی جاتی رہے گی اور جو تمام دینی امور کو خوب کھول کر اور بادلیل بیان کرتی ہے اور جو مومنوں کو سچا راستہ دکھانے والی ہے اور جو اس پر عمل کرتے ہیں ان کو نیک انجام کی خبر دیتی ہے۔اس لئے یہ شیطانی تعلیم نہیں ہو سکتی کیونکہ شیطان نہ سچا راستہ دکھاتا ہے نہ اس کی تعلیم پر چل کر کوئی شخص خدا کی رحمت اور برکت حاصل کرتا ہے۔اسی طرح اس کتاب پر ایمان لانے والے وہ ہیں جو خدا کی عبادت کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور بعد میں آنے والے کلام پر یا بعد میں آنے والی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔یعنی اول تو شیطان کی نازل کردہ تعلیم میں جھوٹ ہوتا ہے ہدایت نہیں ہوتی دوسرے اس تعلیم کے متبع ہدایت سے بہکے ہوئے ہوتے ہیں اور نیکوکار نہیں ہوتے۔لیکن اس کتاب میں ہدایت ہے اور سچائیاں ہیں اور اس کے ماننے والے لوگ خدا تعالیٰ کی بھی عبادت کرتے ہیں اور بندوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے ہیں اور ہمیشہ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی باتوں کے ماننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔اسی طرح دوسری زندگی کا احساس بھی ہر وقت ان کے دل میں رہتا ہے۔

پس نہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان اُتر سکتے ہیں جو ایسی کتاب لائے ہیں جو ہدایت اور بشارت ہے اور نہ آپ کو شاعر کہا جا سکتا ہے۔کیونکہ آپ کے ماننے والے انسانوں کی ہمدردی اور خدا تعالیٰ کی محبت کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔اور شاعر نہ خود عمل کرتا ہے اور نہ اس کے اتباع عمل کرتے ہیں۔

خلاصہ مضامین اس سورۃ کے شروع میں طٰسٓ حروف مقطعات میں سے آئے ہیں۔چونکہ یہی حروف مقطعات مٓ کی زیادتی کے ساتھ سورۂ شعراء سے بھی پہلے آئے ہیں اس لئے یہ سورۃ سورۂ شعراء کے مضمون کے سلسلہ میں ہی ہے۔

طٰسٓ میں ط لطیف کا قائم مقام ہے اور س سَمِیع کا۔پھر فرماتا ہے۔تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ اس سورۃ میں جو آیتیں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن کا حصہ ہیں اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنی دلیلیں خود بیان کرتی ہے اور یہ کتاب کامل ہدایت بھی ہے جیسا کہ هُدًى کی تنوین سے جو اس کو نکرہ بناتی ہے ظاہر ہے اور نکرہ عظمت کے لئے آیا کرتا ہے۔(کتاب العروس للسبکی شرح مختصر المعانی جزو اول ص ۳۴۹)

پھر فرماتا ہے کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے بشارت کا موجب ہے۔ایسے مومنوں کے لئے جو اپنی بدنی عبادتوں کو خدا تعالیٰ کے حضور میں ہمیشہ پیش کرتے رہتے ہیں اور اکیلے ہی عبادت نہیں کرتے بلکہ دوسرے

بنی نوع انسانوں کو بھی عبادت کی طرف راغب کر کے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں (جیسا کہ يُقِيْمُوْنَ کے لفظ سے ظاہر ہے اور اقامت ہمیشہ نماز باجماعت میں ہی کہی جاتی ہے) اس طرح وہ مومن جن کے لئے قرآن بشارت ہے وہ ہیں جو اپنے اموال میں سے ایک حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں غریبوں اور ناداروں پر خرچ کرنے کے لئے دیتے رہتے ہیں اور وہ یہ خرچ لوگوں کا لیڈر بننے کے لئے نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوجائے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ان کو یقین ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے نتیجہ میں آخر ان کو روحانی اور جسمانی درجات ملیں گے۔(آیت ۳و۴)

وہ لوگ جو انجام آخر پر خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی ایمان نہیں لاتے ان کو اپنی سب کرتوتیں خوبصورت نظر آتی ہیں اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ان کو بڑا عذاب ملے گا اور وہ آخر کار ناکام رہیں گے اور نقصان اٹھائیں گے۔ (آیت ۵و۶)

تجھ پر جو یہ قرآن نازل ہوا ہے یہ بڑی حکمت والے اور علم والے خدا کی طرف سے ہے۔اس لئے اس میں بڑی برکتیں ہیں اور بڑی حکمتیں ہیں اور بڑا علم ہے۔(آیت ۷)

موسیٰ ؑ کا واقعہ ہم تجھے بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے دور کچھ آگ دیکھی ہے۔میں وہاں جا کر یا تو کوئی معلومات اس ملک یا اس راستہ کی لاتا ہوں یا کوئی انگارہ لاتا ہوں تا کہ تم آگ سینکو۔ (آیت ۸)

جب موسیٰ ؑ اس آگ کے پاس آئے تو انہیں پکار کر کہا گیا کہ اس آگ میں جس کا جلوہ نظر آیا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا وہ بڑی برکت والا ہے اور اس آگ کے اردگرد کا علاقہ بھی برکت والا ہے۔یعنی جو لوگ اس کلام کو قبول کریں گے ان کو بھی بڑی برکت ملے گی۔ وہ رب العالمین خدا جس نے اپنا جلوہ اس آگ میں دکھایا ہے بڑا پاک ہے۔ (آیت ۹)

پھر کہا گیا کہ اے موسیٰ ؑ! بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں اور بڑا غالب اور حکمت والا ہوں۔یعنی جو نظارہ تم نے دیکھا ہے وہ خدا کا جلال ہے اور تُو اپنا عصا پھینک دے۔ جب انہوں نے عصا پھینکا تو دیکھا کہ وہ اس طرح ہلتا تھا جس طرح سانپ ہلتا ہے۔موسیٰ ؑ ڈرے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔اس پر ان کو الہام ہوا کہ اے موسیٰ ؑ! ڈر نہیں۔ڈر میرے دشمنوں کے لئے ہے۔ڈر میرے رسولوں کے لئے نہیں۔ہاں اگر کوئی شخص غلطی سے ظلم کرے اور پھر اس کے بعد نیکی اختیار کرے تو میں معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔(آیت نمبر ۱۰ تا ۱۲)

اور اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال۔ جب تو اس کو نکالے گا تو دیکھے گا وہ بالکل سفید ہے۔ یعنی وہ چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ مگر کسی قسم کا عیب اس میں نہیں ہوگا۔ (آیت ۱۳)

یہ نشان جو ہم نے موسیٰ ؑ کو دیا یہ ان نو نشانوں میں سے ایک تھا جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جانے والے تھے۔ کیونکہ وہ لوگ فرمانبرداری سے نکلے ہوئے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب موسیٰ ؑ وہ نشان لے کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس آیا تو باوجود اس کے کہ وہ نشان بڑے واضح تھے اور حقیقت کو دکھانے والے تھے انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اور کہا یہ تو کھلا کھلا فریب ہے۔ اور بڑی سختی سے ان نشانات کا انکار کیا۔ حالانکہ ان کے دلوں نے ان کو سچا سمجھ لیا تھا۔ ان کا یہ انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا۔ پھر دیکھ کہ ایسے فسادی لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ (آیت ۱۴ و ۱۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کرتا ہے اور ان دونوں کا قول یہ بیان فرماتا ہے کہ ہمیں بہت سے مومن بندوں پر خدا تعالیٰ نے فضیلت بخشی ہے۔ یعنی خلافتِ روحانی اور جسمانی کے ذریعہ۔ (آیت ۱۶)

اس کے بعد فرماتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی وفات پر سلیمان ؑ تخت نشین ہوئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے بھی وہ بولی سکھائی گئی ہے جو بلندی کی طرف پرواز کرنے والے لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو سکھائی جاتی ہے۔ اور مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے خدا تعالیٰ ان کو مہیا کر دیتا ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ (آیت ۱۷)

پھر فرماتا ہے۔ ایک دفعہ سلیمانؑ کے سامنے جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے ان کے لشکر حاضر کئے گئے اور انہیں ترتیب وار الگ الگ کھڑا کیا گیا۔ (یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اس وقت کسی ملک پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہے تھے)۔ (آیت ۱۸)

آپ اپنے لشکروں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں آپ نملہ قوم کی وادی میں سے گذرے۔ (جس کو غلطی سے مفسرین نے چیونٹیوں کی وادی سمجھ لیا ہے) آپ کو اور آپ کے لاؤ لشکر کو دیکھ کر نملہ قوم کی ملکہ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ اے نملہ قوم کے لوگو اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ تا کہ یہ خیال کر کے کہ تم سلیمانؑ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں پاؤں کے نیچے روند نہ ڈالے۔ حضرت سلیمانؑ نملہ قوم کی ملکہ کے اس اعلان پر ہنس پڑے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے کہ اس نے دور دراز کے ملکوں میں بھی یہ بات پھیلا دی ہے کہ سلیمانؑ ظالم نہیں اور وہ ادنیٰ قوموں کے ساتھ بھی انصاف کرتا ہے۔ (آیت ۱۹ و ۲۰)

اس وقت حضرت سلیمانؑ نے اپنے لشکر کا جائزہ لیا تو ایک سردارِ لشکر کو جس کا نام ھُد ھُد تھا غائب پایا۔ ایسے نازک موقعہ پر ایک فوجی افسر کے غائب ہونے سے آپ کو شدید تشویش ہوئی اور آپ نے کہا کہ میں یقیناً اسے سخت ترین سزا دوں گا یا اسے قتل کر دوں گا۔ اور یا پھر اسے واضح دلیل کے ساتھ بتانا پڑے گا کہ وہ کیوں غائب رہا۔ (آیت ۲۱ و ۲۲)

تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ وہ سردار واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ چونکہ آپ ملک سباء پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ میں پہلے سے اس ملک کے حالات دریافت کرنے کے لئے وہاں چلا گیا اور اب میں یہ رپورٹ لے کر آیا ہوں کہ اس ملک کی حکمران ایک عورت ہے لیکن غضب کی حاکم ہے۔ ہر قسم کے ساز و سامان اس کے پاس موجود ہیں اور اس کی بادشاہت بہت بڑی ہے لیکن روحانی لحاظ سے یہ خرابی بھی ہے کہ ملکہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتی ہے اور توحید سے روگردان ہے۔ حضرت سلیمانؑ سمجھ گئے کہ وہ شرارتاً غائب نہیں ہوا تھا اور انہوں نے کہا۔ بہت اچھا ہم وہاں جا کے دیکھیں گے کہ تُو سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ مگر پہلے میرا یہ خط لے جا اور اسے ملکہ اور اس کے درباریوں کے سامنے رکھیو اور خود مؤدبانہ طور پر پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیو۔ اور دیکھیو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں (آیت ۲۳ تا ۲۹)

جب ہُدہُد نے وہ خط پیش کیا۔ تو ملکہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ ایک بڑا معزز مکتوب ہے جو سلیمانؑ کی طرف سے آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ میرے خلاف سرکشی مت کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔ (آیت ۳۰ تا ۳۲)

اس کے بعد ملکہ سبا نے اپنی قوم کے سرداروں سے کہا کہ اس مشکل مسئلہ کے حل کے لئے مجھے مشورہ دو۔ انہوں نے کہا۔ حضور ہم تو بڑے طاقتور ہیں اور آزمودہ کار جرنیل ہیں۔ مگر فیصلہ بہر حال آپ کے اختیار میں ہے۔ ملکہ سبا نے کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ بادشاہ جب اپنے زبردست لشکروں کے ساتھ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو اجاڑ کر رکھ دیا کرتے ہیں اور وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل جانوروں کی طرح بنا دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے تو یہ تجویز سوچی ہے کہ میں حضرت سلیمانؑ کو ایک تحفہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ میرے آدمی کیا جواب لاتے ہیں۔ (آیت ۳۳ تا ۳۵)

حضرت سلیمانؑ کو جب وہ تحفہ پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے کہا خدا نے مجھے اس سے بہتر چیزیں دے رکھی ہیں۔ یہ تحفہ جو مجھے رشوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے مجھے اپنے عزائم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اے ہُدہُد ان کی طرف واپس

لوٹ جا اور انہیں بتا دے کہ اب میں ایک ایسا لشکر لے کر ان پر چڑھائی کروں گا جس کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں ہوگی۔

پھر حضرت سلیمانؑ نے اپنے سردارانِ لشکر سے کہا کہ پیشتر اس کے کہ یہ لوگ میری اطاعت کا دم بھرتے ہوئے میرے پاس آئیں۔تم میں سے کون ملکہ کا تخت میرے پاس لائے گا۔ایک سردار بولا کہ آپ کے چڑھائی کرنے سے بھی پہلے میں وہ تخت لے آؤں گا اور اس قیمتی دولت کے لانے میں کسی قسم کی خیانت مجھ سے سرزد نہیں ہوگی لیکن ایک اور شخص جس کو دینی علم حاصل تھا اس نے کہا کہ یہ تو پھر بھی دیر میں لائے گا میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے وہ تخت لے آؤں گا۔یعنی ایک نیا اور اعلیٰ درجہ کا تخت بنوا کر آپ کے دربار میں فوراً حاضر کر دوں گا۔جب حضرت سلیمانؑ نے دیکھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کا تخت بن کر آ گیا ہے تو وہ اللہ کا شکر بجا لائے۔مگر انہوں نے کہا۔میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا تخت بنا کر لاؤ جسے دیکھ کر ملکہ کو اپنا تخت حقیر نظر آنے لگے۔میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس بات کو دیکھ کر وہ اپنے گھمنڈ پر ہی قائم رہتی ہے یا میری برتری اور فوقیت کو تسلیم کرتی ہے۔چنانچہ ایسا ہی کیا گیا آخر ملکہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کہ بتاؤ تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے۔اس پر بجائے پوری طرح تسلیم کرنے کے وہ کہنے لگی کہ یہ ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔(آیت نمبر ۳۶ تا ۴۳)

تب حضرت سلیمانؑ نے اس پر شرک کی برائی واضح کی اور عملی رنگ میں اس پر توحید کی حقیقت آشکار کرنے کے لئے ایک محل بنوایا جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگائے گئے تھے۔ان کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ملکۂ سبا اس محل میں داخل ہوئی تو اس نے سمجھا کہ سچ مچ پانی بہہ رہا ہے اور گھبرا کر اس نے اپنے کپڑے اڑس لئے۔حضرت سلیمانؑ نے کہا۔بی بی تجھے غلطی لگی ہے۔یہ پانی نہیں بلکہ شیشہ میں سے پانی نظر آ رہا ہے۔اس دلیل سے وہ سمجھ گئی کہ توحید ہی سچی ہے اور وہ شرک چھوڑ کر حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔(آیت ۴۴و۴۵)

حضرت سلیمانؑ کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ ثمود کا ذکر فرماتا ہے۔کیونکہ ثمود کی قوم کا بہت سا علاقہ حضرت سلیمانؑ کے ماتحت آ گیا تھا۔اور بتاتا ہے کہ ان کے نبی نے بھی ان کو توحید کی تعلیم دی مگر وہ لوگ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔بعض نے مان لیا اور بعض نے انکار کر دیا۔حضرت صالحؑ کے سمجھانے پر انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! ہم تو تجھے سبز قدم سمجھتے ہیں۔انہوں نے کہا۔مجھے بھی تمہاری خیر نظر نہیں آتی کیونکہ تم ایک ایسی قوم ہو جو سچے دین کو چھوڑ بیٹھی ہو۔ثمود کی قوم میں نو بڑے بڑے عمائد تھے جنہوں نے آپس میں مل کر قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے کو اکسایا کہ رات کے وقت صالحؑ اور اس کے اہل وعیال پر چھاپہ مارو اور اسے قتل کر دو۔اور جب کوئی پوچھے تو صاف

انکار کردو اور کہہ دو کہ ہم نے تو اس کی ہلاکت کا واقعہ دیکھا ہی نہیں ۔مگر آخر اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہی غالب آئی ۔ چنانچہ دیکھ لو کہ ان کے گھر تمہارے سامنے اجڑے پڑے ہیں ۔اور خالی اور ویران ہیں ۔(آیت ۴۶ تا ۵۴)

اس کے بعد لوطؑ کا واقعہ بیان فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو جنسی بے اعتدالیوں سے روکا ۔مگر قوم نے مخالفت کی ۔آخر زلزلہ سے ان کے شہر کو الٹا دیا گیا اور وہ قوم تباہ کر دی گئی ۔(آیت ۵۵ تا ۵۹)

ان انبیاء کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب بتاؤ کہ کیا اللہ اچھا ہے جو اپنے بندوں کو بچاتا رہتا ہے یا معبودانِ باطلہ اچھے ہیں جن کے ماننے والے کبھی کامیاب نہیں ہوئے ۔(آیت ۶۰)

پھر فرماتا ہے ۔تم اتنا تو سوچو کہ زمین و آسمان کا خدا جو بادلوں سے پانی اتار کر قسم قسم کے باغ اُگاتا ہے وہ بہتر ہے یا وہ معبودانِ باطلہ بہتر ہیں جو ان باغوں اور پانیوں کے محتاج ہیں ۔اسی طرح غور کرو کہ وہ کون ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے کے قابل بنایا ہے ۔اور اس کے اندر دریا چلائے ہیں اور پھر اس نے میٹھے اور نمکین پانی میں ایک روک بنا دی ہے ۔کیا ایسے مدبّر خدا کا کوئی اور شریک پیش کیا جا سکتا ہے ۔پھر یہ بھی تو دیکھو کہ مصیبت زدہ لوگوں کی دعاؤں کو کون قبول کرتا ہے اور کون ان کی دعاؤں کو قبول کر کے انہیں دنیا کا بادشاہ بنا دیتا ہے ۔کیا ایسے خدا کا کوئی اَور ہمسر ہو سکتا ہے ۔مگر افسوس ہے کہ لوگ پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے ۔(آیت ۶۱ تا ۶۳)

پھر فرماتا ہے کہ خشکیوں اور سمندر کے اندھیروں میں تمہیں کون راستہ دکھاتا ہے ۔اسی طرح بادلوں سے پہلے بھیگی ہوئی ہوائیں کون چلاتا ہے ۔کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اَور معبود ہے جو ایسا کر رہا ہے ۔اسی طرح وہ جو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر پیدائش کے سلسلہ کو جاری رکھتا ہے اور جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دیتا ہے کیا اس قادر مطلق خدا کے سوا اَور کوئی بھی معبود ہے ۔زمین و آسمان کے غیب اللہ تعالیٰ کے سوا اَور کوئی نہیں جانتا ۔مگر تمہارے معبود تو وہ ہیں جو اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کا مشرکانہ دین دنیا میں کب قائم ہوگا ؟(آیت ۶۴ تا ۶۷)

فرماتا ہے کفار بس اسی الجھن میں پڑے رہتے ہیں کہ جب ہم اور ہمارے باپ دادا مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہم زندہ کس طرح ہوں گے ۔یہ باتیں پہلے بھی کہی جاتی رہی ہیں اور درحقیقت انہیں کی نقل میں اب بھی وہی باتیں دہرائی جا رہی ہیں ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ کہانیاں ہی تھیں تو پھر پہلے منکرین نے اپنے اپنے زمانہ میں سزائیں کیوں پائیں ۔اور اگر وہ سزا پاتے رہے ہیں تو اے محمدؐ رسول اللہ تیرے مخالفین بھی ان باتوں پر الٰہی گرفت سے بچ نہیں سکتے ۔ایسی صورت میں تجھے ان کی تباہی پر غم نہیں کھانا چاہیے ۔کیونکہ وہ بہرحال آنے والی ہے ۔اسی طرح ان کی مخالفانہ تدبیروں سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے ۔کیونکہ ان کی تمام تدبیریں ناکام رہیں گی ۔یہ لوگ

پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب کب آئے گا؟ فرماتا ہے کچھ تو جلدی آنے مقدر ہیں اور کچھ دیر میں آئیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے وہ ان کے مخفی ارادوں اور ظاہری افعال کو خوب جانتا ہے۔ لیکن اپنے فضل کی وجہ سے ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ (آیت ۶۸ تا ۷۵)

فرماتا ہے۔ آسمان اور زمین میں جتنے مخفی امور ہیں وہ سب خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں قرآن کریم کو دیکھ لو کہ وہ سچی بات بیان کر دیتا ہے جبکہ بائیبل اور دوسری الہامی کتب میں مرورِ زمانہ کی وجہ سے کئی قسم کی غلط باتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ قرآن مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا پیغام ہے اور وہ اس کے ذریعہ صرف بنی اسرائیل کا صداقت سے منحرف ہونا ہی ظاہر نہیں کرے گا بلکہ وہ اسرائیلی قوموں کے درمیان فیصلہ بھی کرے گا اور سچوں کو غالب اور جھوٹوں کو مغلوب کر دے گا۔ (آیت ۷۶ تا ۷۹)

فرماتا ہے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ پر توکل کر۔ بیشک تیرا کام لوگوں کو حق پہنچانا ہے مگر پھر بھی جو مردہ دل لوگ ہیں ان کو نہیں منوایا جاسکتا۔ اسی طرح بہرا جب پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ تو اشارہ دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ہدایت کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ یہی حال اس اندھے کا ہوتا ہے جو بینا کے پیچھے چلنے کے لئے تیار نہ ہو۔ صرف اسی کو سچائی سمجھائی جاسکتی ہے جو خدا تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان لاتا ہو۔ (آیت ۸۰ تا ۸۲)

فرماتا ہے جب ان کی تباہی کا وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ زمین میں سے ایک کیڑا نکالے گا جو ان کو کاٹے گا۔ اور دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ سزا ان کو اس وجہ سے ملی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ (آیت ۸۳)

پھر فرماتا ہے۔ تم اس دن کو یاد کرو جبکہ ہم ہر اس قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کر رہی ہو گی ایک بڑی جماعت کھڑی کریں گے۔ اور پھر ان جماعتوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یعنی دنیا میں مختلف ایسوسی ایشنز بن جائیں گی۔ اور سب قوموں میں سے ایک ایک گروہ بے دینی کی خاص طور پر تعلیم دینے لگ جائے گا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا فتویٰ جاری نہ ہو جائے۔ تب ان کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ (آیت ۸۴ تا ۸۶)

فرماتا ہے۔ کیا انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم ان پر رات یعنی نبوت کے بعد کا زمانہ اس لئے لائے تھے کہ یہ ترقی کی نئی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کریں۔ لیکن یہ لوگ تو اَور بھی سست ہو گئے۔ اور انہوں نے دن یعنی نبوت کے زمانہ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ (آیت ۸۷)

ایک دن آئے گا کہ صور پھونکا جائے گا۔ یعنی تمام قوموں کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیا جائے گا اور آسمان اور زمین میں جو کوئی ہیں وہ سب ڈر جائیں گے مگر باوجود اس کے کہ یہ تباہی عام ہوگی پھر بھی خدا تعالیٰ کے حضور دعا کا راستہ کھلا رہے گا۔ (آیت ۸۸)

فرماتا ہے۔ تُو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ کھڑے ہیں۔ حالانکہ وہ اس طرح چل رہے ہیں جس طرح بادل۔ یعنی زمین چلتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ اسی طرح چلتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط بنایا ہے اور وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ (آیت ۸۹)

جو شخص کوئی نیکی بجا لائے گا۔ اسے اپنے عمل سے بہتر بدلہ ملے گا۔ لیکن بدی کرنے والے کو آگ میں اوندھے منہ گرا دیا جائے گا۔ مگر بدی کی سزا بہرحال عمل کے مطابق ہوگی زیادہ نہیں۔ (آیت ۹۰ و ۹۱)

فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ! تو لوگوں سے کہہ دے کہ مجھے خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں۔ یعنی اس جلوہ کے پیچھے چلوں جو مکہ میں ابراہیمؑ کے ذریعے ظاہر ہوا تھا اور عملاً فرمانبرداری کا نمونہ بن کر دکھاؤں اور قرآن سب کو پڑھ کر سناؤں۔ میں کسی پر زبردستی نہیں کروں گا بلکہ میرا کام صرف لوگوں کو پیغام حق پہنچانا ہے۔ آگے ماننا یا نہ ماننا ان کا کام ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ خاموش بیٹھا رہے گا۔ وہ آسمان سے اترے گا اور ایسے نشان دکھائے گا جو تمہارے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود کو لا کر کھڑا کر دیں گے۔ (آیت ۹۲ تا ۹۴)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

طٰسٓ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

(پڑھتا ہوں) طاہرؔ (اور) سمیعؔ (یعنی پاک اور دعاؤں کا سننے والا خدا اس سورۃ کا اتارنے والا ہے)

ہُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ

اس کی آیتیں قرآن اور مدلل کتاب کا حصہ ہیں۔ (جو) مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت (کا موجب) ہیں۔

الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ

(ایسے مومن) جو نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں۔ اور آخروی زندگی پر (یا بعد میں

ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾

آنے والی موعود باتوں پر) یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر۔ اس سورۃ سے پہلے بھی حروف مقطعات طٰسٓ آئے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ط اللطیف کا قائم مقام ہے اور سٓ سمیع کا۔

پہلی سورۃ اور اس سورۃ میں یہ فرق ہے کہ پہلی سورۃ کے آخر میں میمؔ بھی آتا تھا جو مجید کا قائم مقام تھا۔ مگر اس سورۃ میں اسے اڑا دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں خدا تعالیٰ کی مجد اور بزرگی پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اور اس سورۃ میں مضمون تو مشترک ہے لیکن خدا تعالیٰ کے مجید ہونے پر اس میں اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا پچھلی سورۃ میں دیا گیا تھا اور اس کی ظاہری دلیل یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر زیادہ کیا گیا تھا اور خدا تعالیٰ کی مجد اور اس کی بزرگی زیادہ تر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ظاہر ہوئی ہے اور اس سورۃ میں موسیٰؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کے وجود سے اللہ تعالیٰ کے واقفِ اسرار روحانیہ ہونے کا ثبوت تو ضرور ملتا ہے۔ اسی طرح اس کے سمیع ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مجید ہونے کا ثبوت جتنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی سے ملتا ہے اتنا ثبوت حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ یا

ان کے ساتھیوں کی زندگی سے نہیں ملتا۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۔فرماتا ہے اس سورۃ کی آیتیں قرآن کریم کی آیتیں ہیں اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنے مضمون کو آپ کھول کر بیان کرتی ہے۔اور مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت کا موجب ہے۔ مگران مومنوں کے لئے نہیں جو صرف منہ سے اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے جو نمازیں قائم کرتے ہیں اور زکوتیں دیتے ہیں اور آخرت پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ فرما کر قرآن کریم کی ایک ایسی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے جس سے باقی الہامی کتب کلیۃً محروم ہیں۔دنیا میں کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جو اس کثرت کے ساتھ پڑھی جاتی ہو جس کثرت کے ساتھ دنیا میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے۔اور یہی وہ فضیلت ہے جو تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ میں بیان کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن کی آیات ہیں یعنی اس کتاب کی آیات ہیں جس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن ہے یعنی وہ تلاوت میں اس قدر آتا ہے کہ دنیا کی اَور کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

درحقیقت جو کتاب سب دنیا کو فائدہ پہنچانے والی ہو ضروری تھا کہ وہ قرآن ہو یعنی کثرت سے پڑھی جانے والی ہو۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ تورات اور انجیل کے تراجم کے باوجود وہ اس قدر نہیں پڑھی جاتیں جس قدر کہ قرآن پڑھا جاتا ہے حالانکہ وہ عربی زبان میں ہے اور لوگ بھی اسے عربی زبان میں ہی پڑھتے ہیں۔مخالفین کا یہ کہنا کہ چونکہ ایسے ذرائع اختیار کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے لوگ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ نمازوں وغیرہ میں پڑھنا اور اس وجہ سے اس کا پڑھا جانا ایک طبعی امر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پھر بھی طبعی امر نہیں کیونکہ اول جس کتاب کو نماز میں پڑھنے کا حکم ہو ضروری نہیں کہ لوگ کثرت سے اس پر ایمان لے آئیں۔آخر کثرت نسبت سے ہوتی ہے۔دوسری کتب کے مقابل میں کثرت تلاوت اس کی تبھی ہوسکتی تھی جبکہ اس کے ماننے والوں کی تعداد بھی بہت ہو۔ورنہ اس کی کثرت سے تلاوت کس طرح ہوسکتی تھی۔اور لوگوں سے منوالینا تو طبعی امر نہیں ہے۔سکھ لوگ گرنتھ پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ قرآن نہیں۔ کیونکہ ماننے والے نہایت محدود ہیں۔اور کثرت سے پڑھنے والوں کا وجود یقیناً پیشگوئی کے ماتحت آسکتا ہے۔

دوم۔اگر ماننے والے بھی کثرت سے ہوں تب بھی ضروری نہیں کہ لوگ حکم کو ماننے والے ہوں۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود غیر زبان ہونے کے لوگ کثرت سے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی طبعی امر نہیں ہے۔

سوم۔ پھر سوال یہ ہے کہ جبکہ الہامی کتب خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں اور خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ یہ تدابیر جن سے قرآن پڑھا جاتا ہے اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ پھر کیوں نہ اس نے دوسری کتب کے متعلق بھی وہ تدابیر اختیار کرلیں۔ یا اب کیوں وہ لوگ یہ تدابیر اختیار نہیں کر لیتے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہی ایک کتاب قرآن بنے۔ اور جب کتب کے نازل کرنے والے خدا نے صرف ایک کتاب کو ہی قرآن بننے کے لئے چنا ہے تو یقیناً وہ افضل ہے۔

چہارم۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی عبارت اس قسم کی ہے کہ وہ بہ نسبت دوسری کتب کے جلد یاد ہوسکتی ہے۔ اس لئے لوگ اسے زیادہ حفظ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہ دوسری کتب نے بھی ایسا ہی کرلیا اور پھر کیا اس قسم کی عبارت بنانا کوئی آسان بات ہے۔

غرض قرآن کریم کا قرآن ہونا ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس میں دوسری کتب شامل نہیں۔ مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ بعض آریہ مباحثوں میں قرآن کریم کی آیات پڑھ کر فخر کیا کرتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہاری کتب پڑھ لیتے ہیں مگر تم ہماری کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں ان کا یہ دعویٰ قرآن کریم کی تائید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ قرآن اپنے دعویٰ کے مطابق قرآن ہے اور دشمن بھی اسی کی زبان میں اسے سیکھ سکتے ہیں اور ویدوں کو خود اس کے ماننے والے بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پس جو نام اس کا غیر معمولی حالات میں قرآن رکھا گیا تھا وہ سچا ثابت ہوا۔ اور دشمن نے خود اپنے فعل سے اس کی صداقت پر مہر لگادی۔ پس یہ ہم پر ہنسی نہیں بلکہ ہماری الہامی کتاب کی تصدیق ہے۔

یہ ایک عجیب امر ہے کہ سورۂ حجر میں تو الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ فرمایا ہے اور اس سورۃ میں طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ فرمایا ہے۔ گویا ایک جگہ کتاب کو پہلے رکھا ہے اور قرآن کو بعد میں اور مبین کی صفت قرآن کے ساتھ لگائی ہے اور دوسری جگہ قرآن کو پہلے رکھا ہے اور کتاب کو بعد میں اور مبین کی صفت کتاب کے ساتھ لگائی ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟

اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ سورۃ حجر کی اس آیت کے بعد کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ کفار کا ذکر ہے اور فرمایا ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ اور سورۃ نمل کی آیت کے بعد مومنوں کا ذکر ہے اور فرمایا ہے کہ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ اور یہ بات واضح ہے کہ کفار قرآن کریم کی تلاوت نہیں کرتے۔ ان کا علم زیادہ تر مسلمانوں سے سن کر ہوتا ہے اور سننے پر لفظ قرآن دلالت کرتا ہے۔ پس ان کے لئے قرآن مبین ہوتا

ہے۔اور مومن اپنے مولیٰ کے کلام کو پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کا پڑھنا ان کے سننے سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً دن میں اگر وہ ایک پارہ کی تلاوت کرتے ہیں تو شاید ایک ربع سنتے ہیں۔پس ان کا علم زیادہ تر صفت کتاب سے آتا ہے۔اس وجہ سے ان کے لئے صفت کتاب زیادہ مبین ہوتی ہے۔پس اول الذکر مقام پر قرآن کے ساتھ مبین کو لگایا اور ثانی الذکر مقام پر کتاب کے ساتھ۔اور یہ جو آگے پیچھے ان لفظوں کو کیا گیا ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ کافر کا پہلا تعلق قرآن سے ہوتا ہے۔یعنی پہلے وہ الفاظ سنتا ہے۔پھر اس کا دل صاف ہو تو وہ اسے اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔اور مومن اسے پہلے واجب سمجھے ہوئے ہوتا ہے پھر اس کے بعد وہ اس کی قرأت کی طرف توجہ کرتا ہے۔پس جس چیز کو جس سے زیادہ قرب تھا اس کے قریب اس لفظ کو رکھ دیا گیا ہے۔

پھر میرے نزدیک سورۂ حجر میں کتاب کا لفظ پہلے اور قرآن کا لفظ بعد میں اور سورۂ نمل میں قرآن کا لفظ پہلے اور کتاب کا لفظ بعد میں اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ سورۂ حجر میں کتاب کی صفت سے زیادہ اس کے قرآن ہونے کی صفت پر زور دیا گیا ہے۔اور چونکہ کسی چیز کا درجہ اور مقام بیان کرتے وقت چھوٹی چیز کو پہلے بیان کیا جاتا ہے اور بڑی کو بعد میں۔اس لئے سورۂ حجر میں کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں بیان کیا گیا ہے۔لیکن اس سورۃ میں چونکہ قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو نمایاں کرنا تھا۔اس لئے اس میں قرآن کا لفظ پہلے رکھا گیا اور کتاب کا بعد میں۔گویا قرآن اور کتاب یہ دو نام نہیں بلکہ دو صفات ہیں جو قرآن کریم کی بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب بھی ہے اور قرآن بھی۔ کتابؐ میں اس کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن میں اس کے بکثرت پڑھے جانے کی خبر دی گئی ہے۔اور یہ دونوں صفات یکجائی طور پر صرف قرآن کریم میں ہی پائی جاتی ہیں۔یعنی یہ کتاب تحریر میں بھی موجود ہے اور اس کثرت سے اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے کہ دنیا میں اور کوئی کتاب نہیں جس کی اس کثرت سے تلاوت کی جاتی ہو۔بیشک تورات اور انجیل بھی پڑھی جاتی ہیں مگر اول تو وہ اس کثرت کے ساتھ نہیں پڑھی جاتیں جس کثرت کے ساتھ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ایسے عشاق عطا فرمائے ہیں جو اس کے ایک ایک لفظ کو حفظ کرتے اور رات دن خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی سناتے رہتے ہیں۔لیکن تورات اور انجیل کا دنیا میں کوئی حافظ نہیں۔ویدوں کا ایک ایک لفظ یاد رکھنے والا دنیا میں کوئی فرد نہیں۔یہی حال ژند اور اوستا کا ہے۔صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے کتابی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے اور حفظ بھی کیا جاتا ہے۔اور پھر نمازوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔پس چونکہ اس سورۃ میں قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو زیادہ نمایاں کرنا تھا۔اس لئے اس سورۃ میں قرآن کا لفظ پہلے اور

کتاب کا لفظ بعد میں رکھا گیا۔

پھر ایک اَور حکمت بھی ان الفاظ کے آگے پیچھے کرنے میں ہے۔ اور وہ یہ کہ سورۂ حجر میں ان انبیاء کا ذکر تھا جن میں کتابت کا رواج کم تھا اور علوم کو زبانی یاد رکھا جاتا تھا۔ جیسے حضرت آدمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت شعیبؑ اور حضرت صالحؑ وغیرہ۔ ان سب کے زمانوں میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور چونکہ سورۂ حجر میں انہی انبیاء کی قوموں سے خطاب کیا گیا ہے جن میں تحریر کا رواج کم تھا اور جنہوں نے حفظ کے ذریعہ سے قرآنی علوم سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس لئے اُس سورۃ میں قرآن کے ساتھ مبین کا لفظ رکھا اور بتایا کہ ان اقوام میں اس کلام کی صفت قرآن لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے گی۔ لیکن کتاب کی صفت بھی ساتھ ہی بیان کر دی تاکہ قرآن کریم کی مکمل حفاظت کا اظہار ہو۔ لیکن اس سورۃ میں کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ لگایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے واقعات پر زور دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھے اور جن میں کتابت کا رواج زیادہ اور زبانی یاد رکھنے کا رواج کم تھا۔ ان انبیاء کی اقوام نے چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کی صفتِ کتاب سے بہ نسبت صفت قرآن کے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا اس لئے اس کی مناسبت سے اس جگہ قرآن کے لفظ پر کم اور کتاب پر زیادہ زور دیا۔ مگر دونوں صفات کا اکٹھا ذکر کر کے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی کہ قرآن کریم حفظ بھی کیا جائے گا۔ اور لکھا بھی جائے گا۔ لیکن وہ قومیں جو تحریر سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی ہیں وہ اسے کتاب سے پڑھ کر زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور اس سورۃ میں وہی قومیں مخاطب کی گئی ہیں۔ گویا وہ قومیں جو حافظہ سے زیادہ کام لیتی ہیں ان کے لئے تو یہ قرآن مبین ہوگا۔ اور جو قومیں تحریر سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں ان کے لئے یہ کتاب مبین ہوگا۔

قرآن کریم پر نظر غائر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قرآن مبین کا لفظ صرف دو دفعہ اور کتاب مبین کا لفظ بارہ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ جس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا کتاب ہونے کے لحاظ سے حلقہ زیادہ وسیع ہوگا اور اکثر لوگ اس کے کتاب ہونے سے ہی فائدہ اٹھائیں گے گو ایک طبقہ ایسا بھی ہوگا جو حفظ کے ذریعہ اس کی برکات سے بہرہ اندوز ہوگا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ تعلیم کا رواج زیادہ کریں تاکہ مسلمان قرآنی برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔

پھر تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ میں قرآن کریم کی دوسری فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک کتاب ہے یعنی وہ لکھی ہوئی اور محفوظ ہے جبکہ باقی الہامی کتب اب صرف نام کی کتاب رہ گئی ہیں حقیقتاً وہ اب کتاب نہیں

رہیں اوران کے الفاظ اوران کی عبارتیں ہی بتا رہی ہیں کہ ان کی حقیقت بدل گئی ہے۔ نیز کتاب وجوب پر دلالت کرتی ہے۔اورصرف قرآن کریم ہی اب ایک ایسی کتاب ہے جس پرعمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کے ہر حکم پر لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ عمل کرتے ہیں ۔مگر تورات،انجیل،ویداورژند پر بہت کم عمل ہوتا ہے۔پس قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے کیا بلحاظ اس کے کہ وہ ساتھ کے ساتھ لکھی جاتی رہی اوراب تک بغیر کسی زیراورزبر کے فرق کے وہ وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اورکیا بلحاظ اس کے کہ یہی وہ کتاب ہے جس پر دنیا میں عمل کیا جاتا ہے باقی مذاہب والے بیشک اپنی الہامی کتب کو شائع کرتے اوران کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی تعلیموں سے اختلاف رکھنے والوں کو بُرا بھلا بھی کہتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو وہ ان کتابوں کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور یہ دونوں حقائق ظاہر و باہر ہیں۔

نولڈکے جرمن کا مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ

''ممکن ہے تحریر کی کوئی معمولی غلطیاں ہوں تو ہوں۔لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔ یوروپین علماء کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

اسی طرح سرولیم میور اپنی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں لکھتا ہے کہ

''اس زمانہ میں جو قرآن موجود ہے اس کے متعلق ہم ویسے ہی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصلی صورت میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا کلام ہے جس یقین سے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدل کلام ہے۔''

(Life of Muhammad by Sir William Muir pg:562,563)

اس کے مقابل پر تورات اورانا جیل کے متعلق خود بڑے بڑے پادری تسلیم کرتے ہیں کہ وہ محرف و مبدل ہوچکی ہیں۔پس دنیائے مذاہب کی تمام الہامی کتب میں سے صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے صحیح معنوں میں کتاب کہا جاسکتا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

پھر عمل کو لو۔تو عیسائی کہنے کو تو کہتے ہیں کہ مسیحؑ نے یہ کتنی اچھی تعلیم دی ہے کہ

’’ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔‘‘ (متی باب ۵ آیت ۳۹)

مگر آج اس تعلیم پر کہیں بھی عمل نہیں ہورہا۔ اگر عمل ہورہا ہے تو صرف قرآنی تعلیم پر جس نے کہا ہے کہ تم مجرم کو پکڑو اور اسے سزا دو۔ لیکن اگر تمہیں دکھائی دے کہ سزا سے وہ اَور بھی بگڑ جائے گا اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے دل میں ندامت پیدا ہوگی اور وہ اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کرے گا تو تمہارا فرض ہے کہ تم اسے معاف کردو۔ کیونکہ تمہارا کام دوسروں کی اصلاح کرنا ہے۔ ناواجب سزا یا ناواجب عفو سے کام لینا تمہارے لئے جائز نہیں۔ غرض عمل کے لحاظ سے بھی صرف قرآن کریم ہی کتاب کہلانے کی مستحق ہے جبکہ باقی کتابیں عمل کے میدان میں بالکل بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی کتاب ہے کہ اس پر عمل کرکے انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے۔

کتاب کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے ماہرین لغت نے لکھا ہے کہ اَلْکِتَابُ مَا یُکْتَبُ فِیْہِ، سُمِّیَ بِہٖ لِجَمْعِہٖ اَبْوَابَہٗ وَ فُصُوْلَہٗ وَمَسَائِلَہٗ یعنی کتاب اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں کچھ لکھا گیا ہو اور اسے کتاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف فصلوں اور ابواب اور مسائل کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کتاب کے معنے خط کے بھی ہیں اور کتاب کے معنے فرض کے بھی ہیں۔ حکم کے بھی ہیں اور قضا و قدر کے بھی ہیں۔ اسی طرح کَتَبَ السِّقَاءَ کے معنے ہوتے ہیں خَرَزَہٗ بِسَیْرَیْنِ مشکیزہ کو چمڑے کے تسمہ کے ساتھ سی دیا اور کَتَبَ النَّاقَۃَ کے معنے ہوتے ہیں اونٹنی کو دوسرے بچے کے ساتھ عادی بنانے کی کوشش کی۔ اور اس کے نتھنوں کو سی دیا تا کہ وہ بُو یعنی بھُس بھری کھال کی بُو نہ سونگھے۔ (اقرب)

ان معانی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کتاب اصل میں جمع کرنے کے معنے رکھتی ہے۔ کتاب کو بھی کتاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مختلف مضامین جمع ہوتے ہیں۔ اور خط کو بھی اس لئے کتاب کہتے ہیں کہ وہ دو دوستوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور فرض اور حکم کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ فرض اور حکم کو پورا کرکے انسان اپنے مطلوب سے مل جاتا ہے۔ اور قضا و قدر کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ انسان اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتا اور وہ اسے پا کر رہتا ہے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کی وحی کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور بندے کو جمع کرنے والی اور ان کے درمیان ایک واسطہ ہوتی ہے اور ان کے درمیان ایک تقریب پیدا کر دیتی ہے۔ پس جو کتاب بندہ اور خدا تعالیٰ کا

تعلق پیدا کر دیتی ہے وہ تو فی الواقعہ کتاب کہلانے کی مستحق ہے۔لیکن جو کتاب انسان کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتی وہ حقیقی معنوں میں کتاب نہیں کہلا سکتی ۔اور یہ خصوصیت صرف قرآن کریم کو ہی حاصل ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان اتصال پیدا کر دیتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے انسان خدا تعالیٰ کا مقرب ہوجاتا ہے۔قرآن کریم نے اس خصوصیت پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ فرماتا ہے ہم نے انسان کی فطرت میں ہی تعلق باللہ کا مادہ رکھ دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے ۔خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (العلق:۳)۔اس نے انسان کے اندر تعلق باللہ کا مادہ رکھا ہے ۔ بیشک اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اس نے انسان کو ایسی حالت سے پیدا کیا ہے جبکہ وہ رحم سے چمٹا ہوا تھا۔لیکن اس آیت کے ایک تحت السطح معنے بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ عربی محاورہ میں خُلِقَ مِنْ شَیْءٍ کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اس کی فطرت میں یہ چیز رکھی گئی ہے مثلاً وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (السجدة:۸) کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔لیکن جب خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ آجائے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ ہم نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جلدی کوئی مادہ نہیں کہ اسے گھولا اور انسان پیدا کر دیا۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ انسان کی فطرت میں عجلت رکھی گئی ہے ۔پس جہاں علق کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو اس حالت سے پیدا کیا ہے کہ وہ رحم سے چمٹا ہوا تھا وہاں اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے انسان کی فطرت میں محبت اور علاقہ کا مادہ رکھا ہے اور اس کی فطرت میں یہ بات مرکوز کر دی گئی ہے کہ وہ کسی کا ہو رہے ۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پنجابی کا ایک مصرع سنایا کرتے تھے۔جس کا مفہوم یہ تھا کہ یا تو تُو کسی کا ہوجا یا کوئی تیرا ہوجائے۔پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے انسانی فطرت میں محبت اور علاقہ کا مادہ رکھا ہے۔یعنی ہم نے اسے ایسی حالت پر پیدا کیا ہے کہ وہ سوائے اس کے چین پا ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی کا ہو رہے ۔ بیشک جب تک اسے اصل چیز نہیں ملتی اس وقت تک وہ کبھی بیوی کا ہو رہتا ہے کبھی بہن بھائی کا ہو رہتا ہے ۔کبھی ماں باپ کا ہو رہتا ہے۔کبھی دوستوں کا ہو رہتا ہے اور اس طرح وہ درمیان میں بھولتا پھرتا ہے۔مگر جب خدا تعالیٰ کے ملنے کا راستہ اس پر کھل جاتا ہے تو پھر وہ خدا تعالیٰ کا ہی ہوجاتا ہے۔حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے موقعہ پر دیکھا کہ ایک عورت کا بچہ گم ہوگیا ہے اور وہ میدان جنگ میں اپنے بچے کو تلاش کرنے کے لئے ماری ماری پھر رہی ہے۔اسے جہاں کوئی بچہ ملتا وہ اسے پیار کرتی اور گلے لگاتی ۔لیکن جب وہ دیکھتی کہ وہ اس کا اپنا بچہ نہیں تو اسے چھوڑ دیتی اور آگے چلی جاتی یہاں تک کہ اسے اپنا بچہ مل گیا۔اس نے اسے پیار کیا اور گلے لگا یا۔اور ایک جگہ آرام سے بیٹھ گئی ۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا۔تم

نے اس عورت کو دیکھا۔جس طرح یہ اپنے بچہ کے لئے بیتاب رہی اور جب اسے اپنا بچہ مل گیا تو سکون اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی۔اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے بھولے بھٹکے بندہ کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔لیکن جب اس کا بندہ صحیح رنگ میں توبہ کر کے اسے مل جاتا ہے تو وہ ایسا ہی سکون محسوس کرتا ہے جس طرح اس ماں نے محسوس کیا ہے (بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد و تقبیلہ)۔پس قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر تعلق اور محبت پیدا کرنے کا مادہ رکھ دیا ہے اور پھر وہ اس کے حصول کے ذرائع پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جو سچے مذہب کو دوسرے مذاہب یا عقائد پر فوقیت بخشتی ہے وہ تعلق باللہ ہی ہے۔ ایک انسان سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر محنتی ہوسکتا ہے۔وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر اچھا تاجر بن سکتا ہے وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر اچھا صنّاع بن سکتا ہے اور وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر صدقہ وخیرات بھی کر سکتا ہے۔مگر دنیا کا کوئی انسان سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر خدا رسیدہ نہیں ہوسکتا۔یہی وہ چیز ہے جو سچے مذہب پر چلنے والے اور نہ چلنے والے میں ما بہ الامتیاز ہے اور جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کوئی شخص سچے مذہب پر چلتا ہے یا نہیں۔یہ ظاہر ہے کہ خدا رسیدہ وہی ہوسکتا ہے جو اس راستے پر چلتا ہے جو خدا تک پہنچتا ہے۔جو شخص خدا تک جانے والے راستہ پر نہیں چلتا وہ خدا تک کس طرح پہنچ سکے گا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کوئی مادی چیز نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی خاص مکان ہے مگر ساری روحانی اور معنوی چیزوں کے لئے رستے ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر پڑھنا یا علم حاصل کرنا مادی چیز نہیں۔زبان جاننا مادی چیز نہیں۔اسی طرح جغرافیہ تاریخ اور حساب کا علم حاصل کرنا مادی نہیں مگر ان سب کے حصول کے لئے کچھ راستے مقرر ہوتے ہیں جب تک زبان دانی کے لئے زبان نہ سیکھی جائے۔جب تک علم حساب کے لئے حساب کی کتابیں نہ پڑھی جائیں جب تک جغرافیہ کے علم کے لئے جغرافیہ کی کتابیں نہ پڑھی جائیں اور جب تک تاریخ دانی کے لئے تاریخ کی کتابیں نہ پڑھی جائیں تب تک انسان زبان تک، حساب تک، جغرافیہ تک اور تاریخ تک نہیں پہنچ سکتا۔اسی طرح گو خدا کوئی مادی چیز نہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ مقرر ہے۔چنانچہ اسلام اس بارہ میں اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۲) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تو تمام بنی نوع انسان کو یہ بشارت دے دے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا خدا تم سے محبت کرنے لگ جائے گا۔اور تم اس کے محبوب اور پیارے بن جاؤ گے۔یہ کتنی بڑی بشارت ہے جو دنیا کو دی گئی ہے اور کتنا امید افزا پیغام ہے جو مردہ قلوب میں بھی حیاتِ نو پیدا کر دیتا ہے۔آج ساری دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ

اس نے تورات یا انجیل یا وید یا ژند اور اوستا پر عمل کر کے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیا ہے اور خدا اس سے ہمکلام ہوتا اور اس پر اپنے غیب کے اسرار ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ہر زمانہ میں ایسے پاکباز لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا اور اس کے انوار اور برکات سے حصہ لیا۔ بلکہ وہ دائمی طور پر مسلمانوں سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰم السجدة:۳۱-۳۲) یعنی وہ لوگ جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ استقلال کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے الہام سے نوازے جائیں گے اور خدا تعالیٰ کے فرشتے ان پر یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی کے بدنتائج کا خوف کرو۔ بلکہ اس جنت کے ملنے سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے دوست رہیں گے۔ اور اس جنت میں جو کچھ تمہارا جی چاہے گا وہ تم کو ملے گا اور جو کچھ مانگو گے وہ بھی تم کو دیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام ہر مومن کے لئے قرب الٰہی کے دروازہ کو کھلا تسلیم کرتا ہے اور وہ بنی نوع انسان کو یقین دلاتا ہے کہ اگر وہ سچے دل سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع کریں گے تو خدا تعالیٰ انہیں یقیناً اپنا محبوب بنا لے گا۔ اور انہیں اپنے کلام اور الہام سے نوازے گا اور مشکلات میں ان کی مدد کرے گا اور انہیں غیر معمولی کامیابیوں اور برکتوں سے حصہ بخشے گا مگر دنیا کی اَور کوئی الہامی کتاب ایسی نہیں جو اپنے متبعین کو ان برکات کا کروڑواں حصہ بھی دے سکتی ہو۔ پس صحیح معنوں میں صرف قرآن کریم ہی کتاب کہلانے کا مستحق ہے۔ جبکہ دوسری الہامی کتب نام کے لحاظ سے تو کتاب کہلاتی ہیں۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ کتاب نہیں کیونکہ وہ خدا اور بندوں کا باہمی تعلق پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

پھر قرآن کریم صرف کتاب ہی نہیں بلکہ وہ کتاب مبین بھی ہے۔ یعنی وہ نہ صرف انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر دیتا ہے بلکہ تقرب الی اللہ کے لئے جس قدر امور کی ضرورت ہے ان سب کو اس نے پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے گویا احکام یا اخلاق فاضلہ یا اعتقادات صحیحہ سے تعلق رکھنے والی کوئی بات ایسی نہیں جو قرآن کریم نے بیان نہ کی ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ جو چیز درون پردہ ہو۔ جب تک وہ آپ ہمیں آواز نہ دے اور آپ ہماری راہنمائی نہ کرے ہمیں باہر سے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو۔ ایک مکان کا دروازہ اندر سے بند ہے اور ہمیں

معلوم نہیں کہ اس کے اندر کون ہے۔ تو ہمیں اندر کا حال کس طرح معلوم ہوسکتا ہے اگر ہم محض اپنے قیاس سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ کریں گے تو وہ ویسی ہی بات ہوگی جیسے مشہور ہے کہ کسی شہر میں چار اندھے رہا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک دن اس شہر میں ہاتھی آ گیا۔ اور سینکڑوں آدمی اس کے دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ ان اندھوں نے شہر والوں سے کہا کہ ہمیں بھی وہاں لے چلو سارا شہر دیکھ آیا ہے۔ اگر ہم نہ گئے تو لوگ کیا کہیں گے۔ چنانچہ کوئی شخص انہیں سہارا دے کر وہاں لے گیا۔ اب وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے انہوں نے کہا چلو ہم ٹٹول کر ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نے ہاتھ مارا تو وہ اس کی دم پر پڑا۔ دوسرے نے ہاتھ مارا تو کان پر پڑا۔ تیسرے نے ہاتھ مارا تو سونڈ پر پڑا۔ چوتھے نے ہاتھ مارا تو پیٹ پر پڑا۔ اس کے بعد وہ واپس آ گئے۔ اور پھر انہوں نے بیٹھ کر آپس میں ہاتھی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ ایک نے کہا ہاتھی بس ایک لمبی سی چیز ہوتی ہے۔ جس کے آگے تھوڑے سے بال ہوتے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ تم بالکل جھوٹ بولتے ہو۔ ہاتھی تو ایسا ہوتا ہے جیسے چھاج ہوتا ہے۔ تیسرے نے کہا تم نے ہاتھی دیکھا ہی نہیں وہ تو ڈھول کی طرح ہوتا ہے۔ چوتھے نے کہا کہ سب غلط کہتے ہو۔ وہ تو ایک موٹی سی لچکدار چیز ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا (اس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا) یہ اختلاف اسی لئے ہوا کہ انہوں نے بے دیکھے محض قیاس سے ایک چیز کا اندازہ لگایا تھا۔ اسی طرح جو چیز درون پردہ ہو اس کا پتہ باہر سے نہیں لگ سکتا اور اگر کوئی پتہ لگانے کی کوشش کرے گا تو وہ اندھوں کی طرح غلط نتیجہ پر ہی پہنچے گا۔ یہی حال خدا تعالیٰ کی معرفت اور اس کی دینی تعلیموں کا ہے۔ یہ علم صرف خدا تعالیٰ کی کتاب سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اور جو شخص اسے باہر سے سیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ ان اندھوں کی طرح ہوتا ہے جن میں سے کسی نے سونڈ پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ میں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے۔ کسی نے دُم پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ میں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے۔ کسی نے پیٹ پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ میں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے اور کسی نے کان پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ میں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے۔

اس زمانہ میں بعض بیوقوف سائینسدان کہتے ہیں کہ ہم عقل سے خدا کو معلوم کر سکتے ہیں۔ جیسے بعض بے وقوف علماء یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا عقل سے کیا تعلق ہے۔ یہ دونوں بیوقوف ہیں۔ خدا کو ہم عقل سے نہیں دریافت کر سکتے اور مذہب کو بغیر عقل کے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ جس طرح دنیا کی تمام معقول باتوں کے سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے اسی طرح مذہب کے سمجھنے کے لئے بھی عقل استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف: ۱۰۹) یعنی اے محمد رسول اللہ! تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ میرا طریق یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں۔ اور میں اور میرے متبع سب بصیرت پر قائم ہیں۔

یعنی ہر بات کو ہم دلیل اور عقل کے ساتھ مانتے ہیں یونہی نہیں مانتے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی انسان محض عقل سے خدا کو پا سکتا ہے۔ خدا کو پانے کے لئے مذہب ہمارا راہنما ہے اور مذہب کے سمجھنے کے لئے عقل کا پاسبان ضروری ہے اور عقل کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے نبی کا وجود ضروری ہے ورنہ خالی عقل سے جن لوگوں نے مذہب کو پانے کی کوشش کی ہے انہوں نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ پنجابی میں ایک ضرب المثل ہے۔ ’’گھروں میں آیاں تے سنیہے تو دینداہاں‘‘۔ یعنی گھر سے تو میں آیا ہوں اور پیغام تم دے رہے ہو۔ بالکل یہی بات خدا تعالیٰ کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص خدا سے ملنا چاہے تو لازماً خدا ہی اسے بتا سکتا ہے کہ تم اس اس طرح مجھے مل سکتے ہو۔ وہ خود بخود اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس وہ سائینسدان پاگل ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا کو اپنی عقل کے زور سے پا سکتے ہیں۔ خدا کو خدا کے ذریعہ ہی پایا جا سکتا ہے اور خدا کی راہنمائی حاصل کرنے کا سب سے بڑا اور کامیاب ذریعہ یہی ہے کہ انسان خدا کے کلام پر غور کرے اسے سمجھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

پھر فرماتا ہے۔ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ یہ قرآن مومنوں کے لئے بہت بڑی ہدایت اور بشارت کا موجب ہے۔ اس جگہ ھدًی کی تنوین تعظیم کے لئے استعمال کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ہدایت بہت بڑی شان رکھتی ہے۔ یعنی ہدایت کا کوئی درجہ اور مقام ایسا نہیں جس کی طرف قرآن کریم بنی نوع انسان کی راہنمائی نہ کرتا ہو۔ یوں تو اپنے زمانہ میں تورات بھی دنیا کی ہدایت کا موجب تھی اور انجیل بھی دنیا کی ہدایت کا موجب تھی اور ژندواوستا بھی دنیا کی ہدایت کا موجب تھی مگر کامل ہدایت جس نے انسان کو نقطۂ کمال تک پہنچا دیا اور جس کے بعد قیامت تک کے لئے کسی اور ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ہدایت کے مختلف مدارج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد:۱۸) یعنی جو لوگ ہدایت کے راستہ پر چل پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت پر ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح خدا تعالیٰ غیر محدود ہے اسی طرح اس کے قرب کی راہیں بھی لامتناہی ہیں۔ مگر قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر مرحلہ پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستہ میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں آتا جب انسان اپنے آپ کو قرآنی راہنمائی سے مستغنی سمجھ سکے۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک قرآنی ہدایت کا محتاج رہتا ہے۔ اور قرآن بھی اسے قدم قدم پر اپنے انوار اور برکات سے حصہ دیتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ مومنوں کے لئے بشارت کا بھی موجب ہے یعنی یہی نہیں کہ قرآن انسان کے سامنے اللہ تعالیٰ

کے قرب کے غیر متناہی دروازے کھولتا ہے بلکہ وہ اس کی تائید میں اپنے نشانات بھی ظاہر کرتا ہے اور اپنی بشارتوں سے بھی اسے حصہ دیتا ہے اگر مومن کی تائید میں الٰہی نشانات ظاہر نہ ہوں تو چونکہ ہدایت ایک روحانی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب دوسروں کو مادی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا۔ اس لئے لوگ اس شبہ میں مبتلا رہ سکتے تھے کہ معلوم نہیں یہ سچ بھی کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی تائیدات مومنوں کے شامل حال رکھتا ہے اور اپنے نشانات ان کی ایمانی تقویت کے لئے اور ان کے دشمنوں پر حجت تمام کرنے کے لئے نازل کرتا رہتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ یہ لوگ حقیقتہً ہدایت یافتہ ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کر لیا ہے۔ ایک جھوٹا اور مفتری انسان یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہے مگر وہ خدا تعالیٰ کے نشانات اپنی تائید میں نازل نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کسی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی نصرت اور اس کی تائید کی فعلی شہادت ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے الہامات نازل ہوتے ہوں۔ اس کی دعائیں غیر معمولی طور پر قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہوں۔ اس کے دشمنوں کو ناکام رکھا جاتا ہو۔ اور اسے اپنے مقاصد میں کامیابی پر کامیابی حاصل ہوتی ہو تو یہ ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں بھی سچا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اس مستقل ہدایت نامہ پر عمل کرتے کرتے خدا تعالیٰ کے قرب میں بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر خدا تعالیٰ بھی ان کی تائید کے لئے آسمان سے اتر آتا ہے اور وہ انہیں مشکلات کے ہجوم میں بشارات سے حصہ دیتا اور انہیں اپنے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے اور جس مقصد کو لے کر وہ کھڑے ہوتے ہیں اس میں انہیں کامیابی عطا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ یہ قرآن ہدایت اور بشارت کا تو موجب ہے مگر ان کے لئے نہیں جو اپنے منہ سے تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن عمل دیکھو تو نہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے نہ قرآن ہدایت کا موجب بنتا ہے اور نہ الٰہی تائیدات اور اس کی برکات ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ قرآن کریم کی کامل ہدایت اور اس کی بشارت کے شیریں ثمرات سے صرف وہی لوگ متمتع ہوتے ہیں جو باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ہمیشہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا اہم ترین حصہ جو اس کے لئے دل اور دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عبادت الٰہی ہی ہے۔ اگر عبادت الٰہی کو ترک کر دیا جائے تو مذہب صرف رسم و رواج کا نام بن کر رہ جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ سے تعلق کا دعویٰ محض ایک ڈھکوسلہ ہوگا۔ اس لئے اس جگہ مومنوں کی پہلی صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یُقِیْمُوْنَ

الصَّلٰوۃَ وہ نمازوں کو قائم کرتے ہیں یعنی خود بھی باجماعت نماز ادا کرتے ہیں جس کی طرف یُقِیْمُوْنَ کا لفظ اشارہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی نمازوں کی ادائیگی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ گویا بحیثیت جماعت وہ نمازوں کی ادائیگی کا ہمیشہ التزام رکھتے ہیں۔ اگر یہاں صرف انفرادی نمازوں کا ذکر ہوتا تو یُصَلُّوْنَ کہنا کافی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یصلّون کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے اَور مقامات میں بھی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ ہی استعمال ہوئے ہیں اور اقامت ہمیشہ باجماعت نماز میں ہی ہوتی ہے۔ پس مومنوں کی ایک بڑی علامت اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں اور نہ صرف خود نمازوں کی پابندی کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی نمازوں کی ادائیگی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے بعض لوگ خود تو نماز کے بڑے پابند ہوتے ہیں مگر اپنے بیوی بچوں کے متعلق کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر ان کے دل میں سچا اخلاص ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بچے کا یا بیوی کا یا بہن بھائی کا نماز چھوڑنا انسان گوارہ کر سکے۔

ہماری جماعت کے ایک مخلص دوست تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے لڑکے نے ایک دفعہ مجھے لکھا کہ میرے والد صاحب میرے نام الفضل جاری نہیں کرواتے۔ میں نے انہیں لکھا کہ آپ کیوں اس کے نام الفضل جاری نہیں کراتے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ مذہب کے معاملہ میں اسے آزادی حاصل رہے اور وہ آزادانہ طور پر اس پر غور کر سکے۔ میں نے انہیں لکھا کہ الفضل پڑھنے سے تو آپ سمجھتے ہیں اس پر اثر پڑے گا اور مذہبی آزادی نہیں رہے گی۔ لیکن کیا اس کا بھی آپ نے کوئی انتظام کر لیا ہے کہ اس کے پروفیسر اس پر اثر نہ ڈالیں۔ اس کی کتابیں اس پر اثر نہ ڈالیں۔ اس کے دوست اس پر اثر نہ ڈالیں۔ اور جب یہ سارے کے سارے اثر ڈال رہے ہیں تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ اسے زہر تو کھانے دیں اور تریاق سے بچایا جائے۔ غرض اقامت صلوٰۃ ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ اور اس میں خود نماز پڑھنا۔ دوسروں کو پڑھوانا اور اخلاص اور جوش کے ساتھ پڑھنا۔ باوضو ہو کر ٹھہر ٹھہر کر باجماعت اور پوری شرائط کے ساتھ نماز پڑھنا شامل ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ نماز خدا اور بندے کے درمیان ملاقات کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ گویا اس کے ذریعہ الوہیت کا وہ رنگ جو نبی کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ پیدا کرنا چاہتا ہے مومنوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز باجماعت کا اس قدر احترام فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! میرا مکان مسجد سے بہت دور ہے اور چونکہ مجھے مسجد پہنچنے میں سخت دقّت پیش

آتی ہے اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے گھر میں ہی نماز ادا کرلیا کروں (اس وقت مدینہ میں کچے مکانات ہوتے تھے اور جب بارش کے دنوں میں پانی گلیوں میں بہتا تھا تو چونکہ پانی دیواروں کی بنیادوں کے ساتھ ٹکرا کر گذرتا تھا اور دیواریں پانی سے ٹوٹ جاتی تھیں اس لئے پانی کی زد سے دیواروں کو بچانے کے لئے لوگوں نے گلی میں دیواروں کی بنیادوں کے ساتھ ساتھ جلے ہوئے پتھر جن کو پنجابی زبان میں کھنگر کہتے ہیں رکھے ہوتے تھے۔ گلیوں میں کھنگر رکھنے کا رواج ہمارے ملک میں بھی ہے اور چونکہ ایک نابینا کے لئے سڑک کے بیچ میں چلنا مشکل ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور دیوار کے ساتھ ہاتھ مارتے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسی دیوار کے ساتھ چلیں جس کے ساتھ کھنگر رکھے ہوئے ہوں تو ان کے گر کر زخمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے) جب اس نابینا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ چونکہ دیواروں کے ساتھ پتھر رکھے ہوتے ہیں اور گلی کے بیچ میں مَیں چل نہیں سکتا اور اگر دیوار کے ساتھ چل کر مسجد میں آؤں تو گر کر زخمی ہونے کا خطرہ ہے اس لئے مجھے اجازت ہو تو میں گھر پر نماز ادا کرلیا کروں۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت اچھا۔ اگر تمہیں مسجد میں آتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے تو تم اپنے گھر میں ہی نماز ادا کرلیا کرو۔ یہ سن کر وہ نابینا گھر کی طرف چل پڑا۔ مگر ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ اس کو واپس بلاؤ۔ وہ جب واپس آیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے گھر میں اذان کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ اس نے عرض کیا۔ ہاں یا رسول اللہ! اذان کی آواز تو پہنچ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر اذان کی آواز تمہارے گھر میں پہنچ جاتی ہے تو چاہے تمہیں مسجد میں آتے وقت ٹھوکریں لگیں اور تم زخمی ہو جاؤ۔ مسجد میں ضرور آیا کرو (مسلم کتاب المساجد باب یجب إتیان المسجد علی من سمع النداء)۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جب عشاء یا صبح کی نماز ہو تو میں اپنی جگہ کسی اَور کو کھڑا کر دوں اور کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر ان کے سروں پر لکڑیوں کے گٹھے رکھ کر سارے شہر کا چکر لگاؤں اور جو لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے ہوں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں (بخاری کتاب الجماعۃ و الامامۃ باب وجوب صلاۃ الجماعۃ)۔ اب دیکھو گو آپ نے عملاً ایسا کیا تو نہیں۔ مگر اس سے اتنا تو ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں نماز باجماعت کی کس قدر اہمیت تھی۔ آپ نے اس مثال کے ذریعہ لوگوں کو سمجھایا کہ جو لوگ باجماعت نماز ادا نہیں کرتے وہ اپنے آپ کو دوزخ کا ایندھن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیشک دنیا میں نیکی کے اَور بھی بہت سے کام ہیں۔ لیکن نماز کو خدا تعالیٰ نے سب سے مقدّم قرار دیا ہے اور سوائے اس کے کہ کوئی معذوری ہو یا کوئی ہنگامی کام پڑ جائے نمازوں کے اوقات میں مسجد میں آنا نہایت ضروری ہے۔ ہنگامی کاموں سے مراد یہ ہے کہ مثلاً کسی جگہ

آگ لگ گئی ہو تو اس وقت آگ بجھانا ضروری ہوگا۔نماز بعد میں ادا کر لی جائے گی۔لیکن اس قسم کے استثنائی حالات کے بغیر جو شخص نماز باجماعت کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے وہ ایک بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف ان آیات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ زکوٰۃ ہے۔زکوٰۃ کی ضرورت اور اس کی اہمیت درحقیقت غربت کے سوال سے پیدا ہوتی ہے۔اور غربت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی بھی بنی نوع انسان سے جدا نہیں ہوئی۔عام طور پر لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ جب دنیا کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک حصہ غریب ہو جاتا ہے۔حالانکہ یہ بات درست نہیں۔آبادی کی کمی کی صورت میں بھی ہمیں غربت ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے اس کی کثرت کی صورت میں۔چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ اس وقت صرف چند ہی افراد تھے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بھی بعض پر غربت کا زمانہ آیا تھا کیونکہ فرماتا ہے کہ اگر تُو اس جنت میں رہے گا تو تُو پیاسا نہیں رہے گا۔تیرے ساتھی بھوکے نہیں رہیں گے۔اور تیرے ساتھی ننگے نہیں رہیں گے۔اس وسیع دنیا میں جہاں ہر دولت اور ہر خزانہ خالی پڑا تھا اور کسی کا کوئی مالک نہیں تھا کسی مخصوص قانون میں رہ کر روزی ملنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ساری دنیا کا سونا ان کے قبضہ میں تھا ساری دنیا کی چاندی ان کے قبضہ میں تھی۔ساری دنیا کا پیتل ان کے قبضہ میں تھا۔ساری دنیا کا لوہا ان کے قبضہ میں تھا۔ساری دنیا کے پھل، پھول اور اعلیٰ درجہ کی زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں۔پھر یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر تُو ایک خاص قانون کے ماتحت رہے گا تو بھوک اور ننگ سے بچ جائے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ باوجود ساری دولتوں کے پھر بھی اس بات کا امکان تھا کہ بعض لوگ بھوکے رہیں۔بعض پیاسے رہیں اور بعض ننگے رہیں۔اور یہ صحیح بات ہے۔درحقیقت دنیا میں دولت دو قسم کی ہوتی ہے ایک بالقوۃ اور ایک بالفعل۔پھر بالفعل بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک بالفعل دولت ایسی ہوتی ہے جو سکہ کی صورت میں ہو یا ان چیزوں کی صورت میں جن سے دوسری اشیاء خریدی جا سکتی ہیں۔اور ایک بالفعل دولت اجناس کی صورت میں ہوتی ہے جن کو استعمال کیا جاتا ہے۔پھر اجناس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو بغیر کسی اَور تیاری کے انسان کے استعمال میں آجاتی ہیں اور ایک وہ جن کی تیاری کے لئے کوشش اور سعی کی ضرورت ہوتی ہے۔جہاں تک بالقوۃ دولت یعنی وجود دولت کا سوال ہے انگریزوں نے اسکا نام ویلتھ رکھا ہے اور اس سے مراد کسی ملک کے وہ سامان دولت ہوتے ہیں جو اس میں قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں۔مثلاً اگر کسی ملک میں سونے کی کانیں ہیں یا چاندی کی کانیں ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے پاس ویلتھ ہے۔مگر اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔اگر وہ چاندی اس تک پہنچ نہیں سکی یا لوگوں کے پاس زرخیز زمینوں میں گندم اور روئی بونے کے سامان نہیں تو پھر بھی وہ لوگ

بھوکے اور پیاسے اور ننگے رہیں گے پس ایک دولت تو اس قسم کی ہوتی ہے جو بالقوۃ ہوتی ہے۔اگر اس ملک کے لوگوں میں صنعت وحرفت نہیں یا انہیں زمینداری کا علم نہیں تو باوجود اس کے کہ وہ کانوں پر بیٹھے ہوں گے اور کروڑوں کروڑ روپیہ کا سونا ان میں موجود ہوگا۔وہ زرخیز زمینوں پر بیٹھے ہوں گے۔ایسی زمینوں پر کہ اگر اس میں ایک دانہ بھی ڈال دیا جائے تو سینکڑوں دانے پیدا ہوں۔لیکن پھر بھی وہ فاقے مر رہے ہوں گے گویا ان کے پاس دولت تو ہوگی لیکن ساکن دولت ہوگی۔لیکن اگر دنیا میں کوئی ایسا نظام قائم ہوجاتا ہے جو لوگوں کو مختلف قسم کے فنون سکھاتا ہے خواہ الہام کے ذریعہ سے یا القائے الٰہی کے ذریعہ سے۔اور وہ کہتا ہے کہ آؤ ہم تمہیں زمینداری کا طریق بتاتے ہیں کپڑا بننے کے طریق سکھاتے ہیں یا اسی قسم کے اور فنون سکھاتے ہیں جن سے تم اپنی تمدنی حالت کو سدھار سکو تو یقیناً اس کے ذریعہ لوگوں کی بھوک اور ان کی پیاس دور ہوجائے گی۔جیسے اسلام کی روایتوں میں خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں یہ آتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے لوگوں کو زراعت سکھائی۔اور حضرت شیثؑ نے ان کو کپڑا بننا سکھایا۔اب چاہے انہیں آدمؑ نے سکھایا ہو یا شیثؑ نے یا کسی اَور نے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے امور میں الہام الٰہی مدد کرتا تھا۔جیسے قرآن کریم میں صاف طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ زبان ابتداء میں الہاماً سکھائی گئی تھی۔چنانچہ فرماتا ہے۔عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۲)۔اس سے قیاس کرکے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح ابتدائی زمانہ میں الہام کے ذریعہ زبان کا سکھایا جانا ضروری تھا۔اسی طرح الہام کے ذریعہ انہیں فنون سکھائے جانے بھی ضروری تھے۔ورنہ اس کے بغیر انسان مدتوں تک تکلیف اٹھاتا چلا جاتا۔پس اگر کوئی نبی آجائے اور وہ یہ کہے کہ تم زمین میں ہل چلاؤ اور کھیتی باڑی کرو۔اسی طرح وہ مختلف قسم کے درخت اور باغات لگانے کی تعلیم دے تو یقیناً اس کے نتیجہ میں اس کے ماننے والوں کو روٹی ملنے لگ جائے گی اور وہ لوگ جو نبی کے تابع نہیں ہوں گے اگر وہ زبان سیکھنے سے انکار کردیں گے تو گونگے رہیں گے۔اور اگر کھیتی باڑی نہیں کریں گے یا کپڑا بننا نہیں سیکھیں گے یا کنوئیں نہیں کھودیں گے تو بھوکے اور پیاسے اور ننگے رہیں گے۔یہ فنون ابتدائی دور میں خواہ کیسی ہی ابتدائی شکل میں ہوں۔خواہ کھال سے وہ اپنا ننگ ڈھانکتے ہوں یا پھلوں پر ان کا گذارہ ہوتا ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو لوگ اس نظام کے ماتحت آجائیں گے وہ بھوک اور پیاس اور ننگ سے بچ جائیں گے۔لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جو غریب ہو۔کیونکہ حوادث آتے ہیں اور انسان کو بے دست و پا بنا دیتے ہیں۔فرض کرو۔دنیا کے پردہ پر ایک ہی انسان ہے کشمیر بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ہزارہ بھی اس کے قبضہ میں ہے۔کابل کی وادیاں بھی اس کے قبضہ میں ہیں اور اس طرح دنیا کے سارے انگور ساری ناشپاتیاں، سارے سیب اور سارے آم اس کے قبضہ میں

ہیں۔لیکن اس کے ہاتھ بھی کٹے ہوئے ہیں اور پیر بھی کٹے ہوئے ہیں تو وہ اس دولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ اور پھر بھی بھوکا اور پیاسا رہے گا۔پس ابتدائی زمانہ میں باوجودیکہ دولت موجود تھی دنیا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ اسے فنون نہیں آتے تھے جب آدمؑ کے ذریعہ دنیا نے فنون سیکھے اور ان کی بھوک اور پیاس اور لباس کی دقّت دور ہوئی تو پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ گیا جو ان چیزوں سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔جیسے لولے۔لنگڑے اور اپاہج وغیرہ۔اب چاہے ساری دنیا میں صرف پندرہ آدمی ہوں اور دو لولے ہوں پھر بھی دو لولے اپنی بھوک اور پیاس کیسے دور کر سکتے ہیں جب تک ان پندرہ میں کوئی نظام موجود نہ ہو اور وہ ان لولوں لنگڑوں کی بھوک اور پیاس دور کرنے کا ذمہ وار نہ ہو۔آدمؑ کی نبوت کی بنیاد اصل میں ان بتدائی تعلیموں پر ہی تھی جن سے انسان انسان بنا۔آپ نے بنی نوع انسان کو زبان سکھائی۔مختلف قسم کے فنون کی تعلیم دی۔تمدن کے اصول بتائے۔انہیں بتایا کہ آپس میں مل کر رہنا چاہیے اور اگر کوئی غریب یا لولا لنگڑا ہو تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔جب اس قسم کی سوسائٹی قائم ہو جائے گی۔ تو ہم کہہ سکیں گے کہ یہ سوسائٹی نہ بھوکی رہے گی نہ ننگی اور نہ پیاسی۔اگر کوئی لولا لنگڑا ہوگا تو دوسرے لوگ اس کی مدد کریں گے۔اور اگر لوگ بھوکے ہوں گے تو وہ زراعت اور باغبانی اور کان کنی کے ذریعہ اپنی اس تکلیف کو دور کر سکیں گے اور اس طرح دنیا کو روپیہ بھی مل جائے گا۔اور ان کی تکالیف بھی دور ہو جائیں گی۔پس غربت کا مسئلہ اس زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ جب سے انسان اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے یہ سوال زیر بحث چلا آیا ہے۔جب ساری دنیا کے مالک صرف دو چار گھرانے تھے تب بھی غربت موجود تھی اور تب بھی ایک قانون کی ضرورت تھی اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ بنی نوع انسان کو یہ پیغام دیا گیا کہ اگر تم ان قواعد کی پابندی کرو گے تو بھوکے اور پیاسے نہیں رہو گے۔جس کے معنے یہ ہیں کہ آدمؑ کے زمانہ میں بھی جب صرف چند آدمی تھے ممکن تھا کہ لوگ بھوکے رہیں۔ممکن تھا کہ وہ پیاسے رہیں اور ممکن تھا کہ وہ ننگے پھریں۔پھر لوگ بڑھنے شروع ہوئے۔پندرہ سے بیس اور بیس سے سو سو سے ہزار۔ہزار سے دس ہزار اور دس ہزار سے لاکھ تک تعداد جا پہنچی اور بڑھتے بڑھتے اب تو دو اڑھائی ارب تک آبادی پہنچ چکی ہے۔مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے پندرہ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ سو آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ہزار اور لاکھ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔بھوک اور ننگ کی بنیاد دولت پر نہیں ہوتی یہ ایک غلط خیال ہے جو لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ غربت آبادی کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اصل وجہ یہ ہے کہ غربت اور امارت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ قانون قدرت نے زمین میں جو خزانے مخفی رکھے ہیں انسان ان کو کس حد تک استعمال کرتا ہے اور کس حد تک ان کے استعمال کرنے

کی عقل اور سمجھ رکھتا ہے۔ مثلاً اگر سونا ہو اور غلہ نہ ہو تو محض سونے سے لوگوں کی بھوک دور نہیں ہو سکے گی یا اگر غلہ بھی آ جائے مگر روٹی پکانی نہیں آتی تو پھر بھی انسان بھوکا رہے گا۔ ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ کچھ مددگار ہوں کچھ لوگ کمانے والے ہوں اور کچھ لوگ پکانے والے ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ غرض کئی قدم ہوتے ہیں جب تک وہ سارے کے سارے مہیا نہ ہوں انسان بھوک اور ننگ سے بچ نہیں سکتا۔ یہ دور ابتدائے عالم سے چلتا چلا آیا ہے ایک زمانہ ایسا تھا۔ جب بنی نوع انسان کے پاس ذرائع آمد زیادہ ہوتے تھے اور کم حصہ مجبوریوں میں گرفتار ہوتا تھا۔ مثلاً اگر ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے لوگوں کو دیکھا جائے یا ان لوگوں کی تعداد معلوم کی جائے جو بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے کسی کام کے قابل نہیں رہتے تو وہ کتنے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ لیکن کام نہ ملنے کی وجہ سے ہزار میں سے نو سو بھی بیکار ہو سکتے ہیں۔ جب کسی ملک کی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ذرائع آمد ترقی نہیں کرتے تو دس میں سے بعض دفعہ نو بیکار پھرتے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ معذور ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں کام نہیں ملتا۔ پس جب دنیا کی آبادی بڑھ گئی۔ تو یہ سوال نہ رہا کہ زمین میں سے دولت کس طرح نکالی جائے بلکہ اس سوال کی صورت بالکل بدل گئی۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے تھے کہ باوجود اپنا سارا زور صرف کرنے کے کام سے محروم رہتے تھے۔ ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ نئے کام نکالے جائیں۔ غرض یہ دور اسی طرح چلتے چلے آئے ہیں اور دنیا نے فقر و فاقہ کی تکالیف دور کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ کبھی ایسا دور آیا کہ لوگوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتے۔ جیسے ہندوستان میں شودروں کی کثرت تھی مگر برہمنوں اور کھشتریوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کا کوئی حق نہیں کہ دنیا میں زندہ رہیں۔ یہ اگر مرتے ہیں تو بیشک مریں۔ چنانچہ انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور شودروں کا کوئی حق متمدن زندگی میں تسلیم نہ کیا گیا۔ پھر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس مصیبت کا علاج صدقہ و خیرات ہے۔ جن کے پاس زیادہ مال ہو انہیں چاہیے کہ وہ غرباء کی مدد کر دیا کریں۔

غرض مختلف تدابیر اپنے اپنے رنگ میں اختیار کی گئیں۔ مگر کوئی بھی تدبیر ایسی کامل نہیں تھی جس سے اس مصیبت کو کلیۃً دور کیا جا سکتا۔ اسلام ہی تھا جس نے اس سوال کا صحیح معنوں میں حل کیا۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کا صدقہ کوئی چیز نہیں ایک معین اور منظم صورت میں غرباء کی بہبودی کا انتظام ہونا چاہیے چنانچہ اس کے لئے اس نے زکوٰۃ اور عُشر کا طریق جاری کیا۔ جس میں امراء سے باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت روپیہ لیا جاتا اور غرباء کی

ضروریات پر صرف کیا جاتا۔ پھر اس نے خبر گیری کے طریق بھی معین کر دیئے یوں تو پہلے بھی حکومتیں ٹیکس لیا کرتی تھیں۔مگر ان کا خرچ معین نہیں تھا۔

اسلام نے اول آمد پر ایک مقرر حصہ ادا کرنا واجب کر دیا اور اس امر کا فیصلہ کیا کہ امراء سے بہر حال اتنا روپیہ لے لیا جائے۔دوسری طرف اس نے خرچ معیّن کر دیا اور اس طرح غرباء کے گذارہ کی صورت پیدا کر دی۔آمد اور خرچ سے تعلق رکھنے والے یہ دو نقطے ایسے ہیں جو اسلام سے پہلے اَور کسی قوم میں نہیں پائے جاتے تھے زکوٰۃ یہودیوں میں بھی ہے مگر ناقص صورت میں (دیکھو خروج باب ۲۳ آیت ۱۰ و ۱۱)۔

لیکن اسلام نے اس قانون کو مدون کر کے ایک ایسا عظیم الشان نظام قائم فرمایا جو ہمارے لئے ہر تاریکی کی گھڑی میں شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اس نظام کی پوری اہمیت نہ سمجھی اور لدھیانے کے بڑھے دریا کی طرح یہ نظام بھی ریت میں غائب ہو گیا۔اور مسلمان اس سے کلیۃً غافل ہو گئے۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آ کر پہلا کام ہی یہ کیا تھا کہ جائیداد والوں کو بے جائیداد والوں کا بھائی بنا دیا۔انصارؓ جائیدادوں کے مالک تھے اور مہاجرؓ بے جائیداد تھے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارؓ اور مہاجرینؓ دونوں میں مواخات قائم فرما دی۔اور ایک ایک جائیداد والے کو ایک ایک بے جائیداد والے سے ملا دیا اور اس میں بعض لوگوں نے اتنا غلّو کیا کہ دولت تو الگ رہی بعض کی اگر دو بیویاں تھیں تو انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی خدمت میں یہ پیشکش کی کہ وہ ان کی خاطر اپنی ایک بیوی کو طلاق دینے کے لئے تیار ہیں۔وہ ان سے بے شک شادی کر لیں (بخاری کتاب مناقب الانصار باب اخاء النبی بین المھاجرین و الانصار)۔یہ مساوات کی پہلی مثال تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جاتے ہی قائم فرمائی۔کیونکہ حکومت کی بنیاد دراصل مدینہ میں ہی پڑی تھی۔اس زمانہ میں زیادہ دولتیں نہ تھیں یہی صورت تھی کہ امیر اور غریب کو اس طرح ملا دیا جائے کہ ہر شخص کو کھانے کے لئے کوئی چیز مل سکے۔پھر ایک جنگ کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کو استعمال فرمایا۔گو اس کی شکل بدل دی۔ایک جنگ کے موقعہ پر آپ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے پاس کھانے کو کوئی چیز نہیں رہی یا اگر ہے تو بہت ہی کم اور بعض کے پاس کافی چیزیں ہیں۔تو یہ صورت حالات دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس جس کے پاس جو کوئی چیز ہے وہ لے آئے اور ایک جگہ جمع کر دی جائے۔چنانچہ سب چیزیں لائی گئیں اور آپ نے راشن مقرر کر دیا (بخاری کتاب الجھاد و السیر باب حمل الزاد فی الغزو)۔ گویا یہاں بھی وہی طریق آ گیا کہ سب کو کھانا ملنا چاہیے۔جب تک ممکن تھا سب لوگ الگ الگ کھاتے رہے مگر

جب یہ امر ناممکن ہوگیا اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ بعض لوگ بھوکے رہنے لگ جائیں گے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تمہیں علیحدہ کھانے کی اجازت نہیں اب سب کو ایک جگہ سے برابر کھانا ملے گا۔صحابہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر ہم نے اس سختی سے عمل کیا کہ اگر ہمارے پاس ایک کھجور بھی ہوتی تو ہم اس کا کھانا سخت بد دیانتی سمجھتے تھے اور اس وقت تک چین نہیں لیتے تھے جب تک کہ اس کو سٹور میں داخل نہیں کر دیتے تھے۔ یہ دوسرا نمونہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دولت بھی آئی اور خزانوں کے منہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیئے۔مگر اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس بارہ میں تفصیلی نظام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاری ہوتا لوگ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔کوئی اَور شخص اسے جاری نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ادھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ہاتھ سے ایک نمونہ قائم کر دیا اور اُدھر مدینہ پہنچتے ہی انصارؓ نے اپنی دولتیں مہاجرین کے سامنے پیش کر دیں۔مہاجرین نے کہا ہم یہ زمینیں مفت میں لینے کے لئے تیار نہیں ہم ان زمینوں پر بطور مزارع کام کریں گے اور تمہارا حصہ تمہیں دیں گے۔لیکن یہ مہاجرین کی طرف سے اپنی ایک خواہش کا اظہار تھا۔انصارؓ نے اپنی جائیدادوں کے دینے میں کوئی پس وپیش نہیں کیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے۔جیسے گورنمنٹ راشن دے تو کوئی شخص نہ لے۔اس سے گورنمنٹ زیر الزام نہیں آئے گی۔ یہی کہا جائے گا کہ گورنمنٹ نے تو راشن مقرر کر دیا تھا۔اب دوسرے شخص کی مرضی تھی کہ وہ چاہے لیتا یا نہ لیتا۔ اسی طرح انصارؓ نے سب کچھ دے دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مہاجرینؓ نے نہ لیا۔غرض عملی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام اپنی زندگی میں ہی شروع فرما دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب بحرین کا بادشاہ مسلمان ہوا تو آپؐ نے اسے ہدایت فرمائی کہ تمہارے ملک میں جن لوگوں کے پاس گذارہ کے لئے کوئی زمین نہیں ہے تم ان میں سے ہر شخص کو چار درہم اور لباس گذارہ کے لئے دو تا کہ وہ بھوکے اور ننگے نہ رہیں (السیرۃ النبویۃ بر حاشیۃ السیرۃ الحلبیۃ جلد ۳ ص ۶۹)۔اس کے بعد مسلمانوں کے پاس دولتیں آنی شروع ہوگئیں۔ چونکہ مسلمان کم تھے اور دولت زیادہ تھی اس لئے کسی نئے قانون کے استعمال کی اس وقت ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ جو غرض تھی وہ پوری ہو رہی تھی۔اصول یہ ہے کہ جب خطرہ ہو تب قانون جاری کیا جائے۔اور جب نہ ہو اس وقت اجازت ہے کہ حکومت اس قانون کو جاری کرے یا نہ کرے۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور مسلمان دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اس وقت غیر قومیں بھی اسلام میں شامل ہوگئیں عرب لوگ تو ایک جتھہ اور ایک قوم کی شکل میں تھے اور وہ آپس میں مساوات بھی قائم رکھتے تھے جب اسلام مختلف گوشوں میں پہنچا اور مختلف قومیں

اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں تو ان کے لئے روٹی کا انتظام بڑا مشکل ہو گیا۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کی مردم شماری کرائی اور راشننگ سسٹم قائم کر دیا۔ جو بنوامیہ کے عہد تک جاری رہا۔ یورپین مؤرخ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے پہلی مردم شماری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کرائی تھی۔ اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ سب سے پہلی مردم شماری رعایا سے دولت چھیننے کے لئے نہیں بلکہ ان کی غذا کا انتظام کرنے کے لئے جاری کی تھی۔ اَور حکومتیں تو اس لئے مردم شماری کراتی ہیں کہ لوگ قربانی کے بکرے بنیں اور فوجی خدمات بجالائیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس لئے مردم شماری نہیں کرائی کہ لوگ قربانی کے بکرے بنیں بلکہ اس لئے کرائی کہ ان کے پیٹ میں روٹی ڈالی جائے۔ چنانچہ مردم شماری کے بعد تمام لوگوں کو ایک مقررہ نظام کے ماتحت غذا ملتی اور جو باقی ضروریات رہ جاتیں ان کے لئے انہیں ماہوار کچھ رقم دے دی جاتی (تاریخ الیعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۵۰ ایام عمر بن الخطاب و طبری جلد ۵ صفحہ ۲۰۳ حملہ الدرۃ و تدوین الدواوین) اور اس بارہ میں اتنی احتیاط سے کام لیا جاتا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام فتح ہوا اور وہاں سے زیتون کا تیل آیا تو آپ نے ایک دفعہ لوگوں سے کہا کہ زیتوں کے استعمال سے میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ تم مجھے اجازت دو تو میں بیت المال سے اتنی ہی قیمت کا گھی لے لیا کروں (سیرۃ ابن عمر الخطاب لابن الجوزی باب التاسع و الثلاثون فی الذکر قولہ و فعلہ فی بیت المال ص ۹۳)۔ غرض یہ پہلا قدم تھا جو اسلام میں لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اٹھایا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نظام قائم ہو جائے تو اس کے بعد کسی اَور نظام کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ سارے ملک کی ضروریات کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ ان کا کھانا۔ ان کا پینا۔ ان کا پہننا ان کی تعلیم ان کی بیماریوں کا علاج اور ان کی رہائش کے لئے مکانات کی تعمیر یہ سب کا سب اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگا۔ اور اگر یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ تو کسی بیمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر بدقسمتی سے بعد میں آنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو کچھ دے دے اور چاہے تو نہ دے۔ اور چونکہ اسلامی تعلیم ابھی پورے طور پر راسخ نہیں ہوئی تھی وہ لوگ پھر قیصر و کسریٰ کے طریق کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ بڈھا دریا جوریت میں غائب ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر میرے دل میں ازسرنو جاری کیا۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے قرآن کریم کی یہ تعلیم لوگوں کے سامنے رکھی۔ مسلمان مجھ سے کثرت کے ساتھ پوچھا کرتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر اور طلباء بھی سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر اسلامی تعلیم یہی تھی تو پھر یہ غائب کیوں ہو گئی؟ اور میں ہمیشہ انہیں کہا کرتا ہوں کہ اس تعلیم کا غائب ہونا ہی بتاتا ہے کہ یہ الٰہی تعلیم تھی۔ اگر یہ انسانی تعلیم ہوتی تو لوگوں کے دلوں میں ضرور قائم رہتی۔ کیونکہ انسانی تعلیم کو قبول

کرنے کے لئے لوگوں کے دماغ تیار ہو چکے ہوتے ہیں اور ماحول مناسب ہوتا ہے۔پس اس کا غائب ہونا ہی بتا رہا ہے کہ یہ تعلیم خدا کی طرف سے آئی تھی۔ وہ ایک دفعہ لہر کی صورت میں اٹھی اور پھر اس میں انحطاط واقع ہو گیا۔ اب مقدر یہ ہے کہ پھر دوبارہ اس کی لہر بلند ہو اور اس کی دوسری لہر پہلی لہر سے زیادہ اونچی ہو۔قانون قدرت پر غور کر کے دیکھ لو۔اس میں یہی نظارہ نظر آئے گا۔بچپن میں جب ابھی میں نے پہاڑ نہیں دیکھا تھا میں یہ خیال کیا کرتا تھا کہ پہاڑ مینار کی طرح ہوتا ہوگا اور رسہ پکڑ کر اوپر چڑھنا پڑتا ہوگا مگر جب میں پہلی دفعہ شملہ گیا تو میں نے دیکھا کہ پہلے ایک ٹیلہ آتا ہے اس کے بعد دوسرا ٹیلہ آتا ہے۔ پھر تیسرا ٹیلہ آتا ہے۔اور ہر ٹیلہ پہلے ٹیلے سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔مگر ہر ٹیلے کے بعد ایک انحطاط بھی ہوتا ہے۔ جب انسان پہلے ٹیلے پر قدم رکھتا ہے تو اس کے بعد اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اب نیچے جا رہا ہوں ۔مگر درحقیقت وہ پہلی سطح سے اونچا ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے ٹیلے کے بعد جب نیچے اترتا ہے۔تو پھر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب میں نچلی طرف جا رہا ہوں مگر حقیقت میں اس کا قدم اونچا اٹھ رہا ہوتا ہے۔اسی طرح قدم بقدم ارتفاع اور انحطاط کے دوروں میں سے گذرتے ہوئے وہ بہت بلند پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے۔جس طرح قانون قدرت میں ہمیں یہ نظارہ نظر آتا ہے۔اسی طرح انسانی دماغوں کا ارتقاء بھی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیوض حاصل کرنے کے نتیجہ میں یہ تعلیم لوگوں نے اپنالی۔مگر چونکہ دماغی ارتقاء بھی لہروں کی صورت میں چلتا ہے اس لئے پہلی لہر کے بعد اس میں ایک انحطاط کی صورت واقع ہوگئی۔اب دوسری لہر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ بلند ہوئی ہے۔اور یہ لہر قانون قدرت کے مطابق پہلی لہر سے زیادہ بلند ہوگی۔مگر بہرحال ہر لہر کے بعد ایک انحطاط بھی آتا ہے اور لوگ اصل تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔ جب تک یہ چیز قائم ہے اس وقت تک کسی انشورنس وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔انشورنس کی غرض آخر کیا ہوتی ہے۔یہی کہ اگر ہم مر جائیں تو ہمارے بیوی بچوں کو روٹی ملتی رہے۔ کپڑا ملتا رہے۔سامانِ خورد و نوش اور مکان ملتا رہے۔ جب حکومت ان تمام چیزوں کی ذمہ وار ہوگی تو انشورنس کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ ساروں کو مکان بھی مل رہا ہوگا۔غذا بھی مل رہی ہوگی۔ کپڑا بھی مل رہا ہوگا۔ان کی تعلیم کا بھی انتظام ہو رہا ہوگا۔اور ان کی بیماریوں کا علاج بھی ہو رہا ہوگا۔یہی وہ قومی اخراجات ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اسلام نے زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات کا وسیع نظام جاری فرمایا ہے۔اور مومنوں کی علامت ہی اس نے یہ بتائی ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور اس طرح مخلوق کی خدمت کر کے خالق کی محبت کو حاصل کرتے ہیں۔ دنیا میں بہترین ذریعہ کسی کی محبت حاصل کرنے کا یہی ہوتا ہے کہ اس کے کسی عزیز سے محبت کی جائے ریلوے سفر میں روزانہ یہ نظارہ

نظر آتا ہے کہ پاس بیٹھے ہوئے دوست کے بچہ کو ذرا پچکار دیں یا اسے کھانے کے لئے کوئی چیز دے دیں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کا باپ اس سے محبت کی باتیں کرنے لگ جاتا ہے کہ گویا وہ اس کا بہت پرانا دوست ہے۔ یہی طریق روحانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ جب انسان بنی نوع انسان کی بھوک اوران کے افلاس کو دور کرنے کے لئے اپنا روپیہ خرچ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ چونکہ یہ میرے پیاروں کی خدمت کرتا ہے اس لئے اسے بھی میرے پیاروں میں داخل کرلیا جائے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے کہے گا کہ دیکھو میں بیمار تھا مگر تم لوگ میری عیادت کے لئے نہ آئے۔ میں بھوکا تھا۔ مگر تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ میں ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ اس پر وہ بندے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تو کس طرح بیمار ہوسکتا تھا یا تو کس طرح بھوکا اور ننگا ہو سکتا تھا تُو تو ان تمام نقائص سے منزہ ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جب میرے بندوں میں سے بعض لوگ بیمار تھے یا بعض لوگ بھوکے اور ننگے تھے اور تم نے ان کی تیمارداری نہ کی۔ نہ انہیں روٹی کھلائی اور نہ ان کا ننگ ڈھانکنے کے لئے انہیں کپڑا دیا تو تم نے انہیں ان چیزوں سے محروم نہیں کیا بلکہ مجھے محروم کیا (مسلم کتاب البر و الصلة باب فضل عیادة المریض)۔ پس زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم ترین رکن ہے جس کو نظر انداز کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ایسا انسان غرباء کے حقوق کو نظر انداز کرنے والا ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے مومنوں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ وہ آخرت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ قربانیاں کرتے اور کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ ان قربانیوں کا پھل انہیں زندگی میں بھی ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ آنے والی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ یقین ان کے اندر اتنی جرأت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو بلا دریغ جھونک دیتے ہیں۔

دنیا میں بھی جب ایک سپاہی لڑائی میں جاتا ہے تو آخر کون سے فائدہ کے لئے جاتا ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں مارا جاؤں گا اور بسا اوقات وہ مارا جاتا ہے مگر فائدہ اس کی قوم اٹھاتی ہے۔ اسی طرح ماں جب اپنے بچے کو اپنا خون چوسا رہی ہوتی ہے تو اسے کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہوتا ہے۔ دودھ کا ایک ایک گھونٹ ماں کے خون سے بنتا ہے۔ اس لئے ایک ایک گھونٹ جو بچے کے گلے سے اترتا ہے وہ درحقیقت ماں کا خون ہوتا ہے جسے وہ چوستا ہے۔ اگر تمہاری ماں تمہارے منہ میں اپنا دودھ نہ ڈالتی۔ اگر تمہاری ماں بھی یہی کہتی کہ میں اپنا خون کیوں چوسنے دوں تو تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اپنا خون دیا اس لئے کہ تم زندہ رہو۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنا خون گراؤ تاکہ تمہاری اولاد اور تمہاری قوم اور تمہارا ملک زندہ رہے۔

بدر کی جنگ میں جو صحابیؓ شہید ہوئے تھے ان صحابیوںؓ نے دنیا کا کون سا سکھ دیکھا تھا۔انہوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑا اپنے ساتھیوں کو چھوڑا اور پھر تیرہ برس تک کفار کے سخت ترین مظالم کا نشانہ بننے کے بعد ایک دُکھتے ہوئے دل کے ساتھ،ایک رِستے ہوئے زخم کے ساتھ انہوں نے مکہ کو بھی چھوڑ دیا اس امید کے ساتھ کہ انہیں پھر مکہ کی زیارت نصیب ہوگی۔مگر ابھی ہجرت پر ڈیڑھ سال بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ اپنے وطن سے دور۔پرانے وطن سے بہت دور اور نئے وطن سے بھی میلوں دور ایک تپتے ہوئے ریت کے جنگل میں کفار کی تلوار سے کٹ کٹ کر تڑپنے لگ گئے۔ان کے سر ایک طرف تھے اور دھڑ دوسری طرف۔اگر یہ لوگ بھی یہی کہتے کہ ہم نے قربانی کر کے کیا لینا ہے۔پھل تو دوسرے لوگوں نے کھانا ہے تو اسلام کو وہ شان وشوکت جو بعد میں اسے حاصل ہوئی کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔

اسی طرح جنگ اُحد کا ایک واقعہ ہے۔جنگ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو فرمایا کہ جاؤ اور زخمیوں کو دیکھو۔وہ دیکھتے ہوئے حضرت سعد بن ربیعؓ کے پاس پہنچے جو سخت زخمی تھے اور آخری سانس لے رہے تھے۔انہوں نے ان سے کہا کہ اپنے متعلّقین اور اعزّاء کو اگر کوئی پیغام دینا ہو تو مجھے دے دیں۔حضرت سعدؓ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں منتظر ہی تھا کہ کوئی مسلمان ادھر آئے تو پیغام دوں۔تم میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ کرو کہ میرا پیغام ضرور پہنچا دو گے۔اور اس کے بعد انہوں نے جو پیغام دیا وہ یہ تھا کہ میرے بھائی مسلمانوں کو میرا اسلام پہنچا دینا اور میری قوم اور میرے رشتہ داروں سے کہنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس خدا تعالیٰ کی ایک بہترین امانت ہیں۔اور ہم اپنی جانوں سے اس امانت کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔اب ہم جاتے ہیں اور اس امانت کی حفاظت تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ایسا نہ ہو کہ تم اس کی حفاظت میں کمزوری دکھاؤ(السیرۃ الحلبیۃ جلد ۲ غزوۃ احد)۔دیکھو ایسے وقت میں جب انسان سمجھتا ہو کہ میں مر رہا ہوں۔کیا کیا خیالات اس کے دل میں آتے ہیں۔وہ سوچتا ہے میری بیوی کا کیا حال ہوگا۔میرے بچوں کو کون پوچھے گا۔مگر اس صحابیؓ نے کوئی ایسا پیغام نہ دیا۔صرف یہی کہا۔کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے اس دنیا سے جاتے ہیں تم بھی اسی راستہ سے ہمارے پیچھے آجاؤ۔ان لوگوں کے اندر یہی ایمان کی طاقت تھی جس سے انہوں نے دنیا کو تہ وبالا کر دیا اور قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے۔قیصر روم حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔کسریٰ نے اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ اگر تم ان عربوں کو بھی شکست نہیں دے سکتے تو پھر واپس آجاؤ اور گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھو۔یہ گوہ کھانے والے لوگ ہیں ان کو بھی تم نہیں روک سکتے۔اس نے جواب دیا کہ یہ تو آدمی معلوم ہی نہیں

ہوتے ۔ یہ تو کوئی بلا ہیں ۔ یہ تلواروں اور نیزوں کے اوپر سے کودتے ہوئے آتے ہیں ۔

یہ جرأت مردوں پر ہی موقوف نہیں ۔ مجھے تو ایک ماں کی قربانی پر حیرت آتی ہے ۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق میں قادسیہ کے مقام پر جنگ جاری تھی ۔ تو کسریٰ میدان جنگ میں ہاتھی لایا ۔ اونٹ ہاتھی سے ڈرتا ہے اس لئے وہ انہیں دیکھ کر بھاگتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا اور بہت سے مسلمان مارے گئے ۔ آخر ایک دن مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو آج ہم میدان سے ہٹیں گے نہیں ۔ جب تک دشمن کو شکست نہ دے لیں ۔ ایک عورت حضرت خنساء اپنے چار بیٹوں کو لے کر میدان جنگ میں آئیں اور ان کو مخاطب کر کے کہنے لگیں کہ پیارے بیٹو! تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں ساری جائداد تباہ کر دی تھی ۔ اور مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے بھائی سے کہوں کہ وہ مجھے حصہ دے ۔ چنانچہ میں اس کے پاس گئی ۔ اس نے میرا بڑا اعزاز کیا ۔ بڑی دعوت کی اور پھر اپنی جائداد میں سے آدھی مجھے بانٹ دی ۔ میں وہ لے کر چلی گئی ۔ تو تمہارے باپ سے میں نے کہا ۔ کہ اب تو آرام سے گذارہ کرو ۔ مگر اس نے پھر اسے بھی برباد کر دیا ۔ اور پھر مجبور کر کے میرے بھائی کے پاس مجھے بھیجا ۔ پھر میں اس کے پاس گئی ۔ اس نے پھر میرا بڑا اعزاز و احترام کیا ۔ اور پھر بقیہ میں سے مجھے آدھی جائیداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے برباد کر دی اور پھر مجھے مجبور کیا کہ اپنے بھائی سے جا کر حصہ لوں ۔ چنانچہ میں پھر بھائی کے پاس گئی اور اس نے پھر بقیہ جائداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے برباد کر دی اور جب تمہارا باپ مرا تو اس نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی ۔ میں اس وقت جوان تھی ۔ تمہارے باپ کی کوئی جائیداد نہ تھی ۔ پھر اپنی زندگی میں اس نے میرے ساتھ کوئی حسن سلوک بھی نہ کیا تھا ۔ اور اگر عرب کے رسم و رواج کے مطابق میں بدکار ہو جاتی تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی ۔ مگر میں نے اپنی تمام عمر نیکی سے گذاری اب کل فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے ۔ میرے تم پر بہت سے حقوق ہیں ۔ کل کفر اور اسلام میں مقابلہ ہوگا اگر تم فتح حاصل کئے بغیر واپس آئے ۔ تو میں خدا تعالیٰ کے حضور کہوں گی کہ میں ان کو اپنا کوئی بھی حق نہیں بخشتی ۔ اس طرح اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو جنگ میں تیار کر کے بھیج دیا ۔ اور پھر گھبرا کر خود جنگل میں چلی گئی اور وہاں تنہائی میں سجدہ میں گر کر اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگی ۔ اور دعا یہ کی کہ اے میرے خدا میں نے اپنے چاروں بیٹوں کو دین کی خاطر مرنے کے لئے بھیج دیا ہے لیکن تجھ میں یہ طاقت ہے کہ ان کو زندہ واپس لے آئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ مسلمانوں کو فتح بھی ہوگئی اور اس کے چاروں بیٹے بھی زندہ واپس آ گئے (طبری و الاستیعاب باب النساء و کناھن باب الخاء خنساء بنت عمرو السلمیة) ۔ یہ جرأت اور بہادری ایمان بالآخرۃ ہی کا نتیجہ تھی ۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی نجات اسلام سے وابستہ ہے اور ہم خواہ مارے بھی

جائیں تب بھی پرواہ نہیں کیونکہ دنیا بچ جائے گی۔ اور اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا بیشک ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج تو اسلام کو کہیں غلبہ حاصل نہیں۔ مگر اس تنزل کے زمانہ میں بھی ان لوگوں کی قربانیوں نے ہی مسلمانوں کو یہ عظمت دی ہوئی ہے کہ اسلام کا نام بوجہ اس کثرت کے جو مسلمانوں کو حاصل ہے دنیا کے تمام لوگ ادب کے ساتھ لینے پر مجبور ہیں۔ یہ رُعب مسلمانوں کو کہاں سے حاصل ہوا؟ انہی لوگوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہے جو بسااوقات فاقہ سے رات کو سوئے اور بسااوقات فاقہ سے ہی صبح کو اٹھے بسااوقات اگر ان کی پگڑی پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو انہیں پہننے کے لئے دوسری پگڑی نہیں ملتی تھی۔ جوتی پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو انہیں پہننے کے لئے دوسری جوتی نہیں ملتی تھی۔ یہ وہی رُعب ہے جو تمہارے باپ دادا کی قربانی کے نتیجہ میں تمہیں حاصل ہوا۔ کہتے ہیں نام بڑا ہوتا ہے کام بڑا نہیں ہوتا۔ اب کام عام طور پر مسلمانوں کے چھوٹے ہیں۔ لیکن انہیں نام ایسا حاصل ہو گیا ہے کہ سب لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ رستم کے گھر میں ایک دفعہ چور آ گیا۔ رستم اس کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلا اور دونوں میں کُشتی شروع ہو گئی چور کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جس شخص کا وہ مقابلہ کر رہا ہے وہی رستم ہے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی رستم کا نوکر ہے۔ آخر مقابلہ کرتے کرتے چور غالب آ گیا اور وہ سینہ پر چڑھ کر رستم کی گردن کاٹنے لگا۔ اتنے میں رستم نے یکدم شور مچا دیا کہ ''آ گیا رستم۔ آ گیا رستم'' اور چور یہ سنتے ہی اس کے سینہ پر سے اتر کر بھاگ گیا۔ حالانکہ اس نے رستم کو گرایا ہوا تھا۔ مگر چونکہ رستم کے نام کو ایک خاص رعب حاصل ہو چکا تھا اس لئے اس نے رستم کو تو گرا لیا۔ مگر رستم کے نام کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ گیا۔ تو جو لوگ قربانیاں کرنے والے ہوتے ہیں وہ دنیا میں اپنا نام چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ مر جاتے ہیں مگر ان کا نام ان کی اولادوں کی حفاظت کرتا چلا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے جہان میں جو انہیں لازوال بدلہ ملے گا اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مومنوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ قربانیوں کے میدان میں بڑھتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر کامل یقین ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ قربانیاں ہماری قوم کو بھی عزت دیں گی اور خود ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا موجب ہوں گی۔ گویا وہ وسیع نتائج جو آئندہ نکلنے والے ہوتے ہیں ان پر انہیں پورا یقین ہوتا ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ

وہ لوگ جو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتے۔ ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لئے خوبصورت

فَہُمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ؕ﴿۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ

کر کے دکھایا ہے پس وہ بہکے بہکے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور وہ اخروی زندگی

وَ ہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ہُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۶﴾

میں سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہوں گے۔

حلّ لُغَات۔یَعۡمَہُوۡنَ یَعۡمَہُوۡنَ عَمَہَ سے نکلا ہے اور عَمَہَ یَعۡمَہُ عَمَہًا وَعُمُوۡہِیَۃً وَعَمَہَانًا کے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَ فِی الضَّلَالِ وَتَحَیَّرَ فِیۡ مُنَازَعَۃٍ اَوۡ طَرِیۡقٍ۔ گمراہی میں بھٹکا پھرا اور کسی جھگڑے میں یا راستہ میں حیران ہو گیا۔ یعنی پوری طرح سمجھ نہ سکا کہ اپنے حق میں کیا دلیل دے اور کس راستہ کو اختیار کرے۔

علامہ زمخشری اپنی کتاب ''کشاف'' میں لکھتے ہیں کہ عَمَہَ کا لفظ بھی عَمٰی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یاء کے ساتھ جو عَمٰی ہے وہ آنکھوں کی بینائی کے فقدان اور عقل کی بینائی کے فقدان میں مشترک طور پر استعمال ہوتا ہے وَالۡعَمَہُ خَاصٌّ بِالۡبَصِیۡرَۃِ اور عَمِہَ جو ھ کے ساتھ ہوتا ہے وہ عقل کی بینائی کے ساتھ مخصوص ہے۔ گویا اہل عرب یہ کبھی نہیں کہتے کہ فلاں شخص اَعۡمَہَ الۡعَیۡنُ ہے (اقرب) مزید تفصیل کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ یونس آیت ۱۲۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کو خوبصورت کر کے دکھائے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے برے اعمال کو بھی اچھا سمجھ رہے ہیں اور گمراہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بدعملی اور ان کے انکار کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ یہ لوگ کسی جزا سزا کے قائل نہیں اس لئے انہیں اپنے اعمال کے متعلق کبھی فکر پیدا نہیں ہوتا اور نہ صداقت پر غور کرنے اور اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لینے کا انہیں کبھی احساس ہوتا ہے۔ اگر انہیں یقین ہوتا کہ ہمیں ایک روز اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے گا اور ہمارے ناپسندیدہ اعمال ہمیں گرفت میں لے آئیں گے تو ان کا رویہ بالکل اَور ہوتا اور ان کے اندر متانت اور سنجیدگی کے جذبات نمایاں ہوتے۔ مگر اب چونکہ گرفت کا احساس ان کے اندر نہیں پایا جاتا اس لئے ان کے دل ایسے غبی ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے ناروا افعال میں

بھی ایک لذت اور سرور محسوس کرتے ہیں۔ اوران کو قابل نفرت چیز قرار دینے کی بجائے قابل تعریف سمجھنے لگ گئے ہیں۔ آخر دنیا میں کیوں کوئی شخص کسی سانپ کے سوراخ میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ کیوں وہ جلتی ہوئی آگ میں نہیں کود جاتا۔ کیوں وہ شیروں کی کچھار میں اپنے آپ کو نہیں پھینک دیتا۔ کیوں وہ زہر کا جام اپنے ہونٹوں سے نہیں لگاتا۔ اسی لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے سانپ کے سوراخ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو میری موت یقینی ہے۔ اگر میں جلتی ہوئی آگ میں کودا تو میرا جھلس جانا یقینی ہے۔ اگر میں نے اپنے آپ کو شیروں کی کچھار میں ڈال دیا تو میری ہلاکت یقینی ہے اگر میں نے زہر کا پیالہ اپنے منہ سے لگایا تو میرا مر جانا یقینی ہے۔ پھر اگر ایسا ہی ایمان کسی شخص کا آخرت پر بھی ہو تو وہ کب کسی گناہ کا دلیری کے ساتھ ارتکاب کر سکتا ہے۔ گناہوں پر دلیری اور نبیوں کے انکار کی بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ آخرت کا یقین دل میں نہیں ہوتا۔ انسان بڑی دلیری سے کہہ دیتا ہے کہ

''ایہہ جہان مٹھا اگلا کِن ڈٹھا''

یعنی اس جہان کے تو مزے ہمیں لوٹنے دو۔ اگلا جہان کس نے دیکھا ہے۔ کہ ایک ان دیکھے دن کے لئے ابھی سے ہم ان لذائذ کو ترک کر دیں۔ غرض اعمال کی خوبی یا برائی صرف جزا سزا کے عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ اپنے برے اعمال کو بھی اچھا سمجھتے ہیں یعنی نیکی اور بدی میں وہ اصولاً کوئی فرق نہیں کر سکتے کیونکہ جب نتیجہ کوئی نہیں۔ نہ اچھے کام کا کوئی انعام ہے اور نہ برے کام کی کوئی سزا ہے تو پھر کسی فعل کا اچھا اور کسی کا برا ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔

یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ تمام اعمال نیت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یوں تو کافر بھی بعض اعمال ایسے کرتا ہے جو مومنوں کے اعمال کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس کے ساتھ نیت نیک نہیں ہوتی اور نہ خدا تعالیٰ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے اس کا عمل اسے کسی انعام کا مستحق نہیں بناتا۔ لیکن مومن کے عمل کا شاندار نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ مومن کے عمل کے ساتھ نیت نیک بھی شامل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی رضا کی جستجو بھی اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ ۔ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب ان کے برے اعمال خدا تعالیٰ ہی ان کو خوبصورت کر کے دکھاتا ہے تو پھر ان کا قصور کیا ہوا۔ سو اس بارہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ درحقیقت یہ خدا تعالیٰ کی ایک سنت ہے اور اس میں انسانی ترقی کے بہت سے راز مضمر ہیں۔ کہ جب کوئی شخص کچھ مدت تک ایک کام کرتا رہتا ہے تو اس کو اس کام سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسے اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اور یہاں اسی قانون قدرت

کی طرف اشارہ ہے نہ کہ کسی خاص تقدیر کی طرف۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ انہوں نے سچے راستہ کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کر لیا تھا اور انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب وہ کوئی کام ایک لمبے عرصہ تک کرتا چلا جاتا ہے تو اس کام کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسے اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے انہیں بھی اب اپنی بد عملی خوبصورت دکھائی دینے لگی ہے۔ اور چونکہ فطرت انسانی کا خدا تعالیٰ ہی خالق ہے اس لئے زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فرما کر اسے خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ورنہ اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ انہیں برے اعمال اچھے کر کے دکھاتا ہے۔ بلکہ وہ خود فطرت کی اعلیٰ درجہ کی خوبی کا غلط رنگ میں استعمال کر کے برے اعمال کو بھی اچھے سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آگ خدا تعالیٰ نے اس لئے بنائی ہے کہ اس سے کھانا تیار کیا جائے یا سردی سے بچاؤ کا سامان مہیا کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص آگ میں گر کر اپنے آپ کو جلا لے تو یہ اس کا اپنا قصور ہوگا آگ کو پیدا کرنے والے خدا کا قصور نہیں ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے انسانی ترقی کے لئے یہ قانون بنایا ہے کہ جو شخص کسی کام کا عادی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ اسے اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے اور اس سے اسے ایک طبعی موانست پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ اس قانون کو اس رنگ میں استعمال کریں کہ وہ برائیوں کا ارتکاب شروع کر دیں اور اس قانون کے نتیجہ میں انہیں اپنی برائیاں ہی حسین نظر آنے لگیں تو اس میں خود ان کا اپنا ہی قصور ہوگا صانع فطرت پر اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے ملائکہ اس کے قلب پر ایک سفید نقطہ لگا دیتے ہیں۔ دوسرا نیک عمل بجا لاتا ہے تو دوسرا سفید نقطہ لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اس کا تمام دل نورانی ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی بدی اس میں سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل جب کوئی شخص بدی کرتا ہے تو فرشتے اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیتے ہیں اور جب وہ دوسری بدی کرتا ہے تو دوسرا سیاہ نقطہ لگا دیتے ہیں اور پھر اگر وہ بدیوں میں بڑھتا جائے تو ان نقطوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا تمام دل تاریک ہو جاتا ہے اور اس کی نیکیوں کا خرمن جل کر راکھ ہو جاتا ہے (مسلم کتاب الایمان باب أن الاسلام بدأ غریبا)۔ یہ حدیث بھی اسی قانون فطرت کی تشریح ہے کہ جب کوئی شخص نیکیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو نیکی اس کے جسم کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اور جب بدیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو بدیاں اس کے جسم کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ اور جو چیز انسان کے جسم کا ایک حصہ بن جائے وہ اسے اچھی ہی دکھائی دیتی ہے بری نظر نہیں آتی۔ اگر اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان پر رحم کرتے ہوئے انسانی فطرت میں یہ بات نہ رکھ دیتا تو نیکی اختیار کرنا یا کسی کام میں دوام اختیار کرنا اس کے لئے بڑا مشکل ہوتا۔ مگر

اس قانون کی وجہ سے نیکیوں میں ترقی کرنے کا سفر بڑا آسان ہوگیا ہے۔اور ہر عمل اس سے اگلے عمل کو آسان تر بنا دیتا ہے۔آخر ایک ماہر فن کی کیوں تعریف کی جاتی ہے اسی لئے کہ مسلسل ایک کام کرنے کی وجہ سے وہ اپنے اندر ایک ایسی قابلیت پیدا کر لیتا ہے کہ اس فن سے اسے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس میں دوسروں سے آگے نکل جاتا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ انسانی فطرت میں یہ ملکہ نہ رکھ دیتا کہ مسلسل کام کے نتیجہ میں اسے اپنے کام سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو کوئی شخص بھی اپنے فن میں ترقی نہ کر سکتا۔یہی قانون نیکی اور بدی کے میدان میں بھی جاری ہے۔ایک نیک انسان پہلے اپنے نفس پر بوجھ محسوس کرتے ہوئے کسی نیکی کی طرف اپنا قدم بڑھاتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وہی نیکی اس کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کا ترک کرنا اس کے لئے ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔اسی طرح جب کوئی شخص بدی میں اپنے آپ کو ملوث کرنا شروع کر دیتا ہے تو خواہ پہلی بدی اس کے دل میں اضطراب پیدا کر دے مگر رفتہ رفتہ وہی بدی اس کی غذا بن جاتی ہے جس کو چھوڑنا اس کے لئے بڑا دوبھر ہوتا ہے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے آخرت کا انکار کر دیا ہے۔جس کی وجہ سے انہیں کسی گرفت کا خوف نہیں رہا۔اس لئے ان کے دلوں میں گناہوں پر دلیری پیدا ہوگئی ہے اور پھر متواتر گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر ایسا زنگ لگ گیا ہے کہ وہ اپنے برے افعال کو بھی اچھا سمجھنے لگ گئے ہیں۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایک چور علاج کرانے کے لئے آیا۔تو آپ نے اسے وعظ ونصیحت کرنی شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہاتھ پاؤں اس لئے نہیں دیئے کہ تم ان سے حرام روزی کھایا کرو۔بلکہ اس لئے دیئے ہیں کہ تم ان کے ذریعے حلال روزی کما کر کھاؤ۔تم چوری کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔اور کیوں حلال روزی نہیں کماتے۔جب آپ نے اسے یہ وعظ ونصیحت کی تو اس کی آنکھیں غصے کی وجہ سے سرخ ہوگئیں۔اور کہنے لگا۔اچھا مولوی صاحب اگر یہ حلال کی روزی نہیں تو پھر اَور کونسی حلال کی روزی ہے۔آپ لوگ میٹھی نیند سو رہے ہوتے ہیں اور ہم مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔اگر کسی کو ہمارے متعلق علم ہو جائے تو وہ ہمیں گولی مار کر مار دے۔ہم اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر چوری کرتے ہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر اور کونسی حلال روزی ہو سکتی ہے؟ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ اسے چوری کی عادت پڑ چکی ہے اور یہ کام کرتے کرتے اس کی فطرت اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ اب یہ کام اس کی نگاہ میں برا نہیں رہا۔اس لئے اب بحث کے رنگ میں سمجھانے سے کوئی خاص فائدہ اسے نہیں ہو سکتا۔چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بات کو

ٹلا دیا۔اورادھرادھر کی باتیں شروع کردیں تا کہ یہ بات اس کے ذہن سے نکل جائے۔جب کچھ دیر گذر گئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟اس نے کہا کہ اکیلا آدمی چوری نہیں کرسکتا بلکہ ہم پانچ سات آدمی مل کر چوری کرتے ہیں۔ان میں سے ایک آدمی گھر کا راز دار ہوتا ہے اور وہ عام طور پر سقّہ یا چوہڑہ وغیرہ ہوتا ہے کیونکہ راز دار کے بغیر چوری نہیں ہوسکتی۔وہی کمروں اور دروازوں کے متعلق بتاتا ہے اور وہی اس بات کے متعلق اطلاع دیتا ہے کہ نقدی اور زیورات کہاں ہیں۔اس کے بعد ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جسے سیندھ لگانی آتی ہو اور وہ ایسے طور پر اوزاروں کو استعمال کرے کہ سیندھ لگانے کی آواز پیدا نہ ہو اور اس کی آواز سے گھر والے بیدار نہ ہوجائیں۔پھر ایک تیسرا آدمی ایسا ہونا چاہیے جو تالے وغیرہ کھولنے میں مشاق ہو۔جب دوسرا آدمی سیندھ لگالیتا ہے تو وہ ایک طرف ہوجاتا ہے اور پھر اس تیسرے آدمی کا کام شروع ہوجاتا ہے اور وہ صندوقوں کے تالے کھولتا جاتا ہے اور پھر ایک چوتھا آدمی ایسا ہونا چاہیے جو کہ ایسے طور پر چلنے میں مہارت رکھتا ہو کہ اس کے پاؤں کی آہٹ محسوس نہ ہو۔تیسرا آدمی تالے کھول کر اور سامان نکال کر چوتھے آدمی کو دیتا جاتا ہے۔اور وہ باہر والوں کو پکڑاتا جاتا ہے۔پھر ایک پانچویں آدمی کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ گلی کے سرے پر کھڑا رہے اور اگر کسی شخص کو آتا جاتا دیکھے تو سیٹی بجادے یا کوئی اور اشارہ کردے تا کہ سب ہوشیار ہوجائیں۔پھر چھٹا شخص ایسا ہونا چاہیے جو سفید کپڑے پہنے ہوئے ہو اور کسی کو اس کے چلنے پھرنے پر شک نہ گذرے۔کیونکہ ہم تو ننگ دھڑنگ ہوتے ہیں اور ہمیں کوئی دیکھ لے تو یقیناً ہم پر چور ہونے کا شبہ کرے لیکن یہ آدمی ایسے کپڑوں میں پھرتا ہے کہ کسی کو اس پر شک نہیں گذر سکتا۔ہم نقدی اور زیورات وغیرہ اس کے سپرد کردیتے ہیں۔وہ نہایت اطمینان سے مال لے کر چلا جاتا ہے۔اور ساتویں شخص کو جو سنار ہوتا ہے دے دیتا ہے۔جو سونے کو اور ہیرے اور جواہرات کو الگ الگ کرکے جدا کرتا ہے اور اسے پگھلا کر ایک نئی شکل دے دیتا ہے۔اور اس سونے کو آگے بیچتا ہے اور پھر ہم سب آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے اسے کہا کہ اگر تمہاری اتنی محنت کے بعد وہ سنار تمہارا سونا کھا جائے تو پھر تم کیا کرو۔اس پر بے اختیار اس چور کے منہ سے نکلا کہ کیا وہ اتنا حرام خور ہوگا کہ دوسرے کا مال کھا جائے گا۔میں نے کہا۔بس اب تم سمجھ گئے ہو۔معلوم ہوا کہ دوسروں کا مال کھانا حرام ہے اور تمہاری فطرت بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے مگر چوری کی عادت نے تمہاری فطرت کو ایسا مسخ کردیا ہے کہ تم اس کام کو بھی حلال کی کمائی سمجھنے لگ گئے ہو۔مگر جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جو شخص ایک لمبے عرصہ تک کسی فعل کا ارتکاب کرتا رہتا ہے وہ رفتہ رفتہ اسے خوبصورت نظر آنے لگتا ہے وہاں اس کا ایک یہ بھی قانون ہے کہ کسی برے کام کا اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

چنانچہ فرماتا ہے کہ باوجود اس کے کہ انہیں اپنے برے اعمال میں لذت آرہی ہے اور وہ انہیں اچھا سمجھ رہے ہیں پھر بھی یہ ان اعمال کے بدنتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے بلکہ انہیں دنیا میں بھی اپنے برے اعمال کی وجہ سے رسوا ہونا پڑے گا۔ اور اُخروی زندگی میں بھی وہ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۞

اور تجھ کو یقیناً قرآن اس (ہستی) کی طرف سے مل رہا ہے جو بہت حکمت والی (اور) بہت جاننے والی ہے۔

حلّ لُغَات۔ تَلَقِّي تَلَقِّي کے معنے براہ راست منہ درمنہ کلام سننے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ تَلَقَّى الشَّيْءَ: اَخَذَهٗ مِنْ فِيْكَ مُشَافَهَةً (اقرب) یعنی تَلَقَّى الشَّيْءَ کے معنے براہ راست دوسرے کے منہ سے کلام سننے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ اب فرماتا ہے۔ منکر بیشک انکار کرتے چلے جائیں۔ گالیاں دینے والے گالیاں دیتے رہیں اور برا بھلا کہنے والے برا بھلا کہتے رہیں۔ خدائے حکیم و علیم نے اپنی سکیم دنیا میں نافذ کر دی ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے پورا ہونے سے روک نہیں سکتی۔ اب حاسدوں کے لئے حسد کے انگاروں پر لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ اپنے مونہہ کی پھونکوں سے نہ خدا تعالیٰ کے اس روشن کردہ چراغ کو بجھا سکتے ہیں اور نہ تیر و سنان سے اسلام کی ترقی اور اس کی عظمت کو روک سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ تعلیم ہے جو حکیم و علیم خدا تجھے بالمشافہ سکھا رہا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایک حکیم ہستی جو ساتھ ہی علیم بھی ہے اس کی تعلیم کو دنیا قبول نہ کرے یا اس کی تعلیم کو مٹانے پر وہ قدرت پا سکے۔ اس جگہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلی سورۃ میں تو یہ فرمایا تھا کہ روح الامین تجھ پر کلام اتارتا ہے اور یہاں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر براہ راست کلام نازل کرتا ہے۔ ان دونوں میں اختلاف کیوں ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ روح الامین سے مراد یہ ہے کہ جس صورت میں خدا تعالیٰ نے فرشتے کو کلام دیا تھا اسی صورت میں اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا اور نسیان یا غلطی کا اس میں کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اور جو کلام غلطی اور نسیان سے پاک ہو اور لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً اور حرکۃً حرکۃً اس شخص کو پہنچ جائے جس کو کلام بھیجا گیا تھا تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ بالمشافہہ بات کرنا۔ کیونکہ بالمشافہہ بات کرنے میں یہی مدنظر ہوتا ہے کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے یا پیغامبر کچھ بھول نہ جائے۔ جب پیغامبر کے متعلق بھی یہ احتیاط کر لی گئی کہ نہ وہ کچھ بھولے

نہ غلطی کرے نہ اس کا سنایا ہوا کلام مخاطب کو بھولے اور نہ وہ اس میں کوئی غلطی کرے تو دونوں کلاموں کو ایک سا درجہ حاصل ہو گیا۔ پس اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ والی آیت سورۂ شعراء کی اس آیت کے خلاف نہیں کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ بلکہ وہ اس کی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

اس آیت میں درحقیقت عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو خدا تعالیٰ بالمشافہہ کلام کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل نازل ہوتا تھا۔ اس جگہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خدا تعالیٰ بالمشافہہ گفتگو کرتا تھا۔ روح الامین کے واسطہ بننے کا ذکر بطور تمثیل کے کیا گیا ہے۔ ورنہ آپؐ سے بالمشافہہ کلام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا

(یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ میں یقیناً تمہارے پاس اس

بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۸﴾

(آگ) سے کوئی (عظیم الشان) خبر لاؤں گا۔ یا تمہارے پاس ایک چمکتا ہوا انگارہ لاؤں گا۔ تا کہ تم آگ سینکو۔

حل لغات۔ **اٰنَسْتُ** اٰنَسْتُ اٰنَسَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اٰنَسَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَهٗ۔ اس کو دیکھا۔ اٰنَسَ الصَّوْتَ: سَمِعَهٗ وَاَحَسَّ بِهٖ۔ اگر اٰنَسَ الصَّوْتَ کا فقرہ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے آواز کو سنا اور محسوس کیا۔ (اقرب) پس اٰنَسْتُ کے معنے ہوں گے۔ میں نے دیکھا۔

شِهَابٌ اَلشِّهَابُ کے معنے ہیں شُعْلَةٌ مِّنْ نَارٍ سَاطِعَةٌ۔ آگ کا شعلہ جو اوپر کو اٹھ رہا ہو۔ كُلُّ مُضِيْءٍ مُّتَوَلِّدٌ مِّنْ نَارٍ۔ آگ سے پیدا ہونے والی روشنی۔ (اقرب)

قَبَسٍ اَلْقَبَسُ کے معنے ہیں شُعْلَةُ نَارٍ تُؤْخَذُ مِنْ مُّعْظَمِ النَّارِ۔ آگ کا شعلہ جو بڑی آگ سے لیا جائے۔ (اقرب)

تَصْطَلُوْنَ تَصْطَلُوْنَ اِصْطَلٰى سے فعل مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور اِصْطَلٰى بِالنَّارِ اِصْطِلَاءً کے معنے ہیں اِسْتَدْفَأَ بِهَا آگ تاپی اور اس سے گرمی حاصل کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا

واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر آتے وقت ایک آگ دیکھی اور اپنے رشتہ داروں سے کہا۔ کہ میں اس آگ کی طرف جاتا ہوں۔ اور یا تو میں اس آگ کے پاس سے کوئی خبر لاؤں گا۔ یا تمہارے لئے کوئی ایسا انگارہ لاؤں گا جس سے تم آگ سینک سکو۔

قبس کا لفظ اس جگہ شھاب کا بدل ہے یعنی شھاب سے میری مراد قبس ہے۔ اور چونکہ یہاں نارًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک روحانی نظارہ تھا جسمانی نظارہ نہیں تھا۔ مادی آنکھ سے دیکھنے والا کبھی یہ نہیں کہا کرتا کہ میں نے ''ایک آگ'' دیکھی ہے۔ بلکہ وہ یہ کہا کرتا ہے کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ اسی طرح مادی آگ صرف ایک شخص کو نظر نہیں آتی بلکہ سب لوگوں کو نظر آتی ہے۔ مگر یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ وہ مجھے نظر آتی ہے۔ جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ آگ آپ کے باقی ساتھیوں کو نظر نہیں آئی تھی۔

پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کشفی طور پر ایک آگ کا نظارہ دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نظارہ کے دکھانے سے خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ میں اس آگ تک جاؤں۔ سو میں اس آگ تک جاؤں گا۔ اور چونکہ وہ آگ ایک کشفی نظارہ تھا۔ اور کشفی طور پر آگ دیکھنے سے مراد ہدایت ہوتی ہے اور ہدایت یا دیکھنے والے کے لئے مخصوص ہوتی ہے یا ساری قوم کے لئے عام ہوتی ہے اور ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جو انکشاف مجھ پر ہونے والا ہے وہ میرے لئے مخصوص ہے یا میرے خاندان اور قوم کے لئے عام ہے اس لئے انہوں نے اپنے اہل سے کہا۔ کہ اگر وہ ہدایت صرف میرے لئے مخصوص ہوئی تو میں اس کی خبر تمہیں آ کر سناؤں گا۔ اور اگر وہ ہدایت ایسی ہوئی کہ مجھے دوسروں تک بھی پہنچانے کا حکم ہوا تو میں اس میں سے کوئی انگارہ تمہارے سینکنے کے لئے بھی لے آؤں گا۔ یعنی کچھ تعلیم اس میں سے تم کو بھی سناؤں گا تا کہ تم اس سے روحانی سردی دور کرو۔

اس جگہ جو قبس وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہ بھی حقیقی آگ پر دلالت نہیں کرتے۔ کیونکہ جب کسی چیز کو کسی اور چیز سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو اس کی صفات کو بھی اس کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی کو شیر کہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ شیر کی طرح تقریر کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ شیر کی طرح چنگھاڑتا ہے۔ پس چونکہ اس جگہ جلوۂ الٰہی کا نام آگ رکھا گیا تھا اس لئے آگے اس کے آثار وغیرہ کا نام بھی انگارہ رکھا گیا۔ پس اس جگہ آگ اور انگارے سے مراد وہ نور الٰہی ہے جو انہوں نے دیکھا تھا۔ اور چونکہ اب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل وحی نہیں ہوئی تھی وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آیا جو نور ان کو نظر آیا ہے صرف ان کی ذات کے لئے ہے یا باقی خاندان اور قوم کے لئے بھی ہے۔ یعنی یہ جلوہ جو دکھائی دیا ہے یہ جلوۂ نبوت ہے یا جلوۂ ولایت۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ

آگ کے پاس جا کر یا تو میں کوئی خبر لاؤں گا یعنی تم کو یہ بتاؤں گا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ فضل نازل فرمایا ہے۔ اور اگر وہ نور خاندان اور قوم کے لئے ہوا یعنی یہ جلوہ جلوۂ ولائت نہ ہوا بلکہ جلوۂ نبوت ہوا اور مجھے حکم ہوا کہ دوسروں کو بھی تعلیم دو تو میں ایسی تعلیمات لاؤں گا جن سے خاندان اور قوم فائدہ اٹھائے اور ان سے گرمی حاصل کرے۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ

پھر جب وہ اس (یعنی آگ) کے پاس آئے تو ان کو آواز دی گئی کہ جو کوئی آگ میں ہے اور جو اس کے گرد ہے

حَوْلَهَا ۭ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹

اس کو برکت دی گئی ہے۔ اور اللہ رب العالمین پاک ہے۔

تفسیر ۔ اپنے رشتہ داروں کو ہوشیار کر کے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ پہنچے جہاں ان کو وہ نظارہ دکھایا گیا تھا تو ان کو الہام ہوا کہ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی جو شخص اس آگ میں ہے اسے بھی برکت دی گئی ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے اسے بھی برکت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ اس آگ میں اللہ تعالیٰ کا وجود تھا۔ اور تورات نے بھی یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ خروج باب ۳ میں لکھا ہے:۔

"خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا۔ اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا۔ تب موسیٰ نے کہا کہ میں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا۔ جب خداوند نے دیکھا کہ وہ دیکھنے کو نزدیک آیا تو خدا نے اس بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ اے موسیٰ! اے موسیٰ! وہ بولا۔ میں یہاں ہوں۔ تب اس نے کہا۔ یہاں نزدیک مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اتار۔ کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔" (خروج باب ۳ آیت ۲ تا ۵)

مگر قرآن اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ موسیٰ پر ہم نے یہ الہام نازل کیا کہ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کہ وہ جو اس آگ میں ہے اسے بھی برکت دی گئی ہے اور اس کے ماحول کو بھی برکت دی گئی ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ دوسروں کو خود برکت دیتا ہے۔ اسے کوئی اَور برکت نہیں دیتا۔ گویا وہ تبارک تو کہلا سکتا ہے مگر بُوْرِكَ

نہیں کہلا سکتا۔ پس یہ معنے کہ مَنْ فِی النَّارِ سے خدا تعالیٰ مراد ہے کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتے۔

پھر بعض لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے بُوْرِكَ کا لفظ بولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو برکت نہیں دی جاتی بلکہ وہ خود برکت دیتا ہے فِیْ کے معنے پیچھے کے کئے ہیں اور مراد یہ لی ہے کہ وہ شخص جو اس آگ کے پیچھے آرہا ہے یا اس کی تلاش میں ہے اسے برکت دی گئی ہے۔ مگر یہ معنے محاورہ کے خلاف ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فِیْ کے معنے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔ مگر یہ معنے ایسے موقعہ پر استعمال کئے جاتے ہیں جبکہ فِیْ کے بعد کسی روحانی یا معنوی چیز کا ذکر ہو۔ ایسے موقعہ پر استعمال نہیں کئے جاتے جبکہ اس کے بعد اشیاء یا اشخاص کا ذکر کیا گیا ہو۔ اور چونکہ مفسرین اس آگ کو جسمانی آگ قرار دیتے ہیں اور جسمانی چیز کے لئے جب فِیْ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے پیچھے کے نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ معنے بھی درست نہیں سمجھے جا سکتے۔

پھر بعض لوگوں نے فِیْ کے معنے قرب کے کئے ہیں اور فِی النَّارِ کے معنے آگ کے قریب ہونے کے کئے ہیں (حاشیہ تفسیر قرطبی جلد ۱۳ ص ۱۵۸)۔ اور وَمَنْ حَوْلَهَا کو اس کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ وَمَنْ حَوْلَهَا کے الفاظ ہی ان معنوں کو ردّ کر رہے ہیں۔ کیونکہ خود مَنْ حَوْلَهَا کے معنے بھی قریب کے ہیں اور دو الفاظ سے ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پس یہ معنے بھی صحیح نہیں۔

پھر بعض نے کہا کہ گو مَنْ کا لفظ عام طور پر ذی عقل وجودوں کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر اس جگہ مَنْ سے مراد لایعقل اشیاء ہیں (تفسیر بحر محیط جلد ۷ ص ۵۶)۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ لکڑیاں جو اس آگ میں ہیں۔ اور اس کے اردگرد کی جگہ بھی الٰہی تجلّی کی وجہ سے بابرکت ہوگئی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سب معانی غلط ہیں۔ اور صرف نار سے دھوکا کھا کر کئے گئے ہیں۔ چونکہ انہوں نے نار کو جسمانی نار سمجھا اس لئے وہ ان مشکلات میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں نَارًا کے لفظ سے ثابت ہے کہ یہ نظارہ مادی آگ کا نہیں تھا بلکہ روحانی نار کا تھا۔ اور جب اس آگ کو روحانی آگ قرار دے دیا جائے اور آگ سے مراد محبت الٰہی کی آگ سمجھ لیا جائے تو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقّت باقی نہیں رہتی۔ کشف یا خواب میں آگ دیکھنے سے مراد ہمیشہ محبت الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ پس بُوْرِكَ کے لفظ سے نہ خدا تعالیٰ مراد ہے نہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ مجسم نہیں اور نہ اس کو کوئی برکت دیتا ہے۔ اور نہ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ سے مراد موسیٰ ؑ ہیں۔ بلکہ اس آیت میں ایک عام قانون الٰہی بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو محبت الٰہی کی آگ میں جل رہا ہو اس کو برکت دی جاتی ہے۔ اسی طرح نہ تو فِیْ کے معنوں کا جھگڑا رہتا ہے نہ مَنْ کے معنوں کا۔ نہ بُوْرِكَ کی ترکیب کا اور آیت بالکل حل ہو جاتی ہے۔ اور وَمَنْ حَوْلَهَا کے معنے

بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔یعنی جو شخص محبت الٰہی کی آگ میں پڑا ہوا ہو نہ صرف اس کو برکت دی جاتی ہے بلکہ اس کے ہم صحبت بھی برکت پاتے ہیں۔محبت کو دنیا کی تمام زبانوں میں آگ سے تشبیہ دی جاتی ہے اور رؤیا و کشوف میں بھی اگر کوئی شخص اپنے آپ کو آگ میں جلتا ہوا دیکھے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ وہ عشق الٰہی کے مقام کو حاصل کرے گا۔ پس بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کا یہی مطلب ہے کہ جو شخص اس آگ میں پڑے گا وہ برکت پا جائے گا اور جو اس کے اندر نہیں پڑے گا۔ بلکہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گا گویا اس سے کم حصہ لے گا وہ بھی برکت دیا جائے گا۔ اگر مَنْ فِي النَّارِ سے مراد موسیٰ ؑ ہوتے تو پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ مَنْ حَوْلَهَا سے کیا مراد ہے۔اس وقت سوائے حضرت موسیٰ ؑ کے آگ کے پاس اور کون تھا جس کے لئے مَنْ حَوْلَهَا فرمایا گیا۔پس اس جگہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ قانون بتایا گیا ہے کہ جو اس آگ میں پڑے گا وہ بھی برکت پائے گا اور جو اس کے پاس آ کر اس کی گرمی حاصل کرے گا وہ بھی برکت پائے گا اور ماضی کا لفظ مضارع کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی برکت دیا جائے گا۔

پرانے زمانہ میں دِلّی کے ایک بزرگ تھے ان کے پاس ایک دفعہ ان کا ایک مرید آیا۔اور اس نے کہا کہ ہمارا جو یہ خیال ہے کہ حضرت کرشن اور حضرت رام چندر جی ہندوستان کے نبی تھے یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک آگ جل رہی ہے اور حضرت کرشن جی تو اس کے اندر ہیں اور حضرت رامچندر جی اس کے کنارہ پر کھڑے ہیں۔وہ بزرگ کہنے لگے تم نے اس خواب کی تعبیر غلط سمجھی ہے۔آگ کے معنے محبت الٰہی کی آگ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ کرشن جی خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور رامچندر جی ان سے کم درجہ رکھتے تھے۔اسی لئے حضرت کرشن جی تو آگ کے اندر جلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور رامچندر جی آگ کے کنارہ پر کھڑے ہوئے نظر آئے (ملفوظات جلد ۵ صفحہ ۴۵۹)۔

آگے فرماتا ہے وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔رب العالمین خدا تمام عیبوں سے پاک ہے۔یعنی جنہوں نے یہ کہا ہے کہ آگ میں خدا تعالیٰ تھا جیسا کہ بائیبل والوں نے وہ سب غلطی کرتے ہیں۔خدا تعالیٰ ہر قسم کے تجسّم سے پاک اور منزہ ہے۔اسی طرح سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو برکت دیتا ہے اس کے ذریعہ دنیا میں اس کی سبّوحیّت کا اظہار ہوتا ہے اور ہر قسم کے عیوب جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کا ازالہ کر دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کا حسین چہرہ دنیا کو ایک بار پھر اپنی پوری شان کے ساتھ نظر آنے لگ جاتا ہے۔

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰﴾ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ

اے موسیٰؑ! بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں جو غالب (اور) حکمت والا ہوں۔ اور تُو لاٹھی پھینک۔ اور جب اس نے

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ

اس (یعنی لاٹھی) کو دیکھا کہ وہ ہل رہی ہے گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر نہ

يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۱﴾

دیکھا (تب ہم نے کہا) اے موسیٰ! ڈر نہیں۔ میں وہ ہوں کہ رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے۔ مگر جس نے ظلم کیا

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

لیکن پھر اس ظلم کو چھوڑ کر نیکی اختیار کی۔ میں (اس کے لئے) بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

حلّ لُغات۔ تَهْتَزُّ۔ تَهْتَزُّ اِهْتَزَّ سے فعل مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِهْتَزَّتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں تَحَرَّكَتْ فِيْ سَيْرِهَا لِحُدَاءِ الْحَادِيْ حدی خواں کے حدی کرنے پر اونٹ تیز چلے۔ اور جب اِهْتَزَّ الْمَآءُ فِيْ جَرَيَانِهٖ کہیں تو معنے ہوں گے تَطَلَّقَ۔ پانی تیزی سے بہا اور اِهْتَزَّ الْكَوْكَبُ فِي انْقِضَاضِهٖ کے معنے ہیں اَسْرَعَ۔ ستارہ جلدی سے ٹوٹا۔ (اقرب) پس تَهْتَزُّ کے معنے ہوں گے۔ جلدی چلتا ہے۔

اَلْجَآنُّ اَلْجَآنُّ کے معنے ہیں حَيَّةٌ بَيْضَآءُ كَحْلَاءُ الْعَيْنِ لَا تُؤْذِيْ۔ سفید رنگ سرمگیں آنکھوں والا باریک سانپ جو کاٹتا نہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ ہم نے اس وقت موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! میں اللہ ہوں جو بڑا غالب اور حکمت والا ہوں۔ اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ آگ کے اندر خدا تعالیٰ تھا جس نے کہا کہ میں اللہ غالب اور حکمت والا ہوں۔ کیونکہ قرآن کریم کے کسی لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آگ کے اندر سے آواز آئی تھی۔ قرآن کریم صرف یہ بتاتا ہے کہ ایسی آواز آئی تھی خواہ وہ کہیں سے آئی ہو۔

درحقیقت یہ آیت بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ محبت الٰہی کی آگ میں جلنے والا انسان بڑی برکت پاتا ہے اور یہ امر اس بات سے ظاہر ہے کہ میں اللہ غالب اور حکمت والا ہوں یعنی جو میری

محبت میں جلے گا وہ غالب ہوگا اور ڈنڈے کے زور سے غالب نہیں ہوگا بلکہ اس کو بڑی حکمتیں عطا کی جائیں گی اور وہ دلائل اور براہین کے ساتھ غالب آئے گا۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء دلائل کے ساتھ دنیا پر غالب آئے۔

پھر فرماتا ہے ہم نے موسیٰ ؑ کو الہام کیا کہ اپنا سونٹا پھینک دے۔ جب اس نے اپنا سونٹا پھینک دیا تو اس نے دیکھا کہ وہ تیزی کے ساتھ ہل رہا ہے جیسا کہ چھوٹا سانپ ہلتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نظارہ کو دیکھ کر دوڑ پڑے اور پیچھے کی طرف انہوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

جیسا کہ سورۂ شعراء کی تفسیر میں بتایا جاچکا ہے یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا۔ اور عصا سے مراد ان کی جماعت تھی۔ چنانچہ عربی زبان میں بھی کہتے ہیں شَقَّ الْعَصَا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے جماعت کی وحدت کو توڑ دیا۔ اسی طرح اس نظارہ کے دکھانے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ جب تک تُو اپنی جماعت کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا اور اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔ وہ ایک عصا کی شکل میں کارآمد وجود رہے گی۔ لیکن جب وہ تیری کامل متابعت کو ترک کر کے تیرے روحانی وجود سے الگ ہوجائے گی تو وہ ایک سانپ کی شکل اختیار کرلے گی۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشفی حالت میں اپنا عصا پھینک دیا تو ان کو اپنی قوم کا وہ حال نظر آ گیا جو ان کی غیر حاضری میں ہونے والا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ پیٹھ پھیر کر دوڑ پڑے اس پر ان کو الہام ہوا کہ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ۔ اے موسیٰ! ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ رسول جب ہماری خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انعام لینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ سزا پانے کے لئے حاضر نہیں ہوتے۔ پس یہ نظارہ تجھے ڈرانے کے لئے نہیں بلکہ تجھے حقیقت حال سے آگاہ کرنے اور قوم کی نگرانی کی طرف توجہ دلانے کے لئے دکھایا گیا ہے۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اس آیت کے متعلق بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے تو پتہ لگتا ہے کہ رسولوں میں سے بعض ظالم بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کا یہ اعتراض نحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اِلَّا کبھی استثناء متصل کے لئے آتا ہے اور کبھی استثناء منقطع کے لئے۔ یعنی اِلَّا کے بعد بعض دفعہ نئے گروہ کا ذکر شروع ہوجاتا ہے اور پہلا ذکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس جگہ بھی اِلَّا استثناء منقطع کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے جو شخص ظلم سے کام لے اور پھر ظلم کے بعد نیکی اختیار کرے تو وہ ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں میری توبہ قبول بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں بڑا بخشنے والا اور رحم

کرنے والا ہوں۔اس لئے انبیاء تو الگ رہے۔ایسے شخص کے لئے بھی ڈرنے کی کوئی حقیقی وجہ نہیں۔

وَ اَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ قف

اور تُو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال۔وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا۔یہ ان نو نشانوں میں سے ہے جو فرعون

فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ قَوۡمِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا

اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جانے والے ہیں وہ اطاعت سے نکل جانے والی قوم ہے۔پس جب ان کے پاس

فٰسِقِیۡنَ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا جَآءَتۡہُمۡ اٰیٰتُنَا مُبۡصِرَۃً قَالُوۡا ہٰذَا

ہمارے نشانات جو آنکھیں کھول دینے والے تھے آئے تو انہوں نے کہا۔یہ تو ایک کھلا کھلا جادو ہے۔اور انہوں

سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۴﴾ ۚ وَ جَحَدُوۡا بِہَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡہَاۤ اَنۡفُسُہُمۡ

نے اصرار سے ظلم اور تکبر کرتے ہوئے ان نشانوں کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان پر یقین لا چکے تھے۔

ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۵﴾ ع ۱ / ۱۶

پس دیکھ کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا کرتا ہے۔

حلّ لُغات۔اِسۡتَیۡقَنَتۡ۔ اِسۡتَیۡقَنَتۡ اِسۡتَیۡقَنَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور اِسۡتَیۡقَنَ کے معنے تَیَقَّنَ کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں تَیَقَّنَ الۡاَمۡرَ: عَلِمَہٗ وَ تَحَقَّقَہٗ یعنی کسی بات کو یقینی طور پر جان لیا۔(اقرب)

تفسیر۔پھر فرمایا کہ اپنے گریبان میں ہاتھ تو ڈال۔جب تو اسے نکالے گا تو وہ سفید ہوگا۔مگر کسی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی نشان نمائی کی وجہ سے وہ نورانی اور سفید ہوگا۔

مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ کے الفاظ بائیبل کے اس ناروا الزام کو ردّ کر رہے ہیں جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ان الفاظ میں لگایا کہ

”اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔“ (خروج باب ۴ آیت ۶ و ۷)

گویا بائیبل نویسوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سفیدی کو کوڑھ کی طرف منسوب کر دیا تھا مگر قرآن کریم جو حضرت موسیٰ ؑ کے دو ہزار سال کے بعد آیا اور جس کی مخالفت میں یہودیوں اور عیسائیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ وہ حضرت موسیٰ ؑ کو جو یہودیوں اور عیسائیوں کا نبی تھا اس الزام سے پاک ٹھہراتا ہے جو خود موسیٰ ؑ کے متبعین نے ان پر لگا دیا تھا۔ اور ان کے ہاتھ کی سفیدی کو کوڑھ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک عظیم الشان نشان قرار دیتا ہے۔

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ چونکہ تجھ پر جو کلام نازل ہوا ہے وہ تیری قوم کے لئے ہے اس لئے تُو جا اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ چمٹا لے۔ یعنی ان کو اپنے ظلِ عاطفت میں لے لے۔ اور ان کی نیک تربیت کر۔ اس تربیت کے نتیجہ میں اس قوم میں سے نہایت اعلیٰ درجہ کے لوگ پیدا ہوں گے۔ جن میں کوئی عیب نہیں ہوگا۔ وہ دل کے صاف اور خدا تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ اور اس کے مقبول ہوں گے۔ اور دنیا کو اپنے نور سے منور کرنے والے ہوں گے۔ لیکن جب وہ تجھ سے الگ ہو گئے۔ یعنی تیری روحانی تعلیم کو انہوں نے پس پشت پھینک دیا تو وہ زمین کی طرف جھک جائیں گے اور جس طرح سانپ سفلی زمین کی مٹی کھاتا ہے اسی طرح وہ بھی دنیا کے کیڑے بن جائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی جو پتھیروں کا کام کرنے والے تھے ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو فتح کو قریب لانے والی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کے نتیجہ میں انہیں ایسی ہمت اور طاقت بخشی کہ انہوں نے عمالقہ کی قوم پر فتح حاصل کی اور کنعان پر خدا نے انہیں حکمرانی عطا فرما دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا عمالقہ کی قوم پر فتح حاصل کر لینا ایسا ہی تھا جیسے چوہا بلی کو مار لے۔ عمالقہ قوم کی شام اور کنعان پر حکومت تھی۔ اور وہ بڑی بھاری شوکت اور عظمت رکھتی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اینٹیں پاتھنے والے غلامی کی زندگی بسر کرنے والے اور سیاست سے کلی طور پر نابلد تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ وہ اس جاہل اور ناواقف اور غلامی کی زندگی بسر کرنے والی قوم کو عمالقہ کی زمین کا وارث کر دے گا اور یہ سینکڑوں سال تک غلام رہنے والی قوم جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی تھی اور ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں مقید رہی تھی عمالقہ کی قوم پر جو تلوار کی دھنی تھی اور ہر قسم کے ساز و سامان اس کے پاس موجود تھے غالب آ جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے انہیں غلبہ عطا فرما دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب انہوں نے اپنی نادانی سے یہ کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ (المائدة:۲۵) یعنی تُو اور تیرا خدا دونوں دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

مگر آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں اور تربیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایسا تغیر پیدا کیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بلا دریغ قربانیوں کی آگ میں جھونک دیا اور آخر کنعان کے دروازے ان کے لئے کھل گئے۔ اور غلام کہلانے والے دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ پھر نہ صرف خدا تعالیٰ نے ان کو دنیوی حکومت عطا فرمائی بلکہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم پر چل کر ان میں بڑے بڑے ربّانی اور احبار بلکہ خدا تعالیٰ کے انبیاء تک پیدا ہوئے جو چودہ سو سال تک دنیا کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتے رہے۔ یہ تمام پاکبازوں کا گروہ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ کی صداقت کا ایک عملی ثبوت تھا۔ اور پھر یہ تمام مقدسین مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کے مطابق معصوم اور بے عیب تھے۔ بائیبل نویسوں نے اپنی نادانی سے خدا تعالیٰ کے ان انبیاء کو جو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے رہے قسم قسم کے ناروا الزام لگائے ہیں۔ کسی کے متعلق کہا ہے کہ اس کا دل غیر معبودوں کی طرف پھر گیا۔ کسی کے متعلق کہا ہے کہ اس نے دوسرے کی بیوی اُڑا لی اور اس کے خاوند کو مروا دیا۔ کسی کے متعلق کہا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا۔ مگر قرآن کریم ان تمام اتہامات سے ان کو پاک ٹھہراتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو پہلے سے یہ خبر دے دی تھی کہ تیری تربیت کے نتیجہ میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو نورانیت کا مجسمہ ہوں گے اور ان میں کوئی ایسا عیب نہیں ہوگا جو ان کی معصومیت کو داغدار کرنے والا ہو۔

فرماتا ہے یہ دونوں نشان ان نو نشانوں میں سے ہیں جو فرعون اور اس کی قوم کے لئے دکھائے جانے والے ہیں۔ کیونکہ وہ اطاعت سے نکلنے والی قوم ہے۔

ان نو نشانات میں سے عصا اور ید بیضاء کے معجزات کا تو اس جگہ ذکر ہے اور دو معجزات کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الاعراف:۱۳۱) یعنی ہم نے آل فرعون کو قحط اور بچوں کی ہلاکت کے عذاب میں گرفتار کیا۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ باقی پانچ نشانات کا اس آیت میں ذکر آتا ہے۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۔ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (الاعراف:۱۳۴) یعنی ہم نے آل فرعون پر کئی قسم کے عذاب بھیجے جن میں طوفان، ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کا عذاب شامل تھا۔

بائیبل کی کتاب ''خروج'' کے مختلف ابواب میں ان عذابوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ طوفان کا عذاب تو وہی تھا جو بحیرۂ احمر میں ظاہر ہوا۔ جب فرعون اور اس کا لشکر اس میں غرق کر دیئے گئے لیکن اس کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر ٹڈیوں کا عذاب بھی نازل کیا۔ یعنی اتنے ٹڈی دَل آئے کہ ملک کی

تمام فصلیں تباہ ہوگئیں اور لوگ بھوکے مرنے لگے۔ جوؤں کا عذاب بھی نازل کیا۔ یعنی اتنی شدید سردی پڑی کہ لوگوں کے لئے غسل کرنا مشکل ہوگیا۔ اوران کے بال جوؤں سے بھر گئے۔ مینڈکوں کا عذاب بھی نازل کیا۔ یعنی اتنی کثرت سے بارشیں ہوئیں کہ جگہ جگہ مینڈک پیدا ہوگئے۔ خون کا عذاب بھی نازل کیا۔ جس سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ ان کا خون خراب ہوگیا اور انہیں کثرت کے ساتھ پھوڑے وغیرہ نکلنے لگ گئے یا ان میں نکسیر کا مرض پھوٹ پڑا۔ یا بواسیر دموی کے مرض نے آگھیرا۔ یا ان میں وہ طاعون پھیل گئی جس میں مریض کے ناک، مونہہ اور مقعد سے خون جاری ہوجاتا ہے۔ اور کبھی جلد کے نیچے جریان خون ہوکر تمام جسم پر سیاہ سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں۔ اور ستر اسی فیصدی مریض ہلاک ہوجاتے ہیں۔ غرض پے درپے ان کے انتباہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب نازل ہوتے رہے۔ مگر فرماتا ہے باوجود اس کے کہ فرعون کی قوم نے وہ نشانات دیکھے جو ان کی آنکھیں کھولنے والے تھے پھر بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہ تو بڑی پُرفریب باتیں ہیں۔ یعنی بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانات خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر اصل میں محض اتفاقات ہیں اور انہوں نے ان نشانات کا انکار کردیا۔ حالانکہ ان کے دل سمجھ چکے تھے کہ یہ محض اتفاقات نہیں بلکہ ان کی بداعمالی کی سزا کے طور پر یہ عذاب آرہے ہیں۔ ان کا یہ انکار محض ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ صداقت کا اپنی زبان سے اقرار کرکے اپنی بڑائی کو ضعف پہنچائیں۔ مگر دیکھ لو کہ پھر ان مفسد لوگوں کا انجام کیسا خطرناک ہوا۔ جب فرعون اور اس کے ساتھی ہلاک ہوگئے تو آج تیرے مخالفوں کا انجام کس طرح اچھا ہوسکتا ہے جو اسی رستہ پر چل رہے ہیں جس پر فرعون اور اس کے ساتھی چلے اور انہی کی طرح اللہ تعالیٰ کے نشانات کا انکار کرتے چلے جارہے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا۔ اور دونوں نے کہا اللہ ہی سب تعریف کا مالک ہے

الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶﴾

جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا

اور سلیمان داؤد کا وارث بنا۔ اور اس نے کہا اے لوگو! ہمیں

مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہر ضروری چیز (یعنی تعلیم) ہم کو دی گئی ہے۔

الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝۱۷

یہ کھلا کھلا فضل ہے۔

حلّ لُغَات۔ مَنْطِقَ الطَّيْرِ مَنْطِقُ الطَّيْرِ، اَلْمَنْطِقُ: اَلْكَلَامُ ۔یعنی منطق کے معنے کلام کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر فرماتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو چونکہ یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاص بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ان دونوں کا یہ قول بیان کیا گیا ہے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی ہے یعنی خلافتِ روحانی اور خلافتِ جسمانی کے ذریعہ سے اس نے ہمیں مومنوں کا افسر بنایا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث ہوا۔ یعنی ان کے انتقال کے بعد ان کا جانشین ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگلی آیات میں جہاں جہاں نَا کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صرف حضرت سلیمانؑ ہی ہیں اور نَا کا لفظ شاہی سطوت اور جبروت کے اظہار کے لئے ہے نہ یہ بتانے کے لئے کہ حضرت داؤدؑ اس میں شامل ہیں۔ کیونکہ آیت کے شروع میں ہی بتایا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت فوت ہو چکے تھے۔ پس یہ جو کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ہم کو منطق الطیر سکھائی گئی ہے۔ اس سے مراد صرف حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ہیں نہ کہ حضرت داؤدؑ۔ کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

مفسرین نے منطق الطیر کی یہ معنے کئے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو کبوتروں اور تیتروں اور چڑیوں اور بٹیروں وغیرہ کی زبان سکھائی گئی تھی اور وہ ان کی بولی کو اسی طرح سمجھ لیتے تھے جس طرح ایک انسان کی گفتگو کو دوسرا انسان سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک بلبل کو دیکھا کہ ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی اپنی دُم اور سر ہلا کر کچھ بول رہی ہے۔ اس کی آواز سن کر آپ نے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے پوچھا کہ

تم جانتے ہو یہ بلبل کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں ہمیں کیا علم ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ یہ کہہ رہی ہے کہ دنیا کے سر میں خاک پڑے۔ میں نے تو آج صرف آدھی کھجور کھائی ہے۔ پھر فاختہ بولی۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہ کہتی ہے کاش یہ سب مخلوق پیدا ہی نہ ہوتی۔

اسی طرح مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ فرمایا کرتے تھے کہ کبوتر کہتا ہے۔ مرنے کے واسطے اپنی اولادیں پیدا کرو۔ اور ویران ہونے کے لئے مکانات بناؤ۔ اور مور کہتا ہے کہ جو کچھ تُو کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ اور ہدہد کہتا ہے کہ جو دوسرے پر رحم کرے گا خدا اس پر رحم کرے گا۔ اور ابابیل کہتی ہے کہ نیک اعمال کو آگے بھیجو تا کہ تم انہیں خدا کے پاس پاؤ اور کبوتر کہتا ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى مِلْءُ سَمَآئِهٖ وَ اَرْضِهٖ۔ اور قطاۃ کہتا ہے کہ جو خاموشی اختیار کرے گا سلامت رہے گا۔ اور طوطا کہتا ہے کہ افسوس اس پر جس کا مقصود اور مطلوب دنیا ہے۔ اور مرغا کہتا ہے کہ اے غافلو اللہ کو یاد کرو۔ اور مینڈک کہتا ہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْقُدُّوْسِ۔ اور چڑیا کہتی ہے اے گنہگارو استغفار کرو۔ اور چیل کہتی ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی خدا کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ غرض انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی کو خوب سمجھتے تھے گو انہوں نے پرندوں میں مینڈک وغیرہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مگر یہ محض استعارے اور مجاز کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرة:۱۸۸) یعنی رمضان کے ایام میں سحری کا وقت اس وقت تک ہے جب تک کہ صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر نہ آنے لگے۔ مگر پنجاب میں بہت سے زمیندار رمضان کی راتوں میں سفید اور سیاہ تاگا اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور چونکہ تاگا اچھی روشنی میں ہی نظر آتا ہے اس لئے وہ اس وقت تک خوب کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ جب تک انہیں سیاہ اور سفید تاگا الگ الگ نظر نہ آنے لگے۔ اسی طرح تشبیہ اور استعارہ کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں اگر خدا تعالیٰ کے ہاتھ کا ذکر آجائے تو بعض لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بھی نعوذ باللہ اسی طرح گوشت پوست کا ہے جس طرح ہمارا ہے۔ اور اگر انہیں کہا جائے کہ ہاتھ سے مراد خدا تعالیٰ کی طاقت ہے تو وہ کہیں گے کہ تم تاویلیں کرتے ہو۔ جب خدا نے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے تو تمہارا کیا حق ہے کہ تم اس کی تاویل کرو۔ یا خدا تعالیٰ کے متعلق اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے الفاظ پڑھ لیں تو جب تک وہ خدا تعالیٰ کو ایک سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھا ہوا تسلیم نہ کریں انہیں چین ہی نہیں آئے گا۔ حالانکہ دنیا کی ہر زبان میں تشبیہہ اور استعارہ کا استعمال موجود ہے۔ ہمارے ملک میں محاورہ ہے کہ ''آنکھ بیٹھ گئی'' مگر کوئی نہیں کہتا کہ آنکھ کی ٹانگیں تھیں یا وہ بیٹھی ہے تو کس

پلنگ پراور کرسی پر بیٹھی ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ آنکھ بیٹھنے کے معنے یہ ہیں کہ آنکھ ضائع ہوگئی۔ اور پھوٹ گئی۔ اسی طرح اور کئی قسم کے استعارات ہماری زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں اور کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ ان استعارات کو زبان کی خوبی اور اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔

غرض جس طرح دنیا کی ہر زبان میں مجاز اور استعارات کا استعمال پایا جاتا ہے اسی طرح الہامی کتابیں بھی ان استعارات کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر وہ لوگ جو استعارہ اور مجاز کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ انہیں ظاہر پر محمول کر لیتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔

یہی حال منطق الطیر کا ہے۔ مفسرین نے صرف طیر کے لفظ کو دیکھ کر خیال کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیازی طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ انہیں تیتروں اور بٹیروں کی بولی بھی سکھا دی تھی مگر سوال یہ ہے کہ اس بولی کے سکھانے کا فائدہ کیا تھا۔ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ پرندے بھی بڑے بڑے علوم اور معارف جانتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس علم سے محروم رہیں اس لئے اس نے آپ کو ان کی زبان بھی سکھا دی۔ مگر پرندے تو ایک جاہل سے جاہل اور غبی سے غبی انسان جتنی بھی عقل نہیں رکھتے پھر ان سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا علم سیکھنا تھا۔ پھر اگر ان کا دماغ واقعہ میں اتنا اعلیٰ ہوتا کہ حضرت سلیمانؑ جیسے نبی کو بھی ان سے معارف اور علوم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو شریعت ان کو ذبح کرنے کی اجازت کیوں دیتی۔ اللہ تعالیٰ کا انسان کو ذبح کرنے کی اجازت نہ دینا اور جانوروں کی ذبح کرنے کی اجازت دینا صاف بتا رہا ہے کہ یہ امتیاز صرف دماغ کے فرق کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور ان کا دماغ عام انسانی دماغ سے بھی ادنیٰ ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی زبان کس حکمت کے ماتحت سکھائی گئی تھی۔

پھر مفسرین صرف یہیں تک بس نہیں کرتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تمام پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی تھیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہُدہُد جو ایک پرندہ تھا وہ اتنی عقل اور سمجھ رکھتا تھا کہ اس نے ملکہ سبا کی باتیں سمجھیں۔ اس کے درباریوں کی باتیں سمجھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی باتیں سمجھیں۔ مگر ہُدہُد کی باتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ گویا ایک پرندہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تمام درباری علماء اور فضلاء سے بھی بڑا تھا۔ کیونکہ وہ ان سب کی باتیں سمجھتا تھا لیکن اس کی بات کو کوئی نہیں سمجھتا تھا اور اگر کوئی سمجھتا تھا تو وہ صرف حضرت سلیمانؑ تھے۔ گویا اگر ہدہد سے کسی کو برابری حاصل تھی تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کو تھی باقی جتنے امراء اور وزراء تھے وہ سب اُس ''کھٹ بڑھئی'' سے نیچے تھے۔ یہ اتنا احمقانہ نقشہ ہے کہ اس کو ایک معمولی عقل رکھنے والا

انسان بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔ اگر یہ بات مانی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پرندے انسان سے افضل ہیں۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرندوں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہاں انسان کو ذبح کر کے کھانا جائز ہے کیونکہ پرندے نعوذ باللہ انسان سے افضل ہیں۔ یہ تو ''اندھیر نگری چوپٹ راجہ'' والی بات ہوگی جس کو کوئی بھی معقول انسان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ایک استعارہ اور مجاز ہے جس کو لوگوں نے نہ سمجھا اور وہ صحیح راستہ سے بھٹک کر دور از کار بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ طیر عربی زبان میں اڑنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اور استعارۃً اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو عالم روحانی کی فضاؤں میں پرواز کرتے اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور اس کے محبوب ہوتے ہیں۔ بانئ سلسلہ احمدیہ کا ایک الہام بھی ان معنوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپ کو ایک دفعہ الہام ہوا کہ:۔

''ہزاروں آدمی تیرے پروں کے نیچے ہیں'' (تذکرہ صفحہ ۱۶۷۲ ایڈیشن ۲۰۲۲ء)

اب ظاہر ہے کہ پَر ہمیشہ پرندوں کے ہی ہوا کرتے ہیں اور پرندے کے پروں کے نیچے بیٹھنے والے بھی پرندے ہی ہوتے ہیں۔ گویا اس الہام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی پرندہ قرار دیا گیا۔ اور پھر یہ بھی بتایا گیا کہ وہ لوگ جو آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے والے ہیں۔ وہ بھی عالم روحانی کے پرندے ہیں۔ اس الہام نے قرآن کریم کی اس آیت کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ طیر سے مراد جسمانی پرندے نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے والے ہیں۔ ان برگزیدہ لوگوں کو استعارۃً اس لئے بھی پرندہ کہا جاتا ہے کہ پرندہ آسمان کی طرف اڑتا ہے اور علوم سماوی آسمان سے نیچے کی طرف اترتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اوپر سے نیچے کی طرف آرہی ہوگی تو وہ سب سے پہلے اسی کو ملے گی جو اوپر پرواز کر رہا ہوگا۔ پس عالم روحانی کی فضاؤں میں پرواز کرنے والے کو اس لئے بھی پرندہ کہا جاتا ہے کہ آسمانی علوم اور اسرار غیبی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے انہی لوگوں کو الہام یا رؤیا و کشوف کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں جو اوپر پرواز کر رہے ہوں۔ اور انہی آسمانی طیور کو اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اپنے فیوض سے متمتع فرماتا ہے۔ پھر وہ لوگ جو ان کی صحبت میں آکر بیٹھتے ہیں وہ بھی اپنے اپنے اخلاص اور درجہ کے مطابق ان فیوض سے مستفیض ہوتے چلے جاتے ہیں۔

غرض طیر کے اس مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ کے یہ معنے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ اے لوگو! مجھے بھی وہ بولی سکھائی گئی ہے جو بلندی کی طرف پرواز کرنے والے لوگوں کو سکھائی جاتی ہے یعنی نبیوں کے معارف اور حقائق اور یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک

حضرت سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے بلکہ صرف ایک بادشاہ تھے ۔ چنانچہ بائیبل میں کہیں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں قرار دیا گیا بلکہ ایک فلاسفر اور عالم قرار دیا گیا ہے ۔ چنانچہ نمبر ا سلاطین باب ۴ میں لکھا ہے:۔

''اور خدا نے سلیمان کو حکمت اور سمجھ بہت ہی زیادہ اور دل کی وسعت بھی عنایت کی جیسی سمندر کے کنارے کی ریت ہوتی ہے ۔ اور سلیمان کی حکمت سب اہل مشرق کی حکمت اور مصر کی ساری حکمت پر فوقیت رکھتی تھی۔'' (آیت ۲۹و۳۰)

اسی طرح لکھا ہے:۔

''اس نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اس کے ایک ہزار پانچ گیت تھے۔ اور اس نے درختوں کا یعنی لبنان کے دیودار سے لے کر زوفا تک کا جو دیواروں پر اُگتا ہے اور چوپائیوں اور پرندوں اور رینگنے والے جانداروں اور مچھلیوں کا بھی بیان کیا۔ اور سب قوموں میں سے زمین کے سب بادشاہوں کی طرف سے جنہوں نے اس کی حکمت کی شہرت سنی تھی لوگ سلیمان کی حکمت کو سننے آتے تھے۔''

(آیت ۳۲،۳۳)

غرض بائیبل حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک حکیم اور فلاسفر تو قرار دیتی ہے مگر نبی قرار نہیں دیتی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ

''جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔'' (نمبر ا سلاطین باب ۱۱۔ آیت ۴،۵)

پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی ہے ۔ اور بتایا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی تھے اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی علوم اور معارف عطا کئے گئے تھے جو اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں کو عطا کئے جاتے ہیں جو اس کی طرف پرواز کرتے اور اس کے قرب میں بہت بلند اور بالا مقام رکھتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ہمیں ہر ضروری چیز عطا کی گئی ہے۔ اس جگہ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہر چیز کے نہیں بلکہ ہر ضروری چیز کے ہیں ۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدمقابل ملکہ سبا کے متعلق بھی اسی سورۃ

میں آتا ہے کہ وَ اُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (آیت ۲۴) حالانکہ وہ دنیا کے ایک نہایت مختصر علاقہ کی بادشاہ تھی۔ اگر وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ کے معنے ہر چیز کے کئے جائیں تو اس آیت کا مفہوم یہ قرار پاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ سبا اور اس کا تخت بھی حاصل تھا اور جب ہدہد نے ملکہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اسے ہر نعمت حاصل ہے تو اس کے معنے یہ تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اور ان کے لشکر بھی اس کو حاصل تھے حالانکہ یہ دونوں باتیں بالبداہت غلط ہیں۔ دراصل عربی زبان کے محاورہ کے مطابق یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کُلّ کا لفظ تمام افراد جنس پر مشتمل ہو بلکہ بسا اوقات یہ لفظ صرف ضرورت کے مطابق اشیاء پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ (الانعام: ۴۵) یعنی جب پہلی قوموں کے افراد نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر پہلے تو ہر قسم کی ترقیات کے دروازے کھول دیئے اور پھر ان پر عذاب نازل کر دیا۔ اس آیت میں بھی کلّ کے لفظ کے یہ معنے نہیں کہ ان کو دنیا کی ہر نعمت ملی بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ اس زمانہ کی اور ان کے ملک کی بڑی بڑی نعمتوں سے انہیں حصہ ملا۔ اسی طرح اہل مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰۤى اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (القصص: ۵۸) یعنی کیا اہل مکہ کو ہم نے ایک عزت والے اور محفوظ مقام میں جگہ نہیں دی۔ جس کی طرف ہمارے انعام کے طور پر ہر قسم کے میوے لائے جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی کلّ سے تمام دنیا کے میوے مراد نہیں بلکہ بہت سے میوے مراد ہیں جو اہل مکہ کی صحت اور ان کی لذت کے سامان پیدا کرنے کے لئے ضروری تھے۔ اسی طرح شہد کی مکھی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ تُو تمام پھلوں کو کھا۔ حالانکہ شہد کی مکھی سارے پھلوں کو نہیں کھاتی بلکہ بعض پھلوں کو کھاتی ہے۔ اسی طرح یہاں وَ اُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ کے معنے ہر چیز کے نہیں بلکہ ہر مطابق ضرورت چیز کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جن جن چیزوں کی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ضرورت ہوتی تھی خدا تعالیٰ ان کو مہیا کر دیتا تھا اور جن جن چیزوں کی اپنے زمانہ میں ملکہ سبا کو ضرورت ہوتی تھی وہ اس کو میسر آجاتی تھیں چنانچہ یہ دعویٰ کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے کھلے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل کے انسانی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔

وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّيْرِ

اور (ایک دفعہ) سلیمانؑ کے سامنے جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اس کے لشکر ترتیب وار اکھٹے

فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۸﴾

کئے گئے۔ پھر ان کو کوچ کا حکم ملا۔

حلّ لُغَات۔ يُوْزَعُوْنَ يُوْزَعُوْنَ اَوْزَعَ سے فعل مضارع مجہول جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَوْزَعَ وَزَعَ سے ہے اور وَزَعَهٗ کے معنے ہیں كَفَّهٗ ومَنَعَهٗ وَحَبَسَهٗ۔ یعنی اس کو ہٹایا۔ روکا یا روکے رکھا۔ اور جب وَزَعَ الْجَيْشَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَ اَوَّلَهُمْ عَلٰۤى اٰخِرِهِمْ یعنی لشکر کو اول سے لے کر آخر تک روکے رکھا اور جب کہیں کہ رَأَيْتُهٗ يَزَعُ الْجَيْشَ تو معنے ہوں گے يُرَتِّبُهُمْ وَيُسَوِّيْهِمْ وَيَصُفُّهُمْ لِلْحَرْبِ یعنی میں نے اسے دیکھا کہ وہ لشکر کو ترتیب دے رہا تھا اور انہیں ٹھیک کر رہا تھا اور لڑائی کے لئے صف بستہ کر رہا تھا۔ (اقرب)

پس يُوْزَعُوْنَ کے معنے ہوں گے کہ (۱) لشکروں کو ترتیب دی جاتی تھی (۲) لشکروں کا پورا پورا انتظام رکھا جاتا تھا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ ایک دفعہ سلیمانؑ کے سامنے جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اس کے لشکر حاضر کئے گئے اور ان کو ترتیب وار الگ الگ کھڑا کیا گیا۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس وقت کسی ملک پر چڑھائی کرنے کے لئے تیار تھے اور انہوں نے اپنی تمام فوج اکٹھی کی تھی جن میں جنات کا بھی لشکر تھا۔ انسانوں کا بھی لشکر تھا اور پرندوں کا بھی لشکر تھا۔

جنّات کا لفظ سامنے آتے ہی مفسرین کا ذہن پھر اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہے جو حضرت سلیمانؑ کے قبضہ میں تھی۔ حالانکہ اگر وہ قرآن کریم پر غور کرتے تو انہیں اس قدر دور از کار تاویلات کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ جنّات کی حقیقت پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا قرآن کریم میں صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہی یہ ذکر آتا ہے کہ ان کے پاس جنّ تھے یا کسی اور نبی کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ اس کے پاس جنّ آئے۔ اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں سورۃ احقاف میں یہ آیات نظر آتی ہیں۔

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَ لَّوْا اِلٰى

قَوۡمِهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ۔ قَالُوۡا يٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا كِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ يَهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ وَاِلٰى طَرِيۡقٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ۔ يٰقَوۡمَنَاۤ اَجِيۡبُوۡا دَاعِىَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوۡا بِهٖ يَغۡفِرۡ لَـكُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُجِرۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ۔ (الاحقاف: ۳۰ تا ۳۲) فرماتا ہے اس وقت کو بھی یاد کرو جبکہ ہم جنوں میں سے کچھ لوگوں کو تیری طرف لائے جو قرآن سننے کی خواہش رکھتے تھے۔ جب وہ تیری مجلس میں پہنچے تو کہنے لگے۔ چپ کرو۔ تا کہ اس کی آواز ہمارے کانوں میں اچھی طرح پڑے۔ جب قرآن کریم کی تلاوت ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے اور کہنے لگے۔ اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب کی تلاوت سنی ہے۔ جو موسیٰؑ کے بعد اتاری گئی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے اتری ہیں ان سب کی تصدیق کرتی ہے اور حق کی طرف بلاتی اور سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ اے قوم۔ اللہ تعالیٰ کے منادی کی آواز کو سنو اور اسے قبول کرو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائے گا۔

پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنّ تورات پر۔ حضرت موسیٰؑ پر اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے تھے۔ پس سلیمانؑ ہی ایک ایسے نبی نہیں جن پر جنّ ایمان لائے۔ بلکہ موسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے کہ جنّات ان پر ایمان لائے۔ مگر افسوس ہے کہ مفسرین حضرت سلیمانؑ کے جنوں کے متعلق تو عجیب عجیب قصے سناتے ہیں۔ کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام قالین پر بیٹھ جاتے اور چار جنّوں کو چار گوشے پکڑوا دیتے اور وہ انہیں اُڑا کر آسمانوں کی سیر کراتے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو جنّ ایمان لائے ان کے متعلق کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کرتے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبھی ایسی مدد کی ہو حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر سفر کرتے تھے۔ آپ کے صحابہؓ کو کئی دفعہ سواریاں نہ ملتیں اور وہ روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کہتے کہ ہمارے لئے کسی سواری کا انتظام فرما دیجئے تو ہم جانے کے لئے حاضر ہیں۔ کئی دفعہ صحابہؓ نے ننگے پیر لمبے لمبے سفر کئے ہیں۔ مگر یہ تمام دکھ اور تکلیفیں دیکھنے کے باوجود ان سنگدل جنّوں کا دل نہ پسیجا وہ حضرت سلیمانؑ کے وقت تو لشکر کا لشکر اٹھا کر دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے اور یہاں ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ دس بیس مہاجرین کو ہی اٹھا کر میدان جنگ میں پہنچا دیتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنّ غیر از انسان وجود ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام پر ایمان لائے (در منثور)۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان معنوں کو قرآن کریم تسلیم کرتا ہے۔ اگر یہ ایک استعارہ ہے تو یقیناً قرآن کریم نے اس کو اپنی کسی دوسری آیت میں حل کیا ہوگا۔ اور استعارہ تسلیم نہ کرنے کی

صورت میں قرآن کریم کی دو آیتیں باہم ٹکرا جائیں گی اور اس طرح قرآن کریم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس کو استعارہ تسلیم نہ کرنے سے قرآن کریم میں اختلاف پیدا ہوتا ہے یا استعارہ تسلیم کر کے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

استعارہ کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو لوگ اسے استعارہ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے شیطان کا لفظ آتا ہے۔ جس طرح شیطان سے مراد ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے علیحدہ ہے۔ اسی طرح جنّ بھی ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے الگ ہے حالانکہ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ میں مفسرین بالاتفاق کہتے ہیں کہ اس جگہ شیاطین سے مراد یہود اور ان کے بڑے بڑے سردار ہیں۔ پس اگر انسان شیطان بن سکتا ہے تو انسان جنّ کیوں نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام: ۱۱۳) کہ ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں شیطان آدمیوں میں سے بھی اور جنّوں میں سے بھی جو لوگوں کو مخالفت پر اکساتے اور انہیں نبی اور اس کی جماعت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ انسان بھی شیطان ہوتے ہیں۔ پس اگر شیاطین الانس ہو سکتے ہیں تو جن الانس کیوں نہیں ہو سکتے۔ یعنی جس طرح انسانوں میں سے شیطان کہلانے والے پیدا ہو سکتے ہیں اسی طرح ان میں جنّ کہلانے والے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم سے ہمیں پتہ لگ گیا کہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہی جنّ نہیں تھے بلکہ حضرت موسیٰ ؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جنّ ایمان لائے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کن کی طرف ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں اس کے متعلق فرماتا ہے وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (النساء: ۸۰) ہم نے تجھے تمام آدمیوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس آیت میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام آدمیوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا حالانکہ اگر آدمیوں کے علاوہ کوئی اور نرالی مخلوق جسے جنّ کہتے ہیں آپ پر ایمان لائی تھی تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ وَالْجِنِّ رَسُوْلًا مگر وہ یہ نہیں فرماتا بلکہ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھے آدمیوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا۔ تو جب آدمیوں کی طرف ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے تھے تو صاف پتہ لگ گیا کہ جہاں یہ ذکر ہے کہ جنّ آپ پر ایمان لائے وہاں ان سے جنّ الانس ہی مراد ہیں نہ کہ کوئی اور نرالی مخلوق جس کا نقشہ عام لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں جس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ ایسی خصوصیتیں عطا کی گئی ہیں جو پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں ۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً کہ پہلے ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری کتاب الصلوۃ باب قول النبی جعلت لی الارض مسجدا و طھورا) مگر میں روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف بھیجا گیا ہوں ۔ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور پر بیان فرماتے ہیں کہ انبیائے سابقین میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں جو اپنی قوم کے سوا کسی اور قوم کی طرف مبعوث ہوا ہو۔لیکن مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنّوں اور طیور اور چیونٹیوں کی طرف بھی بھیجے گئے تھے۔ اگر واقعہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام جنّوں اور طیور کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نعوذ باللہ درجہ میں بڑھ گئے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

پھر اگر یہ جنّ غیر از انسان ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب کیونکر ہو گئے ۔اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (الانعام:۱۲۹) یعنی جب قیامت کے دن سب لوگ جمع ہوں گے تو ہم جنّوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہیں گے اے جنّوں کے گروہ! تم نے اکثر حصہء انسان کو اپنے قابو میں کیا ہوا تھا ہم تو جنّوں کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ جنّوں نے اکثروں کو قابو کیا ہوا ہے۔حالانکہ ہم تلاش کرتے ہیں تو وہ ملتے نہیں۔لوگ وظیفے پڑھتے ہیں چلّہ کشیاں کرتے ہیں اور جب ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور خشکی سے کان بجنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں جنّ آ گیا۔ حالانکہ اس وقت جنّ نہیں آتا بلکہ اس وقت وہ خود دنیا سے کھوئے جاتے اور پاگل ہو جاتے ہیں۔تر و تازہ دماغ کے ہوتے ہوئے جنّ کبھی انسان کے پاس نہیں آتے۔

غرض جنّوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ تم نے انسانوں سے بہت سے فائدے اٹھائے ہیں ۔اور وہ جو انسان ہیں وہ بھی کہیں گے کہ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ ہم میں سے بعض نے بعض سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔اب اپنے اپنے محلہ اور گاؤں میں پھر کر لوگوں سے دریافت کرلو کہ کیا پچاس یا اکاون فیصدی لوگ جنّوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں؟ سو میں سے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ میں جنّوں سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور میرے ان سے تعلقات ہیں ۔جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جنّ سے مراد انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہی بعض جنّ مراد ہیں ۔اور انسانی جنّوں کی دوستیاں بڑی کثرت سے نظر آتی ہیں۔

پھر اس سے بڑھ کر ایک اَور دلیل ہے ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ

مِّنْكُمْ (الفتح:۹،۱۰)۔اے جنّوں اور انسانوں کے گروہ جو ہمارے سامنے کھڑے ہو۔بتاؤ کیا تمہارے پاس ایسے رسول نہیں آئے جو تمہیں میں سے تھے۔اب بتاؤ جب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض جنّ بھی ایمان لائے اور دوسری طرف یہ فرماتا ہے کہ ہمارا رسول بھی انہیں میں سے تھا تو کیا اس سے صاف ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جنّ بھی انسان ہی تھے کوئی غیر از انسان وجود نہیں تھے۔پھر یہیں تک بات ختم نہیں کی بلکہ فرمایا وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا۔ وہ تمہیں انذار بھی کرتے تھے اور قیامت کے دن سے ڈراتے تھے۔گویا حضرت موسیٰؑ ،حضرت سلیمانؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کو ڈرایا بھی کرتے تھے۔اور انہیں یوم آخرت اور اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا کرتے تھے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنّ جنّ الانس ہی تھے کوئی اَور مخلوق نہیں تھے۔جس طرح شیاطین الانس ہوتے ہیں اسی طرح جن الانس بھی ہوتے ہیں۔

اب ایک اور موٹی مثال سنو۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا۔ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ (الفتح:۹،۱۰) کہ ہم نے اس رسول کو اس لئے بھیجا ہے تا کہ تم ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔اب جبکہ جنّ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے تو کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ ان جنّوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبھی مدد کی ہو۔ایک معمولی ملّا کے لئے تو وہ انگوروں کے خوشے لاسکتے ہیں۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ لائے اور آپ کو بسا اوقات فاقے کرنے پڑے ایک دفعہ آپ کے چہرہ پر ضعف کے آثار دیکھ کر صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے۔چنانچہ ایک صحابیؓ نے بکری ذبح کی اور آپ کو اور بعض اَور صحابہؓ کو کھانا کھلایا۔مگر ایسے مواقع میں سے ایک موقع پر بھی تو جنوں نے مدد نہیں کی۔میں سمجھتا ہوں وہ بڑے ہی بے شرم جنّ تھے کہ وہ آجکل کے ملنٹوں کو تو سیب اور انگور لا کر کھلاتے ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن پر وہ ایمان لائے تھے انہوں نے کبھی ایک جَو کی روٹی بھی نہ دی۔پھر وہ مومن کس طرح ہو گئے۔وہ تو پکے کافر تھے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ہی بالکل غلط ہے کہ جنّ کوئی ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے نرالی ہے۔وہ جنّ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ بھی انسان ہی تھے اور جس طرح اَور لوگوں نے آپ کی مدد کی وہ بھی مدد کرتے رہے۔اگر کوئی نرالی مخلوق مانی جائے تو پھر اس سوال کا حل کرنا ان لوگوں کے ذمہ ہوگا جو جنّات کے قائل ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مدد نہ کی۔حالانکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں۔

پھر اس سے بڑھ کر ایک اَور دلیل ہے اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں بطور قاعدہ کلیّہ کے فرماتا ہے۔اِنَّا عَرَضْنَا

الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔(الاحزاب: ۷۳) کہ ہم نے اپنی شریعت اور کلام کو آسمانوں کی مخلوق کے سامنے پیش کیا اور کہا کوئی ہے جو اسے مانے اور اس پر عمل کرے۔اس پر تمام آسمانی مخلوق نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم یہ بارِ امانت اٹھانے کے ہرگز قابل نہیں۔پھر ہم نے زمینوں کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا اور کہا۔لو یہ بوجھ اٹھاتے ہو۔انہوں نے کہا۔ہرگز نہیں۔ پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے بھی انکار کیا حالانکہ لوگ عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ جنّ پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا سارے ڈر گئے اور کسی نے بھی اس ذمہ واری کو اٹھانے کی جرأت نہ کی وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ صرف ایک انسان آگے بڑھا اور اس نے کہا۔مجھے شریعت دیجیئے۔میں اس پر عمل کر کے دکھاؤں گا۔فرماتا ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔انسان نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا۔کیونکہ وہ ہمارے عشق میں سرشار تھا۔اس نے یہ نہیں دیکھا کہ بوجھ کتنا بڑا ہے۔بلکہ شوق سے اسے اٹھانے کے لئے آگے نکل آیا۔اب دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ شریعت کو اٹھانے والا صرف انسان ہے۔اور کوئی شریعت کا مکلّف نہیں۔اب جبکہ انسان کو ہی خدا نے شریعت دی تو سوال یہ ہے کہ اگر جنّ غیر از انسان ہیں تو وہ کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا کیوں اظہار کیا۔اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ غیر از انسان تھے تو خدا تعالیٰ کا کلام باطل ٹھیرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ انسان کے سوا سب مخلوق نے اس شریعت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اور جبکہ قرآن سے بھی ثابت ہے کہ جنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو صاف معلوم ہو گیا کہ یہ جنّ انسان ہی تھے غیر از انسان نہیں تھے۔یہاں بھی جنّ سے مراد جنّ الانس ہی ہیں۔ایسی مخلوق مراد نہیں جو انسانوں کے علاوہ ہو۔اور نہ میں ایسے جنّوں کا قائل ہوں جو انسانوں سے آکر چمٹ جاتے ہیں۔مجھے یاد ہے ایک دوست نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں لکھا کہ میری ہمشیرہ کے پاس جنّ آتے ہیں اور وہ آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے انہیں خط لکھا کہ آپ ان جنّوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ ایک عورت کو کیوں ستاتے ہو۔اگر ستانا ہی ہے تو مولوی محمد حسین بٹالوی یا مولوی ثناء اللہ کو جا کر ستائیں۔ایک غریب عورت کو تنگ کرنے سے کیا فائدہ؟ تو ایسے جنّ کوئی نہیں ہوتے جن کو عام لوگ مانتے ہیں۔بیشک کئی ایسے لوگ بھی ہوں گے جو انگریزی تعلیم کے ماتحت پہلے ہی اس امر کے قائل ہوں۔لیکن مومن کے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہوتا کہ اس کی عقل کیا کہتی ہے بلکہ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔اگر قرآن کہتا ہو کہ جنّ ہوتے ہیں تو ہم کہیں گے آمنّا و صدّقنا۔اور اگر قرآن سے ثابت ہو کہ انسانوں کے علاوہ جنّ کوئی مخلوق نہیں تو پھر ہمیں یہی بات ماننی

پڑے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگ بڑے متکبر اور سرکش ہوتے ہیں جو کسی دوسرے کی اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مگر جب انبیاء کے سامنے آتے ہیں تو یکدم ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہی دیکھ لو۔ ابتداء میں وہ اسلام کی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ایک دفعہ تو انہیں یہاں تک جوش آیا کہ تلوار سونت لی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ کے رعب کی وجہ سے کانپنے لگ گئے (سیرۃ الحلبیۃ جلد ۲ باب ھجرۃ الاولی الی الارض الحبشۃ)۔ تو بعض طبائع ناری ہوتی ہیں۔ مگر جب نبیوں کے سامنے جاتی ہیں تو ٹھنڈی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی طبائع رکھنے والے انسانوں کو عربی زبان میں جنّ کہتے ہیں۔ اسی طرح جنّوں سے وہ لوگ بھی مراد ہوتے ہیں جو محلّات میں رہتے ہیں اور ان کے دروازہ پر آسانی سے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے جِنُّ النَّاسِ: مُعْظَمُهُمْ (اقرب) یعنی جنّ کا لفظ انسانوں میں سے بڑے آدمیوں کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ ان کی حفاظت کے لئے بڑے بڑے مضبوط پہرے دار مقرر ہوتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے ان تک نہیں پہنچ سکتا۔

پرانے زمانہ میں تمام بڑے بڑے بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ خاص خاص مقاموں پر لڑنے کے لئے اور اپنے باڈی گارڈز کے طور پر اعلیٰ قبیلوں کے آدمیوں کو بھرتی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جرمن کے بادشاہ وَل ہیلم نے بھی ایسا دستہ بھرتی کیا ہوا تھا۔ اور نپولین نے بھی ایسا دستہ بھرتی کیا ہوا تھا اور ہندوستان کے بادشاہ اکبر نے بھی باہرہ کے سیدوں میں سے ایسا دستہ بھرتی کیا ہوا تھا۔ چنانچہ جب اکبر نے چتوڑ کے قلعہ پر حملہ کیا اور وہ قلعہ جلد فتح نہ ہو سکا تو اکبر نے ان رجمنٹوں کو جو باہرہ کے سیدوں میں سے بھرتی ہوئی تھیں حکم دیا کہ وہ چتوڑ پر حملہ کریں اور وہ اس وقت تک کٹ کٹ کر مرتے چلے گئے جب تک کہ چتوڑ کے قلعہ کی دیواروں میں رخنہ پیدا نہ ہو گیا۔ چنگیز خاں نے بھی ایک خاص قبیلہ میں سے اپنی حفاظت کا دستہ بھرتی کیا تھا (تاتاریوں کی یلغار صفحہ ۲۰۶،۲۰۷ء)۔ جس کو بڑی عزت دی جاتی تھی۔ اور اس دستہ کے افسروں کو بادشاہ کے دربار میں خاص مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ نپولین کے محافظ دستہ کا ایک عجیب واقعہ مشہور ہے۔ کہ جب واٹرلُو کے میدان میں نپولین کی فوج کو شکست ہوئی تو اس کا محافظ دستہ میدان سے نہیں ہلا۔ لارڈ ولنگٹن کی فوج گولے پر گولے برسا رہی تھی اور وہ مرتے چلے جاتے تھے لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑتے تھے اس وقت نپولین کی فوج کا ایک جرنیل جو ایک خاص کام پر بھیجا گیا تھا واپس آیا اور اس نے جنرل نے کو جو اس خاص دستہ کا افسر تھا جا کر کہا کہ ہمارا گولہ بارود ختم ہو چکا ہے اور دشمن بڑھتا چلا آ رہا ہے تم یہاں کیوں

کھڑے ہو۔ پیچھے ہٹو تا کہ کسی طرح بادشاہ کی جان بچائی جا سکے اور پھر جمع ہو کر دشمن پر حملہ کریں اس پر جرنل نےؔ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور نہایت سادگی سے کہا۔ ’’مگر میں کیا کروں مجھے نپولین نے پیچھے ہٹنا نہیں سکھایا‘‘۔

اس جگہ پر جو جنّ کا لفظ بولا گیا ہے وہ ایسے ہی خاص دستوں کے لئے بولا گیا ہے۔ کیونکہ ان دستوں میں معزز خاندانوں کے افراد بھرتی کئے جاتے تھے جو گھروں میں اور پہروں کے پیچھے رہنے کے عادی ہوتے تھے اور جنّ کہلانے کے مستحق تھے جس کے معنے پوشیدہ وجود کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو عام طور پر نظر نہیں آتے اور پوشیدہ رہتے تھے۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے کہ جنّ کے معنے ہر ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو حواس سے چھپی ہوئی ہو (اقرب) یعنی جن کی آوازیں سنائی نہ دیں۔ اور آنکھوں کو نظر نہ آئیں۔ گویا دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے لوگ یا دوسرے لفظوں میں امراء جیسا کہ لغت نے واضح معنے اس کے امراء بھی کر دیئے ہیں۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تین قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا (۱) امراء کا خاص حفاظتی دستہ۔ (۲) عوام الناس کی فوج۔ (۳) روحانی لوگوں کا دستہ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کو الگ الگ کھڑا کیا کرتے تھے۔ جس طرح تیمور بھی اپنی فوج کے مختلف لوگوں کو الگ کھڑا کیا کرتا تھا۔ مگر وہ روحانی لوگوں یا مولویوں کو فوج کے پیچھے کھڑا کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ جنگ میں سب سے پہلے بھاگیں گے۔ اس لئے ان کو پیچھے کھڑا کرنا چاہیے۔ مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بھی علماء کا یہی حال تھا ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں علماء کا یہ حال نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ صحابہؓ میں سب سے زیادہ بہادر اور دلیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور پھر انہوں نے کہا کہ جنگ بدر میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک علیحدہ چبوترہ بنایا گیا تو اس وقت سوال پیدا ہوا کہ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا کام کس کے سپرد کیا جائے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ننگی تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اس انتہائی خطرہ کے موقعہ پر نہایت دلیری کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کا فرض سرانجام دیا (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ابو بکر صدیق فصل فی شجاعتہ) اسی طرح احادیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ (الجامع الصغیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۱ حدیث نمبر ۲۷۰۵) یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء میں سے قرار دیا ہے مگر خیبر کی جنگ میں سب سے نازک وقت میں اسلام کا جھنڈا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کے ہاتھ میں دیا تھا (ترمذی ابواب المناقب باب مناقب علیؓ)۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت علماء بزدل نہیں تھے بلکہ سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ہاں

شاعر کمزور ہوتے تھے چنانچہ حسان بن ثابتؓ کے متعلق آتا ہے کہ ان کا دل بہت کمزور تھا۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا

یہاں تک کہ جب وہ وادی نملہ میں پہنچے تو نملہ قوم میں سے ایک شخص نے کہا اے نملہ قوم!

النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ

اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر (تمہارے حالات کو)

جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنۡ قَوۡلِہَا

نہ جانتے ہوئے تمہیں پیروں کے نیچے مسل دیں۔ پس وہ (یعنی سلیمانؑ) اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ

اور کہا ۔ اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تیری نعمت کا جو تُو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہے

وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىہُ وَ اَدۡخِلۡنِیۡ

شکریہ ادا کر سکوں۔ اور ایسا مناسب عمل کروں جسے تو پسند فرمائے۔ اور اے خدا اپنے رحم کے ساتھ تُو

بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۰﴾

مجھے اپنے بزرگ بندوں میں داخل کر۔

حلّ لُغات۔ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ حَطَمَ یَحۡطِمُ سے مضارع منفی کا صیغہ ہے اور حَطَمَہٗ کے معنے ہیں کَسَرَہٗ کسی چیز کو توڑ دیا (اقرب) پس لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ کے معنے ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو توڑ دیں۔

اَوۡزِعۡنِیۡ اَوۡزِعۡنِیۡ اَوۡزَعَ سے امر کا صیغہ ہے اور اَوۡزَعَ اللّٰہُ فُلَانًا کے معنے ہیں اَلۡھَمَہُ الشُّکۡرَ خدا نے اسے شکر کی توفیق دی۔ (مفردات) پس اَوۡزِعۡنِیۡ کے معنے ہوں گے مجھے شکر کی توفیق عطا کر۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنا لشکر لے کر روانہ ہوئے تو چلتے چلتے ان کا وادی النمل میں سے گذر ہوا (جس کے ایک معنے چیونٹیوں کی وادی کے بھی ہیں) اس لشکر جرار کو دیکھ کر ایک نملہ نے کہا۔

اے بھائیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ کا لشکر تمہیں بے خبری میں اپنے پاؤں تلے روند ڈالے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کا یہ قول سن کر ہنس پڑے اور انہوں نے کہا۔ اے میرے خدا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں اور میں ایسے نیک اور مناسب حال اعمال بجالاؤں جن سے تو راضی ہو جائے اور تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما۔

مفسرین نے جس طرح جنّوں اور پرندوں کے متعلق مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اسی طرح وادی النمل کے متعلق بھی بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ایک وادی تھی جس میں چیونٹیاں رہتی تھیں اور چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی جانتے تھے اس لئے جب چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ اس نے کیا کہا ہے۔ نہ معلوم ہمارے مفسرین نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ چونٹیاں بھی پرندوں کی ایک قسم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ ہم نے سلیمان کو منطق الطیر کا علم دیا تھا مگر ہمارے مفسرین نے ان کو چیونٹیوں کی بولی کا علم بھی بخش دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں لمبے عرصہ تک بارشیں نہ ہوئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ چلو شہر سے باہر نکل کر استسقاء کی نماز پڑھیں۔ جب آپ نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر اور آسمان کی طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہی ہے کہ خدایا ہم بھی تیری مخلوق ہیں ہمیں بارش سے محروم نہ رکھ۔ آپ نے یہ دعا سنتے ہی فرمایا کہ اب استسقاء کی نماز پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں واپس چلو۔ اس چیونٹی کی دعا ہی کافی ہے اور اسی کے نتیجہ میں بارش برس جائے گی۔

(تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد ۷ ص ۲۰۶)

پھر مفسرین نے اپنی تحقیق یہیں تک ہی نہیں رہنے دی بلکہ انہوں نے چیونٹیوں کے قبیلوں کا بھی پتہ لگایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسانوں میں مغل اور راجپوت اور پٹھان وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح چیونٹیوں میں بھی مختلف قومیں اور قبائل ہیں۔ چنانچہ یہ علم آپ لوگوں کے کام آئے گا کہ چیونٹیوں کے ایک قبیلہ کا نام انہوں نے بنوشیصان بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اسی قبیلہ کی ایک چیونٹی نے یہ بات کہی تھی اور پھر انہوں نے بڑی تحقیق کے بعد اس کے نام کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ گو افسوس ہے کہ کسی ایک نام پر ان کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ چنانچہ بعض نے اس کا نام منذرہ بعض نے طافیہ یا لافیہ اور بعض نے خرمی بتایا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ وہ چیونٹی ایک پاؤں سے لنگڑی تھی۔ اسی طرح مفسرین نے اس کا قد بھی بتایا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں وہ مرغ کے برابر تھی۔ بعض کہتے ہیں بھیڑ کے برابر تھی اور بعض کہتے ہیں وہ بھیڑیے کے برابر تھی۔ اسی طرح مفسرین نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس نملہ کے ساتھ

چالیس ہزار چیونٹیاں بطور نقیب اور ہر نقیب کے ساتھ چالیس چالیس ہزار چیونٹیاں بطور چوبدار رہا کرتی تھیں۔
(تفسیر ابن کثیر، وتفسیر حسینی)

حالانکہ پہلی بات جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس جگہ نملہ سے مراد چیونٹی نہیں یہ ہے کہ اوپر ذکر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر سکھائی تھی۔ مگر اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ اس نے کیا کہا ہے۔ حالانکہ جب دعویٰ یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی آتی تھی تو دلیل میں کسی پرندے کی مثال پیش کرنی چاہیے تھی۔ مگر مفسرین کہتے ہیں کہ چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو سمجھ آ گئی جو عُلِّمۡنَا مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ کا ثبوت ہے۔ حالانکہ چیونٹی پرندہ نہیں۔ پس نملہ سے مراد اگر چیونٹی لی جائے تو یہ دلیل بالکل عقل میں نہیں آ سکتی۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی آتی تھی۔ اور وہ اس کو سمجھتے تھے مگر بولنے لگ جاتی ہے نملہ۔ اور وہ اس بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ غرض پہلی بات جو اس ضمن میں قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ نملہ کیا چیز ہے؟

دوسری چیز یہ قابل غور ہے کہ یہاں حطم کا لفظ آتا ہے اور حَطَمَ کے معنے توڑنے اور غصہ سے حملہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ یہ کر دیتے ہیں کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں اپنے پیروں کے نیچے نہ کچل دیں۔ مگر یہ حَطَمَ کے درست معنے نہیں۔ عربی میں حَطَمَ کے معنے توڑ دینے اور غصہ میں حملہ کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کا ایک نام حُطَمَة بھی رکھا گیا ہے کیونکہ وہ جلا دیتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آگ کے پیر ہوں گے اور وہ لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل دے گی۔ پس لَا يَحۡطِمَنَّكُمۡ کے معنے یہ ہوئے کہ ایسا نہ ہو سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں توڑ دے یا غصہ سے حملہ کر دے اور تباہ کر دے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو اتنے بڑے نبی تھے جن کے پاس جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر در لشکر تھے کیا ان کا سارا غصہ چیونٹی پر نکلنا تھا اور کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ چیونٹیوں پر حملہ کرنے لگ جائیں گے۔ میں بتا چکا ہوں کہ لَا يَحۡطِمَنَّكُمۡ کے معنے پیروں میں مسل دینے کے نہیں بلکہ طاقت کو توڑ دینے اور حملہ آور ہونے کے ہیں۔ اسی لئے عربی زبان میں قحط کو حاطوم کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ملک کی طاقت ٹوٹ جاتی ہے۔ اگر یہ معنے کئے جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا چیونٹیوں نے ایک دوسری سے کہا کہ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر کلہاڑیاں اور کدالیں لے کر آ جائے اور ہماری بلوں کو کھود کھود کر غلّہ کے دانے نکال لے اور اس طرح ہماری طاقت کو توڑ دے۔ مگر کیا کوئی عقلمند ان معنوں کو درست تسلیم کر سکتا ہے؟

تیسری دلیل جو نہایت ہی بیّن اور واضح ہے وہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جتنے صیغے استعمال کئے ہیں سب وہ ہیں جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اُدْخُلُوْا کا لفظ آتا ہے۔ حالانکہ چیونٹیوں کے لحاظ سے اُدْخُلْنَ کا لفظ آنا چاہیے تھا اسی طرح لَا یَحْطِمَنَّکُمْ میں کُمْ کا لفظ آتا ہے۔ حالانکہ کُنَّ کا لفظ آنا چاہیے تھا۔ پس قرآن مجید کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ کوئی انسان تھے جن کے لئے کُمْ اور اُدْخُلُوْا وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ پھر وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ کہہ کر بھی اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ چیونٹیاں نہیں تھیں۔ کیونکہ لشکر تو الگ رہے چیونٹیاں تو نبیوں کے پاؤں کے نیچے بھی آ جاتی ہیں۔ پس اگر اس جگہ نملہ سے مراد چیونٹی لی جائے تو یہ کہنا کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر تم کو بے جانے اپنے پاؤں کے نیچے کچل نہ دے ایک بالکل بے معنے فقرہ بن جاتا ہے۔ کیا دنیا کی کسی بھی مذہبی کتاب میں لکھا ہے۔ خواہ اسلامی ہو یا قبل از اسلام کی کوئی اور کتاب کہ کوئی نبی سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے چلتا تھا کہ کہیں کوئی چیونٹی اس کے پیروں کے نیچے نہ آ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ وادی النمل کوئی چیونٹیوں کی وادی نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی وادی تھی جس میں انسان بستے تھے۔ چنانچہ تاج العروس جو لغت کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ شام کے ملک میں جبرین اور عسقلان کے درمیان ایک علاقہ ہے جسے وادی النمل کہا جاتا ہے اور عسقلان کے متعلق تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ ساحل سمندر کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک شہر ہے جو غزہ سے جو سینا کے ملحق فلسطین کی ایک بندرگاہ ہے بارہ میل اوپر شمال کی طرف واقع ہے۔ اور جبرین شمال کی طرف کا ایک شہر ہے جو ولایت دمشق میں واقع ہے۔ (تقویم البلدان ص ۲۳۸ و معجم البلدان لیاقوت الحموی باب الباء و الیاء و ما یلیہ)

پس وادی النمل ساحل سمندر پر یروشلم کے مقابل پر یا اس کے قریب دمشق سے حجاز کی طرف آتے ہوئے ایک وادی ہے جو اندازاً دمشق سے سو میل نیچے کی طرف تھی ان علاقوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت تک عرب اور مدین کے بہت سے قبائل بستے تھے (مقام کی وضاحت کے لئے دیکھو نقشۂ فلسطین و شام بعہد قدیم و عہد جدید نیلسنز انسائیکلوپیڈیا (Nelson's Encyclopaedia جلد ۱۷ ازیر لفظ Palestine)

اب رہ گیا نملہ سو قاموس میں البرق کے ماتحت لکھا ہے۔ وَالْأَبْرَقَةُ مِنْ مِیَاهِ النَّمْلَةِ (قاموس المحیط) کہ نملہ قوم کے چشموں میں سے ایک چشمہ کا نام ابرقہ تھا۔ غرض لغت اور جغرافیہ کی مدد سے ہمیں نملہ قوم بھی مل گئی اور وادی النمل کا بھی پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ علاقہ شام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاقہ کے نزدیک تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے نام پرانے زمانہ میں بڑے مقبول تھے چنانچہ جنوبی امریکہ میں

بعض قوموں کے نام بھیڑیا، سانپ، بچھو اور کنکھجو را وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے ملک میں ہی ایک قوم کا نام کاڈھا ہے۔ نورالدین کاڈھا لاہور کے ایک مشہور شخص ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک قوم کا نام کیڑے ہے۔ ایک کا نام مکوڑے ہے۔ کشمیر میں ایک قوم کا نام ہاپت ہے جس کے معنے ریچھ کے ہیں (تاریخ اقوام کشمیر صفحہ ۳۰۰)۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام جب ملکہ سبا پر حملہ کرنے کے لئے اپنے ملک سے یمن کی طرف چلے تو ان کا گذر نملہ قوم کی وادی میں سے ہوا۔ جس کو غلطی سے مفسروں نے چیونٹیوں کی وادی بنالیا ہے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو نملہ قوم کی ملکہ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ اے نملہ قوم کے لوگو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ یہ خیال کر کے کہ تم سلیمانؑ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں پاؤں کے نیچے روند ڈالیں۔ ان الفاظ نے مفسرین کو اور بھی جرأت دلائی اور انہوں نے یقینی طور پر اسے ایک چیونٹی کا کلام قرار دے دیا۔ حالانکہ جب کوئی حملہ آور کسی مقابل قوم کو سختی سے شکست دیتا ہے تو اس کے لئے محاورہ میں روند ڈالنے کے الفاظ ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ پس اول تو محاورہ کے لحاظ سے یہ لفظ بالکل واضح تھا لیکن اگر وہ لغت کو دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ حَطَمَ کے معنے توڑ ڈالنے کے بھی ہیں (اقرب) اور مراد یہ ہے کہ اس نملہ قوم کی ملکہ نے کہا کہ سلیمانؑ تم کو توڑ نہ ڈالے یعنی تمہاری قوت اور شوکت کو کچل نہ دے۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنۡ قَوۡلِهَا۔ اس پر سلیمانؑ اس نملہ کی بات سن کر ہنس پڑے۔

یہاں مفسروں نے یہ عجیب بات نکالی ہے کہ سلیمانؑ جسے خدا نے پرندوں کی بولی سکھائی تھی اور مفسروں نے چیونٹیوں کی۔ اس نے چیونٹیوں کے سردار کی بات فوراً سمجھ لی اور ہنس پڑا کہ دیکھو چیونٹیاں بھی مجھے کتنا انصاف پسند سمجھتی ہیں کہ بے سوچے سمجھے تو میرا پیر چیونٹی پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن میں جان بوجھ کر کسی چیونٹی پر بھی پیر نہیں رکھوں گا۔ حالانکہ کوئی شریف آدمی بھی خواہ وہ غیر نبی ہو جان بوجھ کر چیونٹیوں کے اوپر پیر نہیں رکھا کرتا۔ ہم نے تو کئی شریف آدمیوں کو دیکھا ہے کہ برسات کے موسم میں جب کیڑے زمین میں سے نکل آتے ہیں تو وہ بچ بچ کر چلتے ہیں کہ کہیں زیادہ کیڑے ان کے پیر کے نیچے آ کر نہ مارے جائیں۔ پس یہ بات تو غلط ہے۔ اصل بات صرف اتنی تھی کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ نملہ قوم کی ملکہ نے اپنی قوم کو کہہ دیا ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ جاؤ۔ اور مخالف مظاہرہ نہ کرو۔ تا کہ اس مظاہرہ سے بھڑک کر حضرت سلیمانؑ کا لشکر ان پر حملہ نہ کر دے۔ اور ان کو پتہ بھی نہ لگے کہ سردارِ قوم نے اپنی قوم کو عجز و انکسار کا حکم دیا ہے۔ تو آپ ہنس پڑے کہ خدا تعالیٰ نے کس طرح دور دراز کے ملکوں تک بھی یہ بات پھیلا دی ہے کہ سلیمانؑ ظالم نہیں اور وہ ادنیٰ اقوام کے ساتھ بھی انصاف کا سلوک کرتا ہے۔

نملہ قوم کی ملکہ کا یہ اعلان کرنا کہ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ اور دروازے بند کرلو۔ دراصل اس جنگی دستور کے مطابق تھا کہ جب کوئی لشکر کہیں سے گذرے اور وہاں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جائیں اور دروازے بند کرلیں تو اس کے معنے یہ ہوتے تھے کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کرادیا تھا کہ جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جائیں گے اور دروازے بند کرلیں گے۔ تو ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ یہی نملہ نے کہا۔ کہ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ اور دروازے بند کرلو۔ حضرت سلیمانؑ سمجھ جائیں گے کہ یہ میرا مقابلہ کرنا چاہتے۔ اگر ہم باہر رہیں گے تو ممکن ہے وہ حملہ کردیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب نملہ قوم کی ملکہ کا یہ اعلان پہنچا۔ تو وہ ہنسے اور انہوں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میری نیکی اور تقوٰی کی کتنی دور دور خبر پہنچی ہوئی ہے۔ یہ قوم بھی جو اتنی دور رہتی ہے سمجھتی ہے کہ سلیمانؑ ظالمانہ طور پر حملے نہیں کیا کرتا۔ اگر ہم اپنے دروازے بند کرلیں گے تو یہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا حالانکہ اس زمانہ کے جنگی دستور کے مطابق جو فاتح قوم ہوتی تھی وہ ملک کو لوٹ لیا کرتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے مخاطب ہوکر کہا کہ اے اللہ! یہ نیک شہرت تیرے فضل سے ہوئی ہے۔ پس تو مجھے توفیق دے کہ میں تیرے اس انعام کا شکریہ ادا کروں جو تُو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر نازل کیا ہے اور ہمیشہ ایسے کام کروں جن سے تو راضی ہو۔ یعنی جس طرح اب ایک نملہ نے تسلیم کیا ہے کہ سلیمانؑ اور اس کے ساتھی جانتے بوجھتے ہوئے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگر ان لوگوں کے ہاتھوں سے کوئی نقصان پہنچا تو وہ محض غفلت کا نتیجہ ہوگا۔ ورنہ ارادتاً وہ کوئی ظلم اور تعدّی نہیں کرسکتے۔ اسی طرح تو مجھے اور میرے لشکریوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ ہمیشہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق سے آراستہ رہیں اور ہمیشہ لوگ یہ تسلیم کرتے رہیں کہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے دیدہ ودانستہ کوئی ظلم سرزد نہیں ہوسکتا۔ اور تُو اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما دے۔

وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ

اور اس نے سب پرندوں کی حاضری لی۔ پھر کہا۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ کہ میں ھدھد کو نہیں دیکھتا۔ یا وہ (جان بوجھ

مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۱﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ

کر) غیر حاضر ہے۔ میں اس کو یقیناً سخت سزا دوں گا۔ یا اسے قتل کردوں گا۔ یا وہ میرے سامنے کوئی کھلی دلیل

لَاَاذۡبَحَنَّہٗۤ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۲﴾

(اپنی غیر حاضری کی) پیش کرے گا۔

تفسیر ۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے سارے لشکر کا جائزہ لیا اور امراءِ لشکر کو اپنے سامنے حاضری کا حکم دیا تو اس وقت علماء میں سے ایک سردار کو جس کا نام ہدہد تھا انہوں نے غائب پایا اس نہایت ہی نازک موقعہ پر جبکہ آپ ایک ملک پر حملہ کرنے کے لئے جارہے تھے اپنے لشکر کے ایک سردار کو غائب دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کا غصہ بھڑک اٹھا اور ان کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ مبادا اس میں کوئی سازش کام کر رہی ہو۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ کیا ہدہد پر میری نظر نہیں پڑی یا وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ اب میں اسے یا تو کوئی شدید ترین سزا دوں گا یا اسے قتل کر دوں گا اور یا پھر اسے میرے سامنے کوئی واضح ثبوت پیش کرنا پڑے گا کہ وہ کیوں غائب رہا۔

مفسرین خیال کرتے ہیں کہ سچ مچ کے پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں شامل تھے اور لشکر کا ایک سردار ہدہد پرندہ تھا۔ جس کو چھوٹے اور بچے بھی غلیلوں سے مار لیتے ہیں۔ اس زبردست لشکر کو لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام یمن کا ملک فتح کرنے کے لئے نکلے تھے (معالم التنزیل و طبری)۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ قصہ ہدہد کو سردار ثابت نہیں کرتا بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نعوذ باللہ بیوقوف ثابت کرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے نبی بیوقوف نہیں ہوا کرتے۔ یمن کا ملک فتح کرنے کے لئے کبوتر۔ فاختہ۔ چڑیاں۔ ہدہد۔ بٹیر اور تلئیر لے کر نکلنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا۔ ایسے لشکروں کو فتح کرنے کے لئے بادشاہ کی فوجوں کو نکلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے لشکروں کے آنے کی خبر سن کر تو سارے شہر کی گلیوں میں سے بچے اپنی غلیلیں لے کر نکل پڑیں گے اور سارے شہر کے لئے عید کا دن آجائے گا اور خوب پرندوں کا گوشت کھایا جائے گا۔ آخر یہ جنگ ہونے لگی تھی یا چڑی ماروں کا مظاہرہ ہوا تھا۔

تفسیروں کے ان قصوں کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ تیمور جو کچھ کرتا تھا ٹھیک ہی کرتا تھا۔ کیونکہ جو علماء جنگ کو ایسی حقیر کھیل سمجھتے تھے ان کو لشکر کے پیچھے ہی رکھنا مناسب تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ جن کے متعلق ابھی یہ کہا گیا ہے کہ وہ ایک چیونٹی کو بھی جانتے ہوئے اپنے پیروں کے نیچے نہیں کچلتے تھے۔ اب اتنے غصے میں آگئے کہ ہدہد جیسے جانور کے متعلق جو ایک پِدّی کے برابر ہوتا ہے اور کوئی عقل نہیں رکھتا فرماتے ہیں کہ یا تو وہ کوئی زبردست

دلیل لائے ورنہ میں اس کو ذبح کر ڈالوں گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ پرندوں سے وہ امید رکھنی جو بلند عقلی کے مالک انسانوں سے رکھی جاتی ہے ایک نبی کا کام نہیں ہوسکتا۔ نہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایسا کرتے تھے۔ آخر قرآن ہمارے سامنے ہے کیا قرآن سے یہی پتہ لگتا ہے کہ پرندے ایسی عقل کے مالک ہیں۔ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو تو آدمی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اسے کہے وجہ بیان کرو ورنہ ابھی تمہارا سر کاٹ دوں گا۔ یا کبھی تم نے دیکھا کہ تمہارا کوئی ہمسایہ ہدہد پکڑ کر اسے سوٹیاں مار رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میرے دانے تُو کیوں کھا گیا تھا اور اگر تم کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کیا تم اسے پاگل نہیں قرار دو گے۔ پھر وہ لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف یہ امر منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے ہدہد کے متعلق یہ کہا وہ اپنے عمل سے یہی فتویٰ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی لگاتے ہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میں اسے سخت ترین سزا دوں گا۔ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ۔ ورنہ وہ ایسی دلیل پیش کرے جو نہایت ہی واضح اور منطقی ہو۔ گویا وہ ہدہد سقراط بقراط اور افلاطون کی طرح دلائل بھی جانتا تھا۔ اور حضرت سلیمانؑ اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے دلائل پیش کرے گا۔

(۲) پھر قرآن تو یہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنّوں، انسانوں اور طیور کے لشکر تھے مگر حضرت سلیمانؑ کی نظر صرف ہدہد کی طرف جاتی ہے۔ اور فرماتے ہیں مَا لِیَ لَاۤ اَرَی الۡہُدۡہُدَ کیا ہوا کہ اس لشکر میں ہدہد کہیں نظر نہیں آتا۔ دنیوی حکومتوں میں تو جس کا قد پانچ فٹ سے کم ہو۔ وہ فوج میں بھرتی کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ عجیب بھرتی شروع کر دی تھی کہ ہدہد بھی ان کے لشکر میں شامل تھا۔ پھر ہدہد کی کوئی فوج آپ کے پاس ہوتی۔ تب بھی کوئی بات تھی۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ ہدہد صرف ایک آپ کے پاس تھا۔ اس ایک ہدہد نے بھلا کیا کام کرنا تھا۔ اور ایک جانور ساتھ لے جانے سے کیا مطلب تھا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے۔ کہ ہدہد نے یہ یہ کہا۔ اور معجزہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے حالانکہ اصولی طور پر یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بیان ہونا چاہیے تھا۔ مگر بیان ہدہد کا معجزہ ہوتا ہے جو سلیمان علیہ السلام کے معجزہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

(۴) ایک اَور بات یہ بھی ہے کہ ہدہد ان جانوروں میں سے نہیں جو تیز پرواز ہوں اور اس قدر دور کے سفر کرتے ہوں۔ یہ جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے۔ مگر قرآن یہ بتلاتا ہے کہ ہدہد دمشق سے اُڑا اور آٹھ سو میل اڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سبا کے ملک تک پہنچا اور وہاں سے خبر بھی لے آیا۔ گویا وہ ہدہد آجکل کے ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ تیز رفتار تھا۔ اور معجزہ دکھانے والا ہدہد تھا نہ کہ حضرت سلیمانؑ۔ حالانکہ بتانا یہ مقصود تھا کہ حضرت سلیمانؑ

نے معجزہ دکھایا۔

(۵) اسی ہدہد کا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ وہ شرک اور توحید کے باریک اسرار سے بھی واقف تھا۔ اور اس کو وہ وہ مسئلے معلوم تھے جو آجکل کے مولویوں کو بھی معلوم نہیں۔ کتنی اعلیٰ توحید وہ بیان کرتا ہے کہتا ہے۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ۔ یعنی میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بجائے سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور شیطان نے ان کے عمل انہیں خوبصورت کر کے دکھائے ہیں اور انہیں سچے راستہ پر چلنے سے روک دیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے۔ پھر اس کی غیرت دینی دیکھو آج کل کے مولویوں کے ہمسایہ میں بت پرستی ہو رہی ہو تو وہ اس کے روکنے کی کوشش نہیں کرتے مگر ہدہد چاروں طرف اُڑتا پھرتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو خبر دیتا ہے کہ فلاں جگہ شرک ہے۔ فلاں جگہ بت پرستی ہے۔

(۶) پھر وہ سیاسیات سے بھی واقف تھا۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ یعنی ملکہ سبا کے پاس بادشاہت کی تمام صفات موجود ہیں۔ گویا وہ اس کے تمام خزانے اور محکمے چیک کر کے آیا۔ اور اس نے رپورٹ کی کہ تمام وہ چیزیں جن کی حکومت کے لئے ضرورت ہے وہ اس کے پاس موجود ہیں۔

(۷) پھر شیطان اور اس کی کارروائیوں سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے میں جانتا ہوں انسان کا جب شیطان سے تعلق پیدا ہو جائے تو برے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ان خیالات کے نتائج سے بھی واقف تھا۔ کیونکہ کہتا ہے فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ایسے خیالات کے نتیجہ میں شیطان نے انہیں اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستہ سے دور پھینک دیا ہے۔

یہ ہدہد کیا ہوا۔ اچھا خاصہ عالم ٹھہرا۔ ایسا ہدہد اگر آج مل جائے تو سارے مولویوں کو نکال کر اسی کو مفتی بنا دینا چاہیے۔

(۸) ہاں ایک بات رہ گئی۔ اور وہ یہ کہ وہ تختِ سلطنت کی حقیقت سے بھی خوب واقف تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ملکہ سبا کے پاس ایک عظیم الشان تخت ہے جو آپ کے پاس نہیں۔ گویا وہ لالچ بھی دلاتا ہے اور کہتا ہے اس پر حملہ کیجئے۔

یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ یہ ہدہد کوئی پرندہ نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن میں صاف موجود ہے کہ وہ امانت جسے فرشتے بھی نہ اٹھا سکے۔ جسے آسمان اور زمین کی کوئی چیز اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اسے انسان نے اٹھا لیا۔ وہی ہے جو ہماری شریعت کے رموز کو جانتا ہے۔ فرشتہ ایک ہی بات سمجھتا ہے یعنی نیکی کی بات کو مگر انسان نیکی اور بدی

دونوں پہلوؤں کو جانتا اور تمام حالات پر مکمل نگاہ رکھتا ہے۔ مفسر کہتے ہیں کہ ہدہد کوئی جانور تھا۔ حالانکہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ والی آیت موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے سوا کوئی اَور مخلوق اسرار شریعت کی حامل نہیں۔ پس جبکہ ہدہد بھی اسرار شریعت سے واقف تھا تو لازماً وہ بھی انسان ہی تھا نہ کہ پرندہ۔

بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر یہ ہدہد آدمی ہی تھا تو اس کے لئے ذبح کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ عربی زبان میں ذبح کا لفظ قتل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (تاج العروس) جیسے قرآن کریم میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ہی آتا ہے کہ يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ (القصص:۵) وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ اگر ذبح کے لفظ سے ہدہد کو پرندہ قرار دینا درست ہوسکتا ہے تو کیا يُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ کے یہ معنے ہیں کہ وہ سب پرندے تھے جن کو ذبح کیا جاتا تھا۔

پھر بعض دفعہ جب کسی مناسبت کی بناء پر کوئی نام رکھا جاتا ہے تو حسنِ کلام کے لئے الفاظ بھی اسی رنگ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے کسی کو شیر قرار دیا جائے تو کہا جائے گا کہ وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ شیر کی طرح سریلی آواز سے گاتا ہے۔ اسی طرح جب ہدہد کا ذکر کیا گیا تو گو وہ ایک سردار تھا مگر ہدہد کی مناسبت سے اس کے لئے ذبح کا لفظ استعمال کر دیا گیا جو حسنِ کلام کا ایک لطیف نمونہ ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ہدہد نام کیوں رکھا گیا۔ اور گو اس کا عقلی جواب میں قرآن کریم سے ہی دے چکا ہوں۔ مگر اب بتاتا ہوں کہ ہدہد سے مراد کیا ہے۔ ہُدہُد کا پتہ لینے کے لئے جب ہم بنی اسرائیل کی کتابیں دیکھتے ہیں اور اس امر پر غور کرتے ہیں کہ کیا ان میں کسی ہدہد کا ذکر آتا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں میں کثرت سے هُدَدْ نام ہوا کرتا تھا۔ جو عبرانی سے عربی میں بدل کر ہدہد ہو گیا۔ جیسے عبرانی میں ابراہامؑ کہا جاتا ہے مگر جب یہ لفظ عربی میں آیا تو ابراہیمؑ بن گیا۔ اسی طرح عبرانی میں یسوع کہا جاتا ہے اور عربی میں عیسیٰؑ کہتے ہیں اسی طرح عبرانی میں موشے کہا جاتا ہے اور عربی میں یہی نام موسیٰ ہو گیا۔ اب بھی کسی اہل عرب کو لکھنؤ کہنا پڑے تو وہ لکھنؤ نہیں بلکہ لکھنّا ہوء کہے گا۔ اسی طرح عبرانی میں هُدَدْ کہا جاتا تھا مگر چونکہ قرآن کریم عربی میں ہے اس لئے جب یہ نام اس میں آیا تو ھُد ھُد ہو گیا۔

تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ هُدَدْ کئی ادومی بادشاہوں کا نام تھا۔ اور اس کے معنے بڑے شور کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں ھدّ کے ایک معنے اَلصَّوْتُ الْغَلِيْظُ۔ یعنی بڑی بلند آواز کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اونچی آواز والے لڑکے کا نام هُدَدْ یا هُدْهُدْ رکھ دیتے تھے مگر یہ نام تیسرے ادومی بادشاہ کا بھی تھا جس

نے مدین کو شکست دی تھی اور آخری بادشاہ کا نام بھی یہی تھا (Jewish Encyclopedia زیر لفظ Hadad)۔
حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک لڑکے کا نام بھی ہُدہُد تھا۔(پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۴)

بائیبل کی کتاب نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۴ میں بھی ادوم کے خاندان کے ایک شہزادہ کا ذکر آتا ہے جس کا نام ہددؔتھا اور جو یوآب کے قتل عام سے ڈر کر مصر بھاگ گیا تھا۔ جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ پُرانے عہد نامہ میں جب یہ لفظ اکیلا آوے تو اس کے ساتھ کوئی صفاتی فعل یا لفظ نہ ہو تو اس کے معنے ادومی خاندان کے آدمی کے ہوتے ہیں۔

غرض یہ ھُدْ ھُدْ عبرانی زبان کا لفظ ھُدَدْ ہے جو عربی زبان میں آکر ھُدْ ھُدْ ہو گیا۔ چونکہ مفسرین کو یہ شوق ہوتا ہے کہ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنائیں اس لئے وہ بعض دفعہ بے ہودہ قصے بھی اپنی تفسیروں میں درج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ضبّ عربی میں گوہ کو کہتے ہیں۔ مگر ضبّ عرب کے ایک قبیلے کے سردار کا بھی نام تھا۔ اور یہ ایسا ہی نام ہے جیسا ہندوؤں میں طوطارام نام ہوتا ہے وہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اب وعظ کی کتابوں میں اس بات کو ایک قصہ کا رنگ دیتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک سوراخ میں سے گوہ نکلی۔ اور اس نے قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اب جن لوگوں نے یہ بنا لیا کہ ایک گوہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا ان کے لئے ہُدہُد کا پرندہ بنا لینا کون سا مشکل کام تھا۔ چنانچہ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کے غائب ہونے کا اس طرح پتہ چلا کہ ایک دفعہ چلتے چلتے وہ ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں پانی نہیں ملتا تھا۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے وضو کرنا چاہا مگر انہیں پانی نہ ملا۔ انہوں نے کہا۔ ہدہد کہاں ہے اسے کہو کہ پانی تلاش کرے۔ کیونکہ پہلے بھی جب لشکر کو پانی کی ضرورت ہوتی تھی تو ہدہد ہی پانی کی جگہ بتایا کرتا تھا۔ مگر اس روز اسے ڈھونڈا تو وہ نہ ملا جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو غصہ آ گیا۔ اور انہوں نے کہا کہ ہدہد آیا تو میں اسے شدید سزا دوں گا یا اسے ذبح کر دوں گا (روح المعانی)۔ مگر بعض نے اس واقعہ سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر پرندوں کے جھنڈ ہمیشہ سایہ رکھتے تھے۔ ایک دن اچانک ایک سوراخ میں سے دھوپ آ گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ کو پتہ لگ گیا کہ ہدہد کی جگہ خالی ہے۔ (قرطبی)

غرض مفسرین نے عجیب وغریب حکایات اپنی تفسیروں میں لکھ دی ہیں حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ قرآن

کریم میں جو ہدہد کہا گیا ہے یہ ھُدَدَ کا معرب ہے اور اس سے مراد ادومی خاندان کا کوئی شہزادہ ہے جو آپ کے فوجی سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ یہ ادومی خاندان حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں بستا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خاندان کا رقیب تھا۔

اس قوم کے سردار کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہ پایا۔ تو سمجھا کہ یہ رقیب قبیلہ کا سردار ہے ممکن ہے کہ کسی شرارت کی نیت سے دشمن کے ملک میں چلا گیا ہو۔ اور اس پر ان کو غصہ آ گیا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ہدہد عرب قبیلہ کا کوئی سردار ہو۔ کیونکہ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام بھی ہدہد تھا۔ اور تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت تک اس رستہ میں جو فلسطین سے یمن کی طرف آتا ہے عرب قبیلے بستے تھے۔ (تقویم البلدان) اور چونکہ عربوں اور یہودیوں کی باہم سخت چپقلش تھی اور گو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت آ گئے تھے لیکن مخالفت اب تک باقی تھی۔ اس لئے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ عرب قوم کا ایک سردار غائب ہے تو ان کے دل میں شبہ پیدا ہوا اور وہ ناراض ہو گئے۔ اور یمن چونکہ عرب کا ایک حصہ ہے اس لئے یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ

پس کچھ دیر وہ ٹھہرا (اتنے میں ہدہد حاضر ہوا) اور اس نے کہا کہ میں نے اس چیز کا علم حاصل کیا ہے جو تجھے حاصل

جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً

نہیں اور میں سبا (کی قوم کے علاقہ) سے تیرے پاس (آیا ہوں) (اور) ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ (جو یہ ہے

تَمْلِكُهُمْ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّ لَهَا عَرْشٌ

کہ) میں نے (وہاں) ایک عورت کو دیکھا جو ان (کی ساری قوم) پر حکومت کر رہی ہے۔ اور ہر نعمت اسے

عَظِيْمٌ ﴿۲۴﴾ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ

حاصل ہے۔ اور اس کا ایک بڑا تخت ہے۔ اور میں نے اس کو اور اس کی قوم کو اللہ کے سوا سورج کے آگے

دُوۡنِ اللّٰہِ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ

سجدہ کرتے دیکھا۔اور شیطان نے ان کے عمل ان کو خوبصورت کر کے دکھائے ہیں۔اور ان کو سچے راستہ سے

السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ﴿ۙ۲۵﴾ اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ

روک دیا ہے۔جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے۔اور مُصّر ہیں کہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو کہ آسمانوں اور زمین کی

یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ یَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَ

ہر پوشیدہ تقدیر کو ظاہر کرتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو ان تدبیروں کو بھی جانتا ہے۔حالانکہ اللہ

مَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۲۷﴾ السجدة

وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) ایک بڑے تخت کا مالک ہے۔

حلّ لُغَات۔اَلۡخَبۡءُ اَلۡخَبۡءُ کے معنے ہیں مَاخُبِئَ وَغَابَ۔یعنی وہ چیز جو چھپائی جائے اور غائب ہو۔اور خَبۡءُ الۡاَرۡضِ کے معنے ہیں نَبَاتُہَا زمین کی انگوری۔اور خَبۡءُ السَّمَآءِ کے معنے ہیں مَطَرُھَا بارش۔ (اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہاں پڑاؤ کئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ سردار واپس آ گیا۔اور اس نے بتایا کہ چونکہ آپ ملک سبا پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے اور سبا کا علاقہ میرے ملک کا ایک حصہ ہے میں پہلے سے خبر لینے کے لئے وہاں چلا گیا۔کیونکہ زبان اور قوم کے ایک ہونے کی وجہ سے میرے لئے وہاں کے حالات معلوم کرنا آسان تھا مجھے اس بات کا یقینی طور پر علم حاصل ہو چکا ہے۔کہ اس وقت اس ملک میں ایک عورت حاکم ہے لیکن غضب کی حاکم ہے ہر قسم کے ساز و سامان اس کے پاس موجود ہیں اور اس کی بادشاہت بہت بڑی ہے۔

اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ سے یہ مراد نہیں کہ ملکہ سبا کو ہر نعمت میسر ہے۔کیونکہ اگر اسے ہر نعمت میسر ہوتی تو جب اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تحفہ بھیجا تھا تو آپ اس وقت یہ نہ کہتے کہ میرے پاس تو اس سے بھی بڑھ کر چیزیں ہیں۔میں ان تحفوں سے کیونکر متاثر ہو سکتا ہوں۔پس حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میرے پاس تو ملکہ سبا سے بھی بڑھ کر مال و دولت اور سامان موجود ہے بتاتا ہے کہ اُوۡتِیَتۡ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ سے صرف یہ مراد ہے

کہ ملکہ سبا کو اپنی مملکت کے لحاظ سے جس قدر چیزوں کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ تمام چیزیں اسے میسر ہیں۔ اور وہ بڑی بیدار مغز حکمران ہے۔ شاید یہ کہہ کر اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ڈرانا چاہا کہ کہیں وہ اس کے ملک کے ایک حصہ پر قبضہ نہ کرلیں۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ایسی بات کہہ دی جس کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ارادہ میں اور بھی پختہ ہوگئے۔ اور وہ یہ کہ میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کی پرستش کرتے دیکھا ہے اور شیطان نے ان کو اپنے اعمال پر بڑا نازاں کر دیا ہے اور توحید کے رستہ سے ہٹا دیا ہے اور وہ اس بات پر مصر ہیں کہ اس خدا کو سجدہ نہ کریں جو آسمان اور زمین کے تمام چھپے رازوں کو ظاہر کرنے والا ہے اور جس نے سورج اور چاند کو محض ایک خادم کی حیثیت دی ہے اور علومِ ظاہری اور باطنی اپنے انبیاء کو بتا دیئے ہیں۔ وہ اللہ جو کہ موحدوں کا خدا ہے اس کی بادشاہت اس ملکہ کی بادشاہت سے بہت بڑی ہے اور ضرور اس کی بادشاہت غالب آئے گی اس طرح اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خوش کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ بلاوجہ غیر حاضر نہیں رہا۔ بلکہ اس نے ملکی مفاد کے لئے یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھا تھا۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۸﴾

(اس پر سلیمان نے) کہا۔ کہ ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ بولا ہے یا تُو جھوٹوں میں سے ہے۔

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ

تو میرا یہ خط لے جا اور اسے ان کے (یعنی سبا کی قوم کے) سامنے پھینک دے۔ پھر (ادب سے)

فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۹﴾

پیچھے ہٹ (کر کھڑا ہو) جا اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

تفسیر۔ اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ بہت اچھا ہم نے جانا تو ضرور ہے۔ ہم وہاں جا کر دیکھیں گے کہ تُو نے سچ بولا ہے یا ایک جھوٹی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ تُو میرا یہ خط لے جا۔ اور ان لوگوں کے سامنے جا کر انہیں یہ خط پیش کر دے اور پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیو۔ اور دیکھیئو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ ذرا دیکھو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا عقلمند نبی ایک پرندے کو کیا نصیحت کرتا ہے۔ کبوتروں کی گردن

میں تو لوگ خط باندھا ہی کرتے تھے۔ مگر ہدہد کو ڈاکیہ بنانے کا لطیفہ ہمارے مفسرین کو ہی سوجھا ہے پھر ایک بے عقل جانور کو کیسے آداب سکھائے جاتے ہیں کہ براہ راست ملکہ کے ہاتھ میں خط نہ دیجیئو۔ کیونکہ یہ ایک بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے درباریوں کے سامنے خط رکھیئو۔ وہ خود اس کے آگے خط پیش کر دیں گے۔ جیسا کہ سلطانی آداب میں یہ بات شامل ہے پھر جلدی سے جواب نہ مانگیئو۔ گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہی پرندوں کی بولی نہیں آتی تھی بلکہ ملکہ سبا کو بھی آتی تھی۔ اور مناسب انتظار کے بعد جب وہ جواب دیں تو لے آئیو۔

قَالَتْ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۰﴾

(جب اس نے ایسا کیا تو) وہ (ملکہ) بولی۔ اے میرے درباریو! میرے سامنے ایک معزز خط رکھا گیا ہے۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۱﴾

(جس کا مضمون یہ ہے کہ) یہ (خط) سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ جو بے انتہا

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ ع

کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے اس کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم پر زیادتی نہ کرو۔ اور ہمارے حضور میں فرمانبردار بن کر حاضر ہو جاؤ۔

حلّ لُغات۔ **اَلْمَلَأُ** اَلْمَلَأُ کے معنے ہیں اَلْاَشْرَافُ۔ بڑے لوگ۔ صاحب مرتبہ۔ وجاہت والے۔ قِيْلَ سُمُّوْا بِذٰلِكَ لِمَلَاءَتِهِمْ بِمَا يُلْتَمَسُ عِنْدَهُمْ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَجَوْدَةِ الرَّأْيِ اَوْ لِاَنَّهُمْ يَمْلَأُوْنَ الْعُيُوْنَ أُبَّهَةً وَالصُّدُوْرَ هَيْبَةً۔ اور سرداروں کو مَلَأٌ اس لئے کہتے ہیں کہ جس امر کے متعلق ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق رائے دینے کے لئے ان کا دماغ بھرپور ہوتا ہے۔ نیز ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں اور دل رعب سے بھر جاتے ہیں۔ (اقرب الموارد)

تفسیر۔ جب ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ کے درباریوں کے آگے رکھ دیا اور انہوں نے ملکہ کے آگے پیش کر دیا۔ تو ملکہ نے کہا۔ ایک بڑا معزز خط میرے آگے پیش کیا گیا ہے وہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھی ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ میرے خلاف سرکشی مت

کرو۔اور فرمانبردار ہو کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔

دیکھو یہ کتنا واضح اشارہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بلاوجہ اس ملک کی طرف نہیں گئے تھے بلکہ پہلے اس ملک کے لوگوں نے کوئی سرکشی کی تھی اس سرکشی کو دبانے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یمن کا رخ کیا تھا۔ اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا۔ کہ اگر تم فرمانبرداری اختیار کرو گے تو میں تمہارا پہلا قصور معاف کر دوں گا۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط سے پہلے جو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے الفاظ لکھے ہیں۔ان کو دیکھ کر دشمنان اسلام کی طرف سے بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے اپنی ہر سورۃ کے ابتداء میں جو بسم اللہ لکھی ہے وہ درحقیقت پرانی کتب کی ایک چوری ہے اور پہلے لوگ بھی اس کا علم رکھتے تھے۔ چنانچہ راڈول لکھتا ہے کہ یہ کلمہ یہودی الاصل ہے (وہیری ص ۲۸۹ جلد اول) اور وہیری لکھتا ہے کہ یہ امر یقینی ہے کہ یہ کلمہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہودیوں اور صابیوں سے مستعار لیا ہے۔ آخر الذکر ہمیشہ اپنی تحریروں سے پہلے یہ لکھا کرتے تھے۔ ’’بنامِ یزداں بخشائش گردادار (تفسیر وھیری للقرآن الکریم جلد اول صفحہ ۲۸۹) پادری سینٹ کلیئر ٹسڈل صاحب نے اپنی کتاب ’’ینابیع الاسلام‘‘ میں اس عبارت کو زرتشتیوں کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ کتاب دساتیر میں ہر نبی کے صحیفہ سے پہلے یہ عبارت ہے’’ بنام ایزد بخشائش گر مہربان دادگر‘‘ (اردو ترجمہ ینابیع الاسلام اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۷)

یہ عجیب بات ہے کہ تین مسیحی مصنف اس آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کے لئے تین سرچشمے اس کے بیان کرتے ہیں۔ ایک یہودیوں کو اس کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ دوسرا صابیوں کو۔ تیسرا زردشتیوں کو۔ ان لوگوں کا اس آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کے لئے اس قدر کوشش کرنا خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک یہ آیت اپنے معنوں کے لحاظ سے ایک سمندر ہے۔ ورنہ ان کا یہ لکھ دینا ہی کافی ہوتا کہ اس آیت کے مضمون میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ تینوں سرچشموں میں سے اصل سرچشمہ کون سا ہے؟ تینوں قوموں کو اس آیت کا موجد تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس ضروری ہے کہ یہ مسیحی مصنف یا ان کے شاگرد یہ تصفیہ بھی کر لیں کہ آیا یہودیوں نے زردشتیوں یا صابیوں سے چرایا ہے یا برعکس معاملہ ہے۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہودیوں میں اس کلمہ کے استعمال کا ایک بھی حوالہ نہیں دیا گیا۔ اور نہ وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ جن میں یہودی اس مضمون کو بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ باوجود اس بات کے کہ مسیحیت یہودیت کی ایک شاخ ہے اور یہودی کتب گویا مسیحیوں کی اپنی مذہبی کتب ہیں پھر بھی مسیحی مصنّف یہودی کتب

کا حوالہ نہیں دے سکے اور نہ ان کے الفاظ نقل کر سکے البتہ زرتشتیوں اور صابیوں کی کتب کے حوالے انہوں نے نقل کر دیئے ہیں۔ جس سے یہ بات اَور بھی روشن ہو جاتی ہے کہ اس آیت کے حسن کو دیکھ کر وہ کچھ ایسے بدحواس ہو گئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی مذہبی کتب میں اس کا وجود ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

باقی رہے صابی اور زرتشتی سو صابیوں کی کتب تو محفوظ نہیں۔ ہاں زرتشتیوں کی کتب کے بعض حصے اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کتب کی نسبت خود زرتشتی لوگ کہتے ہیں کہ وہ اصل صورت میں محفوظ نہیں ہیں۔ پس کیا تعجب ہے کہ ان کے بعض حصے اسلام کے بعد ہی بنائے گئے ہوں۔ لیکن اگر ان کتب کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی قرآن کریم پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ یہ آیت پہلی دفعہ قرآن کریم میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ یہ آیت پہلے بھی دنیا میں موجود تھی۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو خط ملکۂ سبا کو لکھا۔ اس کے الفاظ بتائے گئے ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَ اۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ۔ پس اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہود یا زرتشتیوں یا صابیوں یا کسی اَور قوم میں یہ آیت پہلے سے موجود تھی تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ جب قرآن کریم خود تسلیم کرتا ہے کہ یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھی۔ تو جو آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھی وہ یقیناً ان کے اتباع کو بھی معلوم ہو گی اور بالکل ممکن ہے کہ دوسری قوموں کے نبیوں کو بھی معلوم ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کا مضمون عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور پہلی قوموں میں ان کی اپنی زبانوں میں ہو گا۔ مگر بایں ہمہ قرآن کریم میں ہر سورۃ سے پہلے اس آیت کی موجودگی نقل نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس آیت کا وجود ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے ہے اور جو کلام کسی نئی غرض کے لئے دوہرایا جائے اور کسی خاص فائدہ کے لئے اختیار کیا جائے وہ نقل یا چوری ہرگز نہیں کہلاتا۔

یہ پیشگوئی خروج باب ۱۹، ۲۰ اور استثناء باب ۱۸ میں مذکور ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کو پاک کر کے سینا کے نیچے لا کھڑا کر۔ تا کہ وہ سنیں کہ میں تجھ سے کلام کرتا ہوں۔ پہلے تو وہ پہاڑ کے پاس کھڑے رہیں۔ لیکن جب قرنا کی آواز بہت بلند ہو تو قریب آ جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وہاں گئے اور خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی بجلی چمکی اور دھواں اٹھا اور گرج پیدا ہوئی۔ وہ لوگ ڈر کے دور جا کھڑے ہوئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ تُو ہی ہم سے بول اور ہم سنیں۔ لیکن خدا ہم سے نہ بولے۔ کہیں ہم مر نہ جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا کہ تم مت ڈرو۔ اس لئے کہ خدا آیا ہے تا کہ تمہارا امتحان کرے اور تا کہ اس کا جلال تمہارے سامنے

ظاہر ہو۔ کہ تم گناہ نہ کرو۔ مگر پھر بھی وہ لوگ دور ہی کھڑے رہے اور صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی اللہ تعالیٰ کے پاس گئے (خروج باب ۲۰ آیت ۱۹ تا ۲۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے جا کر عرض کیا کہ الٰہی میری قوم تو تیرے پاس آنے سے ڈرتی ہے تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ:۔

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھریو۔ اس سب کی مانند جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا۔ اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں تا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب اسے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔'' (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ تا ۲۰)

اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک نبی ان کا مثیل بن کر آئے گا۔ اور وہ جب بھی خدا تعالیٰ کا کلام سنائے گا تو کہے گا کہ میں خدا کا نام لے کر یہ کلام سناتا ہوں۔ اور خدا کا نام لے کر کا ترجمہ عربی زبان میں بسم اللہ ہی ہے۔ پس بسم اللہ میں اسم کا لفظ بڑھا کر اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا قرآن کریم کی ہر سورۃ کے شروع میں ہی ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے تا یہودیوں اور عیسائیوں پر آپ کی سچائی کھل جائے۔ اور ان پر حجت پوری ہو کہ وہ موعود جس کا ان کی کتابوں میں ذکر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ جو ہر بات کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بیان کرتے ہیں۔ پس ہر سورۃ سے پہلے بسم اللہ ہر یہودی اور ہر عیسائی کو توجہ دلاتی ہے کہ تم کیوں اس نبی کو نہیں مانتے جو موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ کا کلام سناتا ہے تو اس سے پہلے یہ الفاظ بھی کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر یہ کلام سناتا ہوں۔ بہرحال اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ (۱) بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیلؑ میں سے ایک نبی آئے گا۔ (۲) اس کو

حضرت موسیٰؑ کی طرح شریعت دی جائے گی۔(۳) وہ جو نیا مضمون بھی خدا کی طرف سے پا کر دنیا کے سامنے پیش کرے گا اس سے پہلے یہ کہہ لے گا کہ میں خدا تعالیٰ کا نام لے کر اس کلام کو شروع کرتا ہوں ۔(۴) اگر کوئی جھوٹا انسان اس پیشگوئی کو اپنے اوپر چسپاں کرنا چاہے گا تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔(۵) اور جو اس پیشگوئی کے مصداق کا انکار کرے گا۔ وہ بھی ہلاک کیا جائے گا۔

پس اس پیشگوئی کے مطابق ہر سورۃ سے پہلے بسم اللہ رکھ دی گئی۔ اور اس طرح یہود اور نصاریٰ کو توجہ دلائی گئی کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰؑ اور وہ موعود نبی نہیں تو انہیں سزا ملے گی کیونکہ پیشگوئی کے مطابق اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق سزا سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اگر وہ وہی موعود ہیں اور اس پیشگوئی کے مطابق خدا کا کلام اس کا نام لے کر بیان کرتے ہیں تو پیشگوئی کے مطابق تم انکار کر کے سزا سے بچ نہیں سکتے ۔ بلکہ خدا تعالیٰ تم سے ضرور حساب لے گا۔

غرض باوجود اس کی کہ بسم اللہ پہلے انبیاء کی امتوں میں بھی مروج تھی۔ قرآن کریم میں اس کا وجود چوری نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ (۱) قرآن کریم خود تسلیم کرتا ہے کہ اس سے پہلے بسم اللہ تھی (۲) اس لئے کہ اس میں بسم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے آئی ہے ۔ اگر اس کی ہر سورۃ بسم اللہ سے شروع نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی جھوٹی ہو جاتی ۔ مگر کیا یہ امر دساتیر کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مصنف بنی اسرائیل میں سے تھے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح شریعت لائے تھے۔ یا ان کی ہر وحی سے پہلے بسم اللہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ وہ تو ایک تاریخ کی کتاب ہے جس میں انبیاء کا حال ہے ۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے یہ الفاظ تھے کہ ’’ ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جو وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔‘‘ گویا ان الفاظ میں یہ شرط بتائی گئی تھی کہ وہ خدا کی وحی اس کا نام لے کر بیان کرے گا پس بسم اللہ کا قرآن مجید کی ہر سورۃ سے پہلے آنا اس پیشگوئی کے مطابق ہے۔ اور اس پر چوری کا اعتراض خصوصاً ان اقوام کے منہ سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیرو ہیں بالکل زیب نہیں دیتا۔

قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ‌ۚ مَا كُنۡتُ

پھر اس (ملکہ) نے کہا۔اے سردارو! میرے معاملہ میں اپنی پختہ رائے دو۔ کیونکہ میں کبھی بھی کوئی فیصلہ

قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ۝۳۳ قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّ

نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس حاضر ہو (کر مشورہ نہ دے لو)۔انہوں (یعنی درباریوں) نے کہا ہم

اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّالۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ فَانۡظُرِىۡ مَاذَا

بڑی طاقت والے ہیں اور بڑے جنگجو ہیں اور (آخری) معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔پس غور کرلیں کہ آپ کیا

تَاۡمُرِيۡنَ ۝۳۴ قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً

حکم دینا چاہتی ہیں (ہم اس کی اتباع کریں گے) اس نے کہا کہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے

اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً‌ ۚ وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ ۝۳۵

تباہ کردیتے ہیں اور اس کے باشندوں میں سے معزز لوگوں کو ذلیل کردیا کرتے ہیں اور وہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں۔

حلّ لُغَات۔قَاطِعَةٌ قَاطِعَةٌ قَطَعَ سے اسم فاعل واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور قَطَعَ فُلَانٌ فِي الْقَوْلِ کے معنے ہیں جَزَمَ اس نے بات پختہ کرلی۔(اقرب) قَاطِعَةٌ کے معنے ہوں گے پختہ فیصلہ کرنے والی۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔یہ خط سن کر ملکہ سبا نے کہا۔اے میری قوم کے سردارو۔میری اس مشکل میں مجھے مشورہ دو۔جب تک تم میرے دربار میں حاضر ہو کر مشورہ نہ دو میں کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ڈیماکرسی قائم ہوگئی تھی اور بادشاہت کے حقوق محدود تھے۔ان سورماؤں نے جنہوں نے حضرت سلیمانؑ کے ایک لشکر کے سردار کو جو پدّی جیسا جانور تھا دیکھ لیا تھا کہا کہ حضور ہم تو بڑے طاقتور ہیں اور جنگ میں بڑے آزمودہ کار ہیں۔ان پرندوں کے لشکر نے ہمارا کیا بگاڑ لینا ہے۔دس منٹ میں ہمارے بچے ہی ان کو مار مار کر کھا جائیں گے۔مگر فیصلہ بہرحال آپ کے اختیار میں ہے جو آپ حکم دیں گے کرلیں گے۔اگر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان چڑیوں کے پیچھے آپ کے جرنیل گھوڑے دوڑاتے ہوئے دوڑ پڑیں تو ہم ایسا ہی کریں گے اور اگر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان چڑیوں کو بھون بھون کر کھاؤ تو ہم ایسا ہی کریں گے۔

ملکہ سبا نے کہا کہ جب بادشاہ کسی زبردست لشکر کے ساتھ ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو اجاڑ دیا کرتے ہیں۔ اور اس کے باشندوں میں سے معزز لوگوں کو ذلیل یعنی جانوروں کی طرح کر دیا کرتے ہیں۔ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ اور ہمیشہ بادشاہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ پر غور کر کے دیکھ لو۔ جب بھی کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی ہے وہ اپنی فتح کے غرور میں مفتوح قوم پر بڑی بڑی سختیاں کرتی ہے اور پھر غرور کے علاوہ اس قوم کو یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ اگر مفتوحین کو جلد کچلا نہ گیا۔ تو ممکن ہے یہ پھر بغاوت کر دیں۔ گویا ان کے قلوب میں اطمینان نہیں ہوتا۔ اور انہیں ہر وقت بغاوت کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے وہ حد سے زیادہ مظالم ڈھاتے اور بڑی بڑی سختیاں لوگوں پر کرتے ہیں۔ جیسے اٹلی نے جب ایبے سینیا پر قبضہ کیا تو اس نے بڑے بڑے ظلم کئے۔ عرب لوگ ان مظالم کو کثرت سے بیان کیا کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اٹلی نے ایبے سینیا پر قبضہ کرنے کے بعد ہزاروں آدمی بلاوجہ مروا ڈالے۔ اور بعض دفعہ لوگوں پر اپنی حکومت کا رعب جمانے کے لئے گھروں کے دروازوں پر لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا۔ غرض ہر قوم جس کی بنیاد مذہب پر نہیں ملکوں کو فتح کرنے کے بعد اس قسم کے مظالم کیا کرتی ہے۔ آخر دنیا میں ہزاروں سال کی تاریخ موجود ہے۔ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اتباع کو چھوڑ کر یا ایک دو اَور بادشاہوں کو مستثنٰی کر کے بتاؤ تو سہی کہ کسی قوم نے کسی ملک پر غلبہ حاصل کیا ہو۔ اور اس نے وہاں ظلم وستم کا بازار نہ گرم کر دیا ہو۔ تورات پڑھ کر دیکھ لو وہاں بھی یہی احکام ہیں کہ

> ’’جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے۔ تو تُو انہیں ماریو اور حرم کیجیئو۔ نہ تو ان سے کوئی عہد کریو۔ اور نہ ان پر رحم کریو............ تم ان کے مذبحوں کو ڈھادو اور ان کے بتوں کو توڑ دو۔ ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔‘‘

(استثناء باب ۷ آیت ۲ تا ۵)

اسی طرح لکھا ہے:۔

> ’’جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو تُو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر......اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے۔‘‘

(استثناء باب ۲۰ آیت ۱۳ تا ۱۶)

غرض جب کوئی قوم فاتح ہو تو وہ یہی کچھ کیا کرتی ہے۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی یہاں کے لوگوں پر بڑی بڑی سختیاں کیں اور جب غصہ نکل گیا تب اعتدال پر آئے۔ ورنہ غدر کے ایام میں

انگریزوں نے جو جو کارروائیاں کی ہیں ان کا ذکر سن کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔اس وقت کے کئی چشمدید واقعات کا ذکر میں نے بھی سنا ہے۔ ہمارے اپنے پڑنانا کا حال ہماری نانی صاحبہ سنایا کرتی تھیں کہ غدر کے دنوں میں وہ سخت بیمار تھے۔ایک دن اچانک انگریزی فوج کے بعض سپاہی مکان کے اندر گھس آئے اوران میں سے ایک نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص کو بھی میں نے لڑتے دیکھا ہے۔وہ بیچارے گھبرا کر کھڑے ہوئے تو ان سپاہیوں نے وہیں گولیوں سے ان کو مار ڈالا۔

ملکہ سباء اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۔یعنی دستور اور قانون یہی ہے کہ جب کسی ملک میں نئے بادشاہ آتے ہیں تو معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں۔ یہ خدائی قانون ہے جو کبھی نہیں بدل سکتا۔سوائے اس کے کہ داخل ہونے والا دنیوی اصطلاح میں مَلِک نہ ہو۔جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء تھے۔ وہ روحانی بادشاہ تھے دنیوی اصطلاح میں مَلک نہیں تھے۔اسی طرح دو چار اور لوگ جنہیں بطور استثناء پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ گو بادشاہ کہلاتے ہوں مگر ان معنوں میں بادشاہ نہیں تھے جن معنوں میں دنیا دار بادشاہ ہوتے ہیں بلکہ درحقیقت وہ خدا تعالیٰ کے نیک بندے تھے۔ چنانچہ ساری یورپین تاریخ میں صرف ایک مثال ایسی نظر آتی ہے جس میں فاتح نے غیر قوموں کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اپنی قوم کے ہی ایک حصہ کے مقابلہ میں عفو اور درگذر کا سلوک کیا۔ یہ مثال ابراھیم لنکن کی ہے۔جو امریکہ کا پریزیڈنٹ تھا۔اس کے عہد حکومت میں ایک دفعہ یونائٹڈ سٹیٹس امریکہ کے ایک حصے نے دوسرے حصے کے خلاف بغاوت کردی۔ جب شمالی یونائٹڈ سٹیٹس نے جنوبی یونائٹڈ سٹیٹس پر فتح پالی اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے لگا تو جرنیلوں نے فتح کا مظاہرہ کرنے کی بہت بڑی تیاری کی ہوئی تھی اوران کی تجویز تھی کہ بینڈ بجاتے ہوئے ہم شہر میں داخل ہوں گے۔مگر جب ابراھیم لنکن نے ان انتظامات کو دیکھا تو اس نے اپنے جرنیلوں کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ کیا یہ خوشی کا مقام ہے کہ امریکنوں نے امریکنوں کو قتل کیا ہے۔لڑائی تو ہمیں مجبوراً کرنی پڑی تھی ورنہ اپنی قوم کا خون بہانا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہوسکتی۔ پھر اس نے اپنے جرنیلوں سے کہا کہ تم پیچھے کھڑے رہو میں اکیلا شہر میں داخل ہوں گا۔ چنانچہ وہ اکیلا شہر میں داخل ہوا اور باغی فوج کے افسر کے دفتر میں جا کر اس کے ڈیسک پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر پُرنم آنکھوں کے ساتھ دعا میں مشغول رہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تمام یوروپین تاریخ میں صرف ایک مثال ہے۔ جہاں فاتح نے مفتوح کو ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔آپؐ نے جب مکہ فتح کیا تو باوجود اس کے کہ کفار مکہ سالہا سال تک آپؐ کو اور آپؐ

کے صحابہؓ کو سخت سے سخت تکالیف پہنچاتے رہے تھے آپ نے ان سب سے کہہ دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ میں تم پر کوئی گرفت نہیں کرتا۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو و درگذر یہیں تک محدود نہیں بلکہ آپؐ نے ایک دفعہ صحابہؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر مصر کو فتح کرے گا۔ جب تم فاتحانہ حیثیت سے اس میں داخل ہو تو اس وقت تم اس بات کو یاد رکھنا کہ تمہاری دادی ہاجرہؑ مصر کی تھی (السيرة النبوية لابن هشام سياقة النسب من ولد اسمعيل)۔ اب کہاں حضرت ہاجرہؑ کا زمانہ اور کہاں صحابہؓ کا زمانہ مگر اتنی دوری کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیس سو سال پہلے کی دادی ہاجرہؑ کا ذکر کر کے اپنے صحابہؓ کو نصیحت فرمائی کہ تم اس تعلق کی بنا پر مصر کے لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا۔ اور ان سے حسن سلوک کرنا۔ پس اس قسم کا نمونہ دکھانا انبیاء کا ہی کام ہوتا ہے۔ ورنہ عام دستور دنیا کے بادشاہوں کا یہی ہے کہ جب وہ کسی ملک میں فاتح بن کر داخل ہوتے ہیں تو بڑے بڑے ظلم کرتے اور ہزاروں لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔

پس ملکہ سبا کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملا تو اس نے اپنی سلطنت کے اکابر سے مشورہ لیا۔ ان سب نے کہا کہ ہم ملک کی خدمت کے لئے تیار ہیں اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں۔ آپ جو حکم دینا چاہتی ہیں۔ دیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہماری موت سے ملک کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ دیکھنا صرف یہ نہیں کہ لوگ جنگ کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موت کوئی فائدہ پہنچائے گی یا نہیں۔ اگر ہم زندہ رہیں اور سلیمانؑ کی بادشاہت قبول کر لیں تو یہ زیادہ مفید ہوگا یا یہ زیادہ مفید ہوگا کہ ہم لڑیں اور مر جائیں اور سلیمان ہمارے ملک پر قابض ہو جائے۔ غرض حکومت کا کلّی تغیّر ہم پر اثر انداز ہو سکتا ہے یا اس کا جزوی تغیر۔ ایک تغیّر تو یہ ہے کہ سلیمانؑ کو اس ملک کی عظمت اور بڑائی حاصل ہو جائے۔ بادشاہت ہمارے پاس ہی رہے ہم صرف اس کے باجگذار ہو جائیں۔ اور ایک تغیّر یہ ہے کہ ہم مارے جائیں اور ملک بھی سلیمانؑ کے قبضہ میں چلا جائے۔ ان تمام امور پر غور کر کے وہ جو کچھ کہتی ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی نئی بادشاہت آیا کرتی ہے تو جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وہ اس ملک کے معززین کو ذلیل کر دیا کرتی ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ حکومتوں میں جب تغیر ہو تو نئی حکومت بڑوں کو چھوٹا اور چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے۔ یہاں یہ مضمون بیان نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر اس کے یہی معنے ہوں تو گو بڑے چھوٹے ہو جائیں گے لیکن چھوٹوں کے بڑا بن جانے سے پھر بھی اس ملک کو ہی فائدہ پہنچے گا اور اسے کوئی نقصان نہیں رہے گا۔ حالانکہ قرآن کریم کی آیت صرف نقصان اور تباہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دراصل اس آیت میں غیر قوم کی حکومت کا ذکر ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جب اس قسم کی نئی بادشاہت کا قیام عمل میں آئے تو وہ

بڑوں کو ذلیل کر دیتی ہے اور جو پہلے ہی ذلیل ہوں وہ اس حکومت میں اَور بھی زیادہ ذلیل اور بے حیثیت ہو جاتے ہیں ۔گویا خارجی قوم کی حکومت نئے حاکم مقرر کرتی ۔ نئے سردار بناتی اور نیا نظام قائم کرتی ہے ۔پھر وہ لوگ اپنا قانون جاری کرتے ۔اپنے افسروں اور اپنے حکّام کا تقرر کرتے اور اپنے ہی نظام کو رائج کرتے ہیں ۔جیسے انگریز یہاں آئے تو انہوں نے انگریزوں کو افسر بنایا ۔مغل آئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ترقی دی ۔پٹھان آئے تو انہوں نے اپنے ہم قوم افراد کو ذمہ واری کے عہدے دیئے ۔اسی طرح آرین لوگوں نے حکومت کی تو انہوں نے آریوں کو عروج پر پہنچایا اور گونڈ اور بھیل وغیرہ اقوام جو کسی زمانہ میں اعزّہ میں سے تھیں انہیں ذلیل کر دیا ۔غرض ہر خارجی بادشاہت دنیا میں ایک نیا تغیر پیدا کرتی اور پہلے نظام کو بدل کر ایک نیا نظام قائم کرتی ہے تا کہ وہ لوگ دوبارہ اقتدار حاصل کر کے بغاوت نہ کر دیں ۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دِلّی میں مجھے ایک شخص کے متعلق بتایا گیا کہ یہ مغلیہ خاندان میں سے ہے ۔اس کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ حقہ اٹھائے پھرتا تھا اور چاندنی چوک میں اور لال قلعہ کے سامنے لوگوں کو حقہ پلاتا تھا ۔اور حقہ پینے والا اسے آنہ دو آنے دیدیتا تھا ۔وہ ہر شخص کے سامنے جاتا اور کہتا حقہ پی لیجئے ۔وہ لوگ جو حقہ کے عادی ہوتے وہ اس سے حقہ لے کر پی لیتے اور جاتے ہوئے آنہ دو آنے دے دیتے ۔اس نے عزت نفس کی وجہ سے بجائے ہاتھ پھیلانے کے یہ طریق اختیار کر لیا تھا ۔پس دنیا کے واقعات اس قانون کی تائید کرتے ہیں کہ جب بھی کسی ملک کی حکومت پر کوئی اور حکومت قبضہ کرتی ہے وہ ملک کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتی ہے اور حکمران خاندان کو کلّی طور پر حکومت کے کاموں سے علیحدہ کر کے گوشۂ گمنامی میں پھینک دیتی ہے اور ایسے لوگوں کو حکومت کی باگ ڈور دے دی جاتی ہے جو پہلی حکومت سے بغض رکھتے ہوں تا کہ وہ ان لوگوں کو اُبھرنے کا موقعہ نہ دیں ۔انگریزوں کو ہی دیکھ لو ۔انہوں نے راجوں مہاراجوں کو اونچا کر دیا اور مغلیہ شاہی خاندان کو اس طرح گرا دیا کہ آج ان کا نام ونشان بھی نہیں ملتا ۔

غرض ملکہ سبا بطور قانون یہ بات بیان کرتی ہے کہ بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں ۔

پھر جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً میں اعزّہ کے صرف یہی معنے نہیں کہ جو لوگ واقعی معزز ہوتے ہیں ان کو ذلیل کیا جاتا ہے بلکہ اس کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے کہ جو لوگ غریبوں ، کمزوروں اور ناتوانوں کو جوتیاں مارنے کی وجہ سے اپنے آپ کو معزز سمجھتے ہیں ان کے اس فعل بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی غیرت اور اس کی محبت غرباء کے لئے جوش میں آتی ہے اور وہ ان پر کسی ایسے بادشاہ کو مسلط کر دیتا ہے جو ان کے خود ساختہ اعزاز کو مٹا کر انہیں ذلیل کر دیتا ہے ۔

گویا جوتوں میں جوتوں کے ساتھ دوسروں کو سیدھا کرنا چاہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغلوب کر دیتا ہے اور دوسروں کو ان پر غلبہ دے دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا جب آپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے رعایا کے ساتھ شریفانہ سلوک روا نہ رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دس قبائل نے بغاوت کر دی اور سلیمانؑ کی وسیع سلطنت ایک ریاست کی شکل میں محدود ہو کر رہ گئی۔ رعایا کے چند قبائل نے اس سے پیشتر بھی ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں منصوبہ کیا تھا کہ ہم حکومت کو موقعہ پا کر کمزور کر دیں۔ اور بغاوت کر دیں۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے تائید الٰہی سے اس قسم کی بغاوتوں کو دبائے رکھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا تخت نشین ہوا تو بارہ قبائل میں سے دس نے اکٹھے ہو کر مشورہ کیا کہ چلو بادشاہ کے پاس چل کر درخواست کریں کہ آئندہ ہم پر سختی نہ کی جائے انہوں نے سمجھا کہ اس طرح اکٹھے ہو کر جانے سے بادشاہ مرعوب ہو جائے گا اور ہم اس سے بعض باتیں منوا لیں گے اگر تو وہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں آپ کے پاس جاتے اور اپنی شکایات پیش کرتے تو چاہے آپ ان کی کوئی بات مانتے یا نہ مانتے اتنا ضرور تھا کہ آپ ان قبائل کا اعزاز کرتے اور انہیں احسن طریق سے سمجھانے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں تمہارے فائدہ کے لئے کر رہے ہیں۔ مگر آپ کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا چونکہ مؤید من اللہ نہیں تھا۔ اور اس کے اندر تقویٰ نہیں پایا جاتا تھا اس نے جب قبائل کے اس قسم کے مشورہ کی خبر سنی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے امراء، وزراء اور دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہ وزراء اور امراء بھی بادشاہ کے ہم خیال تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ ''گربہ کُشتن روزِ اول'' جب وہ قبائل آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کی خوب خبر لیں۔ چنانچہ جب وہ قبائل بادشاہ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا۔ بادشاہ سلامت! ہم نے آپ کے باپ دادا کی بھی خدمت کی ہے اور اطاعت گذار رہے ہیں مگر اس وقت بعض معاملات ایسے ہیں جن میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم پر سختی کی جارہی ہے۔ ان میں نرمی ہونی چاہیے۔ یہ سن کر بادشاہ بڑی شان سے بیٹھ گیا۔ اور اس نے بڑے جوش میں کہا تم نے اگر میرے باپ دادا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تھی تو کونسا احسان کیا تھا۔ انہوں نے تم سے جوتوں کے ساتھ اطاعت کروائی تھی۔ اسی طرح میں بھی تمہارے شور و شر سے ڈرنے والا نہیں۔ بلکہ یاد رکھو میرے باپ دادا نے تو تم سے جوتوں سے اطاعت کروائی تھی اور میں ڈنڈے مار مار کر تم سے اطاعت کرواؤں گا۔ اس لئے مطالبات کو ترک کر دو۔ اگر تم میں سے کوئی ذرا بھی بولا تو گدّی سے اس کی زبان کھینچ لی جائے گی۔ وہ یہ سختی کا جواب سن کر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے وہیں قصر شاہی کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم بغاوت

کر دیں۔ چنانچہ ان دس قبائل کے آدمیوں نے وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر اپنا ایک بادشاہ چن لیا اور سلیمانؑ کے بیٹے سے کہہ دیا کہ ہم تمہاری حکومت سے بغاوت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی بادشاہت سینکڑوں سال تک چلتی رہی اور سلیمانؑ کے بیٹے کی حکومت صرف ایک ریاست بن کر رہ گئی (اخبار الأیام الثانی ۹:۳۱، ۱۰:۱-۱۹، ۱۱:۵-۱۲)۔ اسی طرح وہ لوگ جو ڈنڈے کے زور پر دوسروں پر حکومت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اعزّہ میں سے سمجھتے ہیں ان کی چیرہ دستیاں بھی جب حد سے تجاوز کر جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے اور ملک میں ایسا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ ملک میں بڑے بڑے معزز سمجھے جانے والے ذلیل ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنے ناروا افعال کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

پھر گو ملکہ سبا کا یہ قول ایک سیاسی ذکر کے دوران بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً مگر اس میں اس روحانی قانون کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو انبیاء کی بعثت پر دنیا میں جاری کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح دنیوی ملوک اپنے ساتھ ایک انقلاب لاتے ہیں اسی طرح انبیاء جو مملکت روحانی کے بادشاہ ہوتے ہیں ان کی آمد کے ساتھ بھی جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً کا نقشہ انسانی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور ان کے زمانہ میں بھی کئی چھوٹے بڑے اور کئی بڑے چھوٹے کر دیئے جاتے ہیں۔ کئی حقیر اور ذلیل سمجھی جانے والی قومیں خدا تعالیٰ کے مامور کو قبول کر کے عزت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور کئی معزز سمجھی جانے والی قومیں خدا تعالیٰ کے مامور کو ردّ کر کے ذلیل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ دنیا کا ایک لمبا تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ الٰہی صداقتیں ہمیشہ ایسے علاقوں میں ہی زیادہ کثرت اور زیادہ زور کے ساتھ پھیلتی ہیں جو باقی دنیا کی نگاہوں میں جاہل اور وحشی ہوتے ہیں۔ جب کبھی کسی تعلیم نے یکدم کسی قوم کو پکڑا ہے تو وہ قوم ہمیشہ ایسی ہی ہوتی رہی ہے جو اپنے ظاہری علوم کے لحاظ سے دوسری قوموں سے ادنیٰ اور گری ہوئی سمجھی جاتی ہے۔ مگر پھر وہی قوم خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہہ کر دنیا کی فاتح اور حکمران بن جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو انسانی فطرت اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ نتائج نکالتی رہتی ہے بلکہ انسان تو ایک طرف رہا ہم جانوروں اور درختوں میں بھی یہ بات دیکھتے ہیں۔ سائینس سے ثابت ہے کہ بعض جانور بعض درختوں پر رہنے کی وجہ سے خاص قسم کے رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ تیتری کتنا چھوٹا سا جانور ہے نہ اس میں گوشت ہوتا ہے نہ ہڈی۔ جب تیتریاں پھولوں پر اُڑ رہی ہوتی ہیں تو وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ کتنی حسین اور دلکش نظر آتی ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان تیتریوں کا رنگ زیادہ تر مرہون منت ہوتا ہے ان پھولوں اور پتوں کا جن میں وہ رہتی ہیں۔ وہ مختلف قسم کے پھولوں اور مختلف قسم

کے پتوں میں رہتی ہیں اور انہی پتوں اور انہی پھولوں کے رنگ کا انعکاس اپنے پَروں میں پیدا کر لیتی ہیں۔ چنانچہ اکثر تیتریوں کے رنگ دوسرے جانوروں کے رنگ کے خلاف عارضی ہوتے ہیں۔ اگر ایک طوطے کا سبز رنگ تم مٹانا چاہو تو تم نہیں مٹا سکتے۔ اگر ایک فاختہ کا بھورا رنگ تم مٹانا چاہو تو نہیں مٹا سکتے۔ لیکن تیتری کا پَر اپنے ہاتھ میں مسلو تو اس کا رنگ فوراً تمہارے ہاتھ کو لگ جائے گا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رنگ درحقیقت ایک فوٹو اور انعکاس ہوتا ہے ان شعاعوں کا جو ان پھولوں اور پتوں میں رہنے کی وجہ سے اس کے پَروں پر پڑتی ہیں۔ جب یہ انعکاس ایک لمبے عرصہ تک چلتا چلا جاتا ہے تو اسی قسم کا ایک مستقل رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بالعموم ریت کے اندر رہنے والے جانور بھوسلا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ریت کے تودوں میں ان کی شکل نظر نہیں آتی۔ ہرن سامنے بیٹھا ہوا ہوتا ہے بلکہ گلّے کا گلّا بعض دفعہ سامنے ہوتا ہے مگر ہر شخص ان کو پہچان نہیں سکتا۔ صرف ماہر شکاری ہی امتیاز کر سکتا ہے۔ ورنہ عام انسان بسا اوقات پاس سے گذر جاتا ہے اور اسے معلوم تک نہیں ہوتا کہ سامنے ہرن بیٹھا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ریت میں ایک لمبا عرصہ رہنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ ریت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی حال درختوں کا ہوتا ہے کہ درخت بھی اپنے اپنے ماحول کے مطابق رنگ اختیار کرتے ہیں اور یہی حال انسانوں کا ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی اپنے اپنے ماحول کے مطابق رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ہم ان کو وحشی کہہ دیں۔ ہم ان کو جاہل کہہ دیں۔ ہم ان کو تہذیب وتمدن سے کوسوں دور کہہ لیں۔ لیکن کیا ان کا دماغ اتنا بھی کام نہیں کر رہا ہوتا جتنا ایک طوطے یا ایک تیتر یا ایک ہرن کا دماغ کام کر رہا ہوتا ہے۔ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ جس طرح طوطے اور ہرن نے معین صورت میں اپنے تاثرات کو باہر نہیں نکالا اسی طرح ایک جاہل اور وحشی نے بھی اپنے ماحول کے تاثرات کو باہر نہیں نکالا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے مطابق ایک رنگ اپنے اندر پیدا کرتا رہتا ہے۔ تم اگر کسی وحشی سے پوچھو کہ کیا تم نے اپنی زندگی کے ماحول کے نتیجہ میں کوئی اثر قبول کیا ہے یا نہیں تو وہ کہے گا۔ میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اثر قبول کیا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس سے ایسا ہی ناواقف ہوتا ہے جیسے تیتری یہ نہیں جانتی کہ وہ پھولوں کے رنگ کا اثر قبول کر رہی ہے۔ ہرن یہ نہیں جانتا کہ وہ ریت کی رنگت اپنے اندر پیدا کر رہا ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی بغیر اس بات کے جاننے کے کہ وہ کیا پیدا کر رہی ہے۔ اور اس کے کیا کیا فوائد ہیں۔ مختلف پھولوں پر بیٹھ کر شہد کے باریک ذرات اپنے منہ میں سے نکالتی رہتی ہے اور وہ نکالنے پر مجبور ہوتی ہے اسی طرح وہ قومیں جنہیں دنیا نے الگ پھینک رکھا ہے۔ اپنے ماحول کے اثرات سے متاثر ہو رہی ہوتی ہیں گو وہ خود بھی نہ سمجھ سکیں کہ ان کا ماحول ان کو کسی خاص رنگ میں رنگین کر رہا ہے۔

مگر بہر حال ان قوموں کے دلوں میں باریک طور پر یہ حسّ پائی جاتی ہے کہ خدا نے ہم کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ باقی لوگ اپنا حصہ لے چکے مگر ہم نے اس دوڑ میں اپنا حصہ نہیں لیا ہمیں دنیا نے دھتکار رکھا ہے ہمیں اس نے فوائد سے محروم کر دیا ہے۔ وہ اور اس کی نسلیں فائدہ اٹھا رہی ہیں مگر ہمیں فائدہ اٹھانے کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ یہ وہ خیال ہوتا ہے جو ان قوموں کے دلوں میں بغیر کسی خاص احساس کے یا بغیر کسی معین صورت کے اندر ہی اندر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ میں دنیا کی گری ہوئی قوموں کو ترقی کی بلندیوں پر پہنچانے کے لئے آیا ہوں تو ان قوموں کے اندر ایک خلش سی پیدا ہو جاتی ہے ایک بے چینی سی رونما ہو جاتی ہے۔ ایک اضطراب سا ان کی حرکات سے ظاہر ہونے لگتا ہے وہ کہتی ہیں ہماری امیدوں کے بر آنے کا وقت آ گیا۔ ہماری نحوستوں کے دور ہونے کا زمانہ آ گیا۔ آؤ ہم اس نبی کو قبول کر کے دنیا پر حکمرانی کریں اور اپنے کھوئے ہوئے حق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔

وہ زمین جس میں ایک لمبے عرصہ تک ہل چلایا جاتا ہے۔ جو مختلف قسم کی سبزیاں پیدا کرتی ہے جو مختلف قسم کے پھل اور پھول تیار کرتی ہے بیشک اس کی روئیدگی انسانی آنکھوں کو تراوت بخشتی ہے۔ اس کے پھل انسانی غذا کے کام آتے ہیں۔ اس کے پتے جانوروں کی بھوک مٹانے کا کام دیتے ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک لمبے استعمال کی وجہ سے اپنی طاقت کو کھو بیٹھتی ہے۔ لیکن اس کے پاس کی پڑی ہوئی زمین جو ابھی استعمال میں نہیں آئی ہوتی وہ اس بات کی زیادہ اہل ہوتی ہے کہ اس میں بیج بویا جائے اور اس سے اعلیٰ درجہ کی پیداوار حاصل کی جائے۔ اچھا فلاّح ہمیشہ اس زمین کی طرف جاتا ہے جو خالی پڑی ہو۔ اس زمین کی طرف نہیں جاتا جسے ہزاروں سال سے بویا جا رہا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے اب مجھے اس استعمال شدہ زمین سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اگر فائدہ ہوگا تو اس زمین سے جو بظاہر بنجر ہے۔ جو بظاہر ویران ہے۔ جو بظاہر غیر آباد ہے۔ بیشک اس پر محنت زیادہ ہوگی۔ مگر اس کی فصل دوسری زمینوں سے زیادہ بہتر ہوگی۔ نادان لوگ گاؤں کی مہنگی زمین خریدتے ہیں۔ لیکن ہوشیار زمیندار مربعوں والی زمین خریدتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاؤں کی زمینوں کے مالک بعض دفعہ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سوا ایکڑ زمین اپنے پاس رکھتے ہیں مگر ان کی تہ بند پھٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے جسم پر پوری چادر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک دوسرا شخص عمدہ لباس پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ اچھا کھاتا پیتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے زمیندار ہیں مگر اس کے پاس صرف ایک مربع زمین ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک مربع کے معنے ہیں صرف '۲۵' ایکڑ۔ لیکن باوجود اس کے اس کے پاس صرف '۲۵' ایکڑ زمین ہوتی ہے اور دوسرے کے پاس چھ گنا زیادہ زمین ہوتی ہے۔ وہ غربت میں اپنی زندگی

بسر کرتا ہے اور ایک مربع رکھنے والا کشائش کی حالت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص نے عقلمندی سے وہ زمین اختیار کی جس نے اپنی طاقت خرچ نہیں کی تھی اور دوسرے نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس زمین کو ترجیح دی جو اپنی طاقتوں کو کھو چکی تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے باوجود وہ گھاٹے میں رہا اور تھوڑا خرچ کرنے والا فائدہ میں رہا۔ بیشک شہری لحاظ سے وہ زمین بھی مفید ہوتی ہے۔اور مکانوں کے لئے گراں قیمت پر فروخت ہو جاتی ہے۔مگر جہاں تک فصل کا سوال ہے خالی پڑی ہوئی زمین زیادہ مفید ہوتی ہے۔ اور زمیندارہ اصول بھی یہی ہے کہ جب کسی زمین سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوتا ہے تو اس کو کچھ عرصہ کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔

عرب میں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہم جانتے ہیں کہ یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل تھا اور پیشگوئیوں کے مطابق عرب میں ہی آپ کا مبعوث ہونا ضروری تھا۔مگر سوال یہ ہے کہ خدا بھی اپنے سارے کام حکمت کے ماتحت کرتا ہے۔اسی لئے اس کا ایک نام حکیم ہے۔یونہی بلا سوچے یا بغیر کسی حکمت کے وہ کوئی کام نہیں کرتا اور جبکہ اس کا ہر کام حکمت کے ماتحت ہوتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث کرنا کسی بہت بڑی حکمت کے ماتحت تھا۔اور وہ حکمت یہی تھی کہ عرب وہ ملک تھا جسے ہزار ہا سال سے دنیا میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔بے شک عربوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔آپ کی تکفیر و تکذیب کی۔آپ کو برا بھلا کہا۔آپ کو مٹانے کے لئے انہوں نے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا۔مگر اس کے باوجود جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز عرب میں گونجتی تھی۔کہ اے عربو! میں تمہیں دنیا کا بادشاہ بنانے کے لئے آیا ہوں تو ان کا دل جلدی جلدی حرکت کرنے لگ جاتا تھا وہ کہتے تھے۔یہ کیسی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں آرہی ہے پھر وہ کچھ اور سوچتے اور کہتے یہ تو وہی آواز ہے جس کے لئے ہم اپنے باپ دادا کے زمانہ سے ترستے چلے آرہے تھے۔چنانچہ جب انہیں اپنی مخالفت بھولی، عداوت ان کے دلوں سے دور ہوئی۔اس آواز نے ان کے قلوب میں ہیجان پیدا کر دیا۔اور وہ دیوانہ وار لبیک یا رسول اللہ لبیک یا رسول اللہ کہتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ پڑے۔کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ ہماری ترقی کا زمانہ آ گیا۔ان کے دبے ہوئے جذبات اُبھر آئے۔ان کی دیرینہ خواہشات جوش میں آگئیں اور ہر روک کو توڑ کر وہ اس آواز دینے والے انسان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

مؤرخ لکھتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا خشک صحرا سمندر

بن گیا ہے۔اس کی لہریں اٹھ اٹھ کر ہمسایہ ممالک اور پھران کے ساتھ والے ممالک تک پہنچیں اوران سب کوانہوں نے اپنے زیرنگیں کرلیا۔ یہ دبی ہوئی حس ہی تھی کہ ہمیں دنیا میں ترقی کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔جس نے عربوں میں ایک دیوانگی پیدا کردی۔جنوں کی سی کیفیت ان میں رونما ہوگئی۔انہوں نے کہا یہ کیا ہوا کہ دنیا ترقی میں اپنا حصہ لے چکی مگر ہم اس سے محروم رہ گئے۔تب وہ اپنے اونٹوں کی مہاریں پکڑے نکلے اوراس جوش اور دیوانگی کے ساتھ نکلے کہ قیصروکسریٰ کی حکومتیں پاش پاش ہوگئیں اور وہ دنیا کے کناروں تک اپنی حکومت پھیلانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ سامان تھا جو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی اورعظمت کے لئے کیا کہ آپؐ کواس ملک میں خدا تعالیٰ نے بھیجا جس ملک میں رہنے والوں کے جذبات سینکڑوں سال سے دبے چلے آرہے تھے۔اوروہ سمجھتے تھے کہ اورلوگ تو حصہ لے چکے مگر ہم اب تک محروم ہیں۔گویا ان کی مثال ایسی ہی تھی جیسے کہتے ہیں کہ کوئی اندھا اورسوجا کھا کھانا کھانے بیٹھے۔اندھے نے سمجھا کہ سوجا کھا زیادہ کھانا کھارہا ہوگا۔کیونکہ اس کی آنکھیں ہیں اور میں اندھا ہونے کی وجہ سے اس کے مقابلہ میں کم کھارہا ہوں۔یہ خیال آنے پر اس نے پہلے تو جلدی جلدی کھانا شروع کردیا۔پھر اس خیال کے آنے پر کہ میری یہ حرکت سوجا کھے نے بھانپ لی ہوگی اور وہ بھی ضرور جلدی جلدی کھانے لگ گیا ہوگا اس نے دونوں ہاتھوں سے کھانا شروع کردیا۔پھر جو خیال آیا تو ایک ہاتھ سے وہ چاول منہ میں ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے جھولی میں ڈالتا۔اس پر پھر اسے خیال آیا کہ اب ضرور سوجا کھا بھی ایسا ہی کررہا ہوگا۔چنانچہ اب کی دفعہ اس نے تھالی اٹھالی اور کہنے لگا۔اب میرا ہی حصہ رہ گیا ہے۔تم اپنا حصہ کھا چکے۔اوراس سوجا کھے کی یہ حالت تھی کہ اس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا۔وہ اندھے کی حرکات کو دیکھ دیکھ کر ہی ہنستا جارہا تھا کہ یہ کیا کررہا ہے۔ عربوں نے بھی ایسا ہی کیا۔انہوں نے دنیا کی بادشاہت کی پلیٹ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی اور کہا کہ تم اپنا حصہ لے چکے یہ ہمارا حق ہے۔غرض یہ الٰہی سامان تھا۔کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اس قوم میں مبعوث کیا جو ایک لمبے عرصہ سے ترقی سے محروم چلی آئی تھی اورجس کے جذبات گو دبے ہوئے تھے مگر وہ ایک آواز کے منتظر تھے۔اس آواز کے جو انہیں دنیا کا فاتح اور حکمران بنادے۔ان کے دل یہ دیکھ کر کہ اورلوگ تو اپنا حصہ لیتے جاتے ہیں اورہمیں کوئی پوچھتا بھی نہیں غصہ سے بے تاب ہورہے تھے اور تم جانتے ہو کہ انسان کا ایک ایک سال کا دبا ہوا غصہ باہر نکلے تو وہ دوسرے کو کچل ڈالتا ہے۔پھر کیا حال ہوگا اس قوم کا جس نے صدیوں سے اپنے غصہ کو دلوں میں دبا رکھا ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک دفعہ اپنے باورچی کو محض اس جرم میں کہ کھانے میں اس نے کچھ نمک زیادہ ڈال دیا تھا ایک سو کوڑے لگانے کی سزا دی۔

عزیز الدین ایک مسلمان ان کے وزیر تھے۔ وہ بڑے نرم دل تھے۔ کہنے لگے۔ یہ بادشاہ کی شان سے بعید ہے کہ کھانے میں ذرا سا نمک زیادہ ہو جائے تو وہ اس پر چڑ کر ایک سو کوڑے لگانے کا حکم دے دے۔ مہاراجہ کہنے لگا۔ وزیر صاحب! آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں اسے نمک کی زیادتی پر یہ سزا دے رہا ہوں۔ اس نے میرا ایک سو بکرا کھایا ہوا ہے اور ایک ایک بکرے پر ایک ایک دُرّے کی سزا میں اسے دے رہا ہوں۔ کھانے میں نمک کی زیادتی محض ایک بہانہ ہے۔ اس ذریعہ سے تو مجھے اس کو گذشتہ قصوروں کی سزا دینے کا موقع مل گیا ہے۔

غرض ایک ایک دو دو سال کے جذبات اگر دبے ہوئے ہوں تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ پھر کیا حال ہوگا ان قوموں کا جنہوں نے سالہا سال سے اپنے جذبات کو دبایا ہوا تھا۔ جو سمجھتی تھیں کہ دنیا اپنا حصہ لے چکی مگر ہمارا حصہ اس نے ہمیں نہیں دیا۔ یہ دبے ہوئے جذبات قوموں کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ بے شک یہ جذبات خود ان کی نظروں میں بھی معیّن نہیں ہوتے جیسے تیتری نہیں جانتی کہ وہ پھولوں کا رنگ اختیار کر رہی ہے فاختہ نہیں جانتی کہ وہ بھورا رنگ پیدا کر رہی ہے طوطا نہیں جانتا کہ وہ سبز رنگ پیدا کر رہا ہے۔ ہرن نہیں جانتا کہ وہ بھوسلا رنگ پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مخفی اثر اپنے ماحول کا ہر چیز پر پڑتا ہے۔ اسی طرح انسان اس رنگ میں رنگین ہوتا جاتا ہے جو اس کا ماحول اس کے لئے پیدا کرتا ہے۔ اگر ہرن کی زبان ہوتی اور کوئی شخص اس سے پوچھتا کہ کیا تم کوئی رنگ پیدا کر رہے ہو تو وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں بھوسلا رنگ پیدا کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی یہ خواہش کہ میں صحرا کی ریتوں میں چھپ جاؤں خود بخود اس کے اندر ایک رنگ پیدا کر دیتی ہے جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔ سرخ پھولوں میں رہنے والی تیتری اگر اس کی زبان ہوتی یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں سرخ رنگ پیدا کر رہی ہوں۔ مگر اس کی یہ خواہش کہ میں سرخ پھولوں میں چھپ جاؤں خود بخود اس کے پروں میں سرخ رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ ایک سبز رنگ کا طوطا اگر اس کی زبان ہوتی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں سبز رنگ پیدا کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی یہ خواہش کہ میں سبز رنگ کے پتوں میں چھپا رہوں خود بخود اس کے جسم پر سبز رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح وہ جاہل اور وحشی اقوام جو متمدن دنیا سے علیحدہ ہیں جو حکومت سے محروم ہیں جو دنیا سے فائدہ نہیں اٹھا رہیں گو اپنی زبان سے نہ کہہ سکیں کہ وہ اس ماحول سے کوئی اثر قبول کر رہی ہیں مگر ان کی دبی ہوئی خواہشات ان کے جسم پر ایک رنگ پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ہماری نسل کے بعد نسل پیدا ہوئی مگر دنیا نے ہمارا حق ہم کو نہ دیا۔ ہمارا حق اس نے چھین لیا۔ ہماری دولت اس نے چھین لی۔ ہماری تعلیم اس نے چھین لی۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم دنیا پر چھائیں اور اس سے

اپنا حق واپس لیں۔ یہ وہ تاثر ہے جواس ماحول کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ تاثر ہے جو اقوام کو فاتح بنایا کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم میں آئے جو مہذب سمجھی جاتی تھی جو تعلیم یافتہ تھی جو دنیا کی ترقی کی دوڑ میں اپنا حصہ لے چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کو تین سو سال تک محنت اور تگ ودَو کرنی پڑی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم میں آئے جو مظلوم تھی جو ترقی سے محروم تھی جو دیکھتی تھی کہ اَور قومیں تو آگے نکل گئیں مگر ہم پیچھے رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰؑ کی آواز پر وہ یکدم آپ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ ان کی فطرتیں پکار رہی تھیں کہ ہماری ترقی کا وقت آ گیا۔ جب ان کی فطرت کی آواز خدائی آواز کے ساتھ مل گئی تو انہوں نے دنیا کو روند ڈالا اور اپنا حق لوگوں سے حاصل کر لیا۔

یہی قانون اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ روحانی دنیا میں بھی جب انبیاء کے ذریعہ ایک انقلاب پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً کا نظارہ نظر آتا ہے۔ یعنی کئی بڑے بڑے معزز اور عقلمند کہلانے والے ذلیل ہو جاتے ہیں اور کئی چھوٹے اور حقیر نظر آنے والے افراد یا حقیر اور ذلیل سمجھی جانے والی اقوام بڑی بڑی عزتیں حاصل کر لیتی ہیں۔ ابوجہل اپنی قوم میں کتنا عقلمند اور معزز سمجھا جاتا تھا لوگوں نے اس کا نام ہی ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ رکھا ہوا تھا۔ مگر جب اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو وہ اتنا ذلیل ہو گیا کہ لوگوں نے اسے ابوجہل یعنی جہالت کا باپ کہنا شروع کر دیا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کو دیکھ لو وہ صرف گیارہ سال کے تھے جب وہ دین کی تائید کے لئے کھڑے ہوئے۔ مگر پھر خدا تعالیٰ نے ان کو اتنی عزت دی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ بنے اور پھر ان کی نسل کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا نیک بنایا کہ بارہ نسلوں تک برابر ان میں بارہ امام پیدا ہوئے۔ لیکن وہ لوگ جو اس وقت اپنے آپ کو مکہ کے رؤساء میں سے سمجھتے تھے اور بڑی بڑی عزتوں کے مالک تھے آج ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا اور نہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پس جس طرح دنیوی بادشاہتوں کے متعلق یہ قانون ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً اسی طرح روحانی دنیا میں بھی یہ قانون جاری ہے اور انبیاء کی بعثت پر بھی کئی بڑے سمجھے جانے والے چھوٹے کر دیئے جاتے ہیں اور کئی چھوٹے سمجھے جانے والے بڑی بڑی عزتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔

وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ

اور (میں نے فیصلہ کیا ہے کہ) میں ان کی طرف ایک تحفہ بھیجوں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ میرے ایلچی کیا جواب

الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ

لے کر واپس آتے ہیں۔ پھر جب وہ تحفہ سلیمانؑ کے سامنے لا کر رکھا گیا تو اس نے کہا۔ کیا تم مال کے ذریعہ میری

بِمَالٍ ز فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ج بَلْ اَنْتُمْ

مدد کرنا چاہتے ہو۔ (اگر یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو تم کو دیا ہے

بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ

اور (معلوم ہوتا ہے کہ) تم اپنے تحفہ پر بڑے نازاں ہو۔ (اے ہدہد) تو ان کی طرف لوٹ جا اور (ان سے کہہ

بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَ لَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّ

دے کہ) میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان کے پاس آؤں گا۔ ایسا لشکر کہ اس کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہ ہوگی اور

هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۸﴾

میں ان کو اس (ملک سے) (مفتوح ہونے کے بعد) ایسی حالت میں نکال دوں گا کہ وہ بادشاہت (کی عزت) کھو چکے ہوں گے۔

حلّ لُغَات۔ **اَلْقِبَلُ** اَلْقِبَلُ اَلطَّاقَةُ طاقت۔ یُقَالُ مَالِیْ بِهٖ قِبَلٌ۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے مجھے اس کی کوئی طاقت نہیں۔ (اقرب)

صٰغِرُوْنَ صٰغِرُوْنَ صَاغِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور اَلصَّاغِرُ کے معنے ہیں اَلْمُهَانُ وَالرَّاضِیْ بِالذُّلِّ وَالضَّیْمِ یعنی رسوا شدہ۔ وہ شخص جو ذلت اور ظلم پر رضامند ہو جائے گویا یہ لفظ صَغَار سے ہے جس کے معنے ذلت اور ظلم کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ جب درباری اپنا مشورہ پیش کر چکے تو ملکہ سبا نے کہا کہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں نے

یہ سوچا ہے کہ میں انہیں ایک تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے بھیجے ہوئے آدمی کیا جواب لاتے ہیں۔ پھر اس نے ایک تحفہ ہدہد کے سپرد کیا۔ یہ چڑیا اپنی چونچ میں جو معزز تحفہ لے گئی ہوگی معزز قارئین خود ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے بھی اس تحفہ کو دیکھتے ہی کہا کہ کیا تم یعنی ملکہ کے ملک والے لوگ میری مال سے مدد کرنا چاہتے ہو۔

ہُدہُد کی چونچ میں ایک دھیلے کا دسواں حصہ ہی آیا ہوگا۔ جب وہ تحفہ حضرت سلیمانؑ کے آگے رکھا گیا ہوگا تو ان کو کس طرح فوری طور پر یقین آ گیا ہوگا کہ ملکۂ سبا کے پاس ہر قسم کا مال موجود ہے۔ مگر خیر ہدہد جو کچھ لایا ہوگا اس کو ہم خوب سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اسے دیکھ کر حضرت سلیمانؑ بولے کہ یہ کیا حقیر چیز تم میرے پاس لائے ہو۔ خدا نے اس سے بہتر چیزیں مجھے دے رکھی ہیں۔ تمہارے جیسے ذلیل لوگ ہی اس ہدیہ پر خوش ہو سکتے ہیں جس کو ہُدہُد اٹھا لایا ہے۔

پھر فرمایا۔ اے ہُدہُد! ان کی طرف لوٹ جا۔ میں اب ایسا لشکر لے کر ان پر چڑھائی کروں گا جس کے مقابلہ کی طاقت ان میں نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس لشکر میں ہُدہُد بھی ہوں گے۔ چڑیاں بھی ہوں گی۔ پدیاں بھی ہوں گی اور بئے بھی ہوں گے اور میں ملک سبا کے لوگوں کو ملک سبا سے ذلیل کر کے نکال دوں گا۔ اور وہ دیر تک ایسے زبردست لشکر کی ماتحتی میں رہیں گے۔ (صاغر اسم فاعل ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس ہدیہ پر ناراض ہونا درحقیقت اس لئے تھا کہ پرانے زمانے میں بادشاہوں کا یہ طریق تھا کہ وہ زیادہ زبردست بادشاہوں کا مونہہ رشوت سے بند کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ جب بلقیس کے تحائف حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہنچے تو انہوں نے سمجھا کہ اس نے مجھے بھی ایسا ہی بداخلاق اور رشوت خور سمجھا ہے اور اس کے اس فعل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ رشوت کی پیش کش ایسی ہی تھی جیسے مسلمانوں نے جب ایران پر حملہ کیا تو بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا۔ کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ عرب کے رہنے والے میرے ملک پر حملہ آور ہوئے ہوں۔ وہ تو نہایت ذلیل لوگ ہیں۔ انہیں میرے ملک پر حملہ آور ہونے کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔ تم ان کے جرنیل کو پیغام دو۔ کہ مجھ سے آ کر ملے۔ چنانچہ اس کا پیغامبر اسلامی جرنیل کے پاس پہنچا۔ انہوں نے اپنے ایک صحابیؓ افسر کو ایک دستہ کے ہمراہ بادشاہ ایران کے پاس بھیج دیا۔ صحابہؓ کے ہاتھ میں بڑے بڑے نیزے تھے اور دربار میں لاکھوں روپے کی قالینیں بچھی ہوئی تھیں۔ صحابہؓ ان قالینوں پر اپنے نیزے مارتے ہوئے گزر گئے۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا کہ لاکھوں روپے کے قالین ہیں لیکن یہ لوگ ان پر نیزے مارتے ہوئے آ رہے ہیں۔ جب وہ صحابیؓ قریب پہنچ گئے تو بادشاہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کو مجھ پر حملہ آور ہونے کی کس طرح

جرأت ہوئی تم لوگ تو اس قدر ذلیل تھے کہ تم گوہ کا گوشت کھایا کرتے تھے اور اپنی ماؤں سے نکاح کرلیا کرتے تھے۔ میں تمہارا لحاظ کرتے ہوئے تمہارے ہر سپاہی کو ایک ایک اشرفی اور ہر افسر کو دو دو اشرفی دوں گا۔ تم واپس چلے جاؤ۔ اور حملہ کا ارادہ ترک کردو۔ اس صحابیؓ نے جواب دیا۔ بادشاہ! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری یہی حالت تھی۔ ہم گوہ بیں کھاتے تھے اور ماؤں سے نکاح کرلیا کرتے تھے۔ لیکن اب ہماری وہ حالت نہیں رہی۔ اب خدا تعالیٰ نے ہم میں اپنا ایک رسول مبعوث کیا ہے جس نے ہمارا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور اس نے ہمیں حلال اور حرام کی تمیز سکھا دی ہے۔ اب وہ زمانہ چلا گیا جب لوگ ہمیں رشوت دے کر اپنی بات منوا لیتے تھے۔ اب جب تک ہم تمہارا ملک فتح نہ کرلیں گے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بادشاہ نے کہا۔ میں تمہیں اس گستاخی کی سزا دوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک سپاہی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ ایک بورا مٹی سے بھر کر لاؤ۔ جب وہ مٹی کا بورا لے آیا تو اس نے مسلمان افسر سے کہا۔ آگے آؤ۔ وہ آگے آگئے، اس نے کہا۔ نیچے جھکو۔ اس پر وہ نیچے جھک گئے۔ اس نے مٹی کا بورا اس کی پیٹھ پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔ جاؤ میں اس بورے سے زیادہ تمہیں کچھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے تمہیں اشرفیاں پیش کی تھیں۔ لیکن تم نے انہیں قبول نہ کیا۔ اب تمہیں اس مٹی کے بورے کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ صحابیؓ بورا اٹھا کر جلدی سے باہر نکل گئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا آجاؤ۔ بادشاہ ایران نے ایران کی زمین خود اپنے ہاتھ سے ہمارے سپرد کردی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور لشکر کی طرف روانہ ہوگئے۔ مشرک تو وہمی ہوتا ہے۔ ایران کے بادشاہ نے جب یہ بات سنی تو اس نے لوگوں سے کہا جلدی جاؤ اور اس مسلمان افسر سے مٹی کا بورا لے آؤ۔ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی۔ کہ میں نے اپنے ملک کی مٹی اپنے ہاتھ سے ان کے حوالے کردی۔ لیکن وہ اس وقت تک بہت دور نکل چکے تھے (البدایۃ النہایۃ جلد ۷ غزوۃ قادسیۃ)۔

ملکہ سبا نے بھی چاہا کہ کچھ ہدیئے اور تحائف بھجوا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس حملہ سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ مگر انہوں نے ان تحائف کو ردّ کردیا۔ کیونکہ وہ تحفہ نہیں تھے بلکہ ایک رشوت تھی۔

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ

(اس کے بعد) اس نے (اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر) کہا اے درباریو! تم میں سے کون اس کے تخت کو

يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ

میرے پاس لے آئے گا پیشتر اس کے کہ وہ (لوگ) فرمانبردار ہو کر میری خدمت میں حاضر ہوں۔ (پہاڑی

بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ

قوموں میں سے) ایک سرکش سردار نے کہا۔ آپ کے (اس) مقام سے جانے سے پہلے میں وہ (عرش) لے

اَمِیْنٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ

آؤں گا۔ اور میں اس بات پر بڑی قدرت رکھنے والا اور امانت دار ہوں ۔ (اس پر) اُس شخص نے جس کو (الٰہی)

بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا

کتاب کا علم حاصل تھا کہا کہ میں تیرے پاس اس (تخت) کو تیرے آنکھ جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا۔ پس جب

عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۖ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ

اس نے (یعنی سلیمانؑ نے) اس کو پاس رکھا ہوا دیکھا۔ تو اس نے کہا۔ یہ میرے رب کے فضل کی وجہ سے ہوا ہے

اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ

تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں ۔ اور جو شکر کرے وہ اپنی جان کے فائدہ کے لئے

فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ

ایسا کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو یقیناً میرا رب بے نیاز (اور) بڑی سخاوت کرنے والا ہے۔ (پھر) اس نے کہا

اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۲﴾

کہ اس (یعنی ملکہ) کے لئے اس کا عرش حقیر کر کے دکھاؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ ہدایت پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے بنتی ہے جو ہدایت نہیں پاتے۔

حلّ لُغات۔ اَلْعِفْرِیْتُ اَلْعِفْرِیْتُ کے معنے ہیں اَلنَّافِذُ فِی الْاَمْرِ اَلْمُبَالِغُ فِیْهِ مَعَ دَهَاءٍ ۔ کسی کام کو کر گذرنے والا ۔ اَلْخَبِیْثُ الْمُنْكَرُ ۔ بُرا اور ناپسندیدہ ۔ (اقرب)

تفسیر ۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے سوچا کہ ہدہد کے اس لائے ہوئے تحفہ سے تو کچھ نہیں بنتا۔ کوئی

اور چیز منگواؤ۔ اور فرمایا۔ اے میرے سردارو پیشتر اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس فرمانبردار ہوکر آئیں ملکہ کا تخت کون میرے پاس لائے گا۔ وہ لوگ جو خاص باڈی گارڈ تھے ان کا ایک سردار بولا کہ آپ کے چڑھائی کرنے سے پہلے میں وہ تخت لے آؤں گا۔ چونکہ وہ سردار لشکر تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ اس لشکر کا یہاں کتنے عرصہ تک پڑاؤ ہوگا۔ اس لئے اس نے اندازہ کرلیا کہ اتنے دنوں میں ملکہ کو مرعوب کر کے وہ تخت لایا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کیا کہ میں ایک طاقتور سردار ہوں اور اس چھوٹے سے ملک کی فوج میرا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اور میں آپ کا مطیع بھی ہوں۔ اس مال کے لانے میں کسی قسم کی خیانت مجھ سے نہیں ہوگی۔ لیکن ایک اَور شخص جس کو دینی علم حاصل تھا اس نے کہا کہ آپ کے آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے میں وہ تخت لے آؤں گا۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ طرف کے معنے خراج کے ہوتے ہیں۔ مگر میری نظر سے اب تک یہ معنے نہیں گذرے۔ اس لئے جب تک وہ معنے نہ ملیں میں تو یہی کہوں گا کہ اس فقرہ کے وہی معنے ہیں جو عام طور پر بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی جلدی کے۔ چنانچہ جب کسی کام کے جلدی کرنے کا ذکر کرنا ہو تو یہی کہا کرتے ہیں کہ آنکھ جھپکنے میں یہ کام ہوجائے گا یا آنکھ جھپکنے سے پہلے یہ کام ہوجائے گا۔ پس جب ایک سردار نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ملکہ سبا کا تخت اس کی فوج سے لڑ بھڑ کر اس لشکر کے کوچ کرنے سے پہلے لاسکتا ہے۔ تو ایک یہودی عالم بول پڑا اور اس نے کہا کہ وہ تخت میں اس شخص کے تخت لانے سے بھی پہلے حاضر کردیتا ہوں۔ یعنی جتنی دیر میں یہ غیر یہودی سردار یا ادومی یا عرب سردار کام کرے گا اس سے پہلے میں یہ کام کرلوں گا۔ یعنی ایک نیا اور اعلیٰ درجہ کا تخت بنوا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر کردوں گا اور چونکہ وہ یہود کا ملک تھا۔ اس لئے عبرانی عالم کو یقین تھا کہ یہودی ماہرین صنعت میرے لئے بہت جلد یہ کام کردیں گے۔ پس اس نے عفریت سے بھی پہلے عرش لانے کا وعدہ کیا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ تخت پیش کیا گیا۔ اور آپ نے اسے دیکھا تو فرمایا۔ یہ میرے رب کا فضل ہے کہ اس نے ایسے ایسے ہوشیار افسر مجھے عطا کئے ہیں اور میری ہر تمنا پوری ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر گذار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا۔ اور چونکہ سورۂ بقرۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ اس لئے قرآن کریم نے ہی اس بات کی وضاحت کردی کہ ان انعامات کے نتیجہ میں سلیمانؑ شکر گذار بنا تھا ناشکرا نہیں بنا تھا۔

پھر فرماتا ہے کہ شکر گذار بننا خود انسان کے لئے فائدہ بخش ہوتا ہے اور ناشکر گذار ہونے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے اور اسے کسی کی احتیاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی شکر گذاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے پھر پہلے مضمون کی طرف رجوع کیا اور فرمایا کہ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا۔ یہ تخت جو تم لائے ہوئے ہو تو اچھا لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کے تخت سے بھی زیادہ اچھا تخت ہو۔ پس تم ملکہ کے لئے اس کے تخت کو حقیر بنا دو یعنی ایسا تخت بناؤ کہ اسے اپنا تخت حقیر نظر آنے لگے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اس بات کو دیکھ کر تسلیم کر لیتی ہے کہ نہیں کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کے بڑے فضل ہیں یا اپنے گھمنڈ پر قائم رہتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ

پس جب وہ آ گئی تو کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی

اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَ صَدَّهَا مَا

ہے اور ہم کو اس سے پہلے ہی علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم (تیرے) فرمانبردار بن چکے تھے۔ اور اس (یعنی

كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۴﴾

سلیمانؑ) نے ملکہ کو اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرنے سے روکا۔ وہ یقیناً کافر قوم میں سے تھی۔

تفسیر ۔ جب ملکہ آ گئی تو اس سے کہا گیا کہ یہ تخت جو ہمارے بادشاہ کے پاس پڑا ہے کیا تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے۔ اس پر اس کا گھمنڈ اس کے راستہ میں حائل ہو گیا۔ اور بجائے یہ کہنے کہ یہ تو اس سے بہت اعلیٰ ہے اس نے کہا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ویسا ہی تخت ہے۔ مگر پھر کہنے لگی ان تدبیروں کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تو سلیمانؑ کے دین کے حالات سن کر پہلے ہی معلوم کر چکے ہیں کہ اس کا دین سچا ہے۔ اور ہم فرمانبردار بن چکے ہیں۔

تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو ان چیزوں کی پرستش کرنے سے روکا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتی تھی اور اسے وعظ و نصیحت کی کیونکہ وہ کافر قوم میں سے تھی۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ

اور اسے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ۔ پس جب اس نے اس (محل) کو دیکھا تو اس کو گہرا پانی سمجھا

كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ

اور گھبرا گئی۔ تب اس (یعنی سلیمانؑ) نے کہا۔ یہ تو محل ہے جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں۔

قَوَارِيْرَ ۬ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ

تب وہ (ملکہ) بولی۔ اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور میں سلیمانؑ کے ساتھ

سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۴۵ ع

رب العالمین خدا پر ایمان لاتی ہوں۔

حلّ لُغَات۔ اَلصَّرْحُ اَلصَّرْحُ (۱) اَلْقَصْرُ۔ محل۔ (۲) کُلُّ بِنَآءٍ عَالٍ۔ ہر اونچی عمارت۔ (اقرب)

لُجَّةٌ لُجَّةٌ کے معنے ہیں مُعْظَمُ الْمَآءِ۔ گہرا پانی۔ اَلْمِرْآةُ۔ آئینہ۔ اَلْفِضَّةُ۔ چاندی۔ (اقرب)

مُمَرَّدٌ مُمَرَّدٌ مَرَّدَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور مَرَّدَ الْبِنَآءَ کے معنے ہیں مَلَّسَه وَسَوَّاهُ عمارت کو درست اور عمدہ اور نرم بنایا۔ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيْرَ کے معنے ہیں جس پر شیشے لگائے گئے ہوں۔ اور اسے نازک بنایا گیا ہے۔

قَوَارِيْرُ قَوَارِيْرُ قَارُوْرَةٌ کی جمع ہے اور قارورہ کے معنے شیشہ کے ہیں (اقرب) پس قَوَارِيْرُ کے معنے ہوں گے شیشے۔

تفسیر۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو جنوں نے خبر دی کہ اس کی پنڈلیوں پر بکری کی طرح بال ہیں۔ انہوں نے اس بات کی تحقیق کے لئے ایک عظیم الشان محل بنایا۔ اور اس میں ایک بہت بڑا حوض کھدوا کر اسے پانی سے لبریز کر دیا اور پھر اس پر بلور کے ٹکڑوں کا ایسا فرش لگوایا کہ انسانی نگاہ دھوکہ کھا جائے اور وہ یہ سمجھے کہ صحن میں پانی بہہ رہا ہے۔ جب یہ محل تیار ہو گیا۔ تو انہوں نے بلقیس کو وہ محل ٹھہرنے کے لئے پیش کیا۔ جب وہ صحن میں سے گذرنے لگی۔ تو چونکہ فرش پر شیشہ لگا ہوا تھا اور اس

کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے سمجھا کہ سچ مچ پانی بہہ رہا ہے اور گھبرا کر اس نے اپنے کپڑے اُڑس لئے اور پنڈلیاں ننگی کر دیں۔ اس طریق سے آپ نے معلوم کر لیا کہ واقعہ میں اس کی پنڈلیوں پر بال موجود ہیں۔ اور پھر آپ نے ایک بال صفا پوڈر تیار کیا جس سے اس کے بال دور ہوئے (ابن کثیر)۔

بعض کہتے ہیں۔ پنڈلیوں کے بال دیکھنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس قدر انتظام کیا کرنا تھا اصل بات یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے ملکہ کا تخت منگوایا تھا انہیں خیال آیا کہ تخت منگوانے سے میری سبکی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس سبکی کا ازالہ کرنے کے لئے آپ نے یہ محل بنوایا تا کہ اپنی وقعت قائم کر سکیں۔ مگر کیا دنیا کا کوئی بھی سمجھدار انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی اہم ہیں کہ ان کا ذکر خدا تعالیٰ کے کلام میں اور خصوصاً آخری شریعت کلے حامل کلام میں ہونا چاہیے تھا۔ ان باتوں کا تو نہ دین سے تعلق ہے نہ عرفان سے اور نہ خدا تعالیٰ کے انبیاء ایسے لغو کام کیا کرتے ہیں۔ اصل بات صرف اتنی ہے کہ ملکہ سبا ایک مشرکہ عورت تھی اور سورج پرست تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ شرک چھوڑ دے۔ اس کے لئے آپ نے اسے زبانی بھی نصیحت فرمائی۔ مگر پھر آپ نے چاہا کہ عملاً بھی اس کے عقیدہ کی غلطی اس پر ظاہر کریں۔ چنانچہ اس کے لئے آپ نے یہ طریق اختیار کیا کہ اس کے قیام کے لئے آپ نے ایک ایسا محل تجویز فرمایا جس میں شیشہ کا فرش تھا اور اس کے نیچے پانی بہتا تھا۔ جب ملکہ اس کے فرش پر سے گذرنے لگی تو اسے شبہ ہوا کہ یہ پانی ہے اور اس نے جھٹ اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھا لیا یا اسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ (كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا کے یہ دونوں معنے ہیں) اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے تسلی دی اور کہا کہ بی بی! دھوکا مت کھاؤ۔ جسے تم پانی سمجھتی ہو یہ تو دراصل شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے۔ چونکہ پہلے آپ دلائل سے شرک کی غلطی اس پر واضح کر چکے تھے اس نے فوراً سمجھ لیا کہ انہوں نے ایک عملی مثال دے کر مجھ پر شرک کی حقیقت کھول دی ہے اور سمجھایا ہے کہ جس طرح پانی کی جھلک شیشہ میں سے تجھے نظر آئی ہے اور تو نے اسے پانی سمجھ لیا ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کا نور اجرام فلکی میں سے جھلک رہا ہے۔ چنانچہ اس دلیل سے وہ بڑی متاثر ہوئی اور بے اختیار کہہ اٹھی کہ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی اے میرے رب میں نے شرک کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ اب میں سلیمانؑ کے ساتھ یعنی اس کے دین کے مطابق اس خدا پر ایمان لاتی ہوں جو سب جہانوں کا رب ہے اور سورج اور چاند وغیرہ بھی اسی سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا

اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو ضرور رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) کہ اللہ (تعالیٰ) کی

اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ

عبادت کرو۔ پس وہ سنتے ہی دو گروہ ہو گئے جو آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس (یعنی صالحؑ) نے کہا اے میری قوم!

تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا

تم خوشحالی کے آنے سے پہلے خراب حالی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو؟ کیا تم خدا (تعالیٰ) سے اپنے گناہوں پر

تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ

استغفار نہیں کرتے تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ انہوں نے کہا (اے صالح!) ہم نے (جتنا سوچا ہے) تجھے اور تیرے

وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

ساتھیوں کو منحوس ہی پایا ہے (یعنی تم لوگ اپنی قوم کے لئے کسی ترقی کا نہیں بلکہ تباہی کا موجب ہو گے) اس (یعنی

تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

صالح) نے کہا۔ تمہاری نحوست کا سبب تو اللہ کے پاس ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو جس کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔

حلّ لُغَات۔ اِطَّيَّرْنَا اِطَّيَّرْنَا اصل میں تَطَيَّرَ سے ہے اور اس میں قلب اور ادغام کا قاعدہ استعمال ہوا ہے اور تَطَيَّرَ کے معنے ہیں تَشَاءَمَ یعنی نحوست کا اندازہ لگایا یا نحوست محسوس کی۔ اہل عرب کہتے ہیں اِطَّيَّرَ بِهٖ وَاِطَّيَّرَ مِنْهُ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے نحوست کے آثار دیکھے (اقرب)

طَائِرُكُمْ طَائِر کے معنے پرندے کے ہیں۔ لیکن عرب لوگ چونکہ پرندوں سے شگون لیا کرتے تھے اس لئے شگون کے لئے بھی طَائِر کا لفظ بول لیا جاتا ہے چنانچہ مسافر کو رخصت کرتے وقت دعا کے طور پر کہتے ہیں سِرْ عَلَى الطَّائِرِ الْمَيْمُوْنِ۔ مبارک شگون پر چل۔ اسی طرح کہتے ہیں هُوَ مَيْمُوْنُ الطَّائِرِ۔ اور مراد یہ ہوتی

ہے کہ وہ مبارک چہرے والا ہے ۔اسی طرح انسانی اعمال کوبھی خواہ وہ اچھے ہوں یا برے طائر کہتے ہیں ۔اورستارے کوبھی طائر کہتے ہیں کیونکہ ستاروں سے بھی نحوست اور بھلائی کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں (اقرب)

تُفْتَنُوْنَ فُتِنَ الرَّجُلُ فِيْ دِيْنِهٖ کے معنے ہوتے ہیں مَالَ عَنْهُ۔اپنے دین سے علیحدہ ہوگیا اورفُتِنَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ۔ فَذَهَبَ مَالُهٗ أَوْعَقْلُهٗ۔اس پر کوئی مصیبت نازل ہوئی جس کی وجہ سے اس کا مال یااس کی عقل جاتی رہی۔

تفسیر ۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ ثمود کا ذکر فرماتا ہے۔یہ قوم یہود کی ترقی کے زمانہ سے پہلے گذر چکی تھی اور حضرت موسیٰ ؑ کے قریب زمانہ کی تھی۔مگر اس کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے بعد اوران کے واقعہ سے ملا کر اس لئے کیا گیا ہے کہ ثمود کی قوم کا بہت سا علاقہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت آ گیا تھا۔

قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ تاریخوں کے لحاظ سے واقعات بیان کرے۔قرآن کریم مذہب اور تمدن کی کتاب ہے۔اس لئے مذہب اور تمدن کے لحاظ سے جو واسطہ مختلف قوموں میں تھااس کے لحاظ سے وہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ ثمود جو پہلے گذرے تھے مگران کا علاقہ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت آ گیا تھا۔ اور یہودی تمدن نے ان پر اثر ڈال لیا تھا اورانہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت قبول کر لی تھی اس لئے ان کی قوم کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوم کے بعد کر دیا گیا۔کیونکہ درحقیقت جن لوگوں کا نام جنّ رکھا گیا ہے وہ ثمود کی قوم کے ہی لوگ تھے ۔جنہیں ایک غیر قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے جنّ کہہ دیا گیا۔پس چونکہ ان کی زنجیر یہودیوں کی زنجیر میں مل گئی تھی اوران کا ایک ادنیٰ حصہ ہوگئی تھی اس لئے ان کا ذکر یہودیوں کے ذکر کے بعد کیا گیا۔

قومِ ثمود کے متعلق فرماتا ہے کہ ان کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں توحید کی تعلیم دی تھی۔مگر بجائے اس کے کہ وہ اس کی آواز کو سنتے اوراس پر لبیک کہتے انہوں نے جھگڑااورفساد شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں دوگروہ ہوگئے ۔کچھ لوگوں نے تو حضرت صالح علیہ السلام کو مان لیا۔اور کچھ لوگوں نے انکار کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ثمود عاد کے قائم مقام تھے اور یہ لوگ عرب کے جنوب سے بڑھتے ہوئے عرب کے شمال کے تمام علاقوں میں پھیل گئے تھے۔اور بہت سی موحّد قوموں کا ان سے تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ''فتوح الشام''

کا مصنف ابو اسمٰعیل لکھتا ہے کہ ثمود قوم بصریٰ سے لے کر (جو شام کا ایک شہر ہے) عدن تک پھیلی ہوئی تھی اور وہیں ان کی حکومت تھی۔ پھر حمیر اور سبا کی طاقت کے زمانہ میں جب ان کو ہجرت کرنی پڑی تو اس وقت وہ جنوب سے شمال کو نکل گئے۔ چنانچہ پہلے حجاز پھر تہامہ اور پھر حجر میں چلے گئے (عرض القرآن صفحہ ۱۸۸)۔ پس وہ لوگ جو توحید کے زیر اثر تھے انہوں نے تو حضرت صالح علیہ السلام کو مان لیا۔ مگر جو توحید سے دور علاقہ کے رہنے والے تھے انہوں نے آپ کی سخت مخالفت کی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں سمجھایا مگر بجائے اس کے کہ وہ نصیحت حاصل کرتے انہوں نے کہا اے صالح! ہم تو تجھے سبز قدم سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ تیری تعلیم سے جو ہماری قوم میں تفرقہ پیدا ہوا ہے یہ ہماری قوم کو تباہ کر دے گا۔ ان نادانوں نے یہ نہ سمجھا کہ صالحؑ ہمیں زندہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ یہ ہمیں قعرِ مذلّت سے اٹھا کر بام رفعت پر پہنچانے کے لئے آیا ہے۔ انہوں نے صرف یہ دیکھ کر کہ صالحؑ کے آنے سے قوم کے اندر ایک ہلچل پیدا ہوگئی ہے اور کچھ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ہم ایک غلط راستہ پر چل رہے تھے اب ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور برے اعمال سے اجتناب اختیار کرنا چاہیے۔ یہ کہنا شروع کر دیا کہ قوم میں یہ بگاڑ صرف صالحؑ کی نحوست کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر صالح نہ آتا تو ہماری یکجہتی کو یہ صدمہ نہ پہنچتا۔ حالانکہ مردہ انسان خواہ لاکھوں بھی ہوں دنیا میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا کرتے۔ تغیر ہمیشہ زندہ وجودوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے خواہ ان کی کتنی ہی قلیل تعداد کیوں نہ ہو۔ صالحؑ کے آنے سے پہلے وہ لوگ مردہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کے ذریعہ ان کی اصلاح کا سامان کیا۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ اس سامان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے انہوں نے حضرت صالحؑ کو قوم کا بیڑہ غرق کرنے والا قرار دے دیا۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے توحید کے قیام کے لئے کھڑا کیا تھا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے تفرقہ انداز قرار دیا تھا۔ اسی طرح کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا قرار دیا۔ بلکہ وہ ایک دفعہ حضرت ابوطالب کے پاس محض اس لئے آئے کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں اور انہیں توحید کی اشاعت سے روکنے کی کوشش کریں۔ کفار مکہ کی یہ گھبراہٹ بالکل ویسی ہی تھی جیسے حضرت صالحؑ کے زمانے میں ان کے مخالفین نے جب انہیں توحید کی تعلیم دیتے دیکھا تو انہوں نے بگڑ کر حضرت صالحؑ کو منحوس اور سبز قدم کہنا شروع کر دیا۔ مگر نہ حضرت صالحؑ نے خدائے واحد کا پیغام پہنچانا ترک کیا اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی تعلیم ترک کی۔ اور آخر اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک دن مردہ عرب زندہ ہو گیا۔ آخر ایک زندہ اور مردہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق ہوتا ہے کہ مردہ کو کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے اس کے کسی عزیز ترین وجود

کو گالی دی جائے یا اسے قتل کر دیا جائے وہ دفاع کے لئے کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔نہ اس ظلم کا اسے کچھ احساس ہوتا ہے۔لیکن زندہ انسان اپنے نفع اور نقصان کو بھی سمجھتا ہے۔اور دوسروں کے حقوق کے لئے بھی جدو جہد کرتا ہے۔ یہی کیفیت روحانی مردوں میں بھی پائی جاتی ہے وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہر قسم کے مظالم دیکھتے ہیں لوگ ان کے سامنے جھوٹ بولتے ہیں۔ان کی موجودگی میں دھوکہ بازیاں کرتے ہیں۔ان کی آنکھوں کے سامنے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں۔مگر انہیں پرواہ تک نہیں ہوتی مگر جب اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی دنیا میں آتا ہے تو وہ کہتا ہے اگر تم کسی کو جھوٹ بولتے دیکھو تو اسے منع کرو۔اگر کوئی ظلم کر رہا ہو تو اسے ظلم سے روکو۔بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب مومن کوئی بری بات دیکھے تو ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے۔اور اگر ہاتھ سے ازالہ نہ کر سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکتا ہو تو اپنے دل میں ہی بُرا منائے۔مگر روحانی مردوں میں یہ تینوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔وہ برائی ظلم اور جھوٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔مگر نہ تو وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرتے ہیں نہ زبان سے کسی کو منع کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے برے فعل پر اپنے دل میں ہی برا مناتے ہیں (مسلم کتاب الایمان باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان)۔بے شک بعض دفعہ وہ دکھاوے کے طور پر زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں۔مگر کہتے وقت ان کے چہرے پر غیرت کے آثار نہیں پائے جاتے۔ مگر زندہ انسان کی یہ علامت ہے کہ اس کے اندر ان تینوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی۔وہ بری بات کو دیکھ کر یا تو ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے گا۔یا زبان سے دوسرے کو روکے گا۔اور یا پھر دل میں ہی برا منائے گا۔

اس کی ایک نمایاں مثال حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ ہے۔حضرت عثمان بن مظعونؓ چھوٹی عمر میں ہی اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔تو عثمان بن مظعونؓ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔جب وہ تیار ہو گئے تو مکہ کے ایک رئیس نے ان سے کہا کہ تمہارا باپ میرا دوست تھا اور وہ میرا بھائی بنا ہوا تھا۔اگر تم اس وجہ سے ہجرت کر رہے ہو کہ لوگ تمہیں تکلیفیں دیتے ہیں تو میں سارے شہر میں اعلان کر دیتا ہوں کہ عثمان آج سے میری پناہ میں ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔حضرت عثمان بن مظعونؓ نے اس کی بات مان لی۔اور اس نے دستور کے مطابق اعلان کر دیا کہ میں عثمانؓ کو پناہ دیتا ہوں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انہیں تکلیفیں پہنچانے سے رک گئے۔اور وہ آزادانہ طور پر ادھر ادھر پھرنے لگے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مکہ کے لوگ دوسرے مسلمانوں پر برابر ظلم کر رہے ہیں تو ان کی غیرت نے یہ برداشت نہ کیا کہ وہ آرام سے پھرتے رہیں اور ان کے بھائی اسلام کی وجہ سے تکلیفیں اٹھائیں۔وہ

اس رئیس کے پاس پھر آئے اور کہنے لگے کہ اپنی پناہ واپس لے لو۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا کہ میرے بھائیوں پر ظلم ہو اور میں آرام سے پھروں۔ اس نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور آخر اس نے اعلان کر دیا کہ آج سے عثمانؓ میری حفاظت میں نہیں ہے۔ اس اعلان کے کچھ دن بعد عکاظ کا میلہ لگا اور لبید جو ایک بہت بڑے شاعر گذرے ہیں انہوں نے ایک مجلس میں اپنا قصیدہ سنانا شروع کیا۔ مکہ کے بڑے بڑے عمائد اور رؤساء بیٹھے شعر سن رہے تھے اور جھوم جھوم کر اس کے شعروں کی داد دے رہے تھے کہ لبید نے یہ مصرع پڑھا ؎

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٗ

یعنی سنو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔ یہ مصرع سنتے ہی حضرت عثمان بن مظعونؓ نے اونچی آواز سے کہا کہ بالکل درست ہے۔ تم نے سچ کہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔ وہ شاعر عثمانؓ سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اسی سال کے قریب تھی اور بعد میں وہ ایک سو بیس سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ سال کی عمر کے بچے نے اس کے شعر کی داد دی ہے تو چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑا کُہنہ مشق اور نہایت تجربہ کار سمجھتا تھا اس کو ایک اٹھارہ سالہ بچے کا داد دینا چبھا اور اس نے رؤساء سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے مکہ والو! کیا تم میں اب کوئی ادب باقی نہیں رہا۔ اس لڑکے نے مجھے کیوں داد دی ہے۔ اس کا داد دینا بتاتا ہے کہ اب تم میں اپنے شاعروں کا کوئی ادب باقی نہیں رہا۔ اس پر لوگوں نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ڈانٹا اور انہیں کہا کہ بڑوں کی مجلس میں بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ تم خاموش بیٹھو اور شعر سنو۔ اس کے بعد لبید نے اسی شعر کا اگلا مصرع پڑھا کہ ؎

وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٗ

یعنی ہر نعمت آخر ایک دن زائل ہونے والی ہے۔ یہ مصرعہ سن کر حضرت عثمان بن مظعونؓ پھر بول اٹھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوتیں۔ اب وہ شخص جس نے عثمانؓ کے داد دینے پر بھی برا منایا تھا وہ ان کی مذمت کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے شعر سنانے بند کر دیئے اور کہا کہ میں ایسی مجلس میں آئندہ کوئی شعر سنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس پر ایک شخص بڑے جوش سے اٹھا اور اس نے عثمان بن مظعونؓ کو گھونسہ مارا جو سیدھا ان کی آنکھ میں لگا اور ان کی آنکھ کا ایک ڈیلا باہر نکل آیا۔ وہ رئیس جس نے پہلے انہیں پناہ دی تھی وہ بھی اسی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا وہ رؤساء کی موجودگی میں اتنی جرأت تو نہیں کر سکتا تھا کہ کھلم کھلا عثمانؓ کی حمایت کرتا مگر جیسے کسی نوکر کا بچہ اگر آقا کے بچے سے لڑ پڑے اور آقا کا بچہ نوکر کے بچے کو مارے تو نوکر اپنے بچے کو ہی ڈانٹنا شروع

کر دیتا ہے۔اسی طرح اس رئیس نے بھی حضرت عثمانؓ کو دیکھا اور غصہ سے کہا۔ میں نہیں کہتا تھا کہ میری پناہ میں سے نہ نکلو۔اب دیکھا پناہ میں سے نکلنے کا کیا مزہ آیا۔اب بظاہر تو یہ الفاظ غصہ والے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت ان میں محبت کی ایک جھلک پائی جاتی تھی ۔ جب اس رئیس نے یہ بات کہی تو عثمان بن مظعونؓ نے جواب دیا کہ اگر میری ایک آنکھ نکل گئی تو کیا ہوا۔خدا کی قسم میری تو دوسری آنکھ بھی اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ اسے خدا کی راہ میں نکلنے کا کب موقعہ ملتا ہے۔ یہ وہ نئی زندگی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ صحابہؓ کو ملی اور جس نے انہیں ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں ابوجہل کے سامنے ہر قسم کے برے کام کئے جاتے تھے مگر وہ انہیں ہنسی خوشی برداشت کر لیتا تھا۔ابوجہل کے برداشت کر لینے اور صحابہؓ کے برداشت نہ کر سکنے کی وجہ یہی ہے کہ ابوجہل مردہ تھا اور صحابہؓ زندہ تھے ۔پھر صحابہ کی زندگی کا اس امر سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ مکہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے رکھی گئی تھی ۔مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مکہ کے لوگ کولھو کے بیل کی طرح صرف ایک ہی جگہ چکر کاٹتے رہے اور عرب سے کبھی باہر نہیں نکلے ۔مگر جونہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی ۔وہ ایک قلیل عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئے حالانکہ صحابہؓ انہی لوگوں کی اولاد تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک جو اڑھائی ہزار سال کا لمبا عرصہ بنتا ہے ساکت اور جامد بیٹھے رہے اور کولھو کے بیل کی طرح عرب کے اندر ہی چکر کاٹتے رہے لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر زندگی کی ایک نئی روح پھونکی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے چین، سپین، سسلی، اٹلی، افریقہ اور روس کی سرحدوں تک جا پہنچے۔اور ابھی آدھی صدی بھی نہیں گذری تھی کہ مسلمان ساری دنیا پر چھا گئے ۔یہی وہ زندگی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو عطا ہوئی اور یہی وہ زندگی تھی جس کا جام ہر نبی کو دیا گیا۔اور انہوں نے چاہا کہ روحانی لحاظ سے سڑے گلے مردے بھی وہ جام اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک نئی زندگی حاصل کریں ۔مگر اس لئے کہ انبیاء ایک نیا نظام جاری کرتے ہیں اور ہر نظام اپنے ساتھ ایک انقلاب وابستہ رکھتا ہے وہ لوگ جو روحانیت کے دشمن ہوتے ہیں ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔اور انہیں ہر قسم کی نحوستوں کا موجب قرار دے دیتے ہیں۔موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب بانی سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے مطابق طاعون اور زلازل سے اموات ہوئیں تو گو ایک طبقہ نے ہدایت حاصل کی مگر کچھ لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ یہ بلائیں اور وبائیں محض مرزا صاحب کی نحوست کی وجہ سے آرہی ہیں۔اگر یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ نہ کرتے

تو دنیا پر یہ عذاب کیوں آتے۔ یہی بات حضرت صالح علیہ السلام کے مخالفین نے بھی کہی کہ یہ سب تیری نحوست کا نتیجہ ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کی بات سن کر کہا۔ کہ تمہارا نحس اور مبارک شگون تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اس کو سزا پر آمادہ کرو گے تو وہ تمہیں سزا دے گا اور انعام پر آمادہ کرو گے تو انعام دے گا۔ لیکن مجھے بھی تمہاری خیر نظر نہیں آتی۔ کیونکہ تم ایک ایسی قوم ہو جو سچے دین کو چھوڑ بیٹھی ہے۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم سزا ہی پاؤ گے۔

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي

اور شہر میں نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ

انہوں نے کہا کہ تم سب اس پر اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاؤ کہ ہم اس کے

لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا

اور اس گھر والوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے۔ پھر جو بھی اس کے خون کا مطالبہ کرنے آئے گا

مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا

ہم اس سے کہیں گے کہ ہم نے اس کے اہل کی ہلاکت (کے واقعہ) کو نہیں دیکھا اور ہم سچے ہیں۔

مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اور انہوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور وہ جانتے نہیں تھے۔ پھر دیکھ ان کی تدبیر کا نتیجہ

مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۲﴾ فَتِلْكَ

کیا نکلا۔ ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پس (دیکھ) یہ ان کے گھر ہیں جو ان کے ظلموں

بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ

کی وجہ سے گرے ہوئے ہیں۔ اس میں علم والی قوم کے لئے بڑا نشان ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے تھے نجات دی۔

حلّ لُغَات۔رَھْطٌ اَلرَّھْطُ کے معنے ہیں ۔قَوْمُ الرَّجُلِ وَقَبِیْلَتُهٗ۔یعنی قوم اور قبیلہ۔وَعَدَدٌ یُجْمَعُ مِنَ الثَّلٰثَةِ اِلَى الْعَشَرَةِ وَ لَيْسَ فِيْهِمُ امْرَاَةٌ۔اور تین سے دس تک کے عدد کی گنتی جس میں کوئی عورت نہ ہو اسے بھی رَھْط کہتے ہیں۔(اقرب)

لَنُبَیِّتَنَّهٗ لِنُبَیِّتَنَّهٗ بَیَّتَ سے فعل مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔اور بَیَّتَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں عَمِلَهٗ اَوْ دَبَّرَهٗ لَيْلًا ۔رات کو کام کیا۔یا اس کام کے کرنے کے متعلق رات کو تدبیر کی (اقرب) پس نُبَیِّتَنَّهٗ کے معنے ہوں گے ہم اس کی ہلاکت کے متعلق رات کو تدبیر کریں گے۔

دَمَّرْنَا دَمَّرْنَا دَمَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَھُمْ وَعَلَيْهِمْ کے معنے ہیں اَھْلَکَھُمْ ۔ان کو ہلاک کیا۔(اقرب)

خَاوِيَةً خَاوِیَةً خَوٰی سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور خَوَتِ الدَّارُ کے معنے ہیں سَقَطَتْ وَتَهَدَّمَتْ۔مکان گر گیا اور تباہ ہو گیا اور خَوِيَتِ الدَّارُ کے معنے ہوتے ہیں خَلَتْ مِنْ اَهْلِهَا۔رہنے والوں سے گھر خالی ہو گیا۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے۔حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس شہر میں مبعوث فرمایا تھا اس میں قوم ثمود کے نو ائمۃ الکفر رہتے تھے جو رات دن تخریبی سرگرمیوں میں مشغول رہتے تھے اور حضرت صالحؑ کے مشن کو نقصان پہنچانے اور آپ کی اشاعت توحید کی مساعی کو ناکام بنانے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔اگر وہ اپنی بڑائی اور عزت کو اصلاحی کاموں میں صرف کرتے اور لوگوں کو صلاحیت اور رشد کے راستہ پر چلانے کی کوشش کرتے تو ان کی عزت میں اَور بھی اضافہ ہو جاتا۔مگر انہوں نے اس راستہ پر قدم مارا جو انہیں ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔چنانچہ ایک دن انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ آؤ اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر معاہدہ کرو کہ ایک رات ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے اہل و عیال پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں گے اور پھر جب اس کے ورثاء ہم سے خون بہا مانگیں گے تو ہم ان سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے اس کے اور اس کے اہل کے قتل کے واقعہ کو دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔اس طرح انہوں نے حضرت صالحؑ کی تباہی کا منصوبہ سوچا۔مگر انہیں معلوم نہیں

تھا کہ آسمان پر ایک خدا موجود ہے جو صالحؑ کی حفاظت کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی تدبیریں کیں مگر ان کے بالمقابل ہم نے بھی تدبیریں کیں اور وہ ہماری تدبیروں کو کہاں سمجھ سکتے تھے۔ وہ اسی دھوکا میں مبتلا رہے کہ صالح کے قتل کے منصوبے میں انہیں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اور وہ سمجھ بھی نہ سکے کہ آسمانی تدبیر غالب آ رہی ہے اور ان کی تدبیر ناکام جا رہی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ ان کی تدبیروں کے باوجود ہم نے ان نو آدمیوں کو بھی اور ان کی قوم کے تمام چھوٹوں اور بڑوں کو بھی جو اس قاتلانہ منصوبہ میں ان کے شریک تھے یا ان کی ہمدردی انہیں حاصل تھی اپنے عذاب کا نشانہ بنا دیا اور ان سب کو تباہ و برباد کر دیا۔ تمہارے سامنے ان کی اجڑی ہوئی بستیاں اور گرے ہوئے مکانات اور مکینوں سے خالی مکان موجود ہیں جو لوگوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اور اس میں عقل اور دانش رکھنے والی قوم کے لئے بڑا بھاری نشان ہے۔ مگر جو لوگ صالحؑ پر ایمان لائے تھے اور جنہوں نے تقویٰ اور طہارت میں اپنی عمر بسر کی تھی ہم نے ان کو اس عذاب سے بچا لیا اور ان کی ترقی کے سامان پیدا کئے۔

قوم ثمود کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح حضرت صالحؑ کے قتل کے لئے ان کی قوم کے نو ائمۃ الکفر نے ایک خطرناک سازش کی تھی۔ اسی طرح مکہ کے نو ائمۃ الکفر بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے باہم معاہدہ کریں گے اور آخر وہ اسی فیصلہ پر پہنچیں گے کہ تمام قبائل مل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیں۔ مگر جس طرح حضرت صالحؑ کے دشمن ناکام رہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ مکہ کے ائمۃ الکفر کو بھی ناکام کرے گا۔ اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دی اور انہیں عذاب کے مقام سے نکال کر لے گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بھی دشمن کے نرغہ سے نکال کر مدینہ لے جائے گا اور آپ کی کامیابی اور فتوحات کا دروازہ کھول دے گا۔

ہر شخص جو تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ کس طرح یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی جس طرح حضرت صالحؑ کے زمانہ میں نو بڑے بھاری مفسد تھے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ عیہ وسلم کے مقابلہ میں نو ہی ائمۃ الکفر تھے۔

(۱) سب سے بڑا مفسد جو گو یا رأس المعاندین تھا ابوجہل تھا جسے مکہ والے ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ کہا کرتے تھے (۲) دوسرا مفسد ابولہب تھا (۳) تیسرا مفسد امیہ بن خلف تھا۔ (۴) چوتھا مفسد النضر بن الحارث تھا (۵) پانچواں مفسد عقبہ بن ابی معیط تھا (۶) چھٹا مفسد ولید بن مغیرہ تھا (۷) ساتواں مفسد عاص بن وائل تھا (۸) آٹھواں مفسد

عتبہ تھا اور (۹) نواں مفسد شیبہ تھا۔

ان میں سے ابوجہل۔امیہ۔عقبہ بن ابی معیط، عتبہ اور شیبہ پانچوں جنگ بدر میں مارے گئے۔النضر ابن الحارث جنگ بدر میں قید ہوا۔اور پھر اپنے جرائم کی پاداش میں مارا گیا۔ولید ہجرت کے تین ماہ بعد پاؤں میں تیر چبھ جانے کی وجہ سے ہلاک ہوا۔عاص بن وائل ہجرت کے دوسرے ماہ اچانک پاؤں سوجھ جانے سے مر گیا اور ابولہب جنگ بدر کے تھوڑا عرصہ بعد مکہ میں بیمار ہو کر ہلاک ہوا (بخاری کتاب المغازی باب دعاء النبی علی کفار قریش)۔

ان لوگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو نقصان پہنچانے اور آپ کو جسمانی رنگ میں بھی ہر رنگ کا دکھ پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور پھر انہوں نے یہیں تک بس نہ کی بلکہ ایک دن قریش مکہ کے تمام رؤساء دارالندوہ میں جمع ہوئے۔اور انہوں نے کہا کہ اب ہمیں اسلام کے مٹانے کے لئے متحدہ طور پر کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔اور آخر ابوجہل کی اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک نوجوان چنا جائے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک تلوار دے دی جائے۔پھر یہ سارے کے سارے اکٹھے ہو کر ایک رات محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیں۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ چونکہ تمام قبائل کے چنیدہ نوجوان اس میں شریک ہوں گے۔اس لئے بنو عبد مناف کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ساری قوم کے ساتھ لڑ سکیں۔وہ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ خون بہا مانگ لیں۔سو وہ ہم دے دیں گے۔غرض انہوں نے یہ تدبیر کی اور اپنے دل میں خوش ہوئے کہ اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے مگر جس خدا نے حضرت صالحؑ اور ان پر ایمان لانے والے مخلصین کو دشمنوں کی سازش سے محفوظ رکھا تھا اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچاؤ کے متعلق بھی تدبیر کی۔اور ادھر تو وہ یہ منصوبہ کر کے باہر نکلے اور ادھر خدا نے اس منصوبہ کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی اور آپ کو ہجرت کی اجازت مل گئی (سیرۃ لابن ھشام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔یہ ہجرت کی اجازت درحقیقت اسلام کے غلبہ کی ایک عظیم الشان بنیاد تھی اسی ہجرت کے نتیجہ میں جنگ بدر کی صورت میں اہل مکہ پر وہ عذاب آیا جس نے ان کی طاقت کو بالکل توڑ کر رکھ دیا۔اور پھر دوسرا عذاب ان پر اس وقت آیا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ کو فتح کر لیا۔مکہ والوں پر جو یہ عذاب آیا۔وہ ان کے لئے نہایت دردناک تھا۔مکہ کے رؤساء کو لوگوں میں اس قسم کی عزت اور عظمت حاصل تھی کہ لوگ ان کے سامنے بات تک کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے اور ان کے احسانات بھی لوگوں پر اس کثرت کے ساتھ تھے کہ کوئی ان کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ان کی اس عظمت کا پتہ اس واقعہ سے لگ سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جس سردار کو مکہ والوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا دیا۔ یہ دیکھ کر ایک صحابیؓ نے اپنی تلوار کا کندہ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو مت لگا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تا کہ معلوم کرے کہ یہ کون شخص ہے جس نے میرے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مارا ہے۔ صحابہؓ چونکہ خود پہنے ہوئے تھے اس لئے ان کی صرف آنکھیں اور اس کے حلقے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر غور کر کے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ تم فلاں شخص ہو۔ انہوں نے کہا۔ ہاں! اس نے کہا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے فلاں موقعہ پر تمہارے خاندان کو فلاں مصیبت سے نجات دی تھی۔ اور فلاں موقع پر تم پر فلاں احسان کیا تھا۔ کیا تم میرے سامنے بولتے ہو۔ اب تو احسان فراموشی کا مادہ لوگوں میں اس قدر عام ہو چکا ہے کہ کسی پر صبح کو احسان کرو تو شام کو وہ بھول جاتا ہے اور شام کو کرو تو صبح کو بھول جاتا ہے اور کہتا ہے کیا میں اب ساری عمر اس کا غلام ہی بنا رہوں۔ وہ ساری عمر کے احسانات چھوڑ ایک رات کے احسان کی قدر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر عربوں میں احسان مندی کا جذبہ بدرجہ کمال پایا جاتا تھا جب اس نے اپنے احسانات گنوائے تو گو یہ ایک نہایت ہی نازک موقعہ تھا مگر پھر بھی اس صحابیؓ کی نظریں زمین میں گڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اس پر پھر اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنی شروع کر دیں اور کہا۔ میں عرب کا باپ ہوں۔ میں تمہاری منّت کرتا ہوں کہ تم اپنی قوم کی عزت رکھ لو۔ اور دیکھو یہ جو تمہارے اردگرد جمع ہیں یہ تو مصیبت آنے پر فوراً بھاگ جائیں گے اور تمہارے کام آخر تمہاری قوم ہی آئے گی۔ پس کیوں اپنی قوم کو ذلیل کرتے ہو اسی دوران میں اس نے اپنی بات پر زور دینے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منوانے کی خاطر آپ کی ریش مبارک کو پھر ہاتھ لگا دیا۔ اور گو آپ کی ریش مبارک کو اس کا ہاتھ لگانا لجاجت کے رنگ میں ہی تھا اور اس لئے تھا کہ آپ سے وہ اپنی بات منوائے مگر چونکہ اس میں تحقیر کا پہلو بھی پایا جاتا تھا۔ اس لئے صحابہؓ اسے برداشت نہ کر سکے۔ اور جونہی اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا۔ پھر کسی شخص نے زور سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف مت بڑھا۔ اس نے پھر آنکھ اٹھائی اور غور سے دیکھتا رہا کہ یہ کون شخص ہے جس نے مجھے روکا اور آخر پہچان کر اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا ابو بکرؓ! میں جانتا ہوں کہ تم پر میرا کوئی احسان نہیں (بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد و سیرۃ لابن ہشام امر حدیبیہ)۔ پس وہ دوسروں پر اس قدر احسان کرنے والی قوم تھی کہ سوائے حضرت ابو بکرؓ کے جس قدر انصار اور مہاجر وہاں تھے ان سب پر اس رئیس کا کوئی نہ کوئی احسان تھا۔ اور حضرت ابو بکرؓ کے سوا اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے ہاتھ کو روک سکے۔ اب ایک تو وہ

زمانہ تھا کہ اہل مکہ کو اس قدر عزت حاصل تھی کہ ان کا ایک سردار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتا ہے اور آپ کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا کر کہتا ہے۔ میں عرب کا باپ ہوں۔ میری بات مان لو۔ اور جب وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتا ہے تو سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اَور کوئی صحابیؓ جرأت نہیں کرسکتا کہ اسے روکے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر رؤساء مکہ کا کوئی نہ کوئی احسان تھا۔ اور یا پھر وہ زمانہ آیا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو یہ تمام رؤساء مجرموں کی طرح آپ کے سامنے پیش کئے گئے اور آپ نے ان سے پوچھا۔ کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اس وقت ان لوگوں نے نہایت ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اپنے سر جھکا لئے اور کہا کہ ہم آپ سے اسی سلوک کی امید رکھتے ہیں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا (سیرۃ لابن ھشام ذکر اسباب الموجبۃ للمسیر)۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کا مکہ سے نکالا جانا حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کی طرح بڑی بھاری کامیابیاں اور فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اسلام مکہ سے نکل کر عرب میں اور پھر عرب سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گیا اور مشرکین مکہ کا نشان تک باقی نہ رہا۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ

اور (ہم نے) لوطؑ کو (بھی رسول بنا کر بھیجا) جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم بدیاں کرتے ہو۔

تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ

اور تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں کے پاس شہوت کی نیت سے آتے ہو۔

النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ

حقیقت یہ ہے کہ تم ایک جاہل قوم ہو۔ پس اس کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ (اے لوگو!)

قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ

لوط کے خاندان کو اپنے شہر سے نکال دو۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو بڑا نیک بننا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے

اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا

اس (یعنی لوطؑ) کو اور اس کے خاندان کے لوگوں کو سوائے اس کی بیوی کے نجات دی۔ ہم نے اس (یعنی بیوی)

اِمْرَاَتَهٗ ١٘ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۞ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ

کو پیچھے رہنے والوں میں گن چھوڑا تھا۔اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی۔اور جن کو عذاب کا پیغام

مَّطَرًا ج فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۞ ع

پہنچ چکا ہوان کی بارش بہت بری ہوتی ہے۔

ع ۱۴ / ۱۹

حل لغات۔غٰبِرِيْنَ غَابِرِيْنَ غَابِرٌ کی جمع ہے اور اَلْغَابِرُ کے معنے ہیں اَلْبَاقِیْ۔باقی رہنے والا۔نیز اَلْغِبْرُ کے معنے ہیں اَلْحِقْدُ۔کینہ۔(اقرب) پس غَابِر کے معنے ہوں گے باقی رہنے والا یا کینہ رکھنے والا۔

تفسیر۔قوم ثمود کی ہلاکت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان فرماتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے گذر چکے تھے یعنی حضرت سلیمانؑ موسیٰ علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جو آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جن کے لوطؑ چچازاد بھائی تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ یہاں اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ ان کے واقعہ کو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے واقعہ سے مشابہت ہے۔حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی رات کے وقت منصوبہ کر کے ان پر حملہ کرنا چاہا تھا۔اور لوطؑ کی قوم نے بھی رات کے وقت منصوبہ کر کے ان کو گھر سے نکالنا اور ان کے مہمانوں کو ذلیل کرنا چاہا تھا۔اسی مشابہت کی وجہ سے اس واقعہ کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔اور درحقیقت یہ تمام واقعات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور پیشگوئی بیان کئے جارہے ہیں۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی حضرت لوطؑ کی قسم کا واقعہ پیش آیا۔حضرت لوطؑ کی قوم نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ ان کو ان کے شہر سے نکال دیں۔یہی فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی کیا تھا اور دونوں کا الزام ایک تھا گو وجوہ مختلف تھے۔دونوں کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہم سے زیادہ پاکیزہ قرار دیتے ہیں مگر ہوا یہ کہ خدا نے لوطؑ اور اس کے اہل کو سوائے اس کی بیوی کے بچالیا۔کیونکہ وہ آپ کے مخالفوں میں سے تھی۔اور وہ آپ کی تعلیم سے کینہ اور بغض رکھتی تھی۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بچالیا اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ بھی محفوظ رہے۔پس اس آیت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ یقیناً آپ کے اہل میں شامل ہیں۔بیشک حضرت لوطؑ کے متعلق یہ بھی آتا ہے کہ ان کی بیوی پیچھے رہ گئی۔مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام چونکہ حضرت لوطؑ سے بہت بالا تھا اس لئے آپ کی کوئی

بیوی ان معنوں میں پیچھے نہیں رہی تھی جن معنوں میں کہ حضرت لوطؑ کی بیوی پیچھے رہی تھی۔ کوئی بیوی اپنی مرضی سے پیچھے نہیں رہی اور کوئی بیوی دائمی طور پر پیچھے نہیں رہی اور نہ کوئی بیوی کسی عذاب میں مبتلا ہوئی بلکہ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں بعد میں مدینہ پہنچ گئیں۔ حضرت سودہؓ اور آپ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو تو حضرت زیدؓ لے آئے۔ جنہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف میں لاتے ہی دو اونٹ اور پانچسو درہم دے کر مکہ بھجوایا تھا تا کہ وہ آپ کی بیٹیوں اور ازواجِ مطہرات کو لے آئیں۔ اور حضرت عائشہؓ اپنے بھائی حضرت عبداللہؓ کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔ اور اس طرح آپؐ کی سب بیویاں آپ کے انعامات میں حصہ دار بنیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور ان کو باہر سے آنے والے لوگوں پر ظلم کرنے فساد کرنے اور جنسی معاملات میں بے راہ روی اختیار کرنے سے منع کیا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرتے انہوں نے حقارت سے حضرت لوط علیہ السلام کے ماننے والوں کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا کہ اِنَّھُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَھَّرُوْنَ کہ یہ لوگ بڑے نیک بنے پھرتے ہیں۔ یعنی حقیقتاً تو نیک نہیں مگر ہمارے افعال پر اعتراض کر کے یہ لوگ اپنی بڑائی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ ایک ایسا گروہ ہے جو تکلف سے نیکی ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نیکی اور تقویٰ کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن دراصل نیک نہیں ہے۔

فرماتا ہے وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ۔ ہم نے ان کے جرائم کی پاداش میں ان پر ایک تباہ کن بارش برسائی۔ اور جن کے لئے تباہی اور بربادی کا فیصلہ ہو چکا ہو ان پر نازل ہونے والی بارش بہت ہی ہولناک اور خطرناک نتائج کی حامل ہوا کرتی ہے۔ یہ بارش دراصل پتھروں کی تھی جو ایک خطرناک زلزلہ کے نتیجہ میں ہوئی۔ یعنی زمین کا تختہ الٹ گیا۔ اور مٹی سینکڑوں فٹ اوپر جا کر پھر نیچے گری۔ اور اس طرح گویا مٹی اور پتھروں کی ان پر بارش ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس بارش کو عذاب کے طور پر نازل کیا گیا تھا وہ ظاہری بارش بھی تھی جو جنگ بدر کے وقت ہوئی اور ریت اور کنکروں کی بارش بھی تھی۔ جو اس وقت آئی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے بعد کنکروں کی ایک مٹھی اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی۔ آپ کا یہ کنکر پھینکنا گویا آسمانی طاقتوں کو ایک اشارہ تھا ادھر آپ نے کنکروں کی مٹھی پھینکی اور ادھر ایک تیز آندھی مسلمانوں کی پشت کی طرف سے چل پڑی اور اس کے ساتھ ریت اور کنکروں کا ایک طوفان اٹھا جس نے کفار کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے تیر بھی ہوا کی مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں تک پہنچنے سے رک گئے۔ اور میدان کے درمیان میں ہی

بے کار اور بے ضرر ہو کر گرنے لگے اور اس طرح کفار مکہ پر وہ عذاب آ گیا جو قوم لوطؑ کی مشابہت میں ان پر آنا ضروری تھا۔ اور جس کے لئے ابوجہل نے بھی یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال: ۳۳) یعنی اے خدا اگر اسلام ایک سچا مذہب ہے اور ہم غلط راستہ پر جا رہے ہیں تو تُو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا ہمیں کوئی اور دردناک عذاب دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے نتیجہ میں آسمان سے ان پر پتھر بھی برسائے اور پھر انہیں اس عذاب الیم میں بھی مبتلا کیا کہ ان کے چنیدہ افسر اس جنگ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کی عزتیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی وجاہتوں کا خاتمہ ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا پر آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر ہو گئی۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ

تو کہہ دے ہر تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے۔ اور اس کے وہ بندے جن کو اس نے چن لیا ہو ان پر ہمیشہ سلامتی

آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ۝۶۰

نازل ہوتی ہے۔ کیا اللہ (تعالیٰ) بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو وہ (اس کا) شریک قرار دیتے ہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ تو لوگوں سے کہہ دے کہ ہر قسم کی تعریف کا اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے جس نے ہر زمانہ میں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اپنے انبیاء بھیجے۔ کسی زمانہ میں اس نے موسیٰؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ کسی زمانہ میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کو بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں حضرت صالحؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا۔ کسی زمانہ میں حضرت لوطؑ کو نبوت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ اور پھر خدا نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کو کبھی اپنی نصرت اور تائید سے محروم نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے لئے سلامتی نازل ہوتی رہی اور ہمیشہ ہی اس کے برگزیدہ بندوں پر سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اب بتاؤ کیا اللہ اچھا ہے جو اپنے بندوں کو بچاتا اور ترقی دیتا رہتا ہے اور جس نے لوگوں کی راہنمائی کے لئے اپنے کلام اور الہام کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے یا یہ معبودان باطلہ اچھے ہیں جن کے ماننے والے ہمیشہ تباہ ہوتے ہیں اور جن کی طرف سے کبھی کوئی رسول اس پیغام کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا کہ مجھے ھبل نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھجوایا ہے یا لات اور مناۃ نے بھجوایا ہے اور میں اپنے مخالفوں پر غالب رہوں گا۔

سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر ہمیشہ اس کی طرف سے سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے۔اس لئے مومنوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جب بھی کسی نبی کا نام لیں تو اس کے ساتھ علیہ السلام کے الفاظ ضرور کہا کریں۔وہ لوگ جو حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں بعض دفعہ ان دعائیہ کلمات کے متعلق سوال کر دیا کرتے ہیں کہ انبیاء کے لئے سلامتی کی خاص طور پر کیوں دعا کی جاتی ہے جبکہ ان کا خدا تعالیٰ کے سایہء رحمت میں ہونا ایک قطعی اور یقینی امر ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سلامتی تو ان کو بے شک حاصل ہے کہ وہ وفات پا کر اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت میں چلے گئے۔لیکن ایک اور بات ایسی ہے جس کے لحاظ سے ان کے مرنے کے بعد بھی ہمیشہ سلامتی کی دعا کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء دنیا میں ایک بہت بڑی روحانی جائیداد چھوڑ کر جاتے ہیں۔دنیوی جائدادیں تو اگر نااہل ہاتھوں میں چلی جائیں تب بھی ان کی تباہی کا اثر بہت محدود ہوتا ہے لیکن انبیاء جو جائیداد چھوڑ جاتے ہیں اگر اس کو گمراہی کا ذریعہ بنالیا جائے تو صدیوں تک لوگ گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان کے لئے دعاؤں کے سلسلہ کو ہمیشہ جاری رکھا جائے۔انہوں نے تو وہ جائداد اس لئے چھوڑی ہوتی ہے کہ لوگ اس سے روشنی اور نور حاصل کریں۔مگر پیچھے آنے والے روشنی اور نور حاصل کرنے کی بجائے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو کئی قسم کے گناہ ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان اور حضرت لوط علیہم السلام کی طرف منسوب کر دیئے (پیدائش باب ۲ آیت ۱۳ تا ۱۹، پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۱ تا ۳۵،ملوک اول باب ۱۱ آیت ۳،سموئیل باب ۱۱ آیت ۲ تا ۲۷)۔لوگ جب ان واقعات کو پڑھتے ہیں تو کمزور طبع لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ جب انبیاء نے اس طرح کر لیا تھا تو ہم کیوں نہ کریں۔عیسائی یوں تو منہ سے دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بالکل معصوم اور بے گناہ تھے مگر تفصیلات میں وہ ان پر بھی الزام لگانے سے باز نہیں آئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔کہ ایک دفعہ وہ کسی کا گدھا بے پوچھے لے گئے اور اس پر سواری کرتے پھرے (مرقس باب ۱۱ و متی باب ۲۱)۔پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو گالیاں دیتے اور انہیں کتے اور زناکار وغیرہ کہتے تھے (متی باب ۷ آیت ۶ و متی باب ۲۵ آیت ۲۶ و متی باب ۱۲ آیت ۳۹)۔اسی طرح کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھا کر صلیب پر لٹک گئے اور اس طرح نعوذ باللہ لعنتی بنے۔ اور تین دن تک دوزخ میں رہے (نمبر ا پطرس باب ۳ آیت ۱۸ تا ۲۰)۔پھر کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے سؤروں کے گلّے بغیر ان کے مالکوں کو کوئی قیمت دینے کے تباہ کر دیا کرتے تھے (متی باب ۸ آیت ۲۸ تا ۳۲ و مرقس باب ۵)۔اسی طرح ہندوؤں کو لو تو وہ حضرت کرشنؑ اور حضرت رامچندر جی کو اپنا اوتار مانتے ہیں مگر رامچندر جی کا سیتا سے جو سلوک بیان

کرتے ہیں وہ اگر ایک طرف رکھ لیا جائے اور دوسری طرف ان کی بزرگی اور نیکی دیکھی جائے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ایسا فعل کیا ہوگا مگر وہ حضرت رامچندر جی کی طرف بغیر کسی جھجک کے یہ ظلم منسوب کرتے ہیں۔ پھر حضرت کرشنؑ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مکھن چُرا چُرا کر کھایا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے (رامائن اتھر کا ندار دو جلد ۷ صفحہ ۹۷۹، ۹۸۰ سرک ۵۳ تا ۵۴ سیتا جی کی جلاوطنی)۔ پس انبیاء جہاں ہدایت پھیلانے کا ذریعہ ہوتے ہیں وہاں شیطانی لوگ ان کو ایک قسم کی گمراہی اور شیطنت پھیلانے کا بھی ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انبیاء پر سلام کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے تا کہ ہم جب بھی ان انبیاء کا نام لیں ساتھ ہی یہ دعا بھی کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان فتنہ گروں کو تباہ کرے جو ان کا نام لے لے کر دنیا میں گمراہی پھیلاتے ہیں تا کہ ان کی کوششیں اکارت نہ چلی جائیں۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت سے بیمار ہوئے۔ تو آپ اپنی آخری گھڑیوں میں بڑے اضطراب کے ساتھ کروٹیں بدلتے اور بار بار فرماتے کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ آخر یہ لازمی بات ہے کہ جب نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا تو لوگوں میں توحید نہیں رہے گی۔ اور شرک روز بروز بڑھتا چلا جائے گا۔ پس انبیاء پر سلام اسی حکمت کی وجہ سے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے انوار اور برکات کے سلسلہ کو وسیع کرے اور وہ فتنہ گر تباہ ہوں جو ان کی روحانی جائیداد کو غارت کرنے والے ہیں۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

(بتاؤ تو) آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور (کس نے) تمہارے لئے بادل سے پانی اتارا ہے۔ پھر اس

مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ

(یعنی پانی) کے ذریعہ سے ہم نے خوبصورت باغ نکالے ہیں۔ تم ان (باغوں) کے درخت نہیں اگا سکتے تھے۔

تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ ﴿۶۱﴾

کیا اللہ کے ساتھ اَور بھی معبود ہے (جو سب کائنات عالم کا انتظام کر رہا ہے) لیکن یہ (کافر) ایسی قوم ہیں جو اس کے شریک بنا رہے ہیں۔

حل لغات۔ حَدَآئِقَ حَدِيْقَةٌ کی جمع ہے اور اَلْحَدِيْقَةُ کے معنے ہیں اَلْبُسْتَانُ يَكُوْنُ

عَلَیْہِ حَائِطٌ ایسا باغ جس کے گرد دیوار ہو۔(اقرب)

بَہْجَۃٌ اَلْبَہْجَۃُ کے معنے ہیں اَلْحُسْنُ ۔خوبصورتی ۔وَیُقَالُ ھُوَ حُسْنُ لَوْنِ الشَّیْءِ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بَہْجَۃٌ کسی چیز کے رنگ کی خوبصورتی کا نام ہے۔وَقِیْلَ ھُوَ فِی النَّبَاتِ النَّضَارَۃُ۔وَفِی الْاِنْسَانِ ضَحِکُ اَسَارِیْرِ الْوَجْہِ اَوْظُھُوْرُالْفَرَحِ اَلْبَتَّۃَ۔بعض ائمہ لغت کہتے ہیں کہ بَہْجَۃٌ کا لفظ اگر نباتات کے متعلق استعمال ہوتو اس کے معنے تازگی اور سرسبزی کے ہوتے ہیں اور جب انسان کے متعلق اس لفظ کا استعمال ہوتو یہ معنے ہوں گے کہ اس کا چہرہ تمتما اٹھا یا یہ کہ اس سے خوب خوشی ظاہر ہوئی ۔(اقرب)

تفسیر ۔فرماتا ہے ۔تم آسمانی اور زمینی نظام پر غور کر کے دیکھو کہ یہ زمین اور آسمان کس نے پیدا کئے ہیں اور پھر کون ہے جو بادلوں سے پانی اتار کر قسم قسم کے باغ اگاتا ہے حالانکہ تم ایک درخت بھی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر سوچو کہ وہ خدا جس نے یہ نظام کائنات بنایا وہ بہتر ہے یا وہ معبودان باطلہ بہتر ہیں جو ان باغوں اور پانیوں اور آسمان اور زمین سب کے محتاج ہیں ۔تم اس خدا جیسا کوئی اَور دکھاؤ تو سہی ۔یقیناً تم نہیں دکھا سکتے ۔مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے اور وہ خوامخواہ خدا تعالیٰ کے ہمسر بناتے چلے جاتے ہیں۔

اس آیت کے پہلے حصہ میں غائب کی ضمیر استعمال ہوئی ہے ۔لیکن دوسرے حصہ میں اَنْۢبَتْنَا کہہ کر جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ یہ قرآنی کمالات میں سے ایک بہت بڑا کمال ہے کہ وہ بعض دفعہ ایک چھوٹے سے لفظ کے ذریعے ایک بہت بڑا اشارہ کر دیتا ہے۔اس جگہ بھی غائب سے متکلم کی طرف ضمیر بلا وجہ نہیں پھیری گئی ۔ بلکہ اس لئے پھیری گئی ہے کہ زمین وآسمان کی پیدائش اور آسمان سے بارش نازل ہونے اور اس کے ذریعہ زمین سے ہر قسم کی سبزیاں اور باغات پیدا ہونے پر جب انسان غور کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال اور جبروت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور وہ اسے غائب نہیں بلکہ حاضر سمجھنے لگتا ہے ۔ چنانچہ اسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں اَنْۢبَتْنَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔گویا خدا بندوں کے سامنے کھڑا ہے اور وہ انہیں اپنے احسانات گنوا رہا ہے۔پس یہ غلطی نہیں بلکہ قرآن کریم کے اعلیٰ درجہ کے کمالات میں سے ایک بڑا کمال ہے۔

پھر اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہری پیدائش عالم کو پیش کر کے روحانی پیدائش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔اور بتایا ہے کہ جس طرح مادی دنیا میں زمین وآسمان کی پیدائش اور بادلوں سے بارش نازل ہونے کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ایسا ہی قانون جاری ہے۔اور انبیاء کی آمد بھی ایک بارش سے مشابہت رکھتی ہے جس طرح

وہ بادل جو ضرورت کے مطابق اور لمبے انتظار کے بعد خشک زمین پر برستا ہے جب لوگ گرمی کی شدت اور حبس کی تکلیف کی وجہ سے بے کل ہو رہے ہوتے ہیں۔ جب انسان اور جانور تازہ اور اچھے پانی کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ جب کھیت اپنی روئیدگی کو نکالنے اور سبزہ کو ابھارنے کے لئے پانی کی چھینٹوں کو ترس رہے ہوتے ہیں اور اسے دیکھ کر دنیا خوش ہوتی ہے کہ اب اس کی امیدیں برآئیں گی اور اس کی فصلیں تروتازہ ہو جائیں گی۔ اسی طرح روحانی ظلمات کی تکلیف اور ایک لمبے انتظار کے بعد انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں ظہور ہوا کرتا ہے جو اپنے انفاس قدسیہ سے پیاسی دنیا کو سیراب کرتے اور علم وعرفان کے دریا بہا دیتے ہیں جن سے بڑے بڑے روحانی باغ تیار ہوتے ہیں جو آنکھوں کی تراوت اور دلوں کی تسکین کا موجب بنتے ہیں۔ مگر جہاں بارش اللہ تعالیٰ کے فضلوں میں سے ایک بہت بڑا فضل ہے اگر بروقت بارش نہ ہو تو فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور کنوؤں کے پانی تک خشک ہو جاتے ہیں۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ تکالیف بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب لوگوں کو نماز کے لئے مسجد میں آنا پڑتا ہے۔ یا سودا سلف کے لئے بازار جانا پڑتا ہے تو انہیں کیچڑ کی وجہ سے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے وقت پر مکانوں کی چھتوں پر لپائی نہ کرائی ہو ان کی چھتیں ٹپک پڑتی ہیں جس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے پاس جانور باندھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ عام حالات میں تو وہ صحن وغیرہ میں انہیں باندھ لیتے ہیں مگر بارش اور سردی میں انہیں جانور اپنے کمروں میں باندھنے پڑتے ہیں اور وہ وہیں گوبر وغیرہ کرتے ہیں۔ ان کو بدبو بھی آتی ہے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر وہ مجبور ہوتے ہیں۔ تو جہاں بارش اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل ہے۔ وہاں اس میں کچھ تکلیف کے پہلو بھی ہیں۔ پھر اس میں اندھیرا بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات تو شدید کڑک ہوتی ہے جس سے بچوں اور کمزور لوگوں کے دل ہل جاتے ہیں اور بعض کمزور بچے ڈر سے مر بھی جاتے ہیں۔ پھر بارش میں بعض اوقات بجلی بھی چمکتی ہے اور کبھی گرتی بھی ہے جس سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اور یہ سب تکلیف کے مختلف پہلو ہیں۔ مگر بارش کے مقابلہ میں لوگ ان تکالیف کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ سب جانتے ہیں کہ بارش ہوگی تو اس کے ساتھ کیچڑ بھی ہوگا۔ کیا کوئی ایسا زمیندار بھی ہے جو سمجھتا ہو کہ بارش ہوگی تو زمین گیلی نہ ہوگی۔ اور کیچڑ نہ ہوگا۔ یا پھر کوئی ایسا زمیندار ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ بارش ہونے سے سردی بڑھ جائے گی۔ پھر کوئی نہیں جو یہ نہ جانتا ہو کہ بارش کے ساتھ کڑک بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات بجلی بھی گرتی ہے جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ سب لوگ ان باتوں کو جانتے ہیں مگر پھر بھی وہ یہی دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ بارش ہو۔ وہ کیوں یہ دعائیں کرتے ہیں اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ بارش کے ساتھ جو فضل وابستہ ہوتا ہے اور اس سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں تکلیف بہت کم

ہے۔ یہی حال انبیاء کی بعثت کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ یعنی جس طرح بادلوں میں سے بارش ہوتی ہے تو جہاں اس کے بے شمار فائدے اور برکتیں ہوتی ہیں وہاں اس میں ظلمات کڑک اور بجلی بھی ہوتی ہے اور اس سے کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کی بعثت کا حال ہے۔ اس میں برکتیں بھی بہت ہوتی ہیں مگر کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح بارش کی تکلیف کے باوجود اس کی ناقدری نہیں کی جاتی۔ اسی طرح انبیاء کی بعثت کی بھی ناقدری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ان تکالیف کی قیمت اس وقت معلوم ہوگی جب قیامت کے دن نتیجہ نکلے گا۔ جب فصل پکتی ہے۔ تب زمیندار کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھیرے اور کڑک اور برق کتنی قیمتی تھی اگر یہ نہ ہوتی تو زمیندار جب اپنے کھیت میں فصل پکنے پر جاتا۔ تو سوائے تھوڑے سے سوکھے اور جلے ہوئے دانوں کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آسکتا۔ لیکن بارش ہونے کے بعد جب اس کی فصل پکتی ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندھیرا اور وہ کڑک اور وہ بجلی کتنی مفید تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں اس کے ہاں غلّہ پیدا ہوا۔ کپڑوں اور دوسرے اخراجات مثلاً شادیوں بیاہوں کے لئے سامان میسر آیا۔ ایک ایک دانہ کے ستر ستر اسی اسی اور سَو سَو دانے ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے ساتھ بھی کچھ تکالیف وابستہ ہوتی ہیں مگر جو انسان ان تکالیف کے باوجود اس نعمت کی قدر کرتا ہے اس کی مثال ویسی ہی ہوتی ہے جیسے اس زمیندار کی جس کی فصل پر ابھی بارش برس چکی ہو۔ بیشک اس کے ساتھ اندھیرے بھی ہوتے ہیں۔ کڑک بھی ہوتی ہے۔ بجلیاں بھی ہوتی ہیں مگر پھر بھی لوگ اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور اس کے فوائد کے مقابلہ میں ان تکالیف کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوجاتا کہ ہر زمیندار اگر دس دفعہ پھسلے تو پھر بارش ہوگی تو تم دیکھتے کہ کس طرح زمیندار بیس بیس دفعہ پھسلتے یا اگر خدا تعالیٰ یہ قانون بنا دیتا کہ ہر بارش کے ساتھ بیس دفعہ کڑک پیدا ہوگی تو زمیندار کہتے خدایا تیس دفعہ کڑک پیدا ہو مگر بارش ضرور ہوجائے۔ غرض انبیاء کی بعثت کی بارش کے ساتھ مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان کی بعثت کے ساتھ جو تکالیف وابستہ ہوتی ہیں۔ مومن کو دلیری سے ان کو برداشت کرنا چاہیے۔ جب وہ ایک دفعہ دین کو سچا سمجھ کر قبول کرتا ہے تو پھر خواہ اسے کتنی تکالیف آئیں خواہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اسے ہرگز کمزوری نہیں دکھانی چاہیے اور دین کے ساتھ اس طرح چمٹے رہنا چاہیے جس طرح چیونٹا جسے پنجابی میں ''کاڈھا'' کہتے ہیں چمٹ جاتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میاں جان محمد صاحب کشمیری قادیان کی مسجد اقصیٰ کے امام ہوا کرتے تھے۔ ہمارے دادا صاحب نے انہیں مقرر کیا ہوا تھا۔ وہ ہمارے گھر کا کام کاج بھی کرتے تھے۔

ایک دن کوئی دوست مچھلی تحفہ کے طور پر لائے۔ ہماری ڈیوڑھی کے آگے ایک تخت پوش بچھا رہتا تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر مچھلی صاف کرنے لگے اور ہم چار پانچ بچے تماشہ دیکھنے کے لئے پاس بیٹھ گئے۔ میرے ہاتھ میں ایک پیڑا تھا جو میں کھا رہا تھا۔ مچھلی کے خیال میں شاید میرا ہاتھ تخت پوش سے لگ گیا اور ایک چیونٹا پیڑے پر چڑھ گیا۔ میں جب اسے کھانے لگا تو اس چیونٹے نے میرے ہونٹ پر کاٹ لیا۔ میں نے اسے بہتیرا کھینچا اور چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے نہ چھوڑا۔ آخر میاں جان محمد صاحب نے اسے چھری سے کاٹ دیا۔ یہی حال مومن کا ہونا چاہیے۔ یا تو وہ دین کو اختیار ہی نہ کرے اور اگر کرے تو پھر اس کے ساتھ اس طرح چمٹ جائے جس طرح چیونٹا چمٹ جاتا ہے اور پھر چاہے اسے کاٹ ڈالا جائے وہ دین چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو۔ آخر ایمان کی فصل تو مرنے کے بعد ہی کٹتی ہے۔ اگر وہ اس جدوجہد میں مر بھی جائے گا تو کیا ہوگا۔ صرف اتنا ہی فرق پڑے گا کہ لوگوں کی فصل اگر مئی میں کٹتی ہے تو اس کی فروری میں کٹ جائے گی اور اس کے دانے پہلے اس کے گھر آ جائیں گے۔

پھر بارش کے ساتھ انبیاء کی مشابہت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ جب مادی بادل برستے ہیں تو ان کے برسنے سے ہر قسم کی روئیدگی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بارش ایک ہی ہوتی ہے مگر اسی بارش سے ایک طرف میٹھے پھل پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف اسی بارش سے کڑوے پھلوں کو بھی نشوونما حاصل ہوتا ہے۔ بارش کا ایک ہی قطرہ جہاں انگور کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے۔ جہاں آم کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے جہاں اور مختلف میٹھے پھلوں کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے وہاں بارش کا وہی قطرہ کیکر کو اور حنظل کو زیادہ تلخ بنا دیتا ہے۔ کھٹی چیزوں کو زیادہ ترش بنا دیتا ہے۔ وہی بارش کا قطرہ جو انسان کے اندر گوشت پیدا کر دیتا ہے وہی قطرہ گھاس کے اندر روئیدگی پیدا کرتا ہے۔ جنگل میں اگی ہوئی مختلف قسم کی جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں اور پہاڑیوں کی وادیوں میں پیدا ہونے والی بوٹیاں بھی اسی بارش سے اپنی روئیدگی کو ابھارنا شروع کر دیتی ہیں۔ غرض بارش کا وہی قطرہ جہاں انسان کے اندر تروتازگی اور نمو پیدا کرتا ہے وہاں وہ جنگل میں اگنے والی ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیوں میں بھی روئیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حال انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی جب روحانی بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے تو دونوں قسم کی روئیدگی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ایک طرف سویا ہوا کفر بھی بیدار ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ایمان بھی تروتازہ ہو جاتا ہے کفر بھی اس زمانہ میں اپنی شان دکھانا شروع کر دیتا ہے اور مخالف لوگوں کے اندر بھی ایک نئی قسم کی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آخر مکہ بھی وہی تھا اور عرب بھی وہی تھا۔ لیکن آپ کی بعثت سے قبل عرب کے سرداروں کا کوئی نظام معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہم کفار کو بھی منظم اور مصروف عمل پاتے ہیں اور وہ سارے کے سارے اس کام کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں کہ کسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو پھیلنے سے روکیں اور سارے متحد ہو کر اس دین کو مٹانے کے لئے کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ یہ تنظیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب آسمان سے بارش آتی ہے تو ہر قسم کی چیزوں میں روئیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور کفر بھی اپنا سر اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب جھوٹے مدعی کھڑے ہوتے ہیں تو لوگ ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے کیونکہ بکری بکری سے کبھی نہیں ڈرتی۔ بکری شیر سے ڈرا کرتی ہے۔ اس لئے جب کوئی جھوٹا مدعی کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اس سے نہیں ڈرتے۔ لیکن جب کبھی فطرت انسانی یہ سمجھتی ہے کہ سچا موعود آ گیا ہے تو اس وقت کافر بھی بیدار ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سچا خطرہ ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا میرے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ جس قسم کی منظم مخالفت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی ہے یا اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ہوئی ہے ایسی مخالفت کسی جھوٹے مدعی کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔ بابؔ کے زمانہ میں بیشک شورش اور فساد پیدا ہوا۔ لیکن یہ فساد بابیوں کے اپنے افعال کے نتیجہ میں تھا۔ پہلے بابیوں نے بعض لوگوں کو قتل کیا ان قتلوں کے نتیجہ میں حکومت نے ان کو مارا۔ لیکن پبلک خاموش رہی اور اس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا (Baha Ullah and the New Era pg. 32,33)۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تمام غیر قوموں میں آپ کے مقابلہ کا جوش پیدا ہو گیا اور ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح احمدیت کو کچلا جائے۔ یہ چیز دنیا کے پردہ پر اَور کسی مدعی کے مقابلہ میں نظر نہیں آتی۔ بہائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ قرار دیتے ہیں (الکواکب الدریۃ جلد اول صفحہ ۲۲۰)۔ لیکن ایک مسلمان کہلانے والا ایک بہائی کی باہوں میں باہیں ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو تم بھی سچے اور ہم بھی سچے۔ چلو دونوں مل کر احمدیت کا مقابلہ کریں۔ تو جس طرح بارش کا پانی گرنے سے ہر قسم کی روئیدگی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح روحانی بارش کے وقت کفر بھی بیدار ہو جاتا ہے اور ایمان بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ادھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے ایک مخلص جماعت قائم ہوئی۔ وہ جماعت جس کے اندر تقویٰ اور اخلاص پایا جاتا ہے اور اس کے ایمان کے اندر ایک بیداری اور بلندی کی امنگ پائی جاتی ہے اور اُدھر آپ کے آنے سے کفر میں بھی بیداری اور حرکت پیدا ہو گئی۔ غرض جس طرح بارش کے آنے پر تلخ بوٹیاں جو آپ ہی آپ اگ آتی ہیں وہ اپنا جوش اور ابھار دکھاتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کی جماعتوں سے بھی امید رکھتا ہے کہ ان تلخ بوٹیوں کے مقابل میں اسی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ

کر اپنا ابھار دکھائیں اور روحانی حسن کو ظاہر کرنے کی ایسے رنگ میں کوشش کریں کہ شیطان کا حسن بالکل ماند پڑ جائے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ

(بتاؤ تو) کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا ہے اور اس کے بیچ میں دریا چلائے ہیں۔ اور اس کے (فائدہ) کے

لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ

لئے پہاڑ بنائے ہیں اور دو سمندروں کے درمیان (جن میں سے ایک میٹھا اور ایک کھاری ہوتا ہے) ایک روک

اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ ﴿۶۲﴾

بنائی ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اَور معبود ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

حلّ لُغات۔ **رَوَاسِیَ** اَلرَّوَاسِی کے معنے ہیں اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ۔ مضبوط گڑے ہوئے پہاڑ۔ (اقرب)

حَاجِزًا حَاجِزًا حَجَزَ سے اسم فاعل ہے۔ اور حَجَزَهٗ حَجْزًا و حِجَازَةً کے معنے ہیں مَنَعَهٗ وَ كَفَّهٗ وَدَفَعَهٗ۔ اس کو روکا اور ہٹایا۔ اور اَلْحَاجِزُ کے معنے ہیں اَلْبَرْزَخُ۔ روک۔ پردہ۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ وہ کون ہے۔ جس نے زمین کو رہائش کے قابل بنایا ہے۔ اور اس کے اندر دریا چلائے ہیں۔ جن کے پانی کو سلامت رکھنے کے لئے اس نے پہاڑوں کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے جن سے دریاؤں کو مدد ملتی رہتی ہے۔ پھر زمین میں اس نے سمندر بنائے ہیں اور سمندروں کے نمکین پانی اور دریاؤں کے میٹھے پانی کے درمیان ایک روک بنادی ہے یعنی سمندر کا نمکین پانی ڈھلوان کی طرف ہے۔ وہ دریاؤں کے میٹھے پانی کو خراب نہیں کرسکتا۔ اور دریاؤں کا میٹھا پانی سمندر کے نمکین پانی کے مقابلہ میں اتنا تھوڑا ہے کہ باوجود سمندروں میں گرنے کے پھر بھی وہ سمندر کے پانی کے مزے کو بدل نہیں سکتا۔ اور اس طرح میٹھے اور نمکین پانی میں ایک دائمی روک قائم رہتی ہے۔ کیا ایسے مدبّر خدا کا کوئی اَور شریک پیش کیا جاسکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ لیکن مشرک لوگ اکثر جاہل ہوتے ہیں۔ وہ اتنے بڑے نشانات کو دیکھنے کے باوجود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارتے پھرتے ہیں۔

کائناتِ عالم کا یہ نظارہ پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جب

تمہارے مادی فوائد کے لئے اتنے بڑے سامان پیدا کئے گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ تمہاری روحانی ضرورتوں کو کس طرح انداز کرسکتا تھا۔تم جانتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین میں ایسے نشیب پیدا نہ کرتا جن میں دریاؤں کا پانی سکڑ کر چلتا تو سب زمین پر پانی ہی پانی ہوتا۔اور یہ دنیا رہنے کے قابل نہ ہوتی۔اسی طرح اگر پہاڑ نہ ہوتے جو سارا سال برف کے ڈھیر جمع رکھتے ہیں اور جن کی مدد سے تمام دریا ملک کو سال بھر پانی مہیا کرتے رہتے ہیں تو تمہاری باؤلیاں اور حوض تمہیں کب تک زندہ رکھ سکتے تھے یہی کیفیت روحانی عالم میں بھی پائی جاتی ہے۔

انسانی تدابیر جو باؤلیوں اور حوضوں کی طرح ہوتی ہیں صرف عارضی طور پر ایک محدود دائرہ میں بنی نوع انسان کو کام دیتی ہیں مستقل ہدایت جو آسمانی پانی سے مشابہت رکھتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آتی ہے اور وہی لوگوں کی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے۔پھر جس طرح پہاڑ قسم قسم کی ضروری ادویہ اور پھل اور پھول اور نہ ختم ہونے والے لکڑی کے ذخائر جمع رکھتے ہیں اسی طرح روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی ایک ایسے کلام کی ضرورت تھی جو دائمی طور پر دنیا ک لئے ہدایت اور رحمت کے ذخائر اپنے اندر جمع رکھتا۔پھر جس طرح نمکین اور میٹھے پانی میں اللہ تعالیٰ نے ایک روک بنادی ہے۔اسی طرح کفر اور ایمان میں بھی اس نے دلائل کی ایک دیوار حائل کردی ہے جس کی وجہ سے ایمان کا پانی اپنی حلاوت کی وجہ سے اور کفر کا پانی اپنی تلخی اور مرارت کی وجہ سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ایسے محسن خدا کا دوسروں کو شریک قرار دینا اور اس کے دروازہ کو چھوڑ کر بتوں کے آگے اپنا سر جھکانا ایسے ہی لوگوں کا شیوہ ہوسکتا ہے جو عقل اور فہم سے کلیۃً عاری ہوں۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ

(نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دعا کو سنتا ہے جب وہ اس (یعنی خدا) سے دعا کرتا ہے۔اور (اس کی) تکلیف کو

يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا

دور کردیتا اور وہ تم (دعا کرنے والے انسانوں) کو (ایک دن) ساری زمین کا وارث بنادے گا۔کیا

تَذَكَّرُوْنَ ؕ ﴿۶۳﴾

(اس قادرِ مطلق) اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟۔تم بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔تم یہ بھی تو دیکھو کہ مصیبت زدہ انسان کی دعاؤں کو کون قبول کرتا ہے اور کون اس کی

مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔ اور کون تم کو زمین کا وارث بناتا ہے۔ کیا ایسی صفات حسنہ رکھنے والے خدا کا کوئی ہمسر تمہیں نظر آتا ہے؟ مگر افسوس کہ تم لوگ قطعاً نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اس آیت میں جو مُضْطَرّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا شخص مراد ہے جو اپنے چاروں طرف مشکلات ہی مشکلات دیکھتا ہے اور اسے اپنی کامیابی کا کوئی مادی رستہ نظر نہیں آتا۔ صرف ایک جہت اللہ تعالیٰ والی باقی رہ جاتی ہے اور اسی پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ گویا مُضْطَرّ کے صرف یہی معنے نہیں کہ اس کے دل میں گھبراہٹ ہو۔ کیونکہ گھبراہٹ میں بعض دفعہ ایک شخص بے تحاشہ کسی طرف چل پڑتا ہے بغیر اس یقین کے کہ وہ جس طرف جارہا ہے وہاں اسے امن بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔ بلکہ بعض لوگ گھبراہٹ میں ایسی طرف چلے جاتے ہیں جہاں خود خطرہ موجود ہوتا ہے اور وہ اس سے نہیں بچ سکتے۔ پس محض اضطراب کا دل میں پیدا ہونا اضطرار پر دلالت نہیں کرتا۔ اضطرار پر وہ حالت دلالت کیا کرتی ہے جب چاروں طرف کوئی پناہ کی جگہ انسان کو نظر نہ آتی ہو اور ایک طرف نظر آتی ہو۔ گویا اضطرار کی نہ صرف یہ علامت ہے کہ چاروں طرف آگ نظر آتی ہو بلکہ یہ بھی علامت ہے کہ ایک طرف امن نظر آتا ہو اور انسان کہہ سکتا ہو کہ وہاں آگ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دعا خدا تعالیٰ کے حضور قبول کی جاتی ہے جس کے کرتے وقت بندہ اس رنگ میں اس کے سامنے حاضر ہوتا ہے کہ اسے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے میرے لئے اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔ یہی وہ مضطر کی حالت ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَامَلْجَأَ وَلَامَنْجَأَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ (بخاری کتاب الوضوء باب النوم علی شق الایمن) یعنی اے خدا تیرے عذاب اور تیری طرف سے آنے والے ابتلاؤں سے کوئی پناہ کی جگہ نہیں سوائے اس کے کہ میں سب طرف سے مایوس ہو کر اور آنکھیں بند کر کے تیری طرف آجاؤں۔ تو لَامَلْجَأَ وَلَامَنْجَأَ والی جو حالت ہے یہی اضطرار کی کیفیت ہے اور جب خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ کہا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ ایسے شخص کی دعا جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ملجاء و ماویٰ نہیں سمجھتا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا مَنْجَاء قرار نہیں دیتا ضرور سنی جاتی ہے اور یہ شرط بلا وجہ نہیں رکھی گئی ہے۔ کہ گو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی ہر مضطر کا علاج ہے مگر بعض دفعہ اس کے دیئے ہوئے انعام کے ماتحت کوئی بندہ بھی دوسرے کے اضطرار کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ ایک آدمی سخت غریب ہوتا ہے۔ اس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں اور اسے نظر نہیں آتا کہ وہ نئے کپڑے کہاں سے بنوائے کہ اچانک ایک امیر آدمی جو بعض دفعہ ہندو ہوتا ہے۔ بعض دفعہ سکھ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ پارسی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ جینی یا بت پرست ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے اور کہتا ہے تمہارے کپڑے پھٹ گئے ہیں آؤ میں تمہیں نیا جوڑا بنوا دوں۔ اب گو ہمارے یقین کے مطابق

خدا تعالیٰ نے ہی اس امیر آدمی کے دل میں تحریک پیدا کی کہ وہ اسے کپڑے بنوا دے مگر جو کامل الایمان نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ میری اضطرار کی حالت میں فلاں آدمی میرے کام آیا ہے مگر وہی آدمی جس نے اسے کپڑوں کا جوڑا بنا کر دیا تھا جب یہ ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے۔ پانی تک اسے ہضم نہیں ہوتا۔ تمام جسم کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور چل پھر بھی نہیں سکتا تو ایسی حالت میں وہ امیر آدمی اس کی مدد نہیں کر سکتا بلکہ اگر کوئی اچھا لائق اور رحمدل طبیب ہوتا ہے اور وہ اسے اس حالت میں دیکھتا ہے تو کہتا ہے تمہیں علاج پر روپیہ خرچ کرنے کی توفیق نہیں تو میں تمہیں مفت دوائی دینے کے لئے تیار ہوں تم میرے پاس رہو اور اپنے مرض کا علاج کرو۔ اب ایسی اضطرار کی حالت میں امیر اس کے کام نہیں آیا بلکہ طبیب اس کے کام آیا۔ جب وہ کپڑوں کے لئے مضطر تھا تو امیر آدمی اس کے کام آ گیا مگر جب وہ علاج کے لئے مضطر ہوا تو ایک طبیب اس کے کام آ گیا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس پر کوئی مقدمہ بن جاتا ہے۔ وہ بے گناہ ہوتا ہے اس کا دشمن زبردست ہوتا ہے اور وہ کسی وجہ سے ناراض ہو کر اسے کسی مقدمہ میں ماخوذ کرا کے عدالت تک پہنچا دیتا ہے۔ اب اسے نہ وکیل کرنے کی توفیق ہے اور نہ اس میں خود مقدمہ لڑنے کی قابلیت ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ کیا کرے۔ آخر کوئی رحمدل وکیل اسے مل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے میں بغیر فیس کے تمہاری وکالت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اب ایسے موقعہ پر نہ امیر اس کے کام آ سکا۔ نہ طبیب اس کی مشکل کو دور کر سکا۔ صرف وکیل اس کے کام آیا۔ اسی طرح ایک اور وقت میں یہ مضطر ہوتا ہے۔ بوجھ اٹھائے جا رہا ہوتا ہے کہ تھک کر چُور ہو جاتا ہے اور بوجھ اس سے گر جاتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس بوجھ کو پھر اٹھا سکے۔ اب ایسے وقت میں نہ امیر اس کے کام آ سکتا ہے۔ نہ طبیب اس کے کام آ سکتا ہے۔ نہ وکیل اس کے کام آ سکتا ہے۔ البتہ کوئی مضبوط زمیندار چلتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تُو یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے بوجھ مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا۔ اس پر وہ زمیندار اس کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ اب یہ مضطر تو تھا۔ مگر اس حالت میں نہ امیر اس کے کام آ سکا۔ نہ طبیب اس کے کام آ سکا۔ نہ وکیل اس کے کام آ سکا۔ بلکہ اس کا ایک زمیندار بھائی اس کے کام آ گیا۔ تو ایک ہی انسان کے مختلف اضطراروں میں مختلف لوگ اس کے کام آ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ۔ مطلق مضطر جس کے لئے کوئی شرط نہیں کہ وہ کس قسم کا مضطر ہو۔ خواہ وہ بھوکا ہو۔ ننگا ہو۔ پیاسا ہو۔ بیمار ہو۔ بوجھ اٹھائے جا رہا ہو۔ کسی قسم کا اضطرار ہو اس کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پھٹے پرانے کپڑے ہوں۔ تو کوئی امیر اس کے کام آ جائے۔ مگر طبیب اس کے کام نہیں آ سکتا۔ کوئی بیمار ہو تو طبیب اس کے کام

آ جائے مگر وکیل اس کے کام نہیں آ سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی بے گناہ کسی مقدمہ میں مبتلا ہوتو وکیل اس کے کام آ جائے ۔مگر بوجھ اٹھانے کے وقت وکیل اس کے کام نہیں آ سکتا۔ ہوسکتا ہے بوجھ اٹھانے کے وقت ایک زمیندار اس کے کام آ جائے لیکن امیر طبیب اور وکیل اس کے کام نہیں آ سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ سارے کام کر سکتا ہے۔ باقی انسان جس قدر ہیں وہ تو کسی کسی ضرورت میں کام آ سکتے ہیں۔ کوئی ایک قسم کے مضطر کے کام آ سکتا ہے کوئی دوسرے قسم کے مضطر کے کام آ سکتا ہے۔ مگر ہر قسم کے مضطرین کی ضرورتیں پورا کرنے والی خدا کی ہی ذات ہوتی ہے اور انسان کے اضطرار کی ہزاروں حالتیں ہوتی ہیں۔ بھلا ان حالتوں میں کوئی بندہ کسی کے کب کام آ سکتا ہے۔ ان حالتوں میں تو کوئی بادشاہ بھی کسی کے کام نہیں آ سکتا۔ فرض کرو ایک شخص سخت بیمار ہے۔ اب بادشاہ کا خزانہ اس کے کام نہیں آ سکتا۔ بادشاہ کی فوجیں اس کے کام نہیں آ سکتیں۔ بادشاہ کا قرب اس کے کام نہیں آ سکتا۔ اس کے کام تو اللہ تعالیٰ ہی آ سکتا ہے۔ جو ہر قسم کی بیماریوں کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یا ایک جنگل میں گذرنے والا شخص جس پر بھیڑیا یا شیر اچانک جھپٹ کر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ بادشاہ کا چاہے کتنا ہی منہ چڑھا ہو یا بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو بادشاہ اس کے کیا کام آ سکتا ہے یا طبیب جو اس کا علاج کرتا تھا وہ اس کے کیا کام آ سکتا ہے یا امیر جو نئے کپڑے سلا دیتا تھا وہ اس کے کیا کام آ سکتا ہے یا وکیل جس نے رحم کر کے اس کا مقدمہ لے لیا تھا اس کے کس کام آ سکتا ہے۔ جنگل میں وہ تن تنہا جا رہا ہوتا ہے کہ شیر چیتا یا بھیڑیا اس کے سامنے آ جاتا ہے ایسی حالت میں وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو کام آتی ہے۔ کوئی انسان کام نہیں آ سکتا۔ تو جب تک انسان کے اندر یہ یقین پیدا نہ ہو کہ ہر قسم کے اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کام آتا ہے اس وقت تک وہ مضطر نہیں کہلا سکتا۔ مگر بہر حال جب وہ مضطر ہونے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو خدا اس کے پاس دوڑتے ہوئے آ جاتا ہے اور اس کی ہر تکلیف اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔ دنیا میں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ لوگ اگر دوسروں کے خلاف فریاد کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے افسران سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے ہمارے خلاف شکایت کی تو ہم تمہاری زبان گدّی سے کھینچ لیں گے۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں نے فریاد کی تو بعد میں وہی افسر مجھے اور رنگ میں مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ مگر یہاں یہ حالت ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی سایہ ڈالے ہوئے ہوتی ہے اور مصیبت زدہ بندہ اپنے لحاف میں پڑا آہیں بھر رہا ہوتا ہے اور دنیا کا کوئی فرد نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے یا کیا کہہ رہا ہے۔ کوئی افسر اسے دھمکا نہیں سکتا۔ کوئی افسر اسے فریاد کرنے سے روک نہیں سکتا۔ وہ لحاف میں لیٹے لیٹے خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنی آواز بلند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا! فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے تو میری طرف سے آپ اس کا بدلہ لے۔ ظالم نہیں جانتا کہ اس کے خلاف بادشاہ تک

شکایت پہنچ چکی ہے۔ وہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ اس کے دل میں کوئی خیال گذرتا ہے۔ مگر مظلوم کی فریاد خدا تعالیٰ کے عرش کو ہلا دیتی ہے۔ پس فرماتا ہے اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ جب انسان خدا تعالیٰ کے حضور مضطر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا تو اس وقت کون اس کی مدد کے لئے آتا ہے۔ دنیا غافل ہوتی ہے مگر خدا اپنے بندے کی مدد سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ خود آتا ہے اور کہتا ہے اے میرے بندے۔ میں تیری مدد کے لئے آ گیا ہوں۔ اور پھر وہ ایسی محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے کہ اس کا ہر دکھ دور ہو جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ وہ صرف یہیں تک اپنے انعامات کو محدود نہیں رکھتا کہ مضطر کی دعا کو قبول کر کے اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے بلکہ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔ وہ بڑے بڑے سرکشوں اور ظالموں کو تباہ کر کے مظلوم اور کمزور نظر آنے والے لوگوں کو ان کا خلیفہ اور جانشین بنا دیتا ہے۔ گویا انفرادی رنگ میں بھی وہ پریشان حال لوگوں کی تکالیف کو دور کرتا ہے اور قومی رنگ میں بھی مظلوم اور اسیر اقوام کو بام رفعت تک پہنچاتا ہے اور بڑے بڑے مغرور اور خودسر اور ظالم اور عیاش حکمران ان کی آہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۱۴، ۱۵) یعنی ہم یقینی طور پر تم سے پہلے بھی قوموں کے بعد قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ جبکہ انہوں نے باوجود اس کے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلے کھلے نشانات لے کر آئے تھے ظلم سے کام لیا اور وہ ایمان نہ لائے اور ہم مجرموں سے اسی طرح انتقام لیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنا دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم دنیا میں کیسے عمل کرتے ہو۔ اور مظلومیت کی حالت میں جو تمہارے اندر نیکی اور تقویٰ پایا جاتا تھا آیا اپنی طاقت کے زمانہ میں بھی تم اس کو قائم رکھتے ہو یا نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ مضطر کی دعا اسے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تو مستحق بنا دیتی ہے مگر انعامات کو قائم رکھنے اور اس کے تسلسل کو لمبا کرنے کے لئے پھر اَور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اس میں غفلت سے کام لیتی ہے تو وہ اس انعام کو کھو بیٹھتی ہے۔

زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے فردی اور قومی دونوں قسم کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انفرادی رنگ میں بھی یہ سلوک ہے کہ وہ مظلوم کی دعا کو قبول کر کے اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ اور قومی رنگ میں بھی اس کا یہ قانون ہے کہ وہ ظالم قوم کو مٹا کر مظلوموں کو ان کا جانشین بنا دیا کرتا ہے اور تاریخ میں اس کی

ہزاروں مثالیں پائی جاتی ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں واقعات کو اپنی ہستی کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اس کی تہ میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہی کام کر رہا ہے۔مگر افسوس کہ تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کے آستانہ کو ترک کر کے بتوں کے آگے اپنے سر جھکاتے پھرتے ہو۔

اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی ذات کا یقین دلانے اور اور پنے وجود کا علم دینے اور انہیں اپنی طرف کھینچنے کے لئے دعا کا دروازہ کھولا ہے جو ہر مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے یعنی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا انسان ہو اگر وہ مضطر ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی دعاؤں کو سنے گا اور اس کے لئے وہ راستہ کھول دے گا جس سے اس کی مشکلات دور ہو جائیں گی اور اسے اطمینان قلب حاصل ہو جائے گا۔

مجھے یاد ہے قادیان میں ایک دفعہ ایک ہندو میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے میرے آقا نے آپ کے پاس بھجوایا ہے اور دریافت کیا ہے کہ کیا نور ملنے کا بھی کوئی طریق ہے؟ پہلے تو اس نے یہ نہ بتایا کہ کون اس کا آقا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے اور اس نے بات کو چھپانا چاہا۔مگر جب میں نے جرح کی تو کہنے لگا۔وہ بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ان کے پاس عمارتوں اور نہروں کا ٹھیکہ ہوتا ہے اور ہندوستان میں اس کا ایک بڑا بھاری کارخانہ بھی ہے۔آخر بہت سی باتوں کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ سردار بلدیو سنگھ صاحب جو ہندوستان کے ڈیفنس منسٹر رہے ہیں ان کے والد نے اسے بھجوایا تھا۔ ٹاٹانگر کے پاس ان کا بڑا بھاری کارخانہ ہے۔میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تو سکھ ہیں اور تم ہندو ہو تمہارا ان کے ساتھ کیسے تعلق ہوا۔اس پر اس نے کہا کہ میں اور وہ بچپن میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ میری بڑی دوستی ہے۔اب انہوں نے اس دوستی کی وجہ سے ہی ایک دفتر کا مجھے انچارج بنایا ہوا ہے اور مذہبی خیالات کا تبادلہ مجھ سے کرتے رہتے ہیں۔انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مرزا صاحب سے جا کر پوچھو کہ کیا نور ملنے کی بھی کوئی تدبیر ہے۔ہم مسلمان پیروں کے پاس بھی گئے ہیں۔ہندوؤں کے پاس بھی گئے ہیں،سکھوں کے پاس بھی گئے ہیں۔ مگر ہمیں کہیں نور نہیں ملا۔میں نے کہا۔یہ ہماری تو اصطلاح نہیں سکھوں کا ایک محاورہ ہے جو ان میں رائج ہے۔ مگر بہر حال ہم جس چیز کو ہدایت کہتے ہیں وہ اس کا نام نور رکھتے ہیں۔اور ہدایت ملنے کا راستہ میں بتانے کے لئے تیار ہوں۔مگر چونکہ اس نے شروع میں ہی کہہ دیا کہ وہ بڑے مالدار ہیں۔اور کروڑ پتی ہیں۔اس لئے میں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گو میں عیسائی نہیں مگر حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت اور بزرگی کا قائل ہوں اور آپ فرماتے ہیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گذر جانا آسان ہے لیکن دولت مند کا خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل

ہے (متی باب ۱۹ آیت ۲۴) ۔اس لئے گو میں تمہیں نور حاصل کرنے کا راستہ بتا دوں گا۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ نور کو قبول نہیں کریں گے ۔ کہنے لگا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ نور مل بھی جائے اور پھر بھی انسان اس کو چھوڑ دے ۔میں نے کہا۔حضرت مسیحؑ نے ایسا ہی کہا ہے۔اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے نور دیکھنے کے باوجود اسے قبول کرنے کی کوشش نہیں کرنی ۔اس نے کہا۔آپ ہمیں نور حاصل کرنے کا راستہ بتائیں ۔وہ اسے ضرور قبول کریں گے ۔اس پر میں نے اپنے پرائیویٹ سکرٹری کو بلایا۔اور اسے کہا کہ چونکہ یہ عربی نہیں جانتے اس لئے انہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۔کا پنجابی میں ترجمہ لکھ کر دے دو۔ چنانچہ انہیں اس کا پنجابی ترجمہ لکھ کر دے دیا گیا اور میں نے کہا روزانہ سوتے وقت آپ لوگ یہ دعا پڑھا کریں مگر جس وقت یہ دعا کریں اس وقت اپنے دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کریں کہ اے خدا تو ہمیں کہیں بھی ہدایت دکھائے ہم اسے قبول کرلیں گے ۔اگر اس دعا کے کرتے وقت آپ نے دل میں یہ فیصلہ نہ کیا کہ خدا تعالیٰ جو بھی ہدایت دے گا ہم اسے قبول کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو نور نہیں دکھائے گا ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ مداری نہیں وہ فضول کھیلیں نہیں دکھایا کرتا۔ہاں اگر آپ کے دل میں کمزوری کی وجہ سے بعد میں آپ سے کچھ غلطی ہوجائے تو یہ اَور بات ہے۔ چور چوری سے توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قبول کر لیتا ہے ۔حالانکہ دوسرے دن وہ توبہ توڑ کر پھر چوری کرنے لگ جاتا ہے ۔پس اگر آپ کے نفس میں کوئی کمزوری ہوئی تو اللہ تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں کرے گا وہ صرف یہ دیکھے گا کہ اس وقت آپ کی نیت یہ ہے کہ اس کی ہدایت کو قبول کرلیں گے ۔اس پر وہ چلا گیا پندرہ بیس دن کے بعد اس کی چٹھی آئی کہ آپ کی بات سچی ہوگئی ۔خدا تعالیٰ کا نور میرے آقا کو نظر آ گیا ہے۔مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی یہ دوسری بات بھی سچی ہوگئی کہ ان سے مانا نہیں جائے گا۔اب نور تو نظر آ گیا ہے مگر انہیں اس کو قبول کرنے کی ہمت نہیں ۔معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اسلام کی صداقت کے متعلق کوئی اشارہ کر دیا ہوگا۔مگر پھر اس نے سوچا ہوگا کہ اگر میں نے اسلام قبول کرلیا تو میرے بیٹے کی وزارت بھی جائے گی اور میرا کارخانہ بھی تباہ ہو جائے گا اس لئے قبول کرنے کا کیا فائدہ۔

غرض اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے دعاؤں کا راستہ کھلا رکھا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سچے دل سے توجہ کرنے والا خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ مضطر ہو جائے تو خدا تعالیٰ اس کی دعا کو یقیناً سنتا ہے۔مگر افسوس ہے کہ لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

اَمَّنۡ یَّهۡدِیۡکُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَ مَنۡ یُّرۡسِلُ

(بتاؤ تو) خشکیوں اور سمندروں کی مصیبتوں میں کون تم کو نجات کی راہ دکھاتا ہے۔ اور کون اپنی رحمت (یعنی

الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَی

بارش) سے پہلے خوشخبری کے طور پر ہواؤں کو بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟

اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۴﴾ؕ

اللہ تمہاری شرک کی باتوں سے بہت بلند ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ بتاؤ تو سہی کہ خشکیوں اور سمندروں کے اندھیروں میں تمہیں کون رستہ دکھاتا ہے اس جگہ برّ سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام الٰہی نہیں پایا جاتا۔ اور بحر سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام الٰہی تو پایا جاتا ہے لیکن وہ انسانی دخل اندازیوں کی وجہ سے سمندر کے پانی کی طرح شور ہو گیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں ان معنوں کی وضاحت موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ (الروم:۴۲) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ وہ قومیں بھی بگڑ گئی تھیں جن میں الہامی پانی کا وجود نہیں ہے اور وہ اپنی عقل سے اپنے لئے قانون بناتی ہیں۔ اور وہ قومیں بھی بگڑ گئی تھیں جن میں الہامی پانی تو ہے لیکن سمندر کے پانی کی طرح شور ہو کر انسان کے استعمال کے قابل نہیں رہا۔

اسی طرح بتاؤ تو سہی کہ بادلوں سے پہلے بھیگی ہوئی ہوائیں کون چلاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے جو یہ ہوائیں چلاتا ہے۔ یقیناً وہ مشرکوں کے شرکیہ خیالات سے بہت بالا ہے۔

جہاں تک ظاہری ہواؤں کا تعلق ہے بیشک ان کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک ثبوت ہے۔ لیکن اس جگہ پر روحانی ہواؤں کا ذکر ہے اور رحمت سے مراد بعثتِ انبیاء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بعثتِ انبیاء سے پہلے ان کی قبولیت کے لئے لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ یہ محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب کوئی نبی ہی آئے تو وہ قوم کی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ اس کے سوا قوم کی اصلاح کا اَور کوئی ذریعہ نہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آنے والا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور چونکہ بتوں کی طرف سے ایسے کوئی آدمی نہیں آتے اس لئے آنے والوں

کے ذریعہ شرک کی تردید اور توحید کا قیام ہوجاتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے مشرکانہ خیالات سے بہت بالا ہونے کا ثبوت لوگوں کو نظر آجاتا ہے۔

اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آنے سے پہلے خدا تعالیٰ نے ایسی رَو چلادی تھی کہ تمام کے تمام لوگ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں یہ تسلیم کرنے لگ گئے تھے کہ یہ زمانہ مہدی اور مسیح کا محتاج ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک دفعہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی تو اس کے بعد انہوں نے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

''ممالک اسلامیہ کے سفر میں جتنے مشائخ اور علماء سے ملاقات ہوئی میں نے ان کو امام مہدی کا بڑی بے تابی سے منتظر پایا۔'' (اہل حدیث ۲۶؍جنوری ۱۹۱۲ء)

اسی طرح یورپ کا ایک مفکر جس کا نام مارس انڈس تھا۔ وہ بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک کی سیاحت کے لئے گیا۔ تو اس نے بعد میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ

''دمشق، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لنڈن اور واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار میں ہیں جو سماجی مقصد واصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو''۔ (بحوالہ رسالہ ''نگار'' جنوری وفروری ۱۹۵۱ء)

یورپ کا ایک پروفیسر جس کا نام میکنزی ہے اس نے ایک کتاب ''انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی'' میں اس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال تک نہیں پہنچ سکتی لکھا کہ

''ہمیں بھی ترقی کے لئے ایک مسیح کی ضرورت ہے''۔ (بحوالہ مکاتیب اقبال صفحہ ۶۲ و ۶۳ ۔)

اسی طرح نواب صدیق حسن خان صاحب نے بڑی بے تابی کے ساتھ لکھا کہ

'' حساب کی رُو سے مہدی کا ظہور تیرھویں صدی کے شروع میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہ صدی پوری گذر گئی اور مہدی نہ آئے۔ اب چودھویں صدی ہمارے سر پر آئی ہے۔ شائد اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور چار یا چھ برس کے اندر اندر مہدی ظاہر ہوجائیں۔'' (اقتراب الساعۃ ص ۲۱)

علامہ اقبال نے بھی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا کہ

''یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الّا اللہ''

(کلیات اقبال صفحہ ۵۲۷)

پھر اَور لوگ تو الگ رہے مولانا مودودی صاحب کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ

’’ اکثر لوگ اقامت دین کی تحریک کرنے کے لئے کسی ایسے مردِ کامل کو ڈھونڈتے ہیں جو ان میں سے ایک ایک شخص کے تصور کمال کا مجسمہ ہو اور جس کے سارے پہلو قوی ہی قوی ہوں ۔کوئی پہلو کمزور نہ ہو۔دوسرے الفاظ میں یہ لوگ دراصل نبی کے طالب ہیں اگرچہ زبان سے ختم نبوت کا اقرار کرتے ہیں ۔اور کوئی اجرائے نبوت کا نام بھی لے تو اس کی زبان گُدّی سے کھینچنے کے لئے تیار ہوجائیں ۔مگر اندر سے ان کے دل ایک نبی مانگتے ہیں اور نبی سے کم کسی پر راضی نہیں ۔‘‘

(ترجمان القرآن دسمبر و جنوری ۴۳۔۱۹۴۲ء ص ۴۰۶)

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسی رَو چلا دی کہ تمام دنیا بڑی بے تابی سے ایک مسیح اور مہدی کا انتظار کرنے لگ گئی ۔یہ بھیگی بھیگی ہوائیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ اب جلد ہی آسمانِ روحانیت پر ایسا بادل چھانے والا ہے جو اپنی موسلا دھار بارش سے پیاسی روحوں کو سیراب کردے گا۔اور ان کی بے قراری کو دور کردے گا۔اسی لئے بانی سلسلہ احمدیہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ

’’اے بندگانِ خدا! آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب امساکِ باراں ہوتا ہے اور ایک مدت تک مینہہ نہیں برستا تو اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کنوئیں بھی خشک ہونے شروع ہوجاتے ہیں ۔پس جس طرح جسمانی طور پر آسمانی پانی بھی زمین کے پانیوں میں جوش پیدا کرتا ہے اسی طرح روحانی طور پر جو آسمانی پانی ہے (یعنی خدا کی وحی) وہی سفلی عقلوں کو تازگی بخشتا ہے ۔سو یہ زمانہ بھی اس روحانی پانی کا محتاج تھا۔

میں اپنے دعویٰ کی نسبت اس قدر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں عین ضرورت کے وقت خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جبکہ اس زمانہ میں بہتوں نے یہود کا رنگ پکڑا اور نہ صرف تقویٰ اور طہارت کو چھوڑا بلکہ ان یہود کی طرح جو حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں تھے سچائی کے دشمن ہوگئے ۔تب بالمقابل خدا نے میرا نام مسیح رکھ دیا۔نہ صرف یہ ہے کہ میں اس زمانہ کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہوں بلکہ خود زمانے نے مجھے بلایا ہے۔‘‘　　(براہین احمدیہ حصہ پنجم کی یادداشتیں ص ۱۲)

غرض اس زمانہ کے لوگوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ کے مطابق بانی سلسلہ احمدیہ کی صداقت پر ایک بڑی بھاری دلیل مہیا کردی ہے۔فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا یہ لوگوں کا اپنا کام ہے۔

اَمَّنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ

(بتاؤ تو کہ) وہ جو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر (پیدائش کے) سلسلہ کو جاری کرتا ہے۔ اور جو بادلوں اور زمین سے

السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ

تمہیں رزق دیتا ہے۔ کیا (اس قادر مطلق) اللہ کے سوا کوئی اَور معبود بھی ہے؟ تُو کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی

اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶۵﴾

دلیل پیش کرو (کہ اس کے ثانی اَور بھی ہیں)۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے تم بتاؤ تو سہی کہ کون ہے جو تمہیں پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر پیدائش کے اس سلسلہ کو جاری رکھتا ہے۔ اور کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اس قادر مطلق خدا کے سوا کوئی اور بھی ہے جو ایسا کر سکے۔ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اس جگہ بھی مَنۡ یَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ سے طبقات الارض والی پیدائش مراد نہیں کیونکہ طبقات الارض والی پیدائش نہ تو کسی نے دیکھی ہے اور نہ اس کو توحیدِ باری تعالیٰ کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اس جگہ پیدائش اولیٰ سے مراد قوموں کو تمکنت بخشنا اور یُعِیۡدُہٗ سے مراد غالب قوموں کے زوال کے بعد ان میں دوبارہ زندگی اور بیداری کی روح پیدا کرنا ہے۔ گویا بتایا کہ اگر تم قوموں کی ترقی اور ان کے زوال کی تاریخ پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جب بھی کسی قوم نے ترقی کی ہے تو صرف الٰہی مدد اور تائید سے کی ہے اور جب بھی کوئی قوم اپنے انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ ہوئی ہے تو اس کا احیاء ثانیہ بھی الٰہی تدبیروں کے ماتحت ہی ہوا ہے۔ خود بخود نہیں ہوا۔ اس آیت میں قوموں کی ترقی اور غلبہ کے بعد ان کے زوال اور پھر زوال کے بعد ان کے دوبارہ احیاء کا ذکر کر کے مسلمانوں کو بھی نہایت لطیف پیرایہ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ تمہیں بھی دنیا پر محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے غلبہ حاصل ہوگا۔ اس لئے کبھی اس ترقی کو اپنے زور بازو کا نتیجہ نہ سمجھنا ورنہ تمہاری ساری ترقیات جاتی رہیں گی اور پھر آسمانی تدبیر کے بغیر تمہیں دوبارہ دنیا میں غلبہ میسّر نہیں آ سکے گا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس قیمتی سبق کو فراموش کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی طور پر وہ ایسے زوال کا شکار ہوئے کہ اغیار کی نگاہ میں وہ ہنسی کا نشانہ بن کر رہ گئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان دنیا میں پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں

ہوا جو ہمیشہ زندہ رہا ہو۔لیکن اگر قومیں چاہیں تو وہ ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہیں۔یہی امید دلانے کے لئے حضرت مسیح ؑ ناصری نے فرمایا کہ

’’میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔‘‘ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶، ۱۷)

یعنی یوں تو ہر انسان کے لئے موت مقدّر ہے جس کے نتیجہ میں مَیں تم سے ایک دن جدا ہو جاؤں گا۔لیکن اگر تم چاہو اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگتے رہو تو تم ابد تک زندہ رہ سکتے ہو۔پس انسان اگر چاہے بھی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔لیکن قومیں اگر چاہیں تو زندہ رہ سکتی ہیں اور اگر وہ زندہ نہ رہنا چاہیں تو مر جاتی ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اِسی زندگی کی امید دلاتے ہوئے ’’الوصیۃ‘‘ میں تحریر فرمایا کہ

’’تمہارے لئے دوسری قدرت کا بھی دیکھنا ضروری ہے۔اور اس کا آنا تمہارے لئے بہتر ہے۔کیونکہ وہ دائمی ہے۔جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔اور وہ دوسری قدرت آنہیں سکتی جب تک میں نہ جاؤں لیکن جب میں جاؤں گا تو پھر خدا اس دوسری قدرت کو تمہارے لئے بھیج دے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔‘‘ (روحانی خزائن جلد ۲۰ رسالہ الوصیت صفحہ ۳۰۵)

’’ہمیشہ‘‘ کے یہی معنے ہیں کہ جب تک تم چاہو گے قدرت ثانیہ تم میں موجود رہے گی۔اور قدرت ثانیہ کی وجہ سے تمہیں دائمی حیات عطا کی جائے گی۔

اس جگہ ’’قدرت ثانیہ‘‘ سے ایک تو وہ تائیدات الٰہیہ مراد ہیں جو مومنوں کے شاملِ حال ہوا کرتی ہیں۔اور دوسرے وہ سلسلہ خلافت مراد ہے جو نورِ نبوت کو ممتد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ خود قائم فرماتا ہے۔اگر قوم چاہے اور اپنے آپ کو مستحق بنائے تو تائیدات الٰہیہ بھی ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہ سکتی ہیں۔اور اگر قوم چاہے اور وہ اپنے آپ کو مستحق بنائے تو انعامِ خلافت سے بھی وہ دائمی طور پر متمتع ہو سکتی ہے۔خرابیاں ہمیشہ ذہنیت کے مسخ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ذہنیت درست رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کسی قوم کو چھوڑ دے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد: ۱۲) یعنی اللہ تعالیٰ کبھی کسی قوم کے ساتھ اپنے سلوک میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے دلوں میں خرابی پیدا نہ کر لے۔اور یہ ایسی چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔لیکن اتنی سادہ سی بات بھی قومیں فراموش کر دیتی ہیں اور وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔انسان کا مرنا تو ضروری ہے۔اگر وہ مر جائے تو اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔لیکن قوموں کے لئے مرنا ضروری نہیں۔قومیں

اگر چاہیں تو وہ زندہ رہ سکتی ہیں۔ لیکن وہ زندگی کے اصول کو فراموش کر کے ہلاکت کے سامان پیدا کر لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی تھی کہ اگر وہ اس پر عمل کرتے تو ہمیشہ زندہ رہتے لیکن قوم نے عمل کرنا چھوڑ دیا اور وہ مرگئی۔ دنیا بار بار یہ سوال کرتی ہے اور میرے سامنے بھی یہ سوال کئی دفعہ پیش ہوا ہے کہ باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ نے صحابہؓ کو ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی تھی جس میں ہر قسم کی سوشل تکالیف اور مشکلات کا علاج تھا۔ اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ وہ تعلیم کہاں گئی؟ اور ۳۳ سال میں ہی وہ کیوں ختم ہوگئی؟ عیسائیوں کے پاس مسلمانوں سے کم درجہ کی خلافت تھی۔ لیکن ان میں اب تک پوپ چلا آرہا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے تینتیس سال کے عرصہ میں ہی خلافت کو ختم کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیوں میں پوپ کے باغی بھی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت ایسی ہے جو پوپ کو مانتی ہے اور انہوں نے اس نظام سے فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں ۳۳ سال تک خلافت رہی اور پھر ختم ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں کی ذہنیت خراب ہوگئی۔ اگر ان کی ذہنیت درست رہتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ یہ نعمت ان کے ہاتھ سے چھینی جاتی۔ مجھے یہ حقیقت ایک دفعہ رؤیا (یہ رؤیا ۲۴، ۲۵ راکتوبر ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب کا ہے۔ منہ) میں بھی بتائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پنسل کے لکھے ہوئے کچھ نوٹ ہیں جو کسی مصنّف یا مؤرخ کے ہیں اور انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ پینسل بھی Copying یا Blue رنگ کی ہے۔ نوٹ صاف طور پر نہیں پڑھے جاتے لیکن جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نوٹوں میں یہ بحث کی گئی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان اتنی جلدی کیوں خراب ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے عظیم الشان احسانات ان پر تھے۔ اعلیٰ درجہ کا تمدن اور بہترین اقتصادی تعلیم انہیں دی گئی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ گر گئے اور ان کی حالت خراب ہوگئی۔ یہ نوٹ انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جو انگریزی لکھی ہوئی تھی وہ بائیں طرف سے دائیں طرف کو نہیں لکھی ہوئی تھی۔ بلکہ دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھی ہوئی تھی لیکن پھر بھی میں اسے پڑھ رہا تھا۔ اور اس میں سے ایک فقرہ کے الفاظ قریباً یہ تھے کہ

There were two reasons for it. Their temperament becoming morbid and anarchical.

یعنی وہ خرابی جو مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی طبائع میں دو قسم کے نقائص پیدا ہو گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ مار بڈ Morbid ہو گئے تھے یعنی اَن نیچرل Un-natural اور ناخوشگوار

ہو گئے تھے۔اور دوسرے ان کی ٹنڈنسیز Tendencies انارکیکل Anarchical ہوگئی تھیں۔یعنی ان میں فساد اور بغاوت کی روح پیدا ہوگئی تھی۔میں نے سوچا کہ واقع میں یہ دونوں باتیں صحیح ہیں ان کا مار بڈ Morbid ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ انہیں جو بھی ترقیات ملیں وہ اسلام کی وجہ سے ملی تھیں۔اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ملی تھیں۔ان کی ذاتی خوبی یا کمال کا ان میں کوئی دخل نہیں تھا۔مگر انہوں نے ان ترقیات کو اپنی ذاتی قابلیتوں کا نتیجہ سمجھنا شروع کر دیا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مکہ والوں کی جو کچھ حالت تھی اس کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ لوگ ان کا صرف مجاور سمجھ کر ادب کرتے تھے۔ورنہ ذاتی طور پر ان میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جس کی وجہ سے لوگ ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے۔اسی طرح جب وہ غیر قوموں میں جاتے تو وہ بھی ان کا مجاور سمجھ کر ہی اعزاز کرتیں۔یا زیادہ سے زیادہ تاجر سمجھ کر ادب کرتی تھیں۔وہ انہیں کوئی حکومت قرار نہیں دیتی تھیں اور پھر ان کی حیثیت اتنی کم سمجھی جاتی تھی کہ دوسری حکومتیں یہ سمجھتی تھیں کہ ہم جب چاہیں ان کو کچل سکتی ہیں جیسے یمن کے گورنر نے بیت اللہ کو گرانے کے لئے حملہ کر دیا۔جس کا قرآن کریم نے اصحاب الفیل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت فرمایا تو تیرہ سال تک تو صرف تھوڑے سے آدمی آپ پر ایمان لائے مگر ہجرت کے آٹھویں سال بعد سارا عرب ایک نظام کے ماتحت آ گیا اور اسلام کو ایسی طاقت اور قوت حاصل ہوگئی کہ بڑی بڑی حکومتیں اس سے ڈرنے لگیں۔اس وقت دنیا حکومت کے لحاظ سے دو بڑے حصوں میں منقسم تھی۔اول رومی حکومت دوم ایرانی سلطنت۔رومی سلطنت کے ماتحت تمام مشرقی یورپ۔ٹرکی۔ایشے سینیا۔ یونان۔مصر۔شام اور اناطولیہ تھا۔اور ایرانی سلطنت کے ماتحت عراق۔ایران۔رشین ٹری ٹوری کے بہت سے علاقے۔افغانستان۔ہندوستان کے بعض علاقے اور چین کے بعض علاقے تھے۔ان دونوں حکومتوں کے سامنے عرب کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔لیکن ہجرت کے آٹھویں سال بعد سارا عرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو گیا۔اس کے بعد جب سرحدات پر عیسائی قبائل کی شرارت کی آپ کو خبریں ملنی شروع ہوئیں تو پہلے تو آپؐ خود وہاں تشریف لے گئے اور جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ کوئی شامی لشکر اس وقت جمع نہیں ہو رہا تو آپؐ بعض قبائل سے معاہدات کر کے بغیر کسی لڑائی کے واپس آ گئے۔لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی قبائل نے پھر شرارت شروع کی۔تو آپؐ نے ان کی سرکوبی کے لئے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا۔اس لشکر نے بہت سے قبائل کو سرزنش کی اور بہتوں کو معاہدہ سے تابع کیا (تاریخ الخمیس غزوۃ تبوک)۔پھر آپؐ کی وفات کے بعد اڑہائی سال کے عرصہ میں ہی یہ حکومت عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنی شروع ہوئی۔فتح مکہ کے پانچ سال کے

بعد ایرانی حکومت پر حملہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا گیا تھا۔ اور چند سالوں میں رومی سلطنت اور دوسری سب حکومتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ اتنی بڑی فتح اور اتنے عظیم الشان تغیر کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ تاریخ میں صرف نپولین کی ایک مثال ملتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو تعداد اور طاقت میں اس سے زیادہ ہو۔ جرمن کا ملک اس وقت ۱۴ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ اور اس طرح اس کی تمام طاقت منتشر تھی۔ چنانچہ ایک مشہور امریکن پریذیڈنٹ سے کسی نے پوچھا کہ جرمن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا۔ ایک شیر ہے۔ دو تین لومڑ ہیں اور کچھ چوہے ہیں۔ شیر سے مراد رشیا تھا۔ لومڑ سے مراد دوسری حکومتیں تھیں۔ اور چوہوں سے مراد جرمن تھے۔ گویا جرمن اس وقت ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ روس ایک بڑی طاقت تھی۔ مگر وہ روس کے ساتھ ٹکرایا اور وہاں سے ناکام واپس لوٹا۔ اسی طرح انگلستان کو بھی فتح نہ کر سکا اور انجام اس کا یہ ہوا کہ وہ قید ہو گیا۔ پھر دوسرا بڑا شخص ہٹلر ہوا۔ بلکہ دو بڑے آدمی دو ملکوں میں پیدا ہوئے یعنی ہٹلر اور مسولینی۔ دونوں نے بیشک ترقیات حاصل کیں لیکن دونوں کا انجام شکست ہوا۔ مسلمانوں میں سے جس نے یکدم بڑی حکومت حاصل کی وہ تیمور تھا۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بیشک دنیا کے کناروں تک گیا لیکن وہ اپنے اس مقصد کو کہ ساری دنیا فتح کر لے حاصل نہ کر سکا مثلاً وہ چین کو تابع کرنا چاہتا تھا لیکن تابع نہ کر سکا اور جب وہ مرنے لگا تو اس نے کہا۔ میرے سامنے انسانوں کی ہڈیوں کے ڈھیر ہیں جو مجھے ملامت کر رہے ہیں۔ پس صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی آدمؑ سے لے کر اب تک ایسے گذرے ہیں جنہوں نے فرد واحد سے ترقی کی اور تھوڑے عرصہ میں ہی سارے عرب کو تابع فرمان کر لیا۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد آپ کے ایک خلیفہ نے ایک بہت بڑی حکومت کو توڑ دیا اور باقی علاقے آپؐ کے دوسرے خلیفہ نے فتح کر لئے۔ یہ تغیر جو واقع ہوا محض خدائی نصرت کا نتیجہ تھا۔ کسی انسان کا کام نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر مکہ میں پہنچی تو ایک مجلس میں حضرت ابوبکرؓ کے والد ابوقحافہؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پیغامبر نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تو سب لوگوں پر غم واندوہ کی کیفیت طاری ہو گئی اور سب نے یہی سمجھا کہ اب ملکی حالات کے ماتحت اسلام پراگندہ ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔ اب کیا ہو گا؟ پیغامبر نے کہا۔ آپ کی وفات کے بعد حکومت قائم ہو گئی ہے اور ایک شخص کو خلیفہ بنا لیا گیا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کون خلیفہ مقرر ہوا ہے؟ پیغامبر نے کہا ابوبکرؓ۔ ابوقحافہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ کون ابوبکرؓ؟ کیونکہ وہ اپنے خاندان کی حیثیت کو خوب سمجھتے تھے اور اس حیثیت کے لحاظ سے وہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بیٹے کو سارا عرب بادشاہ تسلیم کر لے گا۔ پیغامبر

نے کہا۔ابو بکرؓ جو فلاں قبیلہ میں سے ہیں ۔ابو قحافہ نے کہا۔کس خاندان میں سے ہے ۔ پیغامبر نے کہا۔فلاں خاندان میں سے ۔اس پر ابو قحافہ نے دوبارہ دریافت کیا۔ وہ کس کا بیٹا ہے؟ پیغامبر نے کہا۔ابو قحافہ کا بیٹا۔اس پر ابو قحافہ نے کہا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور پھر کہا۔آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی تھے ۔ابو قحافہ پہلے صرف نام کے ہی مسلمان تھے ۔لیکن اس واقعہ کے بعد انہوں نے سچے دل سے سمجھ لیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ میں راستباز تھے کیونکہ ابو بکرؓ کی خاندانی حیثیت ایسی نہ تھی کہ سارے عرب آپ کو مان لیتے ۔پس یہ الٰہی دین تھی ۔بعد میں مسلمانوں کی ذہنیت ایسی بگڑی کہ انہوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ یہ فتوحات ہم نے اپنی طاقت سے حاصل کی ہیں ۔کسی نے کہنا شروع کر دیا کہ عرب کی اصل طاقت بنو امیہ ہیں ۔اس لئے خلافت حق ان کا ہے ۔کسی نے کہا۔بنو ہاشم عرب کی اصل طاقت ہیں ۔کسی نے کہا۔ بنو مطلب عرب کی اصل طاقت ہیں ۔کسی نے کہا۔خلافت کے زیادہ حقدار انصار ہیں جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھروں میں جگہ دی۔ گویا تھوڑے ہی سالوں میں مسلمان ماربڈ Morbid ہو گئے ۔اور ان کے دماغ بگڑ گئے ان میں سے ہر قبیلہ نے یہ کوشش شروع کر دی کہ وہ خلافت کو بزور حاصل کر لے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت ختم ہو گئی۔

پھر مسلمانوں کے بگڑنے کا دوسرا سبب انارکی Anarchi ہے۔اسلام نے سب میں مساوات کی روح پیدا کی ۔لیکن مسلمانوں نے یہ نہ سمجھا کہ مساوات پیدا کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ایک آرگنائزیشن ہو۔اس کے بغیر مساوات قائم نہیں رہ سکتی ۔اسلام آیا ہی اسی لئے تھا کہ وہ ایک آرگنائزیشن اور ڈسپلن قائم کرے اور ڈسپلن بھی ایسا جو ظالمانہ نہ ہو۔لیکن چند ہی سال میں مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ خزانے ہمارے ہیں اور اگر حکّام نے ان کے راستہ میں روک ڈالی تو انہوں نے انہیں مارنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ روح تھی جس نے مسلمانوں کو خراب کیا۔انہیں یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ حکومتِ الٰہیہ ہے اور اسے خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے ۔پس اسے خدا تعالیٰ کے ہی ہاتھ میں رہنے دیا جائے تو بہتر ہے ۔اللہ تعالیٰ سورۂ نور میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ خلیفے ہم بنائیں گے ۔لیکن مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ خلیفے ہم نے بنائے ہیں ۔اور جب انہوں نے یہ سمجھا کہ خلیفے ہم نے بنائے ہیں تو خدا تعالیٰ نے کہا۔اچھا اگر خلیفے تم نے بنائے ہیں تو اب تم ہی بناؤ۔ چنانچہ ایک وقت تک تو وہ پہلوں کا مارا ہوا شکار یعنی حضرت ابو بکرؓ ۔حضرت عمرؓ ۔حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا مارا ہوا شکار کھاتے رہے ۔لیکن مرا ہوا شکار ہمیشہ کام نہیں دیتا۔ زندہ بکرا۔یا زندہ بکری یا زندہ مرغا مرغی تو تمہیں ہمیشہ گوشت اور انڈے کھلائیں گے لیکن ذبح کی ہوئی مرغی یا بکری

زیادہ دیر تک نہیں جاسکتی کچھ وقت کے بعد خراب ہوجائے گی ۔حضرت ابوبکرؓ ۔حضرت عمرؓ ۔حضرت عثمانؓ اورحضرت علیؓ کے زمانہ میں تو مسلمان شکار کا تازہ گوشت کھاتے تھے لیکن جب انہوں نے اپنی زندگی کی روح کو ختم کردیا تو تازہ شکار کی بجائے اپنے باپ دادا کا مارا ہوا شکار انہوں نے کھانا شروع کردیا۔مگر یہ شکار کب تک کام دے سکتا تھا۔ایک ذبح شدہ بکری میں اگر بیس پچیس سیر گوشت بھی ہوتو آخر وہ ختم ہوجائے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ان کا مارا ہوا شکار بھی ختم ہوگیا اور پھر ان کا وہی حال ہوا کہ

''ہتھ پرانے کھوسڑے بسنتے ہوری آئے''

وہ ہر جگہ ذلیل ہونا شروع ہوئے ۔انہیں ماریں پڑیں۔اوران کی تمام شان وشوکت جاتی رہی ۔عیسائیوں نے تو اپنی مردہ خلافت کو آج تک سنبھالا ہوا ہے لیکن انہوں نے اپنی زندہ خلافت کو اپنے ہاتھوں زمین میں گاڑ دیا۔ جو محض نفسانی خواہشات ۔دنیوی ترقیات کی تمنا اور وقتی جوشوں کا نتیجہ تھا۔

اب چونکہ خدا تعالیٰ نے پھر اپنے فضل سے مسلمانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ جماعت احمدیہ میں خلافت قائم کی ہے اس لئے میں اپنی جماعت سے کہتا ہوں کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے آپ کو خلافت سے وابستہ رکھو۔اور خلافت کے قیام کے لئے قربانیاں کرتے چلے جاؤ۔اگر تم ایسا کرو گے تو خلافت تم میں ہمیشہ رہے گی خلافت تمہارے ہاتھ میں خدا تعالیٰ نے دی ہی اسی لئے ہے تاوہ کہہ سکے کہ میں نے اسے تمہارے ہاتھ میں دیا تھا۔اگر تم چاہتے تو یہ چیز تم میں قائم رہتی ۔اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے الہامی طور پر بھی قائم کرسکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہ کہا کہ اگر تم لوگ خلافت کو قائم رکھنا چاہو گے تو میں بھی اسے قائم رکھوں گا گویا اس نے تمہارے منہ سے کہلوانا ہے کہ تم خلافت چاہتے ہو یا نہیں چاہتے ۔اب اگر تم اپنا منہ بند کرلو۔ یا خلافت کے انتخاب میں اہلیت مدنظر نہ رکھو تو تم اس نعمت کو کھو بیٹھو گے۔پس مسلمانوں کی تباہی کے اسباب پر غور کرو۔ اور اپنے آپ کو موت کا شکار ہونے سے بچاؤ ۔تمہاری عقلیں تیز ہونی چاہئیں ۔اور تمہارے حوصلے بلند ہونے چاہئیں تم وہ چٹان نہ بنو جو دریا کے رخ کو پھیر دیتی ہے۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم وہ چینل Channel بن جاؤ جو پانی کو آسانی سے گذارتی ہے۔تم ایک ٹنل ہو جس کا کام یہ ہے کہ وہ فیضان الٰہی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل ہوا ہے اسے آگے چلاتے چلے جاؤ۔اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گے تو تم ایک ایسی قوم بن جاؤ گے جو کبھی نہیں مرے گی ۔اور اگر تم اس فیضان الٰہی کے رستہ میں روک بن گئے ۔اس کے رستہ میں پتھر بن کر کھڑے ہوگئے ۔تو وہ تمہاری قوم کی تباہی کا وقت ہوگا پھر تمہاری عمر کبھی لمبی نہیں ہوگی اور تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح پہلی

قو میں مریں۔

پھر فرماتا ہے وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔تم اس امر پر بھی غور کرو کہ آسمان اور زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے ۔کیا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے جو تمہیں یہ رزق بہم پہنچا رہا ہے ۔اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ قوم کی مالی حالت میں جو ترقی ہوتی ہے وہ بھی الٰہی سامانوں سے ہی ہوتی ہے۔کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جس میں محنت کی عادت نہ ہو۔اور کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جس میں سچ کی عادت نہ ہو۔اور قوم کے اندر محنت کرنے اور سچ پر قائم رہنے کا مادہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی آتا ہے۔پس قومی ترقیات کو کسی غیر کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا صرف ایک خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی شخص دلیل پیش نہیں کرسکتا اور اگر کرے گا تو خود تاریخ اس کو ردّ کر دے گی۔

پھر اس آیت میں بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تمہاری جسمانی حیات کے لئے اللہ تعالیٰ تمہیں رزق مہیا کرتا ہے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ اس نے روحانی حیات کے لئے جو انسانی پیدائش کا منتہٰی ہے کوئی انتظام نہ کیا ہو۔اس کا انسانی جسم کی حفاظت اور اس کے بقاء کے لئے رزق مہیا کرنا بتا رہا ہے کہ وہ انسانی روح کی درستی اور اس کی ترقی کے لئے بھی سامان مہیا کرتا ہے اور انبیاء و مصلحین کا وجود اس کی اس رزاقیت کا ایک کھلا ثبوت ہے ۔اگر مشرکین کا یہ دعویٰ کہ ان کے بت بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں درست ہے تو وہ انبیاء کے مقابلہ میں کیوں وہ مدّعی پیش نہیں کرتے جو ان کے بتوں نے کھڑے کئے ہوں اور اگر وہ ایسا کوئی مدعی پیش نہیں کرسکتے تو یہ صاف طور پر اس امر کا ثبوت ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دینا ایک بے دلیل بات اور محض لاف زنی ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

(پھر تُو) کہہ دے کہ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی ہے خدا کے سوا (ان میں سے کوئی) غیب کو نہیں جانتی۔

وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۞۶۶ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي

اور ان میں سے کوئی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو کب زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اخروی زندگی کے

الۡاٰخِرَةِ ۟ بَلۡ هُمۡ فِيۡ شَكٍّ مِّنۡهَا ٝ بَلۡ هُمۡ مِّنۡهَا

بارے میں ان کا علمِ باطل ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے

عَمُوۡنَ ؏ ﴿۶۷﴾

بارہ میں بالکل اندھے ہیں۔

ع۲۰

حلّ لُغَات۔ **اِدّٰرَكَ** اِدّٰرَكَ اصل میں تَدَارَكَ تھا۔ ت کو دال سے ہم مخرج ہونے کی وجہ سے دال بنا کر دال میں ادغام کر دیا۔ پہلا حرف ساکن ہونے کی وجہ سے ہمزۂ وصل ابتداء میں لایا گیا۔ اور تَدَارَكَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں تَلَاحَقُوْا اَیْ لَحِقَ اٰخِرُهُمْ اَوَّلَهُمْ یعنی قوم کا آخری حصہ اول حصہ سے مل گیا۔ (اقرب)

عَمُوْنَ عَمُوْنَ عَمِیٌّ کی جمع ہے اور اَلْعَمِیْ کے معنے ہیں ذُوالْعَمٰی اندھا جس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے زمین و آسمان میں سوائے خدا کے اَور کوئی غیب نہیں جانتا۔ یعنی مصفّٰی علمِ غیب صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔ اور یہ لوگ جو بتوں کے پرستار ہیں یا ستاروں وغیرہ کو دیکھ کر غیب کی خبریں بتانے کے دعویدار ہیں یہ تو اپنی ترقی کا زمانہ بھی نہیں بتا سکتے اور اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ ان کی قوم کب ترقی کرے گی یہ برابر تباہ ہوتے جا رہے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ان کی تباہی کب دور ہو گی۔ اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو پہلے اکیلے تھے آج کروڑوں کے سردار بنے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے معبود بھی اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے یا انہیں ستاروں سے علم غیب حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں یہ اپنی ترقی کا زمانہ نہیں بتا سکتے اور کیوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی جو غیر اللہ سے علم غیب حاصل کرنے کے قائل نہیں روک نہیں دیتے جب یہ اپنی ترقی کا زمانہ بھی نہیں بتا سکتے تو انہوں نے اور کونسی غیب کی خبر بتانی ہے۔ پھر فرمایا کہ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے انجام کے بارہ میں علم سے بالکل خالی ہیں۔ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا بلکہ خود بھی اپنی ترقی کے متعلق انہیں کوئی یقین نہیں۔ صرف اندھوں کی طرح تخمینے کرتے ہیں جس طرح اندھا ادھر ادھر ہاتھ مارتا ہے۔ تو کبھی اس کے ہاتھ میں لکڑی آ جاتی ہے اور کبھی لوہا۔ کبھی سیدھی سڑک پر چلنے لگتا ہے اور کبھی گڑھے میں گر جاتا ہے اسی طرح ان کو بھی کبھی کوئی ایک آدھ بات تخمینے سے درست معلوم ہو جاتی ہے اور کبھی حق سے دور باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ بہرحال

ان میں اور خدا تعالیٰ کے انبیاء میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے انبیاء پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں آسمان وزمین کے غیب بیان کئے جاتے ہیں۔ مگر غیر اللہ میں سے کوئی نہیں جو آسمان وزمین کا غیب بتا سکے۔ پھر نبی تو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ان کی قوم اور ان کے ماننے والے کب ترقی کریں گے۔ لیکن معبودان باطلہ کا کوئی نمائندہ کبھی نہیں بتا سکتا کہ معبودان باطلہ کب زندہ ہوں گے۔ یعنی ان کا مشرکانہ دین کب دنیا میں قائم ہوگا۔ اس بارہ میں ان کا علم ختم ہو چکا ہے۔ بلکہ اب تو انہیں اپنی ترقی کے متعلق خود بھی کوئی یقین نہیں رہا۔ صرف اٹکل پچو باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اٹکل پچو باتیں بھی الگ رہیں اصل حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں بالکل اندھے ہیں اور وہ اپنے مستقبل کے متعلق کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ جبکہ خدا کا رسول توحید کی اشاعت اور اس کے غلبہ کی خبروں کے بعد خبریں دے رہا ہے اور دنیا میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا

اور کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادے مٹی ہو جائیں گے

لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۸﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ

تو کیا ہم پھر زمین سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے۔ ہم اور ہمارے باپ دادوں

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ

سے اس سے پہلے ایسا ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ مگر یہ صرف پہلے لوگوں کی باتیں ہیں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)

فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۷۰﴾

تُو کہہ دے کہ زمین میں پھر و اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا تھا۔

حلّ لُغَات۔ اَسَاطِيْر اَسَاطِيْرُ سَطْرٌ کی جمع اِسْطَارٌ ہے اور اِسْطَارٌ کی جمع اَسَاطِيْر ہے۔ وَقَالَ الْمُبَرِّدُ جَمْعُ اُسْطُوْرَةٍ۔ امام لغت مبرّد نے کہا ہے کہ اَسَاطِيْر اُسْطُوْرَةٌ کی جمع ہے اور اُسْطُوْرَةٌ کے معنے ہیں مَا يُسْطَرُ اَیْ يُكْتَبُ۔ لکھی ہوئی تحریر۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ کفار کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مر کر مٹی ہو جائیں گے تو اس وقت

ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ بیشک ہمیں اور ہمارے گذشتہ آباؤ اجداد کو بھی اس سے پہلے ایسے ہی وعدے دیئے جاتے رہے ہیں مگر ہم تو سمجھتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اور یہ قیامت کا شور محض پرانے لوگوں کی ایک نقل ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تم زمین میں پھر کر دیکھو۔ کہ مجرموں کا کیسا انجام ہوا۔ پھر کیوں تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو خدا اس دنیا میں مجرموں کو اپنے کیفر کردار تک پہنچا سکتا ہے۔ اس دنیا میں انہیں قیامت کا ایک نظارہ دکھا سکتا ہے۔ اس کے لئے انہیں دوسری قیامت کا نظارہ دکھانا کون سا مشکل امر ہے۔ تمہارا بڑا اعتراض آخر یہی ہے کہ ہزاروں سال سے کہنے والے کہتے چلے آئے ہیں مگر قیامت اب تک نہیں آئی۔ اور تمہارے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قیامت کا ادّعا بالکل باطل ہے۔ لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا خدا قیامت نہیں لاسکتا؟ اگر وہ لاسکتا ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دنیا میں اس کے نظارے بھی دیکھ رہے ہو تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ قیامت کیوں نہیں آئی ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ تم زمین میں پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا کیسا انجام ہوا۔ کیا وہ سزا نہیں پاتے رہے۔ اور جب آج تک تمام مجرم سزا پاتے چلے آئے ہیں تو تم یہ کس طرح یہ سمجھ سکتے ہو کہ ہمیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ جس طرح پہلی مجرم قوموں پر دنیا میں ہی قیامت کا آجانا اور ان کا صفحہ ہستی سے معدوم کر دیا جانا اخروی قیامت کا ایک ثبوت ہے اسی طرح تم پر جو دنیوی عذاب آئیں گے یہ بھی اخروی قیامت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہوں گے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور تُو ان پر غم نہ کھا اور ان کی تدبیروں کی وجہ سے تنگی محسوس نہ کر۔

تفسیر۔ چونکہ اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین اپنی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ اور وہ بھی پہلے مجرموں کی طرح اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوں گے۔ اور یہ بات ایسی تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں سخت قلق اور اضطراب پیدا کرنے والی تھی۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی قوم ہلاک ہو۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! تُو ان کی تباہی پر غم نہ کر۔ کیونکہ یہ تباہی کی گھڑی ان پر ضرور آنے والی ہے مگر چونکہ ابھی ان کی کامل تباہی میں کچھ دیر ہے۔ اس عرصہ میں یہ لوگ تیرے خلاف برابر منصوبے کرتے چلے جائیں گے اور تجھے مٹانے

کے لئے ہر قسم کی تدابیر عمل میں لاتے رہیں گے۔ پس تُو ان کی تدبیروں پر اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریو۔ کیونکہ آخر ان کی تدبیریں ناکام رہیں گی اور وہ کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ قُلْ

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟ ۔تُو کہہ دے کہ ممکن ہے کہ وہ

عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

(عذاب) جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا

اور تیرا رب لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ

اور تیرا رب ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جن کو ان کے سینے چھپا رہے ہیں

مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور جن کو وہ ظاہر کر رہے ہیں۔

حلّ لُغَات۔ تُكِنُّ: تُکِنُّ کَنَّ سے باب افعال فعل مضارع معروف واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور کَنَّ الشَّیْءَ وَاَکَنَّہٗ کے معنے ہیں سَتَرَہٗ فِیْ کِنِّہٖ وَغَطَّاہُ وَاَخْفَاہُ۔ کسی چیز کو پردے میں چھپا دیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ یہ کفار اس قدر سرکش ہو چکے ہیں کہ بجائے اس کے کہ انہیں جو ڈھیل دی گئی ہے اس سے یہ فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نفس کی اصلاح کرتے اور خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتے یہ بڑی بے باکی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہوگا۔ تُو ان سے کہہ دے کہ ممکن ہے وہ عذاب جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو۔ یعنی تباہی کی کامل گھڑی تو کچھ دیر میں آئے گی لیکن اس سے پہلے بعض اور چھوٹے چھوٹے عذابوں کا جلدی آنا بھی مقدر ہے اس لئے تمہیں اپنی بے باکی سے توبہ کرنی چاہیے کیونکہ کوئی انسان بھی خدا تعالیٰ کے عذاب کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ باقی رہا یہ سوال کہ

بڑا عذاب جلدی کیوں نہیں آ جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ یعنی وہ چاہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو لوگوں کو ڈھیل دے کر بچا لوں۔ مگر افسوس کہ بجائے اس کے کہ بندے اس کے شکر گذار ہوں وہ ڈھیل دیکھ کر اَور بھی متکبر ہو جاتے ہیں اور شرارتوں میں ترقی کر جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ تیرا رب ان کے مخفی ارادوں اور ظاہر باتوں سب کو جانتا ہے اور ان کی وجہ سے انہیں سزا کا مستحق سمجھتا ہے لیکن محض اپنے فضل کی وجہ سے انہیں ڈھیل دے رہا ہے۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

اور آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی چھپی ہوئی چیز ہے ایک بیان کرنے والی کتاب میں (محفوظ) ہے۔

مُّبِيْنٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں سناتا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں

اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّ

اور وہ ضرور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔ تیرا رب ان (یعنی بنی اسرائیل)

رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ج

کے درمیان اپنے حکم (یعنی قرآن) کے ساتھ (سچا) فیصلہ کرتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۹﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّكَ عَلَى

اور وہ غالب (اور) بہت بڑے علم والا ہے۔

الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۸۰﴾

پس اللہ (تعالیٰ) پر توکل کر۔ تو یقیناً ایک مدلّل حق پر قائم ہے۔

حل لغات۔ غَآئِبَةٌ غَائِبَةٌ کے معنے ہیں۔ كُلُّ غَائِبٍ عَنِ الْحَاسَّةِ وَ عَمَّا يَغِيْبُ عَنْ عِلْمِ الْاِنْسَانِ (مفردات) یعنی ہر وہ چیز جس کا حسّ سے علم نہ ہو سکے۔ یا جس کا انسان کو علم نہ ہو۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔آسمان اور زمین میں کوئی بھی مخفی چیز نہیں مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ پوری طرح محفوظ ہے۔چنانچہ اس کے ثبوت کے طور پر قرآن کریم کو دیکھ لو کہ اکثر باتیں جن میں بنی اسرائیل اختلاف رکھتے ہیں۔ان کو قرآن کریم خوب کھول کر بیان کر رہا ہے اور سچی بات خواہ ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہو اسے نکال کر سامنے لے آتا ہے۔اور ہر عقلمند کو ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کا بیان صحیح ہے اور بائیبل کا بیان غلط۔مثلاً بائیبل میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کی تجلّی دیکھنے کے لئے طُور پر گئے تو ان کے پیچھے ہارون علیہ السلام مشرکوں کے ساتھ مل گئے اور انہوں نے خود ان کے لئے سونے کا بچھڑا بنایا۔اور پھر اس کی پرستش شروع کر دی (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶)۔لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔یہ ایک نہایت ہی گندہ اور ناپاک الزام ہے جو ان پر لگایا جا رہا ہے۔انہوں نے تو بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش کرنے سے بڑی سختی کے ساتھ روکا تھا اور فرمایا تھا کہ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ (طٰہٰ:۹۱) یعنی اے میری قوم! بچھڑے کے ذریعہ تم ایک بڑی آزمائش میں ڈالے گئے ہو۔تمہارا رب تو رحمٰن خدا ہے جو پیدائش سے بھی پہلے تمہاری مدد کرتا رہا ہے اور اب بھی اس نے اپنی ہزاروں نعمتوں سے تمہیں متمتع کیا ہوا ہے۔اس بچھڑے نے تمہاری کیا مدد کرنی ہے کہ تم اس کے آگے اپنا سر جھکا رہے ہو۔پھر قرآن کریم اس امر کی بھی وضاحت فرماتا ہے کہ یہ بچھڑا ایک روحانیت سے بے بہرہ شخص نے بنایا تھا۔جس کا نام سامری تھا۔اب دیکھو قرآن کریم دو ہزار سال کے بعد آیا اور بائیبل خود اس کے ماننے والوں کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں لکھی گئی تھی۔مگر جو کتاب موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں لکھی گئی وہ تو ہارون علیہ السلام کو ملزم قرار دیتی ہے۔مگر تیرہ سو سال کے بعد نازل ہونے والا قرآن ہارون علیہ السلام کو ہر قسم کے الزامات سے پاک ٹھہراتا ہے۔پھر اگر علم النفس کے ماتحت دیکھا جائے کہ ان دونوں روایات میں سے کونسی روایت درست ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی روایت ہی درست ہے کیونکہ بائیبل بھی حضرت ہارون علیہ السلام کو صاحبِ الہام تسلیم کرتی ہے۔اور جب وہ انہیں خدا رسیدہ سمجھتی ہے تو ایک صاحبِ الہام کو یہ شبہ ہی کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا بھی ہے یا نہیں۔آخر بچھڑے کی پوجا وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کے وجود میں شبہ ہو۔مگر جو خود ملہم من اللہ ہو اسے خدا تعالیٰ کے وجود میں کس طرح شبہ ہو سکتا ہے۔پس علم النفس کی شہادت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام پر بائیبل نے جو الزام لگایا ہے وہ سراسر غلط ہے۔اور یہ چیز ایسی ہے جو ہر عقلمند کو تسلیم کرنی پڑتی ہے۔چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جسے انگلستان کے بڑے بڑے علماء نے مل کر مرتب کیا ہے اس میں بھی اس امر پر بحث کرتے ہوئے تسلیم کیا گیا ہے کہ ہارون علیہ السلام کے

شرک کرنے کا واقعہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بائیبل میں اَور بھی کئی واقعات بعد میں بڑھا دیئے گئے ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۴ زیر لفظ دی گولڈن کاف وجلد ۱۵ زیر لفظ موسیٰ)۔

اسی طرح بائیبل بیان کرتی ہے کہ جب بنی اسرائیل نے مصر سے ہجرت کی تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے (خروج باب ۱۲ آیت ۳۸)۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وَهُمْ اُلُوْفٌ (سورۂ بقرۃ ع ۳۲)۔ وہ صرف ہزاروں تھے اور تاریخ سے اور بائیبل کی تفصیلات سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ ہزاروں ہی ہو سکتے تھے لاکھوں نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ لاکھوں آدمی اتنی جلدی مصر کے دور دراز علاقہ سے بحیرۂ قلزم تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نہ لاکھوں آدمیوں کے لئے سواریاں میسر آسکتی تھیں۔ آجکل مشینوں کا زمانہ ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تیس چالیس ہزار آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو ریلیں اور لاریاں ان کے لے جانے سے عاجز ہو جاتی ہیں کجا یہ کہ گھوڑوں بیلوں اور گدھوں کا زمانہ ہو اور ایک رات میں لاکھوں آدمی کئی سو میل پر پہنچا دیئے جائیں۔

اسی طرح قرآن کریم بھی بیان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا اور بائیبل بھی یہی بیان کرتی ہے مگر تفصیلات کو دیکھا جائے تو بائیبل کا حکم بالکل بے معنے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا حکم اپنے اندر بڑی بھاری حکمتیں رکھنے والا دکھائی دیتا ہے۔ بیشک قرآن اور بائیبل کا اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ بائیبل کہتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاقؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور قرآن کریم حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام لیتا ہے۔ لیکن ذبیح اسحاقؑ ہو یا اسماعیلؑ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا بات ایک ہی رہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کا حکم دیا اور آپ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن جہاں تک اس واقعہ کے اخلاقی پہلو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بتایا ہوا واقعہ اپنے اندر بڑی بھاری معقولیت رکھتا ہے۔ لیکن بائیبل کے بیان کردہ واقعہ میں کوئی معقولیت دکھائی نہیں دیتی۔ بائیبل کہتی ہے کہ

> ’’خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابراہام! اس نے کہا۔ میں حاضر ہوں۔ تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تُو پیار کرتا ہے ساتھ لے جا کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔‘‘

(پیدائش باب ۲۲ آیت ۱، ۲)

بائیبل کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب انہوں نے اضحاق کو باندھا اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا اور چھری لی تا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے

’’تب خداوند کے فرشتہ نے اسے آسمان سے پکارا کہ اے ابراہام! اے ابراہام۔ اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ تُو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر۔ کیونکہ میں اب جان گیا کہ تُو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ اور ابراہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔‘‘

(پیدائش باب ۲۲ آیت ۹ تا ۱۴)

گویا بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام کو کسی شکل میں بھی ذبح نہیں کیا گیا۔ نہ ظاہری رنگ میں اور نہ تشبیہی رنگ میں اور اس طرح یہ سارا واقعہ بائیبل کے بیان کے مطابق ایک کھیل تھا جو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کھیلا۔ آخر اس میں کیا لطف تھا کہ پہلے تو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تُو اسحاقؑ کو ذبح کر اور پھر انہیں منع کر دیا۔ اگر اس واقعہ سے خدا تعالیٰ کا صرف اتنا ہی منشاء تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان ظاہر ہو تو کیا خدا تعالیٰ کو پہلے معلوم نہیں تھا کہ ابراہیمؑ صادق الایمان اور راستباز انسان ہے اور اسے جو بھی حکم دیا جائے گا وہ اس کی تعمیل کے لئے فوراً کھڑا ہو جائے گا۔ اور جبکہ خدا تعالیٰ کو پہلے ہی سے اس بات کا علم تھا تو حضرت اسحاقؑ کو ذبح کرنے کا حکم دینا اور پھر اس سے روک دینا ایک بالکل بے معنے بات بن جاتی ہے۔ اور اس کی تہ میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ اسماعیلؑ کی قربانی کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا وہ تشبیہی زبان میں تھا۔ یہ مراد نہیں تھی کہ آپ واقعہ میں اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کر دیں بلکہ ذبح سے مراد اس کو دین کی خاطر ایسی جگہ پر رکھنا تھا جہاں کھانے پینے کے سامان مہیا نہیں تھے۔ چنانچہ گو قرآن کریم کے مطابق بھی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے منع کیا گیا لیکن خواب کا جو اصل مفہوم تھا یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ آنا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس حکم پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عمل کروایا چنانچہ آج تک مکہ اسمٰعیلؑ کی نسل سے آباد ہے اور خدائے واحد کی وہاں پرستش کی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ پس قرآنی تشریح کے مطابق یہ قربانی ظالمانہ اور وحشیانہ نہیں تھی۔ بلکہ پُرمغز اور بامعنی قربانی تھی جس سے آج تک دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور اب بھی اسمٰعیلؑ کے ذریعہ اس بے آب و گیاہ جنگل میں خدائے واحد کا نام بلند کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لاکھوں آدمی حج کے موقعہ پر اس وادی غیر ذی زرع میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر شخص بلند آواز سے کہتا ہے کہ لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ

لَاشَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ۔یعنی اے میرے خدا میں حاضر ہوں۔جس طرح کہ ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔میں تیری توحید کو پھیلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔اب اس واقعہ پر غور کرو اور سوچو کہ کیا بائیبل میں بیان کیا ہوا واقعہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعہ سے کوئی بھی مناسبت رکھتا ہے۔ بائیبل کا حکم تو ایک وحشیانہ اور ظالمانہ حکم معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں تھی۔ اسحاق ؑ کے گلے پر چھری پھیرنے سے دنیا کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا یا خود اسحاق ؑ کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔مگر اسمٰعیل کو مکہ میں چھوڑنے سے اسمٰعیلؑ کو بھی فائدہ ہوا اور دنیا کو بھی فائدہ ہوا۔اسمٰعیلؑ توحید سکھانے کا ایک بہت بڑا استاد بن گیا اور دنیا اس کے ذریعہ خدائے واحد کی عبادت کرنے میں کامیاب ہوگئی۔مکہ کو دنیا کے نقشہ سے الگ کردو تو ساری دنیا میں توحید کا کوئی مرکز باقی نہیں رہتا۔اور اسمٰعیلؑ کی قربانی کو حذف کردو تو خدا تعالیٰ کے لئے زندگیاں وقف کرنے والا ولولہ پیدا کرنے کی کوئی صورت دنیا میں باقی نہیں رہتی۔پس قرآن کریم ہر قسم کے گرد و غبار کو جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے بائیبل کے واقعات پر چھا گیا تھا صاف کرکے سچے اور درست واقعات دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ یعنی آسمان اور زمین کی ہر مخفی سے مخفی بات خدا تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہے۔

پھر قرآن کریم صرف انہی حقائق پر روشنی نہیں ڈالتا جن میں مسلمانوں اور بنی اسرائیل کا باہم اختلاف ہے بلکہ وہ یہود اور نصاریٰ کے آپس کے اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی دنیا کے سامنے صحیح حقیقت کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔مثلاً پیدائش مسیحؑ کے متعلق ہی تمام یہود اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت نعوذ باللہ ناجائز تھی۔چنانچہ ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ یوسف نجار کے نطفہ سے بغیر شادی کے پیدا ہوئے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۵ ص ۱۰۲ نیز دیکھو جیوش لائف آف کرائسٹ ص ۱۳)۔اور بعض کہتے ہیں کہ پنتھیرا نامی ایک رومی سپاہی تھا جس کے حضرت مریم ک ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور انہی تعلقات کے نتیجہ میں حضرت مسیحؑ کی ولادت ہوئی (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۷ ص ۱۷۰ کالم اول)۔اس کے مقابلہ میں انجیل یہ بیان کرتی ہے کہ

’’یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔‘‘

(متی باب ۱ آیت ۱۸)

غرض یہود اور نصاریٰ میں ولادتِ مسیح کے مسئلہ پر ہی عظیم الشان اختلاف پایا جاتا ہے۔یہود آپ کی ولادت

کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور عیسائی اس ولادت کو روح القدس کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ کے اس باہمی نزاع کا فیصلہ کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اعلان فرماتا ہے کہ وَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَہَا فَنَفَخۡنَا فِیۡہَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَ جَعَلۡنٰہَا وَ ابۡنَہَاۤ اٰیَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء:۹۲) یعنی حضرت مریم نے اپنے تمام سوراخوں کو گناہ سے محفوظ رکھا تھا۔ پس ان پر بدکاری کا الزام لگانا ایک شرمناک افتراء ہے۔ ان کو جو حمل ہوا تھا وہ درحقیقت ایک پاک روح تھی جو ہم نے خود اس کے اندر نفخ کی تھی۔

اسی طرح حضرت مسیحؑ کے دعویٰ مسیحیت کو لو۔ تو یہودی تو سرے سے ہی آپ کی رسالت کے منکر ہیں۔ اور عیسائی آپ کو خدا تعالیٰ کا رسول تسلیم کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ کا بیٹا تصور کرتے ہیں۔ اسلام ان دونوں نظریات کے خلاف ایک صحیح اور درست عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہود بھی غلطی پر ہیں جو حضرت مسیحؑ کے کلّی طور پر منکر ہیں۔ اور عیسائی بھی غلطی پر ہیں جو ان کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ سچی بات صرف یہی ہے کہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل کی طرف صرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے (آل عمران آیت ۵۰)۔

اسی طرح یہودی حضرت مسیحؑ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مصلوب ہو کر لعنتی بنے (استثناء باب ۲۳ آیت ۲۱)۔ اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ وہ موت کے بعد گناہگاروں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے صرف تین دن جہنم میں رہے اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے داہنے ہاتھ جا بیٹھے (پطرس کے نام خط نمبر ا باب ۳ آیت ۱۸)۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حضرت مسیحؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ صلیب پر لٹکائے جانے کے بعد ان کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا کہ وہ صلیب پر فوت ہو گئے ہیں ورنہ وہ صلیب پر سے زندہ اتر آئے تھے (النساء:۱۵۸)۔ اور پھر صلیب سے نجات پانے کے بعد وہ آسمان پر نہیں اٹھائے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں کشمیر میں لایا (المومنون:۵۱)۔ اور انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک اشاعتِ دین کے فرائض سرانجام دیئے۔ غرض قرآن کریم یہود اور نصاریٰ کے باہمی اختلافات کو بھی دور کرتا ہے اور ان امور پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو مسلمانوں اور بنی اسرائیل میں مابہ النزاع ہیں اور اس طرح بنی نوع انسان کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان مہیا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ بِحُکۡمِہٖ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡعَلِیۡمُ۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ سے صرف بنی اسرائیل کے باہمی اختلافات کو ہی دور نہیں کرے گا بلکہ وہ چونکہ غالب اور علم والا ہے۔ اس لئے وہ ان کی مختلف قوموں اور فرقوں کے درمیان فیصلہ بھی کر دے گا اور سچوں کو غالب اور جھوٹوں کو مغلوب کر دے گا۔ چنانچہ اس آیت

کے نزول کے بعد عیسائی ہر جگہ غالب آ گئے اور یہودی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر تھے ہر جگہ مغلوب ہو گئے مگر عیسائیت کا غلبہ چونکہ اسلام کے لئے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا اور مسلمانوں پر اشاعت اسلام کی بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہونے والی تھیں اس لئے عیسائیت کے غلبہ کی خبر دیتے ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی کہ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۔تمہارا کام یہ ہے کہ تم اللہ پر توکل کرتے ہوئے۔ اپنے دین کی اشاعت کرتے چلے جاؤ کیونکہ گو عیسائیت اور یہودیت کے باہمی نزاع میں عیسائیت حق پر ہے مگر حقِ مبین صرف اسلام کے پاس ہی ہے اس لئے تمہارا کام یہ ہے کہ تم اسلام کی اشاعت کے لئے ہر قسم کی تدابیر کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھو۔ کہ وہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔ اور اسلام کا جھنڈا دنیا کے تمام جھنڈوں سے اونچا لہرائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے توکل کا نہایت غلط مفہوم سمجھ لیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ توکل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی تدبیر سے کام نہ لے اور اپنے تمام کاموں کی سرانجام دہی خدا تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں تو توکل ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن دنیا کے معاملہ میں کبھی توکل نہیں کرتے۔ کبھی کسی کا عزیز بیمار ہو جائے تو تم یہ نہیں دیکھو گے کہ وہ خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ رہے اور کہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں وہ خود اسے اچھا کر دے گا۔ بلکہ وہ فوراً دوائی لینے کے لئے ہسپتال کی طرف دوڑے گا۔ وہ کبھی نہیں کہے گا کہ بھلا ملیریا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے یا ہیضہ مجھے کیا کر سکتا ہے یا طاعون مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے وہ فوراً علاج کرے گا۔ اور ڈاکٹروں کی فیسوں پر روپیہ بھی خرچ کرے گا۔ اور اس معاملہ میں توکل سے کام لینے کی بجائے تدبیر سے کام لے گا اسی طرح کبھی تم نہیں دیکھو گے کہ کوئی لڑکا سکول میں داخل ہو تو نہ کتابیں خریدے نہ پڑھائی کرے اور یہی کہتا رہے کہ اللہ مجھے پاس کر دے گا۔ میں اس پر سچے طور پر توکل کرتا ہوں۔ یا کسی کو اپنے لئے مکان کی ضرورت ہو تو نہ اینٹیں مہیا کرے۔ نہ چونا خریدے۔ نہ گارا بنوائے نہ مزدور اور مستری بلوائے اور کہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں یہ تردّد کروں۔ اللہ تعالیٰ خود مکان بنا دے گا۔ یا مثلاً کھانے کی ضرورت ہو تو بیوی کھانا تیار نہ کرے اور شام کو جب خاوند گھر آئے اور پوچھے کہ کھانا تیار ہے تو وہ کہے کہ مجھے کھانا تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہر جاندار کو روزی پہنچانا ہے وہ خود ہمیں کھانا پہنچائے گا۔ اب کیا تم سمجھتے ہو کہ خاوند اس کی بات سن کر یہ کہے گا کہ میری بیوی نے بڑا توکل کیا۔ وہ یقیناً اس پر ناراضگی کا اظہار کرے گا۔ بلکہ ایک غیر تعلیم یافتہ گنوار تو کچھ تعجب نہیں کہ دو چار سونٹیاں بھی رسید کر دے۔ مگر اس قسم کا توکل لوگوں کو دین کے معاملہ میں فوراً یاد آ جاتا ہے۔ ہم اپنی روٹی کے لئے توکل نہیں کرتے۔ ہم اپنے مکان کے لئے توکل نہیں کرتے۔ ہم اپنی ملازمت کے لئے توکل نہیں کرتے۔ ہم اپنے دوسرے

کاموں کے لئے توکل نہیں کرتے بلکہ تمام وہ تدابیر اختیار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب میں مقرر فرمائی ہیں۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ موت اور حیات میرے اختیار میں ہے۔ ذلّت اور عزت میرے ہاتھ میں ہے۔ رزق کی فراخی اور تنگی میرے ہاتھ میں ہے۔ ہم موت سے بچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہم حیات کے پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ذلّت سے محفوظ رہنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہم عزت اور ترقی کے حصول کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہم رزق بڑھانے اور آمدنی کو وسیع کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ہم وہ ساری تدابیر اختیار کرتے ہیں جن تدابیر کا اختیار کرنا دنیوی کاموں کی سرانجام دہی کے لئے ضروری ہے۔ مگر جب دین کا سوال آجاتا ہے ہم نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کرے گا۔ ہمیں اس میں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں ایک دفعہ لاہور سے آرہا تھا۔ یہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ جس کمرہ میں میں سوار ہوا اسی کمرہ میں ایک مشہور پیر صاحب بھی سوار ہو گئے۔ انہیں مجھ سے کچھ کام تھا۔ اور وہ مجھ سے ایک معاملہ میں مدد لینا چاہتے تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے مجھے ممنون کرنے کے لئے ایک رومال نکالا جس میں کچھ میوہ بندھا ہوا تھا۔ اور رومال کھول کر میرے سامنے بچھا دیا اور کہا کہ کھائیے۔ وہ مجھ سے کسی احمدی کے پاس ایک معاملہ میں سفارش کرانا چاہتے تھے۔ مگر اس سے پہلے وہ پیر صاحب یہ فتویٰ بھی شائع کر چکے تھے کہ احمدیوں سے ملنا جلنا اور گفتگو کرنا بالکل حرام ہے اور اگر کوئی ان سے ملے جلے یا گفتگو کرے یا ان کے جلسہ میں شریک ہو تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ جب سیالکوٹ تشریف لے گئے اور وہاں ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے تقریر فرمائی تو راستہ میں بڑے بڑے مولوی ان پیر صاحب کے فتویٰ کے اشتہارات اٹھائے ہوئے لوگوں کو کہہ رہے تھے کہ جو مرزا صاحب کے لیکچر میں جائے گا اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ جو احمدیوں سے ملے گا اس کی بیوی کو بھی طلاق ہو جائے گی۔ اور جو ان کے سلام کا جواب دے گا اس کی بیوی کو بھی طلاق ہو جائے گی مجھے یاد ہے جلسہ میں جب لوگ جاتے تو باہر بڑے بڑے مولوی کھڑے ہو کر لوگوں کو روکتے کہ اندر مت جانا۔ ورنہ تمہارا نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اس پر کئی جوش میں آجاتے اور کہتے نکاح کا کیا ہے نکاح تو سوا روپیہ دیکر پھر بھی پڑھا لیا جائے گا۔ مرزا صاحب نے روز روز نہیں آنا۔ اس لئے ان کا لیکچر ضرور سنیں گے۔ اور یہ کہہ کر وہ جلسہ میں شامل ہو جاتے۔ تو انہی پیر صاحب نے جن کا یہ فتویٰ تھا کہ احمدیوں سے ملنے اور باتیں کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ باوجود یہ معلوم ہونے کے کہ میں بانئ سلسلہ احمدیہ کا لڑکا ہوں رومال بچھا کر

میرے سامنے میوہ رکھ دیا اور کہا کھایئے ۔ مجھے اس فتویٰ کی وجہ سے یوں بھی انقباض تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان بھی پیدا کیا ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ اس روز مجھے کھانسی اور نزلہ کی شکایت تھی ۔ میوہ میں کشمش بھی تھی جس کا کھانا نزلہ کی حالت میں نزلہ کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس لئے میں نے معذرت کی کہ آپ مجھے معاف رکھیں ۔ مجھے نزلہ کی شکایت ہے میں میوہ نہیں کھا سکتا۔ پیر صاحب فرمانے لگے کہ نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کھائیں تو سہی ۔ میں نے پھر انکار کیا کہ مجھے اس حالت میں ذرا سی بدپرہیزی سے بھی بہت تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے ۔ یہ تو باتیں ہی ہیں ۔ کرنا تو سب اللہ نے ہوتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے ۔ میں نے کہا۔ پیر صاحب آپ نے یہ بات بہت بعد میں بتائی ۔ اگر آپ لاہور میں ہی بتا دیتے تو آپ اور میں ایک نقصان سے بچ جاتے ۔ کہنے لگے وہ کیا۔ میں نے کہا غلطی یہ ہوئی کہ آپ نے بھی ریل کا ٹکٹ لے لیا اور میں نے بھی (وہ امرتسر آ رہے تھے اور میں بٹالہ آ رہا تھا) اگر اس مسئلہ کا پہلے علم ہوتا تو نہ ہم ٹانگے پر کرایہ خرچ کرتے نہ ریل کا ٹکٹ مول لیتے ۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہنچانا ہی تھا تو وہ آپ کو امرتسر پہنچا دیتا اور مجھے قادیان پہنچا دیتا۔ ہمیں ٹکٹ پر روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ وہ کہنے لگے تدبیر بھی تو ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ بس اسی اسباب کی رعایت کی وجہ سے مجھے بھی میوہ کھانے میں عذر تھا۔ تو جب انسان کا ذاتی سوال ہو تو اس وقت اسے ہزاروں تدبیریں یاد آ جاتی ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کے دین کا معاملہ ہو تو انسان نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتا ہے کہ مجھے تدبیر سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے اللہ خود کرے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دین کا کام اللہ تعالیٰ نے ہی کرنا ہے اور ہمارے کام بھی دراصل وہی کرتا ہے ۔ ہم ہزاروں کام جو کرتے اور کامیاب ہو جاتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا ہی نتیجہ ہے ۔ ہماری کسی کوشش کا خالصۃً اس میں دخل نہیں ورنہ ہمیں ہر کام میں کامیابی ہو۔ لیکن کامیابی ہر بات میں نہیں ہوتی کسی بات میں ہو جاتی ہے اور کسی میں نہیں ہوتی ۔ ہزاروں لڑکے محنت کر کے پاس ہو جاتے ہیں اور ہزاروں لڑکے محنت کرنے کے باوجود فیل ہو جاتے ہیں ۔ ہزاروں کوشش کرتے ہیں اور انہیں عزت مل جاتی ہے اور ہزاروں عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ پہلے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتے ہیں ۔ تو تمام کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے ۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تدبیر کا تعلق ہو وہاں اگر مومن تدبیر نہیں کرتا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا نازل ہوتی ہے اور وہ اس کی گرفت اور عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دیکھو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک نہایت واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی پیش کی ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ کنعان کی سرزمین کا انہیں وارث بنا دیا جائے گا۔ جیسے ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیں دنیا کا حکمران اور بادشاہ بنائے گا۔ مگر اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جاؤ اور جنگ

کرو۔اس جنگ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں فتح دے دے گا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا یہ حکم سنایا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ہم سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ہمیں کنعان کی سرزمین دے گا وہ اپنے وعدہ کو آپ پورا کرے ۔ہم اپنی جانوں کو کیوں ہلاکت میں ڈالیں ۔موسیٰ ؑ اور اس کا خدا دونوں جا کر دشمنوں سے لڑیں (المائدۃ:۲۲ تا ۲۷) اور جب فتح ہو جائے تو ہمیں آ کر بتا دیا جائے ہم کنعان کی سرزمین میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ باوجود وعدہ کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے وہ زمین ان پر چالیس سال تک حرام کر دی اور ان پر ایسی ذلّت نازل کی کہ وہ تمام لوگ جنہوں نے یہ اعتراض کیا تھا ایک ایک کر کے جنگلوں میں بھٹک کر مر گئے ۔اور پھر ان کی نسلوں کے ذریعہ یہ الٰہی وعدہ پورا ہوا۔تو جہاں تدبیر کا تعلق ہو وہاں باوجود وعدہ کے۔باوجود الٰہی فیصلہ کے۔باوجود الٰہی مشیت اور ارادہ کے اس وقت تک خدا تعالیٰ کی نصرت نازل نہیں ہوتی ۔جب تک تمام کی تمام قوم قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتی ۔اور اگر کوئی قوم قربانی کے لئے تیار نہ ہو تو جھوٹا توکل اسے کامیاب نہیں کر سکتا۔حدیثوں میں آتا ہے ۔ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھوں اور پھر توکل کروں یا اسے آزاد رہنے دوں اور توکل کروں ۔آپ نے فرمایا اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ (ترمذی جلد ۲ ابواب صفۃ القیامۃ)۔ پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر توکل کرو۔یعنی پہلے عمل کرو اور پھر خدا تعالیٰ پر نتیجہ چھوڑو۔یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رات دن کام میں مشغول رہتے تھے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس قدر عبادت کرتے تھے کہ کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے ۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ یا رسول اللہ آپ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں ۔کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف نہیں کر دیئے ۔آپؐ نے فرمایا۔کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل)۔

اگر توکل کے یہ معنے ہوتے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تو سب سے زیادہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل ہونا چاہیے تھا کیونکہ آپؐ سب سے بڑھ کر متوکل تھے۔مگر آپ سب سے زیادہ مشغول رہتے تھے۔ پھر ان معنوں میں سب سے زیادہ توکل تو جنت میں ہو سکتا ہے ۔مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مشغولیت ہوگی جیسے فرمایا فِیْ شُغُلٍ فٰکِهُوْنَ (سورۃ یٰسٓ آیت ۵۶)۔

اگر توکل کا یہی مفہوم ہوتا تو جب وہاں ہر چیز خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنی ہے تو مومنوں کو تو جنت میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہیے تھا مگر وہاں کے لئے بھی شغل کو نکرہ کے طور پر استعمال کر کے بتایا کہ وہاں بڑا عظیم الشان کام

کرنا ہوگا۔فرق صرف یہ ہے کہ وہاں انسان کام سے تنگ نہیں آجائے گا اور تھکے گا نہیں بلکہ خوشی محسوس کرے گا اور کام کرنے کے باوجود اس کے اندر بشاشت قائم رہے گی۔

غرض آج کل لوگوں نے توکل کا نہایت غلط مفہوم سمجھ رکھا ہے۔جو کام ان کی اپنی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اسے تو وہ کر لیتے ہیں۔

اور جو کام نہیں کرنا چاہتے اس کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ ہم توکل سے کام لے رہے ہیں۔اگر توکل کے یہ معنے ہوتے کہ عمل ترک کر دیا جائے۔تو پھر نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرنا ہی انسان کو نجات دے دیتا۔

پس توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں سے پوری طرح کام لے اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے اور اس سے کہے کہ اے خدا! جو سامان میرے اختیار میں تھے وہ تو میں نے سب استعمال کر لئے ہیں اب کوئی کمی رہ گئی ہے تو تُو خود اپنے فضل سے اسے پورا فرما اور میری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کام کے نیک نتائج پیدا فرما۔جب وہ ایسا کرے گا تب اسے اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ اپنے ہر کام میں کامیابی حاصل کرے گا۔لیکن جو شخص کام نہیں کرتا اور پھر اپنے آپ کو متوکل کہتا ہے وہ توکل کے ساتھ تمسخر کرتا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا

تُو (ہرگز) مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔اور نہ بہروں کو ہی (اپنی) آواز سنا سکتا ہے۔خصوصاً جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے

وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ

جاتے ہیں۔اور تُو اندھوں کو بھی ان کی گمراہی سے بچا کر ہدایت نہیں دے سکتا۔تُو تو صرف انہی کو سناتا ہے

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔اور وہ (عملاً بھی) فرمانبردار ہوتے ہیں۔

تفسیر۔چونکہ اوپر یہ کہا گیا تھا کہ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ تُو ایک واضح اور روشن سچائی پر قائم ہے اس

لئے اب اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ واضح سے واضح سچائی کا انکار کرنے والے بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔اس لئے محض کسی ہدایت کا کامل ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ اسے سب لوگ مان لیں گے۔چنانچہ فرماتا ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى جو مُردہ دل لوگ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کی محبت کے جذبات سے بالکل عاری ہوں تم ان کو خدا تعالیٰ کی باتیں نہیں منوا سکتے وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ اور نہ تم بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہو۔بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں یعنی آواز تو وہ پہلے ہی نہیں سن سکتے۔پیٹھ پھیر کر چلے جانے کی وجہ سے وہ دوسروں کے اشارے دیکھنے سے بھی محروم ہوجاتے ہیں اور ان کی ہدایت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔اسی طرح جو اندھا ہو اور بینا کے پیچھے چلنے کے لئے تیار نہ ہو اس کو بھی اس کی گمراہی سے کوئی نہیں بچا سکتا صرف اسی کو سچائی سنائی اور سمجھائی جاسکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات پر ایمان رکھتے ہوں اور ایسے ہی لوگ آخر میں مسلمان ہوتے ہیں۔

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ

اور جب ان کی تباہی کی پیشگوئی پوری ہوجائے گی۔تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک کیڑا نکالیں گے جو ان

الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع

کو کاٹے گا اس وجہ سے کہ لوگ ہمارے نشانات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

حلّ لُغات۔ تُكَلِّمُهُمْ تُكَلِّمُهُمْ كَلَّمَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور كَلَّمَهٗ کے معنے ہیں حَدَّثَهٗ۔بات کی۔وَجَرَّحَهٗ اس کو زخمی کیا۔(اقرب) پس تُكَلِّمُهُمْ کے معنے ہوں گے ان کو زخمی کرے گا۔

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ جب ان روحانی مردوں اور بہروں اور اندھوں کے خلاف خدا تعالیٰ کا فتویٰ جاری ہوجائے گا اور آسمان سے ان کی سزا کا فیصلہ نافذ ہوجائے گا۔تو اللہ تعالیٰ زمین میں سے ایک کیڑا نکالے گا۔جو ان کو کاٹے گا۔اور یہ عذاب ان پر اس لئے آئے گا کہ وہ لوگ ہمارے نشانات کی سچائی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

اس آیت میں دَآبَّةُ الْاَرْضِ کے خروج کی جو پیشگوئی کی گئی ہے اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں وضاحتاً فرمایا ہے کہ اس کا خروج آخری زمانہ میں ہوگا جو مسیح اور مہدی کا زمانہ ہے (تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد ۷ صفحہ ۲۳۱)۔اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب آنے والے مسیح کی

مخالفت بڑھ جائے گی تو فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ (مسلم کتاب الفتن باب ذکر الدجال وصفتہٖ)۔ اللہ تعالیٰ مخالفین کی گردنوں میں ایک پھوڑا پیدا کرے گا جس سے ان کی ہلاکت واقعہ ہوگی۔ ان دونوں حدیثوں کو ملا کر دیکھا جائے تو ان سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دابۃ الارض جس کے خروج کی خبر دی گئی ہے وہ درحقیقت طاعون کا ہی مرض ہے جو حضرت بانی سلسلہ کے زمانہ میں پھیلا اور جس سے لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ چونکہ یہ مرض ایک کیڑے سے پیدا ہوتا ہے جو زمین سے انسان کے جسم میں داخل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی گردن یا بُنِ ران میں ایک خطرناک قسم کا پھوڑا بھی نکلتا ہے جو مہلک ہوتا ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دابۃ الارض بھی قرار دیا۔ اور نغف کی بیماری بھی اس کا نام رکھا۔ اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دابۃ الارض کا خروج آخری زمانہ کی علامات میں سے قرار دیا ہے اس لئے لازماً وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ سے وہی لوگ مراد ہیں جو مسیح موعود کی تکذیب کرنے والے ہوں گے۔ اور جو اپنی روحانی نابینائی کی وجہ سے نہ آسمانی نشانات کو دیکھیں گے۔ نہ روحانی شنوائی کے فقدان کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے کلام کو سنیں گے۔ اور نہ روحانی حیات سے کلیۃً محروم ہونے کی وجہ سے نیکی کا کوئی فعل ان سے سرزد ہوگا۔ ایسے لوگ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی گرفت میں آجائیں گے۔ اور ایک زمینی کیڑا ان کی ہلاکت کے لئے ان پر مسلط کیا جائے گا۔ چونکہ وہ بھی ایک رنگ میں زمینی کیڑے بن چکے ہوں گے۔ اس لئے خدا تعالیٰ بھی ان کی سزا کے لئے ایک زمینی کیڑا ہی ان پر مسلط کرے گا اور انہیں آیاتِ الٰہیہ پر ایمان نہ لانے کی سزا دے گا۔

غرض یہ ایک بڑی بھاری پیشگوئی ہے جو بانی سلسلہ احمدیہؑ کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اور جس کی طرف خود بانی سلسلہ احمدؑیہ پیشگوئیاں بھی بڑی وضاحت سے اشارہ کررہی تھیں چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق رمضان کی تیرہ تاریخ کو چاند گرہن اور اٹھائیس تاریخ کو سورج گرہن ہوا تو اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا کہ اگر لوگوں نے اس نشان سے فائدہ نہ اٹھایا اور تجھے قبول نہ کیا تو ان پر ایک شدید عذاب نازل ہوگا۔ چنانچہ اس بارہ میں آپ نے اپنی کتاب ’’نورالحق‘‘ میں پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا:۔

’’وَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ الْخُسُوفَ وَالْكُسُوفَ اٰيَتَانِ مُخَوِّفَتَانِ وَاِذَا اجْتَمَعَا فَهُوَ تَهْدِيْدٌ شَدِيْدٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ۔ وَاِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْعَذَابَ قَدْ تَقَرَّرَ وَاُكِّدَ مِنَ اللّٰهِ لِاَهْلِ الْعُدْوَانِ۔‘‘ (نورالحق روحانی خزائن جلد ۸ حصہ دوم صفحہ ۲۳۲)

یعنی کسوف وخسوف خدا تعالیٰ کی طرف سے دوڑرانے والے نشان ہیں۔ اور جب یہ اس طرح جمع ہوجائیں

جس طرح اب جمع ہوئے ہیں تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہوتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو سرکشی سے باز نہ آئیں عذاب مقرر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے آپ کے دل میں تحریک کی کہ آپ ایک عام وباء کے لئے دعا کریں چنانچہ آپ اپنے ایک عربی قصیدہ میں جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا فرماتے ہیں ؎

فَلَمَّا طَغَی الْفِسْقُ الْمُبِیْدُ بِسَیْلِهٖ
تَمَنَّیْتُ لَوْ کَانَ الْوَبَآءُ الْمُتَبِّرُ
فَاِنَّ هَلَاكَ النَّاسِ عِنْدَ اُوْلِی النُّهٰی
اَحَبُّ وَ اَوْلٰی مِنْ ضَلَالٍ یُّخَسِّرُ

یعنی جب ہلاک کر دینے والا فسق ایک طوفان کی طرح بڑھ گیا تو میں نے خدا سے چاہا کہ کاش ایک وباء پڑے جو لوگوں کو ہلاک کر دے۔ کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک لوگوں کا مر جانا اس سے زیادہ پسندیدہ اور عمدہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ تباہ کر دینے والی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔

اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں آپ نے اپنی کتاب ''سراج منیر'' میں لکھا کہ

''اس عاجز کو الہام ہوا ہے یَامَسِیْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا یعنی اے خلقت کے لئے مسیح! ہماری متعدی بیماریوں کے لئے توجہ کر۔''

پھر فرماتے ہیں:۔

''دیکھو یہ کس زمانے کی خبریں ہیں اور نہ معلوم کس وقت پوری ہوں گی۔ ایک وہ وقت ہے جو دعا سے مرتے ہیں اور دوسرا وہ وقت آتا ہے کہ دعا سے زندہ ہوں گے۔''

(سراج منیر روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۷۰، ۷۱)

جس وقت یہ آخری پیشگوئی شائع ہوئی اس وقت طاعون صرف بمبئی میں پڑی تھی اور ایک سال رہ کر ہٹ گئی تھی۔ اور لوگ خوش تھے کہ ڈاکٹروں نے اس کے پھیلنے کو روک دیا۔ مگر خدا تعالیٰ کی خبریں اس کے خلاف تھیں چنانچہ جب لوگ اس مرض کے حملہ کو ایک عارضی حملہ خیال کر رہے تھے اور پنجاب میں صرف ایک دو گاؤں میں ہی یہ مرض نہایت قلیل طور پر پائی جاتی تھی باقی سب علاقہ محفوظ تھا اور بمبئی کی طاعون بھی بظاہر دبی ہوئی معلوم ہوتی تھی اس وقت آپ نے ایک اور اعلان کیا اور اس میں بتایا کہ:

’’ایک ضروری امر ہے جس کے لکھنے پر میرے جوشِ ہمدردی نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ جو لوگ روحانیت سے بے بہرہ ہیں اس کو ہنسی اور ٹھٹھے سے دیکھیں گے مگر میرا فرض ہے کہ میں اس کو نوع انسان کی ہمدردی کے لئے ظاہر کروں۔ اور وہ یہ ہے کہ آج جو ۶؍فروری ۱۸۹۸ء روز یک شنبہ ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ خدا تعالیٰ کے ملائک پنجاب کے مختلف مقامات میں سیاہ رنگ کے پودے لگا رہے ہیں۔ اور وہ درخت نہایت بدشکل اور سیاہ رنگ اور خوفناک اور چھوٹے قد کے ہیں۔ میں نے بعض لگانے والوں سے پوچھا کہ یہ کیسے درخت ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ طاعون کے درخت ہیں جو عنقریب ملک میں پھیلنے والی ہے۔ میرے پر یہ امر مشتبہ رہا کہ اس نے یہ کہا کہ آئندہ جاڑے میں یہ مرض پھیلے گا یا یہ کہ اس کے بعد کے جاڑے میں پھیلے گا۔ لیکن نہایت خوفناک نمونہ تھا جو میں نے دیکھا۔ اور مجھے اس سے پہلے طاعون کے بارہ میں الہام بھی ہوا اور وہ یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ۔ اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ۔ یعنی جب تک دلوں کی وبائے معصیت دور نہ ہوگی تب تک ظاہری وباء بھی دور نہیں ہوگی۔‘‘

(ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۰، ۳۶۱)

اس اشتہار کے آخر میں آپ نے اپنے چند فارسی اشعار بھی لکھے جو یہ ہیں کہ ؎

گر آں چیزے کہ مے بینم عزیزاں نیز دیدندے
ز دنیا توبہ کردندے بچشمِ زار وخوں بارے
خورِ تاباں سیہ گشت است از بدکاری مردم
زمیں طاعوں ہمے آرد پئے تخویف وانذارے
بہ تشویش ِ قیامت ماند ایں تشویش گر بینی
علاجے نیست بہرِ دفع آں جز حسن کردارے
من از ہمدردی ات گفتم تو خود ہم فکر کن بارے
خرد از بہر ایں روز است اے داناو ہوشیارے

(ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۳)

یعنی اگر وہ چیز جسے میں دیکھ رہا ہوں اَور دوست بھی دیکھتے تو وہ دنیا سے رورو کر توبہ کرتے۔ لوگوں کی

بدکاریوں کی وجہ سے چمکتا ہوا سورج بھی سیاہ ہوگیا ہے۔اور زمین بھی ڈرانے اور دھمکانے کی خاطر طاعون پیدا کررہی ہے۔اگر تم غور سے دیکھو تو یہ مصیبت قیامت کی مصیبت کی طرح ہے اور اس کو دور کرنے کا علاج سوائے نیک اعمال کے اَور کچھ نہیں۔میں نے صرف ہمدردی کی وجہ سے یہ بات کہی ہے۔اب اے دانا اور سمجھدار انسان تو آپ بھی غور کرلے۔کیونکہ عقل اسی دن کے لئے ہوا کرتی ہے۔

ان پیشگوئیوں سے ظاہر ہے کہ آپ نے ۱۸۹۴ء سے پہلے ایک خطرناک عذاب اور پھر کھلے لفظوں میں وباء کی پیشگوئی کی۔اور پھر جبکہ ہندوستان میں ابھی طاعون نمودار ہی ہوئی تھی کہ آپ نے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کی تباہی کی خبر دی اور آنے والی طاعون کو قیامت کا نمونہ قرار دیا۔اور فرمایا کہ یہ طاعون اس وقت تک نہیں جائے گی جب تک کہ لوگ دلوں کی اصلاح نہیں کریں گے۔اس کے بعد جو کچھ ہوا الفاظ اسے ادا نہیں کرسکتے۔طاعون کی ابتداء گو بمبئی سے ہوئی تھی اور قیاس چاہتا تھا کہ وہیں اس کا دورہ سخت ہوتا۔وہ تو پیچھے رہ گئی اور پنجاب میں طاعون نے اپنا ڈیرہ لگالیا۔اور اس سختی سے اس نے حملہ کیا کہ بعض دفعہ ایک ایک ہفتہ میں تیس تیس ہزار آدمیوں کی موت ہوئی۔اور ایک ایک سال میں کئی کئی لاکھ آدمی مر گئے۔سینکڑوں ڈاکٹر مقرر کئے گئے اور بیسیوں قسم کے علاج نکالے گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ہر سال طاعون مزید شدت اور سختی کے ساتھ حملہ آور ہوئی اور گورنمنٹ منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور بہت سے لوگوں کے دلوں نے محسوس کیا کہ یہ عذاب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انکار کی وجہ سے آیا ہے۔چنانچہ ہزاروں نہیں لاکھوں آدمیوں نے اس قہری نشان کو دیکھ کر صداقت کو قبول کرلیا۔اور اللہ تعالیٰ کے مامور پر ایمان لائے۔اور اس وقت تک طاعون کے زور میں کمی نہ ہوئی جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے مامور کو یہ نہ بتایا کہ

''طاعون تو گئی مگر بخار رہ گیا''

(تذکرہ صفحہ ۴۷۸ ایڈیشن ۲۰۲۲ء)

اس کے بعد سے طاعون کا زور ٹوٹنا شروع ہوگیا اور وہ برابر کم ہوتی چلی گئی۔

یہ پیشگوئی ایسی واضح اور مومن وکافر سے اپنی صداقت کا اقرار کرانے والی ہے کہ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ضد کرتا ہے تو اس کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔جس کی آنکھیں ہوں وہ دیکھ سکتا ہے کہ (۱) طاعون کی خبر ایک لمبا عرصہ پہلے دی گئی تھی۔اور کوئی طبّی طریق ایسا ایجاد نہیں ہوا جس سے اتنا لمبا عرصہ پہلے وباؤں کا پتہ دیا جاسکے۔(۲) طاعون کے نمودار ہونے پر یہ بتایا گیا کہ یہ عارضی دورہ نہیں ہے۔بلکہ سال بسال یہ بیماری حملہ کرتی چلی جائے

گی ۔(۳) یہ بھی قبل از وقت بتایا گیا کہ یہ بیماری پنجاب میں نہایت سخت ہوگی ۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے بتادیا کہ پنجاب میں ہی یہ بیماری سب سے زیادہ پھیلی اور یہیں سب سے زیادہ موتیں ہوئیں ۔(۴) ڈاکٹروں نے متواتر اعلانات کئے کہ اب یہ بیماری قابو میں آ گئی ہے ۔مگر آپ نے بتایا کہ اس وقت تک اس کا زور ختم نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا علاج نہ ہو۔اور ایسا ہی ہوا کہ اس کا دورہ برابر نو سال سختی سے ہوتا رہا۔ (۵) آخر میں خدا تعالیٰ نے خود رحم کر کے خود اس کے زور کو توڑ دینے کا وعدہ کیا اور آپ کو بتایا گیا کہ ’’طاعون تو گئی مگر بخار رہ گیا‘‘ (تذکرہ صفحہ ۸۷۴ ایڈیشن ۲۰۲۲ء)۔ چنانچہ اس الہام کے بعد طاعون کا زور ٹوٹ گیا۔اور بخار کا شدید حملہ پنجاب میں ہوا جس سے قریباً کوئی گھر خالی نہ رہا۔اور سرکاری رپورٹوں میں بھی تسلیم کیا گیا کہ بخار کا وہ حملہ غیر معمولی تھا۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا تھا کہ جب لوگوں پر آسمانی نشانوں اور عقلی دلائل کے ساتھ حجت پوری ہو جائے گی تو اس وقت روحانی مردوں اور روحانی بہروں اور روحانی اندھوں کی سزا دہی کے لئے ایک زمینی کیڑا پیدا کیا جائے گا جو لوگوں کو کاٹے گا اور انہیں زخمی کرے گا۔اس لئے کہ لوگ خدا تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان نہیں لائے تھے۔

بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی کتب میں یہ بھی لکھا ہے کہ دابۃ الارض کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے دل میں یہ ڈالا گیا ہے کہ اس سے طاعون مراد ہے (نزول المسیح ص ۳۸)۔اور آپ نے اپنی کتاب ’’نزول المسیح‘‘ (صفحہ ۳۹ تا ۴۲) میں مختلف قرائن سے اس کو ثابت کیا ہے۔مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس دابہ کے خروج کی پیشگوئی میں صرف طاعون ہی کی خبر نہیں بلکہ خوردبین کی ایجاد کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر دنیا کو کیونکر معلوم ہوسکتا تھا کہ اس بیماری کا باعث ایک دابۃ ہے۔ پہلے لوگ تو بلغم۔صفراء۔سوداء اور دم پر ہی سب بیماریوں کے بواعث کی زنجیر کو ختم کر دیتے تھے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ

اور اس دن (کو یاد کرو) جب ہر (اس) قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کرتی رہی ہوگی ہم ایک بڑا گروہ کھڑا

بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۴﴾ حَتّٰٓى إِذَا جَآءُوْ قَالَ

کریں گے۔پھر اس (گروہ) کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا (تا خدا تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر جواب

اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ

دیں) اور جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے وہ ان سے کہے گا۔کیا تم نے میرے نشانات کا اس کے باوجود انکار کیا تھا کہ

تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ

تم نے علم کے ذریعہ سے ان کی پوری واقفیت حاصل نہیں کی تھی یا یہ بتاؤ کہ تم (اسلام کے خلاف کیا) کیا سازشیں کیا

لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۶﴾

کرتے تھے۔اور ان کے ظلموں کی وجہ سے ان کے خلاف کی گئی پیشگوئی پوری ہوجائے گی۔اور وہ کچھ بات نہ کر سکیں گے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔اس دن کو بھی یاد کرو۔جبکہ ہم ہر اس قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کرتی رہی ہوگی ایک بڑی جماعت کھڑی کریں گے اور پھر وہ گروہ جماعت در جماعت تقسیم کر دیا جائے گا یعنی آخری زمانہ میں ہر مذہب کے پیروؤں میں بے دینی پھیل جائے گی۔اور سب قوموں میں سے ایک ایک گروہ بے دینی کی تعلیم دینے لگ جائے گا جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا چلا جائے گا جب تک ان کے متعلق سزا کا فتویٰ جاری نہ ہوجائے اور خدا تعالیٰ کا ان کو یہ پیغام نہ پہنچ جائے کہ کیا تم نے میرے نشانوں کا انکار کر دیا ہے۔حالانکہ تم نے ان پر پوری طرح غور بھی نہیں کیا تھا۔اور نہ ان کی دلیلوں کو پرکھا تھا۔یا اگر یہ نہیں تو اَور تم کیا کرتے رہے ہو۔اس میں بتایا کہ جب آخری زمانہ کے موعود کے ذریعہ سے اسلام کی صداقت ظاہر کی جائے گی تو مختلف قومیں تعلیم کے نام پر دہریت پھیلانے کے لئے کھڑی ہوجائیں گی اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گی یعنی مختلف ایسوسی ایشنز اور یونیورسٹیاں بن جائیں گی اور دینِ حقّہ کا انکار کرنے لگ جائیں گی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے زمانوں میں بھی دینِ حقّہ کا انکار کرنے والے لوگ پائے جاتے تھے مگر جہاں تک منظم مخالفت اور جتھہ بندی کا سوال ہے۔یہ پہلے زمانوں میں نظر نہیں آتی۔اس زمانہ میں تو تاجروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے۔صنّاعوں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے۔مزدوروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے۔اور سرمایہ داروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے۔بلکہ چوروں اور ڈاکوؤں اور عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے والوں کے بھی منظم گروہ پائے جاتے ہیں۔اسی طرح کفر کا بھی اسلام پر ایک تنظیم کے ماتحت حملہ ہو رہا ہے۔مگر جہاں شیطانی لشکر اپنی تنظیم میں

مشغول ہے آسمان کے فرشتے بھی خاموش نہیں اور وہ بھی تباہی کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ ۔ ایک دن یہ عذاب ان کے گھروں تک پہنچ جائے گا اور خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں پوری ہوجائیں گی ۔ یعنی اسلام غالب آجائے گا اور کفر کی صف ہمیشہ کے لئے لپیٹ دی جائے گی تب ان کی زبانیں بند ہوجائیں گی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے والے یا تو آپؐ پر درود اور سلام بھیجنے لگ جائیں گے یا تباہی اور بربادی کا شکار ہوجائیں گے ۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ

کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم نے رات کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ اس میں آرام حاصل کریں اور دن کو دیکھنے کی

مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۸۷

طاقت دینے والا بنایا ۔ اس میں یقیناً مومن قوم کے لئے بڑے نشان ہیں ۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے ۔ کیا مسلمانوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم جو ان پر رات یعنی نبوت سے بُعد کا زمانہ لائے تھے تو اس لئے لائے تھے کہ وہ اس میں نئی روحانی طاقتیں حاصل کریں اور ظلمت کے مقابلہ کے لئے ہر جگہ نورانی قندیلیں روشن کریں لیکن انہوں نے ثواب کے اس عظیم الشان موقعہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ۔ اب ہم ان کے لئے دن چڑھائیں گے ۔ یعنی اپنا ایک مامور ان میں مبعوث کریں گے ۔ اور یہ دن اس لئے چڑھے گا تا وہ حق و باطل میں تمیز کرسکیں ۔ لیکن اس سے فائدہ صرف مومن اٹھائیں گے ۔ جن کے دل مر چکے ہوں گے وہ پھر بھی پرانی تاریکیوں میں ہی پڑے رہیں گے ۔

اس جگہ رات اور دن کے چکر کی مثال دے کر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے متواتر کام نہیں کرسکتا ۔ اگر اسے متواتر کام پر لگا دیا جائے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ تھک جائے گا اور پھر بے ہوش ہوکر گر پڑے گا ۔ انسان کی اس کمزوری کو ڈھانپنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رات بنائی ہے ۔ جو اسے دوبارہ کام کرنے کے قابل بنا دیتی ہے ۔ یہی حالت روحانی ترقیات کی بھی ہے ۔ انسان پر ایسے وقت بھی آتے ہیں جب اس کی روحانیت قبض کی حالت میں ہوتی ہے ۔ اور اس پر ایسے وقت بھی آتے ہیں جب اس کی روحانیت پر بسط کی حالت ہوتی ہے ۔ ایک معمولی درجہ کے مومن پر بھی کوئی وقت ایسا آتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل

گیا ہے اور اس کا خدا اس کے سامنے ہے اور وہ اپنے سارے جلال اور ساری شان وشوکت کے ساتھ اس پر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی مومن اپنی نماز کو کھڑا کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اسے کھڑا کرتا ہے مگر وہ گرتی ہے وہ اسے پھر کھڑا کرتا ہے اور وہ پھر گرتی ہے۔ وہ پھر کھڑا کرتا ہے اور وہ پھر گرتی ہے۔ اور یہ حالت معمولی درجہ کے مومن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ اونچے درجے کے مومن بھی اپنے اپنے مدارج کے لحاظ سے اس حالت میں سے گذرتے ہیں اور ان پر بھی رات اور دن کی طرح قبض اور بسط کی کیفیات وارد ہوتی رہتی ہیں۔ اگر اس پر ہمیشہ قبض کی حالت رہے تو اس کا دل مرجائے اور وہ روحانیت سے محروم ہو جائے اور اگر اس پر ہمیشہ بسط کی حالت رہے تو وہ عادتاً عبادت کرنے لگ جائے اور اس کی نیکیوں کے پیچھے عزم وارادہ اور خواہش باقی نہ رہے۔ پس انسانی مقام کو قائم رکھنے کے لئے اور اس لئے کہ نیکی کرتے ہوئے اس کا ارادہ اور عزم بھی قائم رہے اور اس کی توجہ بھی قائم رہے ہر مومن پر خواہ اس کا مقام بڑا ہو یا چھوٹا رات اور دن کی طرح لہروں کا زمانہ آتا رہتا ہے۔ اور ہر مومن اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے کبھی اونچا اٹھتا ہے اور کبھی نیچے گرتا ہے مگر ہر دفعہ جب وہ اونچا اٹھتا ہے تو پہلے مقام سے اوپر چلا جاتا ہے اور جب نیچے گرتا ہے تو اس وقت بھی اس کا قدم پہلے مقام سے اوپر چلا جاتا ہے۔ گویا قبض اور بسط کا سلسلہ اسے ہمیشہ ترقی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ تنزل کی طرف نہیں لے جاتا۔ پھر یہ اتار چڑھاؤ کا سلسلہ صرف روحانی کیفیات میں ہی نہیں بلکہ قومی حالات میں بھی جاری رہتا ہے۔ بعض قوموں پر بھی کبھی قبض کی حالت آتی ہے اور کبھی بسط کی۔ کبھی قوم پر ابتلاؤں کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوتی ہیں اور کبھی اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ کبھی اس پر کامیابی کا سورج طلوع ہوتا ہے اور کبھی رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ کبھی قوم کے اندر نشوونما کا جوش ہوتا ہے اور کبھی غفلت طاری ہو جاتی اور اس کے اندر آرام کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال جب تک کوئی قوم اپنے مقام کی بلندی اور پستی کے درمیان چکر کھاتی رہتی ہے وہ گرتی نہیں۔ کیونکہ یہ قبض اور بسط کی حالت ہر انسان اور ہر قوم کے لئے مقدر ہے۔ مگر جب کوئی قوم یا انسان اپنے مقام سے گر کر نچلے درجہ میں چلا جائے تو پھر اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف توجہ دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کی مثال ہمارے سامنے پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم رات سے بھی فائدہ اٹھاؤ اور دن سے بھی۔ تم پر قبض کی حالت طاری ہو تو وہ بھی تمہیں ترقی کی طرف لے جانے والی ہو اور تم پر بسط کی حالت طاری ہو تو وہ بھی تمہارے مقام کو اونچا کرنے والی ہو۔

وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي

اور اس دن (کو بھی یاد کرو) جس دن بگل میں ہوا پھونکی جائے گی جس کے نتیجہ میں آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی

الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۸﴾

ہے گھبرا اٹھے گا۔ سوائے اس کے جس کے متعلق اللہ (تعالیٰ) چاہے گا (کہ وہ گھبراہٹ سے محفوظ رہے) اور سب کے سب اس (یعنی خدا) کے حضور مطیع و فرمانبردار ہو کر آئیں گے۔

حلّ لُغات۔ فَزِعَ فَزِعَ فَزَعًا کے معنے ہیں خَافَ وَ ذُعِرَ۔ ڈر گیا اور ہیبت زدہ ہو گیا۔ (اقرب)

دَاخِرِیْنَ دَاخِرِیْنَ دَخَرَ سے اسم فاعل ہے۔ اور دَخَرَ وَ دَخِرَ دُخُوْرًا وَ دَخَرًا کے معنے ہیں ذَلَّ وَ صَغُرَ۔ ذلیل اور حقیر ہوا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا تم اس دن کو یاد کرو جس دن صُور پھونکا جائے گا۔ اور آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے ڈر جائے گا۔ بگل چونکہ فوجوں کو جمع کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے اس لئے یہاں تمثیلی طور پر بگل کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ وہ دن قریب ہے جب تمام قوموں کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی رہتے ہیں سب گھبرا اٹھیں گے۔

اس آیت میں ہوائی جہازوں اور ایٹم بموں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز آسمان میں اڑتے ہیں اور ایٹم بم زمین میں پھٹ کر زمین میں رہنے والوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور پھر آتشیں مادے کو آسمان کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ میں بتایا کہ باجود اس کے کہ یہ تباہی عام ہوگی پھر بھی خدا تعالیٰ کے حضور دعا کا رستہ کھلا رہے گا۔ اور جو خدا تعالیٰ کو خوش کر سکے گا وہ اس تباہی سے محفوظ رہے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائینسدانوں نے اپنی کوششوں اور تدبیروں کے ساتھ موت کے ذریعہ کو معلوم کر لیا ہے۔ مگر اسلام کو قائم کرنے والا وہ خدا ہے جس کے ہاتھ میں موت بھی ہے اور حیات بھی وہ موت کے ذریعہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا پر حاکم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اصل حاکم وہ ہے جس کے قبضہ میں موت اور حیات دونوں ہیں اور اس نے بتایا ہے کہ اگر لوگ دعاؤں سے کام لیتے رہیں گے تو وہ اس تباہی سے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی سامان پیدا فرما دے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایٹم بم بظاہر قیامت کا ایک نشان نظر آتا ہے مگر قیامت خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے اس نے یہ قیامت

نہ روس کے ہاتھ میں رکھی ہے اور نہ امریکہ کے ہاتھ میں۔ چند سال ہوئے روس کا ایک سائینسدان جو ایٹم بم سے تعلق رکھنے والی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا انچارج تھا مجھے ملا۔ میں نے اسے یہی کہا کہ تم تو کہتے ہو کہ ہم پبلک کو فائدہ پہنچانے کے لئے کام کرتے ہیں مگر تم نے جو ایٹم بم بنایا ہے اس کا کیا فائدہ ہے؟ اگر تم ایٹم بم گرا دو تو امریکہ تباہ ہو جائے گا اور اگر پہلے امریکہ گرا دے تو روس تباہ ہو جائے گا۔ مگر امریکہ یا روس کی تباہی سے پبلک کو کیا فائدہ۔ تمہیں تو پبلک کا فائدہ سوچنا چاہیے۔ اور ایٹم بم کا کوئی توڑ پیش کرنا چاہیے۔ تا دنیا اس سے محفوظ رہ سکے۔ وہ کہنے لگا۔ اس کا کوئی توڑ نہیں نکلا اور نہ ہمارے ذہن میں اس کا کوئی توڑ آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا توڑ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور جب وہ لوگوں کو بچانا چاہے گا تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی توڑ پیدا کر دے گا۔ بانی سلسلہ احمدیہ کے جو الہامات چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک جگہ کچھ ہندسے درج ہیں اور ساتھ ہی ایک نقشہ دیا گیا ہے۔ بعض احمدی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس میں جو خول بنے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل وہی ہیں جو ہائیڈروجن بم میں استعمال ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ نقشہ آج سے قریباً ساٹھ سال پہلے کا ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتنا عرصہ پہلے اس طرف توجہ دلائی گئی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا کہ ایسی ایجاد ہونے والی ہے تو جس خدا نے اپنے بندوں کو اس ایجاد کی توفیق دی وہ لوگوں کو اس سے بچانے کا بھی کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے گا۔

مجھے بھی ایک دفعہ ایک گیس کے متعلق خبر دی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ میں ایک کمرہ میں بیٹھا ہوا ہوں کہ کسی شخص نے ایک گیس پھینکی۔ میں نے اس گیس کو سونگھ کر کہا کہ اس میں سے تو کلورین کی بُو آ رہی ہے اور پھر اس کا خیال کرتے ہی میں باہر کی طرف بھاگا۔ (آنکھ کھلنے کے بعد میں نے بعض سائینسدانوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ بیہوش کرنے والی گیس بھی کلورین سے ہی بنتی ہے مگر میں نے جو خواب میں گیس دیکھی تھی وہ عارضی بیہوش کرنے والی تھی) اس کے بعد مجھ پر سے بھی اثر جاتا رہا۔ اور دوسرے لوگوں پر بھی کوئی اثر نہ رہا۔ اس رؤیا سے بھی میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا کر دے گا کہ جن کے نتیجہ میں دشمن پر فوقیت بھی حاصل ہو جائے گی اور عام تباہی بھی نہیں آئے گی۔ مگر اس کا ذریعہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے۔ اور دعاؤں سے اس کی مدد اور نصرت حاصل کی جائے۔

میں جب بیماری کے علاج کے سلسلہ میں یورپ گیا تو جماعت احمدیہ لنڈن کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک دعوت کا انتظام کیا گیا۔ جس میں لنڈن کے میئر۔ پاکستان کے ہائی کمشنر۔ پارلیمنٹ کے ممبر اور کئی سر برآوردہ

لوگ شامل ہوئے۔ میں نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے یورپین باشندوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ایٹم بم کی ایجاد کی وجہ سے آج کل لوگوں کے دلوں میں بڑی گھبراہٹ پائی جاتی ہے اور وہ حیران ہیں کہ آئندہ دنیا کی سلامتی کی کیا راہ ہوگی۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ ایٹم بم کا علم آج سے بیس سال پہلے کہاں تھا۔ اس وقت تو کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ ایسی ایجاد ہوسکتی ہے لیکن پھر علوم نے ایسی ترقی کی کہ ایٹم بم نکال لیا گیا۔ اب جس خدا نے اپنے بندوں کو ایٹم بم بنانے کا علم دیا ہے کیا وہ اس کا توڑ پیدا نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا میں تو ایک مذہبی آدمی ہوں اور مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے اگر مجھ سے کوئی سوال کرے کہ آیا ایٹم بم کے نکلنے کے بعد کوئی اس کا توڑ بھی پیدا کرسکتا ہے یا نہیں تو میرا جواب یہی ہوگا کہ ہاں۔ ایٹم بم کا علم خدا نے ہی اپنے بندوں کو دیا ہے اور اگر وہ کسی وقت اپنے بندوں کو اس کا توڑ بھی سمجھا دے تو اس کے فضل سے یہ کوئی بعید بات نہیں۔ مگر اس فضل کے حصول کا یہی طریق ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے دعائیں مانگی جائیں اور اس امر پر یقین رکھا جائے کہ ایٹم بم کا نکالنے والا خدا اس کا کوئی نہ کوئی توڑ بھی پیدا کردے گا اور دنیا کے امن کا سامان پیدا فرمادے گا۔

وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ میں بتایا کہ سب کے سب اس کے حضور مطیع و فرمانبردار ہوکر حاضر ہوں گے یعنی کافر سزا پاکر اور مومن یقین و ایمان سے معمور ہوکر۔

وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ

اور تُو پہاڑوں کو اس صورت میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح

السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ

چل رہے ہیں۔ یہ اللہ (تعالیٰ) کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے۔

خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۹﴾

وہ تمہارے اعمال سے خوب خبردار ہے۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کھڑے ہیں۔ حالانکہ وہ اس طرح اُڑتے چلے جارہے ہیں جس طرح بادل۔ یہ خدا تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط بنایا ہے۔ اور وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ سے یہ مراد نہیں کہ پہاڑ الگ چلتے ہیں اور زمین الگ چلتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین چلتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں۔اور جس طرح زمین بادلوں کو اپنے ساتھ کھینچے چلی جاتی ہے۔اسی طرح وہ پہاڑوں کو بھی اپنے ساتھ اٹھائے چلی جاتی ہے۔

اس آیت میں ظاہری طور پر تو پہاڑوں کے چلنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بادلوں کے ساتھ ان کی مشابہت بیان کی گئی ہے لیکن باطنی طور پر اس میں بڑی بڑی حکومتوں کی تباہی کی خبر دی گئی ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ تمہیں تو اپنے زمانہ کی حکومتیں ایسی مضبوط دکھائی دیتی ہیں کہ تم سمجھتے ہو وہ صدیوں تک بھی تباہ نہیں ہوسکتیں مگر خدا تعالیٰ اسلام کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس طرح اڑائے گا کہ ان کا نشان تک بھی نظر نہیں آئے گا۔ چنانچہ اس کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ جس طرح ہوائیں بادلوں کو اڑا کر لے جاتی ہیں اسی طرح جب اسلام کی تائید میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو کفر و شرک کے بڑے بڑے دیو قامت پیکر اس طرح اڑیں گے کہ ان کا نشان بھی دکھائی نہیں دے گا۔مگر یہ سب کچھ انسانی تدابیر سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوگا۔اور اس کی قدرت اور صنعت کا اس سے ظہور ہوگا۔آخر میں فرمایا کہ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ۔یہ عظیم الشان انقلاب اس صورت میں آسکتا ہے جبکہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں۔اگر تم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کروگے اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ظالم بنو گے تو خدا تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ایک ظالم کو مٹا کر دوسرا ظالم اس کی جگہ بٹھا دے۔خدا تعالیٰ اسی صورت میں ان پہاڑوں کو اڑائے گا جب تم اپنے آپ کو اسلامی احکام کا نمونہ بناؤ گے۔اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا مقام حاصل کرلو گے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ

جو کوئی نیکی کرے گا۔اس کو اس سے بہتر بدلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے خوف سے (جس کا ذکر اوپر

يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۹۰﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ

ہو چکا ہے) محفوظ رہیں گے۔اور جو لوگ برے عمل لے کر خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گے ان کے سرداروں کو

وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

دوزخ میں اوندھا کر کے گرا دیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ کیا تمہاری جزا تمہارے عمل کے مطابق نہیں؟

حلّ لُغَات۔ كُبَّتْ كُبَّتْ كَبَّ كَبًّا کے معنے ہیں قَلَبَهٗ عَلٰى رَاْسِهٖ۔ برتن کو سر کے بل اُلٹا دیا۔ كَبَّ زَيْدًا عَلٰى وَجْهِهٖ وَلِوَجْهِهٖ کے معنے ہیں صَرَعَهٗ زید کو پچھاڑ دیا (اقرب) پس كُبَّتْ کے معنے ہوں گے۔ ان کو الٹا یا جائے گا یا پچھاڑا جائے گا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ تم میں سے جو شخص نیک اعمال بجالائے گا اسے اپنی نیکیوں سے بہت بہتر بدلہ ملے گا اور ایسے ہی لوگ اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن جو لوگ برائیوں میں ملوث ہوں گے وہ جہنم میں اوندھے منہ گرا دیئے جائیں گے۔ اور ان سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ کیا یہ جزا تمہارے اعمال کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس آیت میں اسلامی تعلیم کا ایک بڑا اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ آریہ مذہب نجات کے بارہ میں یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نیکیوں کی جزا دیتا ہے تو وہ ہر ایک روح کا کوئی نہ کوئی گناہ رکھ لیتا ہے جس کی سزا اسے بعد میں دی جاتی ہے۔ وہ پہلے انسانی روح کو نجات دے دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر اس گناہ کی وجہ سے جو اس نے کیا ہوتا ہے اور جس کی سزا ابھی اسے نہیں ملی ہوتی پھر اسے مختلف جونوں کے چکر میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا جاتا ہے گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ بھی ان ہندو مہاجنوں کی طرح ہے جو قرض کا ایک حصہ تو وصول کر لیتے ہیں لیکن کچھ تھوڑا سا باقی رہنے دیتے ہیں تاکہ سود کا سلسلہ جاری رہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر سود سمیت ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے بھی نعوذ باللہ دنیا کا سلسلہ اسی رنگ میں جاری کیا ہوا ہے۔ کہ پہلے تو وہ نیک اعمال کی انسان کو جزا دے دیتا ہے اور پھر کسی برے عمل کی سزا میں اسے دنیا میں مختلف جونوں کی شکل میں لوٹا تا رہتا ہے۔ مگر قرآن کریم اس عقیدہ کو کلیۃً ردّ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روح اور مادہ کا خالق خدا جتنی روحیں اور جتنا مادہ جب چاہے صرف ایک کُن کہنے سے پیدا کر سکتا ہے۔ اسے روحوں کے ساتھ آریوں کا بتایا ہوا تمسخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ گو انسان کی نیکی محدود ہے مگر اس کا ارادہ محدود نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے عمل سے بہت زیادہ بدلہ دے گا۔ اور سزا کے دن خواہ دنیا میں آئے یا آخرت میں مومنوں کو محفوظ رکھے

گا۔اور یہ نہیں دیکھے گا کہ ان کے عمل حقیر تھے۔ بلکہ وہ اپنے فضل سے انہیں دائمی نجات عطا فرمائے گا۔ ہاں جو لوگ بدیاں کرتے تھے ان کو آگ میں اوندھے منہ گرا دیا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ کیا تمہارے عملوں کے مطابق تم کو جزا نہیں مل رہی؟ یعنی بدی کی سزا بہر حال عمل کے مطابق ہوگی زیادہ نہیں ہوگی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اس بارہ میں وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف:۱۵۷) میری رحمت ہر چیز پر غالب ہے۔ حتی کہ شدید ترین مخالف کی مخالفت اور دشمنی پر بھی غالب ہے۔ پس اس آیت کے ماتحت بد سے بدتر انسان بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو جائے گا اور آخر جنت کے دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے۔ یہ مضمون تو اخروی حیات کے لحاظ سے ہے۔ دنیوی نقطہ نگاہ سے اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو افراد اسلام کے دوبارہ احیاء کے لئے قربانیاں کریں گے انہیں اپنی ان قربانیوں کا جب بدلہ ملے گا تو وہ ایسا حیرت انگیز ہوگا کہ اس کے مقابلہ میں ان کی قربانیاں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھیں گی چنانچہ دیکھ لو بیشک حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام کے لئے بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن آج وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں اور وہ دنیا کے گلی کوچوں میں سے گذرتے ہوئے سنیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے یوں فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یوں فرمایا ہے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے یوں فرمایا ہے۔ اور دوسری طرف وہ یہ دیکھیں کہ کچھ لوگ اپنے ہاتھوں میں لٹھ لئے چلے جا رہے ہیں اور غصہ سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وجہ ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو فلاں شخص نے برا بھلا کہا ہے یا حضرت عمرؓ کو برا بھلا کہا ہے یا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کو اپنی قربانیاں اس لازوال عزت اور شہرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر نظر آنے لگیں گی۔ اور وہ خیال کرنے لگیں گے کہ ہم نے کوئی قربانی نہیں کی۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک صحابیؓ شہید ہوئے۔ آپ نے ان کے بیٹے کو دیکھا کہ وہ سر نیچے ڈالے ہوئے افسردگی کی حالت میں جا رہا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ: میرا باپ شہید ہو گیا ہے اور پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کے خیال سے میں متفکر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تمہیں علم ہوتا کہ تمہارے باپ سے اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا ہے تو تم اس طرح افسردہ نہ ہوتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کی روح کو اپنے سامنے حاضر کیا اور کہا۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم جو کچھ مانگنا چاہتے ہو مانگو۔ میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر تمہارے باپ نے کہا کہ خدایا میری صرف اتنی خواہش ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں بھیجا جائے تا میں پھر اسلام کی

خدمت کرتا ہوا مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی جان ہی کی قسم ہے کہ اگر میں نے یہ قانون نہ بنا دیا ہوتا کہ میں کسی انسان کو دوبارہ دنیا میں واپس نہیں بھیجوں گا۔ تو میں تیری اس خواہش کو ضرور پورا کر دیتا (ترمذی ابواب التفسیر زیر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا)۔

غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو وقت سے پہلے قربانیاں بڑی بھاری اور گراں نظر آتی ہیں۔ مگر جب ان قربانیوں کا نتیجہ نکلتا ہے تو اسے اپنی قربانیاں بالکل حقیر نظر آنے لگتی ہیں۔ ہر طالب علم جو سکول جاتا ہے وہ اپنا سکول جانا کتنی مصیبت سمجھتا ہے۔ لیکن تمہیں کوئی طالب علم ایسا نظر نہیں آئے گا جو اپنی گذشتہ محنت پر افسوس کا اظہار کرتا ہو۔ بلکہ جب اس کی محنت کا نتیجہ نکلتا ہے اور وہ دنیا میں بڑے بڑے مراتب حاصل کرتا ہے تو اسے اپنی محنت بالکل حقیر نظر آتی ہے۔

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ جو شخص نیک اعمال بجالائے گا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بدلہ ملے گا جو اس کی قربانیوں سے ہزاروں گنا افضل ہوگا۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس سکیم کے راستہ میں روک بن کر کھڑا ہوگا۔ وہ اپنے منہ کے بل گرے گا اور ناکامی و نامرادی کا جہنم اسے جھلس کر رکھ دے گا اور وہ اور اس کی آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی برکات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گی۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَ

مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (یعنی مکہ) کے رب کی جس کو اس (یعنی اللہ) نے معزز بنا دیا ہے عبادت

لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَ

کروں اور ہر چیز اسی کے قبضہ میں ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں۔ اور یہ بھی کہ میں

اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ

قرآن پڑھ کر سناؤں۔ پس جو اسے سن کر ہدایت پا جائے گا تو اس کا ہدایت پانا صرف اسی کی جان کے کام آئے گا

لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور جو اسے سن کر گمراہ ہو جائے گا تو تُو اسے کہہ دے کہ میں صرف ایک ہوشیار کرنے والا (وجود) ہوں۔

تفسیر۔ ان آیات میں بتایا کہ خدا تعالیٰ نے مختلف مقامات کو اپنی تجلیات کا مرکز بنایا ہے۔ کبھی وہ نوح ؑ

کے ذریعہ جُودی سے ظاہر ہوا۔کبھی ابراہیمؑ کے ذریعہ مکہ مکرمہ سے ظاہر ہوا۔کبھی موسیٰؑ کے ذریعہ سینا سے ظاہر ہوا۔ کبھی عیسیٰؑ کے ذریعہ جبل زیتون سے ظاہر ہوا۔لیکن مجھے اس نے یہ حکم دیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں۔یعنی اس جلوہ کے پیچھے چلوں جو مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ ظاہر ہوا تھا۔اور جس نے اس شہر کو عزت اور حفاظت بخشی تھی۔اور اس بات کا اعلان کروں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔اور یہ کہوں کہ مجھے صرف باتیں بتانے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ میں عملاً فرمانبرداری کا نمونہ بن کر دکھاؤں۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ اسلام اس مذہب کا نام ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو ملا ہے۔ اور مسلم کے نام سے وہی لوگ پکارے جاتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان لا کر آپؐ کو اپنا مقتداء اور پیشوا مانتے ہیں لیکن قرآن کریم نے محاورہ کے طور پر دوسرے انبیاء اور ان کے سچے متبعین کو بھی مسلم کے لفظ سے یاد کیا ہے (دیکھو آل عمران آیت ۶۸ و یوسف آیت ۱۰۲ و بقرۃ آیت ۱۲۹ و بقرۃ آیت ۱۳۳)۔یہ ظاہر ہے کہ ان سب کا مسلمان ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد از ظہور ایمان لانے کی وجہ سے تو نہیں ہوسکتا۔کیونکہ ان کے سامنے تو نہ قرآن مجید کی شکل میں کامل شریعت موجود تھی اور نہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت معرض وجود میں آئی تھی۔دراصل قرآنی محاورہ کے رو سے ان کا مسلمان قرار پانا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ اسلام کے دو معنے ہیں ایک تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والا مسلمان ہے اور دوسرے وہ شخص بھی مسلمان کہلاتا ہے جو مطیع اور فرمانبردار ہو۔چنانچہ مسلمان کی مؤخر الذکر حیثیت کے اعتبار سے ہی ہر وہ شخص جو مطیع و فرمانبردار تھا خواہ وہ آدمؑ کا فرمانبردار تھا یا نوحؑ کا فرمانبردار تھا یا ابراہیمؑ کا فرمانبردار تھا یا موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا فرمانبردار تھا وہ مسلمان تھا۔ لیکن مسلمانوں کو دو قسم کا اسلام حاصل ہے ایک تو اس اعتبار سے وہ مسلمان ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کا نام ہی مسلم رکھا گیا ہے۔دوسرے اطاعت و فرمانبرداری کی اس روح کے اعتبار سے بھی وہ مسلم ہیں جو ہر نبی کے متبعین کے لئے دنیا میں وجہِ امتیاز بنی۔پس تمام دوسرے انبیاء کی جماعتوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ دوہرے مسلم ہیں۔انبیاء کی جماعتیں اطاعت و فرمانبرداری کے باعث تو مسلم ہوتی ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ خاص طور پر ہمارا نام بھی مسلم رکھا ہے (الحج:۷۹)۔اور اللہ تعالیٰ جب کسی کا نام رکھتا ہے تو وہ بندوں کی طرح محض تفاول کے طور پر نہیں رکھتا۔بلکہ وہ قادر و توانا جب ارادہ کرتا ہے کہ کسی قوم کے افراد خاص خاص صفات کے حامل ہوں تبھی وہ انہیں کوئی مخصوص نام عطا کرتا ہے۔پس خدا تعالیٰ

کا ہمیں مسلم کا لقب عطا فرمانا نہ صرف اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم وہ صفات اپنے اندر پیدا کریں جن کا یہ نام متحمل ہے۔ بلکہ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے اطاعت و فرمانبرداری کے اعلیٰ معیار پر قائم ہوتے ہوئے جب بھی دینی اور دنیوی اعتبار سے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کوشش کریں گے تو خدا تعالیٰ انہیں اعلیٰ درجات سے ضرور نوازے گا۔ پس حقیقی اسلام کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کامل فرنبرداری اور اطاعت کی روح ہمارے اندر اس طرح رچی ہوئی ہو کہ اس کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی ایک قدم اٹھانا بھی ہمارے لئے ناممکن ہوتا کہ ہم محض نام کے اعتبار سے ہی مسلمان نہ کہلائیں بلکہ ہمارا عمل اور ہمارا کردار بھی اس بات کی گواہی دے کہ فی الواقع ہم اس نام کے مستحق ہیں اور ہمارا اٹھنا اور ہمارا بیٹھنا اور ہمارا چلنا اور ہمارا پھرنا غرض ہماری ہر حرکت اور ہمارا ہر سکون اس نام کے شایانِ شان ہو۔

پھر فرماتا ہے وَ اَنۡ اَتۡلُوَا الۡقُرۡاٰنَ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں سب لوگوں کو قرآن کریم پڑھ کر سناؤں اور انہیں اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کروں۔ فَمَنِ اهۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَهۡتَدِیۡ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَقُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ اس کے نتیجہ میں جو شخص ہدایت پائے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور اگر وہ گمراہ ہو جائے تو مجھے یہ کہنے کا حکم ہے کہ میں کسی پر جبر نہیں کروں گا۔ صرف خدا کا پیغام پہنچاؤں گا آگے ہر شخص آزاد ہے وہ چاہے تو مان لے اور چاہے تو انکار کر دے۔

وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ سَیُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِهٖ فَتَعۡرِفُوۡنَهَا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ع

اور یہ بھی کہہ دے کہ اللہ ہی سب تعریفوں کا مستحق ہے وہ تم کو اپنے نشان دکھائے گا یہاں تک کہ تم ان کو پہچان لو گے اور تمہارا رب تمہارے عمل سے غافل نہیں۔

تفسیر۔ آخر میں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہنے کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ یعنی اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے وہ ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے اس نے آدمؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور نوحؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے۔ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور صالحؑ اور لوطؑ کے زمانے

میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور عیسیٰ ؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے۔ اور جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان کی تائید میں بھی وہ اپنے نشانات دکھاتا رہا۔ اور پھر جب مسلمانوں پر تنزل کا دور آیا تو اسلام کے دوبارہ احیاء کے لئے اس نے مسیح موعود ؑ کو مبعوث فرما کر پھر اپنی قدرت اور جلال کے تازہ نشانات دکھانے شروع کر دیئے۔ پس تمام تعریفوں کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے ہر زمانہ میں اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ اور ہر زمانہ میں نشانات کے ذریعہ دنیا کو اپنا چہرہ دکھایا۔ اگر وہ صرف آدم ؑ یا نوح ؑ یا ابراہیم ؑ یا موسیٰ ؑ یا داوٗد ؑ یا سلیمانؑ یا عیسیٰ ؑ کے زمانہ تک اپنی قدرت نمائی کو ختم کر دیتا تو ہم یہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ الحمد للہ! ہمارا الحمدللہ کہنا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ ہم خود بھی اپنی ذات میں خدا تعالیٰ کے چمکتے ہوئے نشانات دیکھیں۔ اور ہر زمانہ میں اس کی قدرتوں کا ظہور ہوتا چلا جائے۔ پس فرمایا تو دنیا کو سنا دے کہ اسلام ایک زندہ خدا پیش کرتا ہے۔ اگر تم اس سے تعلق پیدا کر لو گے تو وہ تمہیں ایسے نشانات دکھائے گا جس کے نتیجہ میں تم اپنی روحانی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھ لو گے۔ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں وہ جانتا ہے کہ تم اندھیروں میں پڑے ہو اور رسموں میں جکڑے ہوئے ہو۔ پس وہ تمہیں آزاد کرنے کے لئے خود آسمان سے اترے گا اور ایسے نشانات دکھائے گا جو تمہارے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود کو لا کر کھڑا کر دیں گے۔

سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ

سورۂ قصص ۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ تِسْعٌ وَثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَتِسْعَةُ رَكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی نواسی (۸۹) آیات ہیں اور نو (۹) رکوع ہیں۔

وقت نزول حسنؓ اور عکرمہؓ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ ریورنڈ وہیری بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں۔ لیکن مقاتل کے نزدیک اس میں چار آیات مدنی ہیں۔ یعنی اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ سے لے کر سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ تک (آیت ۵۳ تا ۵۶)۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ آیات مدینہ میں نہیں بلکہ مکہ اور جحفہ کے درمیان اتری تھیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مکہ اور جحفہ کے درمیان نہیں بلکہ ہجرت مدینہ کے وقت عین جحفہ کے مقام پر ان آیات کا نزول ہوا تھا۔ لیکن ابن سلام کہتے ہیں کہ ہجرت کے وقت جحفہ میں صرف اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ والی آیت نازل ہوئی تھی۔ باقی تمام سورۃ مکی ہے (بحرِ محیط)۔ عمر ابن محمد کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کے وقت نازل ہوئی تھی۔ اس خیال کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ سورۃ مکی ہی سمجھنی چاہیے کیونکہ ابھی ہجرت مکمل نہیں ہوئی تھی۔

ریورنڈ وہیری کا خیال ہے کہ عمر ابن محمد کا یہ خیال اس وجہ سے ہے کہ اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پھر مکہ واپس لائے گا (تفسیر القرآن للوہیری)۔ مگر وہیری کا یہ استدلال بہت کمزور ہے۔ صحابہؓ تو وقتِ نزول کی بنیاد عام طور پر کسی تاریخی گواہی پر رکھتے ہیں۔ پادری وہیری صاحب چونکہ اس بات کے قائل نہیں کہ قرآن کریم میں کوئی سچی پیشگوئیاں ہیں اس لئے وہ اپنے عقیدہ کے مطابق خود بخود کوئی وجہ تلاش کر لیتے ہیں حالانکہ جس کتاب میں پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ تو بعض دفعہ سو سو سال بعد کی خبر دے دیتی ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کی طرح جن کو اس نے فرعون پر غالب کر دیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو بھی مکہ والوں پر غالب کر دے گا۔ (آیت ۶) اور یہ بات ہجرت کے آخری سالوں میں جا کر پوری ہوئی۔ اگر مذکورہ بالا آیت سے وہ استدلال ٹھیک ہے جو کہ وہیری نے کیا ہے تو پھر فتح مکہ کے مضمون سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ یہ سورۃ فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہے۔ مگر یہ دونوں استدلال غلط ہیں۔ اصل میں یہ دونوں پیشگوئیاں ہیں جو عالم الغیب خدا نے کئی سال پہلے مکہ میں بیان کر دی تھیں۔ اور مختلف آیات کے مضمونوں

سے تنزیل کا وقت نکالنا ایک ڈھکونسلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بار بار بیان ہو چکا ہے صحابہؓ عام طور پر وقتِ نزول تاریخ کی گواہی کی وجہ سے مقرر کرتے تھے نہ کہ آیتوں کے مضمون کی وجہ سے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک مانی ہوئی مکی سورۃ میں لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ کا آنا بتاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی خبر دی اور پھر فتح مکہ کی بھی خبر دی۔ رَآدُّكَ کے الفاظ بتاتے تھے کہ آپؐ مکہ سے جائیں گے اور اِلٰى مَعَادٍ کے الفاظ بتاتے تھے کہ آپؐ مکہ واپس آئیں گے۔ پس یہ آیت قرآن کریم کی صداقت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

تعلق و ترتیب علامہ ابن حیان لکھتے ہیں کہ سورۃ نمل کا سورۂ قصص سے یہ تعلق ہے کہ سورۃ نمل کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمد کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر فرمایا تھا کہ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ وہ تم کو اپنے نشانات دکھائے گا۔ اور ان نشانات سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تھے جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ معجزات ظاہر کرنے والا درحقیقت خدا تعالیٰ کا وجود ہی تھا۔ پس اگر وہ انبیاء کے معجزات کو اپنا نشان قرار دے دے تو یہ درست ہوگا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے سورۂ نمل میں جو نشانات دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے ثبوت میں اس نے سورۂ قصص نازل کی اور اس کے شروع میں ہی فرمادیا کہ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ اس سورۃ کی آیات ایک مدلّل کتاب کی آیات ہیں۔ اور اس طرح کفار کے سامنے اس نے اپنے وعدہ کی صداقت کے ثبوت میں قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے کے نشان کو پیش کردیا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہی ہے۔ لیکن مجھے علامہ ابن حیان کی اس تشریح سے کچھ اختلاف ہے۔ میرے نزدیک یہ تو صحیح ہے کہ سورۂ نمل کے آخر میں نشانات دکھانے کا ذکر ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس کے ثبوت میں قرآن کریم کے اعجاز کو پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ درحقیقت اس سورۃ میں ان نشانات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہوئے ان کی وضاحت کی گئی ہے جن کے دکھانے کا سورۂ نمل میں وعدہ کیا گیا تھا۔ مثلاً مکہ والوں کے مظالم کے نتیجہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی خبر دی گئی ہے اور پھر بتایا گیا ہے کہ ایک دن آپ مکہ فتح کریں گے۔ اور پھر اسی شہر میں فاتحانہ طور پر داخل ہوں گے۔ جس میں سے آپ کو نکالا جائے گا۔ گویا جو وعدہ سورۂ نمل میں کیا گیا تھا۔ اسے سورۂ قصص میں پورا کردیا گیا ہے۔ اور ان نشانات کو بیان کردیا گیا ہے جن کے ذریعہ کفار پر حجت تمام ہونی تھی۔

اس سورۃ کا سورۃ نمل سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ سورۃ نمل کے آخر میں فرمایا تھا وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں قرآن کریم

پڑھ کر سناؤں۔ پھر جو کوئی قرآن سن کر اس سے ہدایت پائے گا۔اس کی ہدایت کا اسے ہی فائدہ پہنچے گا۔اور جو کوئی اس سے پیٹھ پھیر کر چلا جائے گا اس پر تجھے کوئی جبر کا اختیار نہیں دیا گیا۔ بلکہ تو کفار سے کہہ دے کہ مجھے تو صرف ہوشیار کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے زبردستی مسلمان بنانے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔

غرض سورۂ نمل کے آخر میں قرآن کریم پڑھ کر سنانے کا حکم دیا گیا تھا۔اس حکم کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ قصص نازل کی اور اس کے شروع میں ہی فرما دیا کہ طٰسٓمّٓ یعنی خدائے لطیف سمیع اور مجید نے یہ سورۃ نازل کی ہے تا کہ اس وعدے کو پورا کیا جائے جو سورہ نمل میں کیا گیا تھا اور انہیں ایک ایسی کتاب دی جائے جو سب مضمونوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہوتا کہ دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں اسے پڑھا جائے اور قیامت تک آنے والی نسلیں اس کی روحانی راہنمائی سے مستفیض ہوتی رہیں۔

خلاصہ مضامین اس سورۃ کے ابتداء میں حروف مقطعات طٰسٓمّٓ بیان کئے گئے ہیں۔جن میں خدا تعالیٰ کے لطیف ۔سمیع اور مالک یا مجید ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر خدا تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو واقعہ ہم بیان کریں گے وہی سچا ہوگا۔ یعنی بائیبل میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔(آیت ۱ تا ۴)

فرماتا ہے فرعون نے بہت تکبر سے کام لیا تھا۔اور رعایا میں شدید اختلاف پیدا کر دیا تھا۔وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ہلاک کرتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا اور اس طرح ان کی طاقت کو کچلنا چاہتا تھا۔لیکن ہم نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ لوگ جو ملک میں کمزور سمجھے جاتے ہیں ان کو دنیا کا لیڈر بنادیں اور انہیں ویسی ہی نعمتوں کا وارث بنادیں جیسی فرعون کو حاصل تھیں۔اور فرعون اور ہامان دونوں کو وہ انجام دکھادیں جس سے وہ ڈر رہے تھے۔ (آیت ۵ تا ۷)

پھر موسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم نے اُمِ موسیٰؑ کو وحی کی کہ اسے بیشک دودھ پلاؤ مگر جب تجھے اس کی جان کو خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں ڈال دے۔امّ موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔اور اسے ٹوکرے میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ٹوکرا بہتے بہتے فرعون کے محلّات کے پاس سے گذرا تو فرعون کے خاندان میں سے کسی نے اسے اٹھالیا۔اور اس خاندان کی ایک عورت نے بادشاہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ اسے قتل نہ کریں۔ ممکن ہے یہ بڑا ہو کر ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں۔(آیت ۸ تا ۱۰)

ادھر موسیٰؑ کی والدہ کا یہ حال تھا کہ جب اس نے اپنے بیٹے کو سمندر میں ڈال دیا تو اس کے دل پر سے فکر وغم کا

بوجھ اتر گیا اور اس کی ایسی حالت ہوگئی کہ اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی۔ موسیٰ ؑ کی ماں نے اس وقت موسیٰ ؑ کی بہن کو بلایا۔ اور اسے کہا کہ تو اس ٹوکرے کے پیچھے پیچھے جا اور دور سے اسے دیکھتی رہ۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور دور سے ٹوکرے کو دیکھتی رہی۔ لیکن فرعونیوں کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

جب موسیٰ ؑ شاہی محلات میں جا پہنچے اور انہیں دودھ پلانے کا سوال پیش آیا۔ تو موسیٰ ؑ نے الٰہی تصرف کے ماتحت دوسری دائیوں کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ اس پر موسیٰ کی بہن جو ساتھ ساتھ آئی تھی کہنے لگی کہ میں تمہیں ایک گھر کا پتہ دیتی ہوں جس کے افراد اسے بخوشی پال لیں گے۔ اور وہ اس کی ہر طرح نگہداشت رکھیں گے۔ چنانچہ اس الٰہی تدبیر سے موسیٰ ؑ پھر اپنی ماں کی گود میں واپس آ گئے اور اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی۔ (آیت ۱۱ تا ۱۴)

جب موسیٰ ؑ اپنی روحانی بلوغت کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت دی اور آسمانی علوم سے نوازا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رات کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں گئے تو انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں دست و گریبان ہوتے دیکھا۔ ایک ان کا ہم قوم تھا اور دوسرا ان کی دشمن قوم کا فرد تھا۔ موسیٰ ؑ کو دیکھ کر ان کے ہم قوم شخص نے انہیں اپنی مدد کے لئے آواز دی۔ جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو انہوں نے دوسرے شخص کو ایک گھونسہ مار دیا جس کے لگتے ہی وہ شخص گرا اور گر کر مر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کہ اے میرے رب! میرے اس فعل پر جو میں نے اپنی قوم کے ایک مظلوم شخص کی مدد کے لئے کیا تھا۔ مگر نادانستہ طور پر ایک آدمی مر گیا۔ اپنے فضل سے پردہ ڈال دے۔ اور مجھے اس کے برے نتائج سے محفوظ رکھ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ گورنمنٹ کا کوئی آدمی اس وقت نہ آیا اور معاملہ مخفی رہا۔ دوسری صبح وہ پھر شہر میں آئے اور انہوں نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل انہیں اپنی مدد کے لئے بلایا تھا۔ آج پھر کسی شخص سے لڑ رہا ہے موسیٰ ؑ کو دیکھتے ہی اس نے پھر آپ کو آواز دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ آج بھی وہی شخص دوسرے سے لڑ رہا ہے تو انہوں نے سمجھا کہ یہ شخص بھی گرم مزاج اور لڑاکا معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے اسے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ تُو بھی بڑا جوشیلا اور تیز مزاج ہے کہ ہر وقت لڑتا رہتا ہے۔ مگر جب انہوں نے دوسرے شخص کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو ان کے ہم قوم شخص نے غلطی سے یہ سمجھا کہ شاید موسیٰ ؑ آج مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور کہنے لگا۔ اے موسیٰ! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ آج مجھے بھی اسی طرح مار دے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو مارا ہے۔ اس کے اس فقرہ سے ارد گرد کے سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کل جو شخص مرا ہے اسے موسیٰ ؑ نے ہی مارا تھا۔ اور چونکہ مقتول فرعونی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ (آیت ۱۵ تا ۲۰)

اسی دوران میں اچانک ایک شخص شہر کے دوسرے حصہ سے دوڑتا ہوا آیا۔اور اس نے موسیٰ ؑ سے کہا کہ اے موسیٰ! سرداران قوم تجھے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔اس لئے تو فوراً اس شہر سے نکل کر کسی اَور جگہ چلا جا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی وقت شہر سے نکل کر مدین کی طرف چل پڑے۔وہ چاروں طرف احتیاط کے طور پر دیکھتے بھی جاتے تھے اور دعا بھی کرتے جاتے تھے کہ الٰہی مجھے ظالم قوم کی شرارتوں سے نجات دے۔(آیت ۲۱ تا ۲۲)

آخر چلتے چلتے وہ مدین کے چشمہ پر پہنچے وہاں انہوں نے دیکھا۔کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔اور دو لڑکیاں اپنے جانوروں کو روک کر الگ کھڑی ہیں۔موسیٰ علیہ السلام نے ان سے دریافت کیا کہ وہ اس طرح کیوں کھڑی ہیں۔انہوں نے کہا۔کہ جب تک سب لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلایا کرتیں۔کیونکہ ان اوباشوں کے گروہ میں ملنا ہمیں پسند نہیں۔اور ہم خود اس لئے آتی ہیں کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے۔وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگے بڑھ کر ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا اور پھر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی میرے لئے خیر و برکت کے سامان مہیا فرما۔(آیت ۲۳ تا ۲۵)

ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ان میں سے ایک لڑکی شرماتی ہوئی آئی۔اور اس نے کہا کہ میرا باپ آپ کو بلاتا ہے تا کہ آپ کو اس نیک سلوک کی جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے جزا دے۔وہاں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تمام سرگذشت بیان کر دی۔لڑکیوں کے باپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی کہ اب کوئی فکر نہ کرو۔ظالم قوم سے تم نجات پا چکے ہو۔اسی دوران میں ان میں سے ایک لڑکی نے کہا کہ ابا جان! آپ انہیں ملازم رکھ لیں۔یہ مضبوط بھی ہیں اور دیانت دار بھی۔لڑکیوں کا باپ بھی اپنی لڑکیوں سے یہ ذکر سن کر آپ کی دیانت کا قائل ہو چکا تھا اس نے فوراً یہ تجویز پیش کر دی کہ اگر آپ آٹھ سال تک خدمت کریں تو میں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا آپ سے نکاح کر دوں گا۔اور اگر آپ آٹھ کی بجائے دس سال تک خدمت کریں تو یہ آپ کا احسان سمجھا جائے گا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور فرمایا کہ دونوں مدتوں میں سے جو میعاد بھی میں پوری کر سکا میرے لئے اس کا پورا کرنا جائز ہوگا۔(آیت ۲۶ تا ۲۹)

مقررہ میعاد پوری ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔راستہ میں انہوں نے طور کی طرف ایک آگ کا شعلہ دیکھا۔اور اپنے اہل سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔میں وہاں جا کر یا تو تمہارے لئے کوئی خبر لاؤں گا۔یا اس آگ میں سے کوئی انگارہ لاؤں گا۔تا کہ تم سینک سکو۔(آیت ۳۰)

جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو انہیں اس مبارک مقام کے دائیں طرف کے کنارہ کی طرف سے ایک درخت کی جہت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں رب العالمین خدا ہوں۔ پھر الہام ہوا کہ تُو اپنا عصا پھینک دے۔ انہوں نے عصا پھینکا۔ تو وہ انہیں ایک چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نظارہ کو دیکھ کر وہاں سے پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے موسیٰ! ڈر نہیں۔ تو سلامتی پانے والوں میں سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال اور اپنے بازو کو ڈر کی وجہ سے اپنے جسم سے ملالے۔ یہ نشان ہیں جو فرعون اور اس کے سرداروں کے لئے تجھے عطا کئے گئے ہیں۔ (آیت ۳۱ تا ۳۳)

جب موسیٰ ؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ملا۔ تو انہوں نے کہا کہ خدایا میرے ہاتھ سے تو اس کی قوم کا ایک فرد مر چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے پیغام کے پہنچانے سے پہلے ہی میں مارا جاؤں۔ پھر انہوں نے کہا کہ خدایا ہارون جو میرا بھائی ہے وہ مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتا ہے تو اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول کیا اور فرمایا ہم ہارون کے ساتھ تیرے بازو کو مضبوط کریں گے۔ اور تم دونوں کو کھلا کھلا غلبہ عطا فرمائیں گے۔ فرعون تم دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (آیت ۳۴ تا ۳۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے پاس گئے۔ اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا تو فرعون اور اس کے سرداروں نے آپ کی شدید مخالفت کی۔ اور اسے ایک سکیم کے ماتحت تیار شدہ فریب قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سنیں۔ پھر فرعون نے ہامان سے کہا۔ کہ ایک بہت بلند اور اونچی عمارت بناؤ۔ شائد میں اس پر چڑھ کر موسیٰ ؑ کے خدا کو دیکھ سکوں۔ اس طرح اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تکبر سے کام لیا۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم نے اسے اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا اور اب اس دنیا میں بھی ان پر لعنت برستی چلی جائے گی اور قیامت کے دن بھی وہ ذلیل ترین لوگوں میں کھڑے کئے جائیں گے۔ (آیت ۳۷ تا ۴۳)

فرماتا ہے ہم نے موسیٰ ؑ کو ایسی کتاب دی تھی جو لوگوں کو روحانی بینائی بخشنے والی اور ہدایت اور رحمت کا سامان اپنے اندر رکھنے والی تھی۔ مگر انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ جیسا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ تورات کی ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی۔ اور فرماتا ہے کہ تُو اس وقت موسیٰ ؑ کے ساتھ نہیں تھا جب ہم نے طور کے مغربی جانب رسالت کا کام اس کے سپرد کیا۔ اور نہ تُو مدین والوں کے ساتھ رہتا تھا جبکہ ہم نے وہاں تیرے متعلق پیشگوئی کی۔ اگر ایسا ہوتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ تم دونوں نے مل کر باہم منصوبہ کر لیا ہوگا۔ لیکن

موسیٰ ؑ تو تیری پیدائش سے دو ہزار سال پہلے گذر چکے تھے۔ پھر اس کی کتاب میں تیرے متعلق پیشگوئیوں کا پایا جانا تیری صداقت کا کیوں ثبوت نہیں۔ (آیت ۴۴ تا ۴۷)

پھر بتایا کہ نبیوں کی بعثت قوموں پر حجت تمام کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اگر نبی نہ آئیں تو لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے عذر کر سکتے ہیں کہ ہماری طرف تو کوئی سمجھانے والا نہیں آیا۔ پھر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے۔ مگر اب جبکہ خدا تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لئے ایک نبی کو مبعوث فرما دیا ہے وہ اس پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موسیٰ ؑ کی طرح اس پر یکدم اکٹھی کتاب کیوں نازل نہیں ہوئی۔ فرماتا ہے۔ اگر یہی صداقت کی دلیل ہے تو پھر موسیٰ کا کیوں انکار کیا گیا۔ اس کے زمانہ میں بھی تو لوگوں نے یہی کہہ دیا تھا کہ موسیٰ ؑ اور ہارونؑ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ پس تورات کا بھی انکار کیا گیا اور قرآن کا بھی انکار کیا گیا۔ تورات کا تو اس لئے انکار کیا گیا کہ وہ اکٹھی کیوں نازل ہوئی ہے اور قرآن کا اس لئے انکار کیا گیا کہ یہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں نازل ہوا۔ اب تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو کسی تیسرے طریق سے نازل ہوئی ہو۔ اور اس نے دنیا میں ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت پھیلائی ہو مگر تم ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ (آیت ۴۸ تا ۵۰)

ان لوگوں کے یہ اعتراضات بتا رہے ہیں کہ انہیں کسی سچائی سے غرض نہیں۔ بلکہ جو بھی پراگندہ خیال ان کے دل میں آتا ہے۔ وہ اسے ظاہر کر دیتے ہیں اور ایسے لوگ جو پراگندہ خیالات اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے والے ہوں کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ (آیت ۵۱)

فرماتا ہے ہم نے اس وحی کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے نازل کیا ہے اور سارے قرآن میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی اور جو سچے معنوں میں اہل کتاب ہیں وہ تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم کی سچائی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور دوہرے اجر کے مستحق ہیں۔ (آیت ۵۲ تا ۵۵)

پھر ان لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بدی کا نیکی سے مقابلہ کرتے اور اپنی تمام طاقتوں کو خدا تعالیٰ کے رستہ میں خرچ کرتے ہیں اور ہر قسم کی لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ اور دشمنی کرنے والوں کی بھی سلامتی چاہتے ہیں۔ (آیت ۵۵و۵۶)

پھر بتایا کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسر آتی ہے۔ مگر اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنے دل کو ایسا صاف رکھے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اسے ہدایت کی طرف کھینچ کر لے جائے۔ (آیت ۵۷)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اسلام قبول کرلیں تو ارد گرد کی قومیں ہمیں فوراً تباہ کر دیں گی۔ حالانکہ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے تھا کہ جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے مکہ کو حرم قرار دیا ہوا ہے اور اس بے آب و گیاہ جنگل میں ساری دنیا کے پھل اور غلّہ لا رہا ہے وہ اس زمانہ کی ہدایت کو قبول کر لینے والوں کی کیوں حفاظت نہیں کرے گا اور کیوں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ مگر ان لوگوں کو خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں اور اپنی طاقت پر گھمنڈ کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ بستیاں موجود ہیں جو عذاب سے تباہ ہو گئیں۔ مگر پھر بھی یہ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ تباہی ان بستیوں میں رہنے والوں پر اسی لئے آئی تھی کہ انہوں نے رسولوں کا انکار کیا۔ بے شک دنیوی مال و دولت بھی اچھی چیز ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو ترقی ملتی ہے وہ اس تھوڑے سے دنیوی مال یا تھوڑے سے سونے چاندی سے بہت بہتر ہوتی ہے مگر ان لوگوں کی عقل ایسی کمزور ہے کہ اتنی موٹی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (آیت ۵۸ تا ۶۱)

پھر بتایا کہ جس کے پاس دنیوی دولت ہو وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا جن سے اللہ تعالیٰ نے دائمی روحانی برکات کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ اچھی چیز وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو۔ اور ان لوگوں کا انجام یہ ہوگا کہ قیامت کے دن انہیں جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے گا۔ (آیت ۶۲)

اس وقت ائمۃ الکفر جو لوگوں کو اپنے پیچھے چلاتے تھے خدا تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کریں گے کہ ہم نے تو ان لوگوں کو وہی باتیں سکھائی تھیں۔ جن کو ہم سچا سمجھتے تھے مگر ان لوگوں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا۔ انہوں نے ہماری باتوں کو اس لئے مانا کہ خود ان کا اپنا دل ان باتوں کو ماننا چاہتا تھا ورنہ درحقیقت یہ ہمارے پیچھے نہیں چلے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی ہی انہوں نے تقلید کی ہے۔ (آیت ۶۳ و ۶۴)

اس کے بعد ان کے جھوٹے معبودوں کی بیچارگی ظاہر کرنے کے لئے انہیں کہا جائے گا کہ اب اپنے معبودوں کو بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہیں اس عذاب سے نجات دیں۔ وہ آوازیں دیں گے مگر ان کا کوئی معبود انہیں جواب نہیں دے گا۔ اس وقت گمراہ ہونے والے حسرت اور افسوس سے کہیں گے کہ کاش ہم ہدایت اختیار کرتے اور اس غلط راستے پر نہ چلتے۔ (آیت ۶۵)

پھر خدا تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ بتاؤ جو رسول میں نے تمہاری طرف بھیجے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا۔ اس پر وہ ایسے گھبرا جائیں گے کہ تمام خیالات ان کے دماغ سے نکل جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی کوئی بات پوچھنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے وہ یقیناً بامراد ہوں گے۔ (آیت ۶۶ تا ۶۸)

پھر بتایا کہ تمام تغیرات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ جو تغیر بھی چاہتا ہے جاری کرتا ہے۔لیکن کفار کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ۔اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور ان کے دل کے مخفی رازوں سے بھی آگاہ ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے ابتداء بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے اور انجام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے ہر کام میں حمد کا ہی مستحق ہوتا ہے۔(آیت ۶۹ تا ۷۱)

فرمایا۔ یہ لوگ شرک تو کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ اگر رات کو اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لئے لمبا کردے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو ان کے پاس روشنی لائے گا۔ یا اگر دن کو قیامت تک کے لئے لمبا کردے تو خدا تعالیٰ کے سوا اَور کون ہے جو ان کے لئے رات کا وقت لائے ۔خدا تعالیٰ ہی ہے جو سورج کو چڑھاتا اور غروب کرتا ہے ۔پھر فرمایا۔ یہ رات اور دن کا تسلسل اس لئے ہے کہ رات میں تم سکون حاصل کرسکو اور دن میں کام کاج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے بنو۔مگر مشرک لوگ اپنے مزعومہ معبودوں کو اس کا شریک قرار دے دیتے ہیں حالانکہ کوئی مشرک نہیں جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ سورج کو اس کا معبود چڑھاتا ہے یا اس کا غروب ہونا کسی بت کے اشارہ سے ہوتا ہے۔(آیت ۷۲ تا ۷۴)

فرمایا۔ایک دن آنے والا ہے جب ان مشرکوں سے کہا جائے گا کہ آج تمہارے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں ۔وہ کیوں تمہاری مدد نہیں کرتے ۔اگر تمہارے پاس شرک کی تائید میں دلائل تھے تو تمہاری وہ دلیلیں کہاں چلی گئیں ۔ تب مشرکوں پر اپنے بتوں کا جھوٹا ہونا بالکل واضح ہوجائے گا اور وہ کہیں گے کہ سچی بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہی تھی ۔اور ان کے تمام مفتریانہ دعاوی ان کو بھول جائیں گے ۔(آیت ۷۵ تا ۷۶)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مخالفوں کے سامنے قارون کی مثال پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس نے دولت کے نشہ میں اپنی قوم پر سختی کرنی شروع کردی وہ خزانوں کا افسر تھا جن کی کنجیاں اٹھانا بھی ایک مضبوط جماعت کے لئے دوبھر ہوتا تھا۔اس کی قوم نے اسے سمجھایا کہ تکبر نہ کر۔اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔مگر اس نے کہا۔ یہ رتبہ مجھے یونہی نہیں ملا بلکہ میں نے اپنے علم کے زور سے اسے حاصل کیا ہے۔اس نے یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کرچکا ہے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور تھیں ۔پھر ایسا ہو کہ ایک دن وہ بڑی شان وشوکت سے اپنی قوم کے سامنے سے گذرا اور قوم نے اس پر رشک کیا مگر جو لوگ روحانی نگاہ رکھنے والے تھے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی قابل رشک چیز نہیں ۔رشک کے قابل وہ جزا ہے جو مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے ۔مگر یہ جزا انہی لوگوں کو ملا کرتی ہے جو مشکلات میں صبر سے کام لیتے ہیں ۔آخر قارون کی سزا کا وقت آ گیا اور ہم نے اسے اور اس کے

سارے خاندان کو ایسا ذلیل کیا کہ نہ تو کوئی گروہ اس کی مدد کے لئے نکلا اور نہ وہ خود اپنی حالت کو بدل سکا۔ اور لوگوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ (آیت ۷۷ تا ۸۳)

اس کے بعد بتایا کہ جو لوگ ملک میں ناجائز غلبہ کے حصول کی کوشش نہیں کرتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہی کو ترقیات سے حصہ دیا کرتا ہے۔ (آیت ۸۴)

پھر نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہمارا یہ اصول ہے کہ نیکی کا بدلہ تو کام کی نسبت سے بہت زیادہ دیا جاتا ہے لیکن بدی کی سزا صرف اسی قدر دی جاتی ہے جس قدر قصور ہوتا ہے۔ اور پھر پیشگوئی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گو ایک دن تیری قوم تجھے مکہ سے نکال دے گی لیکن وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ اپنی ذات کی قسم کھا کر تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تجھے پھر مکہ میں واپس لائے گا اور تجھے ان لوگوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون اس کا انکار کر کے گمراہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ ہدایت لانے والا ناکام رہے اور گمراہ کامیاب ہو جائیں۔ (آیت ۸۵و۸۶)

اے قرآن کے مخاطب اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان نشان کو دیکھنے کے بعد تیرا فرض ہے کہ تو کفار کا کبھی مددگار نہ بن اور کبھی شرک کے قریب مت جا اور کبھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اَور کو اپنا معبود نہ بنا۔ کیوں کہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ ہر مزعومہ معبود بھی ہلاک ہوگا اور صرف وہی بچیں گے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی کیونکہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہی چلتا ہے اور سب مخلوقات نے پیش بھی اسی کے حضور ہونا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰسٓمّٓ ②

طاہر (پاک) سمیع (دعائیں سننے والا) مجید (بڑی بزرگی والا خدا اس سورۃ کو نازل کرنے والا ہے)۔

تفسیر ۔اس سورۃ کے ابتداء میں حروف مقطعات طٰسٓمّٓ رکھے گئے ہیں۔ جو لطیف۔ سمیع اور مالک یا مجید کے قائم مقام ہیں۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا لطیف ہے اور وہ لطف اور مہربانی سے کام لیتا ہے جبر اور سختی سے کام نہیں لیتا۔ وہ سمیع ہے۔ جب دنیا ہدایت سے محروم ہوئی اور ان کے دلوں میں سے خدا تعالیٰ کی طرف پکار اٹھی کہ ہمیں ہدایت دے تو اس نے یہ قرآن بھیج دیا۔ وہ مالک ہے مخلوق کا اس لئے وہ اپنے بندوں کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یا میم مجید کا قائم مقام ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا بڑی بزرگی والا ہے۔ پس یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ اس کے کمزور بندے ہدایت سے محروم ہوتے۔ اور وہ ان کی خبر نہ لیتا۔ اور چونکہ انہی صفات کو سورۂ شعراء کے ابتداء میں بھی بیان کیا گیا ہے اس لئے مغزِ مضمون کے لحاظ سے ان دونوں سورتوں کا مضمون آپس میں ملتا جلتا ہے۔

بعض لوگ قرآن کریم پر تدبر نہ کرنے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ اس کی آیتیں اور سورتیں یوں ہی بے جوڑ رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ ایک ادنیٰ غور سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں بھی کسی خاص مقصد کے ساتھ آگے پیچھے رکھی گئی ہیں۔ اور اس کی آیتیں بھی اپنے اندر ترتیب اور جوڑ رکھتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ شعراء اور سورۂ قصص کو دیکھ لو۔ سورۂ شعراء سے پہلے بھی طٰسٓمّٓ حروف مقطعات کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اور سورۂ قصص سے پہلے بھی طٰسٓمّٓ حروف مقطعات کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اور سورۂ شعراء میں بھی ان حروف کے بعد یہ آیت ہے کہ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۔ اور اس سورۃ میں بھی طٰسٓمّٓ کے بعد یہ آیت ہے تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حروف مقطعات کسی خاص غرض کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ایک جیسے حروف ایک ہی قسم کے مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔

ہم نے سورۂ نمل کے تفسیری نوٹوں میں بتایا تھا کہ سورۂ نمل کو طٰسٓمّٓ کی بجائے جو شعراء سے پہلے رکھے گئے

ہیں صرف طٰسٓ سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجد اور اس کی بزرگی جتنی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ظاہر ہوئی ہے جن کا سورۂ شعراء میں ذکر آتا ہے اتنی بزرگی موسیٰ اور سلیمان علیہم السلام کے وجود سے ظاہر نہیں ہوئی جن کا ذکر سورۂ نمل میں آتا ہے۔ اب اس سورۃ میں پھر طٰسٓ کے بعد میم بڑھا دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے خصوصاً فتح مکہ کا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی بزرگی ظاہر ہوئی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ③

یہ (یعنی اس سورۃ کی آیات) ایک مدلّل کتاب کی آیات ہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے۔ اس سورۃ میں جو آیتیں بیان کی گئی ہیں وہ ایک کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ یعنی اس کتاب کی جو سب مضمونوں کو کھول کر بیان کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہر مضمون کی دلیلیں دیتی ہے۔

اس آیت میں سورۂ نمل کی آخری آیت وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ پر وارد ہونے والے اس سوال کا بھی جواب دے دیا گیا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف منذر بنایا ہے زبردستی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتاب ہر مضمون کے دلائل پیش کرتی ہے۔ اور جس کے ساتھ مدلّل کتاب ہو اور جس کے ہر دعویٰ کا ثبوت موجود ہو اسے زبردستی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اس کی باتوں کو سن کر سچے دل سے غور کرے گا تو آپ ہی ہدایت پا جائے گا۔ اور اگر غور نہیں کرنا چاہے گا تو اس پر زبردستی کرنا بیکار ہے کیونکہ جس کو دلیل ٹھیک نہیں کر سکتی جبر بھی اس کو ٹھیک نہیں کر سکتا۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ

مومن قوم کے فائدہ کے لئے ہم موسیٰ اور فرعون کے صحیح سوانح تیرے

يُّؤْمِنُوْنَ ④

سامنے پڑھتے ہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ! خدا تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی مثال کے طور پر ہم تجھے موسیٰؑ

کا واقعہ سناتے ہیں لیکن اس شکل میں سناتے ہیں جس شکل میں وہ ہوا تھا۔ یعنی تورات نے اس میں بہت سے انسانی خیالات ملا دیئے ہیں۔ تو ان انسانی خیالات کو الگ کر کے اصل حقیقت لوگوں کے سامنے بیان کر۔

قرآن شریف کی اس آیت کی تصدیق پادری وہیری کے نوٹ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ اس جگہ لکھتے ہیں کہ یہاں محمدؐ رسول اللہ نے موسیٰؑ کے سارے حالات بیان نہیں کئے۔ جس سے پتہ لگتا ہے کہ انہیں یہودیوں سے نامکمل حالات پہنچے تھے۔ لیکن قرآن نے پہلے سے وہیری کے اس اعتراض کو مدنظر رکھتے ہوئے بتا دیا تھا کہ سچا واقعہ وہی ہے جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اَور واقعہ تیرے پاس بیان کیا جائے تو اس کو ہرگز سچا نہ سمجھ۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا

فرعون نے (اپنے) ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا تھا اور اس کے رہنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ

وہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ (اس طرح کہ) ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور ان کی

نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۵ وَ نُرِيْدُ اَنْ

لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور وہ یقیناً فسادیوں میں سے تھا۔ اور ہم نے ارادہ کر رکھا تھا کہ جن لوگوں

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ

کو اس نے ملک میں کمزور سمجھ رکھا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو سردار بنا دیں اور ان کو (تمام نعمتوں کا)

اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۶ۙ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

وارث کر دیں۔ اور ان کو ملک میں تمکنت بخشیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں

وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۷

جس کا ان کو خوف لگا ہوا تھا۔

حل لغات۔ شِيَعًا شِيَعًا شِيْعَةٌ کی جمع ہے اور شِيْعَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں اَتْبَاعُهٗ وَ اَنْصَارُهٗ۔

کسی شخص کے پیرو کار اور مددگار۔ نیز اَلشِّیْعَۃُ کے معنے ہیں اَلْفِرْقَۃُ۔ گروہ (اقرب)

یَحْذَرُوْنَ یَحْذَرُوْنَ حَذِرَ سے فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حَذِرَ یَحْذَرُ (حِذْرًا و حَذَرًا وَمَحْذُوْرَۃً) کے معنے ہیں تَحَرَّزَ مِنْہُ۔ اس سے بوجہ خوف اجتناب کیا (اقرب) پس مَا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ کے معنے ہوں گے جس کا ان کو خوف لاحق تھا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ موسیٰ ؑ کا واقعہ یوں ہوا کہ فرعون نے اپنی حکومت کے گھمنڈ میں تکبر شروع کر دیا۔ اور لوگوں پر تعدّی کرنی شروع کردی۔ وہ تمام رعایا کے ساتھ ایک سا سلوک نہیں کرتا تھا۔ نہ ان کی ترقی کی طرف توجہ کرتا تھا۔ بلکہ مختلف نسلوں اور مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کو آپس میں لڑواتا تھا۔ اور بعض لوگوں کو پسندیدہ اور منتخب جماعت قرار دیتا تھا۔ اور بعض کو حقیر اور حکومت کی حفاظت سے خارج قرار دیتا تھا۔ اور رعایا کے ایک طبقہ کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور ان کی نرینہ اولادوں کو ہلاک کر دیتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ وہ یقیناً زمین میں فساد کر رہا تھا۔ لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا (اور اس زمانہ میں بھی فیصلہ کیا ہے) کہ جن کو کمزور کیا جا رہا ہے ہم ان پر احسان کریں اور ہم ان کو دنیا کا سردار بنا دیں اور ہم ان کو ان انعامات کا وارث کر دیں جو فرعون اور اس کے قریبیوں کو حاصل تھے۔ اور ہم ان کو ملک میں طاقت بخشیں۔ اور ہم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا تھا کہ فرعون اور اس کے ساتھی ہامان کو اور ان دونوں کے لشکروں کو وہ انجام دکھا دیں جس سے وہ ڈر رہے تھے۔ یعنی یہ خوف کہ ملک کی بعض قومیں طاقتور ہو کر ان کو نقصان نہ پہنچا دیں۔

وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا سے ظاہر ہے کہ فرعون نے ''ڈیوائیڈ اینڈ رول'' کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی اور وہ جابر بادشاہوں کی طرح لوگوں کو ہمیشہ آپس میں لڑواتا رہتا تھا تا کہ ان میں اتحاد اور یکجہتی پیدا نہ ہو اور اس کے مظالم کی طرف لوگوں کی توجہ نہ پھرے۔ جس طرح جابر بادشاہ بعض قوموں کی حمایت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض کو ذلیل کر دیتے ہیں اور اس طرح مستقل طور پر ایک دوسرے کے خلاف تنافر اور بغض اور حسد کے جذبات بھڑکاتے ہیں اسی طرح فرعون کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کا جھگڑا قائم رہے اور اس کی حکومت کے ظالمانہ افعال کی طرف ان کی توجہ نہ پھرے۔ بہرحال قرآن مجید اس پالیسی کی شدید مذمت کرتا ہے اور اسے فساد فی الارض کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک قانون کا اطلاق غریب اور امیر اور عالم اور جاہل پر یکساں ہونا چاہیے اور اس بارہ میں کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھنا چاہیے۔ اور درحقیقت دنیا میں وہی حکومت پائیدار امن قائم کرنے کا موجب ہو سکتی ہے جو اس امتیاز کو کلیۃً دور کر دے۔ اور قومی، ملکی، نسلی یا مذہبی اختلاف کی بنا پر عدل و انصاف

کے تقاضوں کو نہ کچلے۔

فرعون چونکہ بنی اسرائیل کو کمزور کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے پہلے تو بنی سرائیل کی نسل کو دائیوں کے ذریعہ بند کرنا چاہا۔مگر جب اس سکیم میں اسے ناکامی ہوئی اور دائیوں نے رحم سے کام لیا تو اس نے لڑکوں کو دریا میں ڈالے جانے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خروج باب ۱ میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے جن میں ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا فوعہ تھا باتیں کیں۔ اور کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ۔ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔لیکن وہ دائیاں خدا سے ڈرتی تھیں۔ سو انہوں نے مصر کے بادشاہ کا حکم نہ مانا بلکہ لڑکوں کو جیتا چھوڑ دیتی تھیں۔ پھر مصر کے بادشاہ نے دائیوں کو بلوا کر ان سے کہا۔تم نے ایسا کیوں کیا کہ لڑکوں کو جیتا رہنے دیا؟ دائیوں نے فرعون سے کہا۔عبرانی عورتیں مصری عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ ایسی مضبوط ہوتی ہیں کہ دائیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جَن کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ پس خدا نے دائیوں کا بھلا کیا اور لوگ بڑھے اور زبردست ہو گئے۔ اور اس سبب سے کہ دائیاں خدا سے ڈریں اس نے ان کے گھر آباد کر دیئے۔ اور فرعون نے اپنی قوم کے سب لوگوں کو تاکیداً کہا۔ کہ ان میں جو بیٹا ہو تم اسے دریا میں ڈال دینا اور جو بیٹی ہو اسے جیتی چھوڑنا۔''

(خروج باب ۱ آیت ۱۵ تا ۲۲)

قرآن کریم نے اس واقعہ کے متعلق یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ کے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں اس سے بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ فرعون بچوں کا گلا گھونٹ دیا کرتا تھا۔مگر یہ درست نہیں۔ ذبح کے ایک معنے لغت میں ہلاک کر دینے کے بھی لکھے ہیں (تاج العروس) پس یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ہلاک کر دیتا تھا۔خواہ یہ ہلاکت دریا میں ڈبو دینے سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ یُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ کے الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں (الاعراف: ۱۴۲) جس سے ان معنوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بنی سرائیل کے بچوں کے قتل ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے سورۂ بقرۃ میں بھی یَذۡبَحُوۡنَ کی بجائے یُذَبِّحُوۡنَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں (البقرۃ: ۵۰) کیونکہ عربی زبان کے قواعد کی رُو سے یُذَبِّحُوۡنَ کے معنوں میں زیادہ شدت اور سختی پائی جاتی ہے۔ اگر یَذۡبَحُوۡنَ کہا جاتا تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ وہ ہلاک کرتے

تھے۔ لیکن یُذَبِّحُوْنَ کہہ کر اس قوم کے غصہ اور کینہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ تلاش کر کر کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ہلاک کرتے تھے۔

وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّ نَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ۔ میں اللہ تعالیٰ نے نُرِیْدُ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو مضارع کا صیغہ ہے۔ جس میں استقبال کے معنے بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ آئندہ بھی ہمارا یہی ارادہ ہے۔ اس لفظ کو استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نہ صرف موسیٰؑ کے وقت ہم نے یہ ارادہ کیا تھا بلکہ آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ حکومتِ ملکی جن لوگوں کو ظالمانہ طور پر کمزور کرنا چاہتی ہے ان کو طاقت دی جائے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور گو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبر کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا لیکن جس طرح الٰہی تدبیروں سے موسیٰؑ کے وقت کام لیا گیا اور فرعون کو تباہ کیا گیا اور اس کے اور اس کے درباریوں کے تختۂ مشق لوگوں کی مدد کی گئی اور ان کو اونچا کیا گیا اسی طرح الٰہی تدبیروں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی کام لیا جائے گا اور مکہ والوں کو تباہ کیا جائے گا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو الٰہی تدبیروں کے ذریعہ سے اونچا کیا جائے گا۔ اور وہ الٰہی تدبیر اس نے شروع میں ہی بیان کر دی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا ایک پُر حکمت اور بادلیل کلام ہے جس کے اثر اور طاقت سے لوگوں کے دل فتح ہو جائیں گے۔ گویا نتیجہ تو وہی نکلے گا جو موسیٰؑ کے وقت میں نکلا مگر موسیٰؑ کے وقت میں تو احکام الٰہی کی تعمیل کے لئے آپ کو اپنی قوم کے ساتھ سختی بھی کرنی پڑی اور پھر موسیٰؑ کی ساری قوم ایمان بھی نہ لائی صرف سیاسی طور پر موسیٰؑ کے ساتھ ہو گئی جیسا کہ بائیبل سے ظاہر ہے۔ کہ ایک لمبے عرصہ تک موسیٰ کی قوم موسیٰؑ پر اعتراض کرتی چلی گئی۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں چونکہ پُر حکمت اور بادلیل کلام دیا گیا ہے۔ آپ کی قوم پورے طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے گی۔ اور موسیٰؑ کی قوم سے بھی بڑھ کر اس کو عزت حاصل ہوگی۔ موسیٰؑ کی قوم تو صرف فرعون کی شان وشوکت کے ایک حصہ کی وارث ہوئی تھی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اس سے بہت زیادہ ترقیات پائے گی کیونکہ اس کے ساتھ کتاب مبین ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا (الفرقان: ۵۳) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تجھے لڑائیاں تو پیش آئیں گی لیکن وہ لڑائیاں تیری زندگی کا ماحصل نہیں ہوں گی بلکہ تیری زندگی کے کاموں کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہوں گی۔ ماحصل تیری زندگی کا یہ ہے کہ قرآن سے اپنی قوم کے ساتھ جنگ کر اور یہ جنگ ہی بڑی جنگ ہوگی۔ تلوار کی جنگ اس کے مقابلہ میں چھوٹی ہوگی۔

اب دیکھ لو یہ پیشگوئی کس شان سے پوری ہوئی مکہ والوں کو بے شک بعض عرب قبائل سے جنگیں پیش آئیں۔ لیکن وہ قبائل بھی چھوٹے تھے اوران کا نتیجہ بھی چھوٹا تھا۔مگر جو جنگ آپ کو قرآن کریم کے ذریعہ کرنی پڑی وہ عرب سے بھی ہوئی ایران سے بھی ہوئی اور پھر بعد میں ساری دنیا سے ہوئی اور ہورہی ہے جس دن اس جنگ کا نتیجہ نکلے گا ساری دنیا کے دل اسلام کے لئے فتح ہوجائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بادشاہت میدانوں اور سمندروں کو پھاندتی ہوئی دنیا کے کناروں تک پہنچ جائے گی۔اس کے مقابلہ میں ظاہری جنگوں کا نتیجہ بہت چھوٹا تھا مگر تعجب ہے کہ ان کھلی آیات کی موجودگی میں مغربی لوگ اب تک یہ اعتراض کرتے چلے جارہے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگوں کے ساتھ اپنے دشمنوں کو مغلوب کیا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتوحات جنگوں کے ساتھ وابستہ تھیں تو پھر قرآن کریم نے اشارۃً ان کو چھوٹا کیوں کہا اور قرآنی جنگ کو بڑا کیوں کہا۔اس نے یہ کیوں فرمایا کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔اے محمدؐ رسول اللہ! تیری اصل جنگ قرآن کریم کے ہتھیار سے ہے۔تُو اس ہتھیار کے ساتھ اپنے دشمنوں سے جنگ کر۔یہی جنگ بڑی جنگ ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ آیت جس میں دو جہادوں کی خبر دی گئی ہے ایک تلوار کے جہاد کی جو چھوٹا ہوگا اور ایک دلائل اور براہین کے جہاد کی جو بڑا ہوگا یہ سورۃ فرقان کی آیت ہے جو مکی سورۃ ہے۔گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے۔نہ کوئی فوج آپ کے ساتھ تھی۔نہ کوئی ملک آپ کے ساتھ تھا کہ آپ کو خدا تعالیٰ نے بتایا کہ تجھے اپنے مخالفوں کے ساتھ لڑائیاں پیش آئیں گی کچھ تلوار کی اور کچھ دلائل اور براہین کی۔دلائل اور براہین کی لڑائیاں بڑی ہوں گی اور تلوار کی چھوٹی۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرق کو بیان فرمایا ہے۔چنانچہ ایک دفعہ آپؐ جہاد سے واپس آئے تو آپؐ نے فرمایا رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ (ردالمختار علی الدر المختار کتاب الجہاد) ہم ایک چھوٹی لڑائی سے واپس آئے ہیں تاکہ بڑی لڑائی یعنی دلائل اور براہین کی لڑائی اور اشاعت قرآن کی لڑائی کو شروع کریں۔پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دلائل اور براہین کی لڑائی کو بڑی لڑائی اور تلوار کی لڑائی کو چھوٹی لڑائی قرار دیا ہے۔

ان آیات میں جو ہامان کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق سیل نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن میں اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن نے ہامان کو فرعونِ موسیٰؑ کا ہم عصر قرار دیدیا ہے۔حالانکہ ہامان ایک ایرانی بادشاہ اخسویرس کے وزیر کا نام تھا۔جو موسیٰؑ کے ایک لمبا عرصہ بعد ہوا اور پھر لکھتا ہے کہ گویہ غلطی بالکل واضح ہے لیکن ایک مسلمان کو اس غلطی کا یقین دلانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے (ترجمۃ سیل للقرآن صفحہ ۳۷۸)۔ریورنڈ وہیری

نے بھی اپنی کتاب ’’کمنٹری آن دی قرآن‘‘ میں اس اعتراض کو نقل کیا ہے۔اسی طرح بعض اور یوروپین مستشرقین نے بھی لکھا ہے کہ ہامان۔فرعون موسیٰؑ کا کوئی وزیر یا اعلیٰ افسر نہیں تھا بلکہ پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک ایرانی بادشاہ کا وزیر تھا۔جس نے اخسویرس کے عہد حکومت میں یہودیوں کے قتلِ عام کی سازش کی مگر بالآخر بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے ہامان کو صلیب پر لٹکا دیا (تفسیر القرآن لوہیری)۔

یوروپین مستشرقین کے اس اعتراض کی بنیاد بائیبل کی کتاب آستر باب ۳ تا ۷ پر ہے جس میں لکھا ہے کہ

’’اخسویرس بادشاہ نے اجاجی ہمداتا کے بیٹے ہامان کو ممتاز اور سرفراز کیا اور اس کی کرسی کو سب امراء سے جو اس کے ساتھ تھے برتر کیا۔اور بادشاہ کے سب ملازم جو بادشاہ کے پھاٹک پر تھے ہامان کے آگے جھک کر اس کی تعظیم کرتے تھے کیونکہ بادشاہ نے اس کے بارے میں ایسا ہی حکم کیا تھا۔ پرمردکی (جو ایک یہودی سردار تھا) نہ جھکتا نہ اس کی تعظیم کرتا تھا۔تب بادشاہ کے ملازموں نے جو بادشاہ کے پھاٹک پر تھے مردکی سے کہا تُو کیوں بادشاہ کے حکم کو توڑتا ہے۔جب وہ اس سے روز کہتے رہے اور اس نے ان کی نہ مانی تو انہوں نے ہامان کو بتا دیا تا کہ دیکھیں کہ مردکی کی بات چلے گی یا نہیں۔ کیونکہ اس نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں یہودی ہوں۔جب ہامان نے دیکھا کہ مردکی نہ جھکتا نہ میری تعظیم کرتا ہے تو ہامان غصہ سے بھر گیا۔لیکن فقط مردکی ہی پر ہاتھ چلانا اپنی شان سے نیچے سمجھا کیونکہ انہوں نے اسے مردکی کی قوم بتا دی تھی اس لئے ہامان نے چاہا کہ مردکی کی قوم یعنی سب یہودیوں کو جو اخسویرس کی پوری مملکت میں رہتے تھے ہلاک کرے۔‘‘

(آستر باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ہامان اپنی تدبیر میں ناکام رہا اور اس کی بیوی نے جس کا نام آستر تھا اور جو یہودن عورت تھی بادشاہ کو ہامان کے خلاف بھڑکا دیا اور بادشاہ نے اسے قتل کروا دیا۔

آستر کی اس روایت پر انحصار رکھتے ہوئے یوروپین مستشرقین نے کسی ایسے ہامان کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے جو فرعون موسیٰ کا ہمعصر ہو۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ کتاب جس پر اس اعتراض کی بنیاد رکھی گئی ہے خود محققین کی نگاہ میں ایک مشکوک اور نا قابل استناد کتاب ہے اور وہ اس کے بیان کردہ واقعات کو درست ہی تسلیم نہیں کرتے۔چنانچہ مارٹن لوتھر اور بعض دوسرے عیسائی علماء نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آستر کی یہ داستان محض ایک افسانہ ہے جو مبالغہ آرائی سے پُر ہے۔بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کا کوئی ایرانی بادشاہ

ایسا نہیں تھا جس کا وزیر یا مصاحب اعلیٰ ہامان نامی گذرا ہو۔ اور نہ ہی اخسویرس بادشاہ کی کوئی ملکہ آستر تھی یہ سب خلافِ تاریخ واقعات ہیں جو اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں (ہارپرز بائیبل ڈکشنری از ملّر زیر لفظ آستر) پس عیسائیوں نے جس کتاب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے وہ تاریخی حیثیت سے ایک نا قابلِ اعتبار کتاب ہے۔ اور جب خود اس کی حیثیت مخدوش ہے تو اس کی بنا پر اسلام پر کوئی اعتراض کرنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم نے ہامان کے متعلق جو امور بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

اول ھامان کو مصر میں فوجی اقتدار حاصل تھا۔ اور جس طرح فرعون کا لشکر تھا اسی طرح ہامان بھی اپنے ساتھ لشکر رکھتا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ (القصص: ۹) یعنی فرعون ہامان اور ان دونوں کے لشکر خطا کار اور گنہگار تھے۔ یہی مضمون آیت ۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۔ یعنی ہم نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں گے جس کا انہیں خطرہ لاحق تھا۔

دوم۔ قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلند و بالا عمارات اور قلعوں وغیرہ کی تعمیر کا کام ہامان کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ایک دفعہ فرعون نے ہامان سے کہا۔ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (القصص: ۳۹) یعنی اے ہامان! میرے لئے ایک بہت بلند اور اونچی عمارت بناؤ۔ شاید کہ اس پر چڑھ کر مجھے کہیں موسیٰؑ کا خدا نظر آجائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ مجھے موسیٰؑ کی سچائی کا کچھ کچھ یقین آ گیا ہے۔ میں اسے تو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ اس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کے جھوٹا ہونے کا یقین ہو جائے گا۔

اب اگر قدیم مصر کی تاریخ سے ہمیں کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگ جائے جو فرعونِ موسیٰؑ کے زمانہ میں ہو اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ لگ جائے کہ اس کے ساتھ فوجی طاقت بھی تھی اور بلند و بالا عمارات اور قلعے وغیرہ بنانے کا کام بھی اس کے سپرد تھا تو قرآن کریم کی صداقت بالکل واضح ہو جائے گی۔ اس غرض کے لئے جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مصرِ قدیم میں بہت سے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی اور ہر شخص کا تعلق کسی خاص دیوتا یا چند مخصوص دیوتاؤں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ مصر کے دارالخلافہ تھیبس کے رہنے والے اپنے دیوتا کو آمان یا آمون کہا کرتے تھے۔ قدیم ایام میں تو اس کا نام ''آمانا'' تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ آمن۔ آمان یا آمون نام لوگوں میں مروج ہو گیا۔ چونکہ آمن یا آمان یا آمون ان لوگوں کا دیوتا تھا جو مصر کے پائیہ تخت میں رہتے تھے اور دارالسلطنت کا ملک

کے دوسرے حصوں پر اثر پڑنا ایک لازمی امر تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ آمان نے سب دیوتاؤں پر برتری حاصل کر لی اور یہ نام ایسا مقدس سمجھا جانے لگا کہ جس طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنے اور اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں اسی طرح مصری ناموں اور القابات میں بھی آمن یا آمون کا لفظ بکثرت استعمال ہونے لگ گیا (تاریخ مصر مصنفہ جیمز ہنری بریسٹڈ ص ۶۰۴)۔ چونکہ ہر دیوتا کا الگ الگ معبد تھا اور ہر دیوتا کے الگ الگ کاہن مقرر تھے۔ اس لئے جب آمان دیوتا کی مقبولیت بڑھی تو آمان کا کاہن بھی تمام کاہنوں کا رئیس تسلیم کیا جانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ بے شمار املاک اور جائیدادیں جو آمان دیوتا کے لئے وقف تھیں وہ اس کے قبضہ میں آ گئیں۔ اور وہ معبدِ آمان کی متعلقہ عمارات کی تولیّت پر بھی قابض ہو گیا (تاریخ ملل قدیمہ مصنفہ سنیوبس مترجم اردو سید محمود اعظم فہمی ص ۳۹)۔

جیمز ہنری بریسٹڈ اپنی کتاب ''تاریخ مصر'' میں ان امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''مصر کے نئے دورِ حکومت میں فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ ایک نئی مؤثر اور طاقتور تحریک جو قدیم نظام کہانت پر مبنی تھی ظہور پذیر ہوئی۔ درحقیقت سلطنتِ مصر میں معابد کی بے پناہ دولت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ کہانت ایک مخصوص پیشہ کی صورت اختیار کر گئی اور جوں جوں کاہنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ویسے ویسے وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی رسوخ اور طاقت حاصل کرتے چلے گئے معابد کی دولت و ثروت میں اضافہ کے ساتھ ہی ایک انبوہ کثیر افسرانِ معابد کا بھی پیدا ہو گیا جن کے ذمہ ان معابد کا انتظام تھا حالانکہ قدیم ایام میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ آخر ملک کے تمام الگ الگ دیوتاؤں کے کلیسیائی نظام ایک عظیم الشان مقدس تنظیم کے ماتحت متحد ہو گئے۔ اس تنظیم کا رئیس اعلیٰ دارالسلطنت تھیبس کے معبد آمان کا بڑا کاہن تھا۔ اس طرح آمان کے کاہن اعظم کی طاقت پہلے کی نسبت کئی گناہ بڑھ گئی۔ فراعنہ مصر نے جب مفتوحہ ممالک سے دولت حاصل کی تو اس کا بیشتر حصہ معبدوں کی نذر کر دیا گیا اور معبد وسیع اور عالیشان محلّات کی صورت اختیار کر گئے۔ جن میں کاہنوں کے گروہ در گروہ رہتے تھے۔ آمان کا کاہن اعظم اس مقدس مذہبی تنظیم کا رئیس اعلیٰ تھا وہ ایک مقدس شہزادہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی بیوی ''خداوند کی کنیز اعلیٰ'' کے لقب سے یاد کی جاتی تھی اور اسے ملکہ کا درجہ حاصل تھا۔''

(تاریخ مصر مصنفہ جیمز ہنری بریسٹڈ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ص ۲۴۷ و ۲۴۸)

آمان دیوتا کا یہ کاہن جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے یوں تو اور بھی بہت سے خطابات تھے۔ لیکن عرف

عام میں اسے ''ھَمْ آمان'' کہا جاتا۔ جیسا کہ مصر قدیم میں رَعْ دیوتا کے بڑے کاہن کو ھَمْ رَعْ اور ''کا'' دیوتا کے بڑح کاہن کو ''ھَمْ کا'' کہتے تھے۔

(" The Dwellers on the Nile" by Sir E.A. Wallis Budge, KT

Pg.148,163,173)

ھَمْ کے معنے خادم یا غلام کے ہوتے ہیں۔ پس ''ھَمْ آمان'' کے معنے تھے۔ ''آمان دیوتا کا خادم یا غلام'' لیکن اصطلاحاً ''ہم'' بڑے کاہن کو کہتے تھے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی وہ رعمیس دوم تھا۔ اور جو آپ کی مخالفت کی وجہ سے تباہ ہوا وہ منفتاح تھا۔ آمان دیوتا کے بڑے کاہن کا پہلی مرتبہ انتخاب رعمسیس دوم کے زمانہ میں ہوا تھا اور اسی زمانہ سے آمان کا کاہن اعظم فرعون کے نظام حکومت کا ممتاز ترین فرد سمجھا جانے لگا تھا۔ چنانچہ اس بارہ میں ''الیگزنڈر مارٹ'' اپنی کتاب ''نیل اور مصر کی تہذیب'' میں لکھتا ہے۔

''رعمسیس دوم نے اپنے عہد حکومت کے سال اول میں ''نَے بُنْ نیف'' کو آمان کا کاہن اعلیٰ منتخب کیا۔ یہ شخص اس سے قبل ھاتور دیوتا کا کاہن اول اور مصر کے سب دیوتاؤں کے کاہنوں کا سردار تھا۔ اور بادشاہ اس کی نشاندہی بھی کر چکا تھا لیکن اسے باقاعدہ طور پر نامزد اس وقت کیا گیا جبکہ بادشاہ نے آمان دیوتا کے حضور معبدِ کرناک میں حاضر ہو کر اپنے دربار کے تمام افسروں، تمام کاہنوں اور تمام بزرگوں کو اس عہدہ کے لئے پیش کیا۔ مگر آمان دیوتا نے سوائے ''نَے بُنْ نیف'' کے اَور کسی پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ جب انتخاب عمل میں آچکا تو بادشاہ نے ''نَے بُنْ نیف'' سے مخاطب ہو کر کہا۔ اب آپ ہی آمان کے کاہن اعلیٰ ہیں۔ معبدِ آمان کے دونوں خزانے اور اس کے دوہرے غلّہ کے گودام اب آپ کی مہر کے ماتحت ہیں۔ ہاتور دیوتا کا معبد اب آپ کے بیٹے کے عصائے حکومت کے تحت ہوگا۔ اور اسی منصب پر فائز ہوگا جو آپ کے لئے مخصوص تھا۔ تمام درباریوں اور اس کے تین ججوں نے اس انتخاب پر بادشاہ اور کاہن اعظم کو مبارکباد دی۔ پھر بادشاہ نے اپنی دو خاص طلائی مہریں اور سونے کا شاہی عصائے بُنْ نیف کو نذر کیا اور اسے مندرجہ ذیل خطابات کے ساتھ اپنے عہدہ پر فائز کیا۔

First prophet of Amon director of the double treasury and director of the soldiers and all the craftmens of thebes.

یعنی ۱۔آمان کا کاہن اعظم

۲۔دوہرے خزانوں اور دوہرے گوداموں کا مدار المہام۔

۳۔سپاہ مصر کا ڈائریکٹر

۴۔دارالحکومت تھیبس کے تمام کاریگروں اور صناعوں کا ناظم ومنصرم

(The Nile and Egyptian Civilization by Alexandre Moret Pg:334)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعونِ مصر کے بعد آمان دیوتا کا بڑا کاہن سب سے زیادہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔اس کا فوج میں بھی دخل تھا اور مذہبی عمارات کی تعمیر کا کام بھی اس کے سپرد تھا۔جیمز ہنری بریسٹڈ بھی اپنی کتاب ''تاریخ مصر'' میں ھُم آمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

He (Ramses II) divided these troops into four division, Each named after one of the great gods: Amon, Re, Ptah and Suteka, and himself took the personal command of the division of Amon.

یعنی رعمسیس دوم نے فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ فوج کو اپنے بڑے دیوتاؤں آمان۔رع۔پتاح اور سیتیخ میں سے کسی ایک کے نام سے موسوم کیا۔اس کے بعد وہ دستہء فوج جو آمان دیوتا کے نام پر تھا۔اس کی کمان اس نے خود سنبھال لی۔(ص ۴۲۵)

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون مصر کے بعد دوسرے درجہ پر آمان کا کاہن سمجھا جاتا تھا۔چونکہ آمان کو تمام دیوتاؤں کا بادشاہ سمجھا جاتا۔اس لئے آمان کے کاہن کو بھی تمام مذہبی تنظیم کا رئیس اعلیٰ قرار دے دیا گیا۔اسے دوہرے خزانوں اور دوہرے گوداموں کا منصرم اور سپاہِ مصر کا ڈائریکٹر قرار دے دیا گیا۔اور اسے اس قدر سلطنت حاصل ہوئی کہ فرعونِ موسیٰ کی فوج میں ایک ڈویژن کا نام ہی آمان کے نام پر رکھا گیا۔اور پھر اس وجہ سے کہ اس کے زیر انتظام تمام مذہبی عمارات کی تعمیر ہوا کرتی تھی اسے صناعوں کے رئیس اعلیٰ کا خطاب بھی دیا گیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مصر میں ہر جگہ عالیشان مندر۔مقابر۔محلات اور کئی قسم کے بت اور

مورتیاں بنائی جاتی تھیں اور یہ سب کام آمان دیوتا کے کاہن کی نگرانی میں ہی ہوا کرتا تھا۔ اسی لئے اِسے Great cheif of the artificers. یعنی صنّاعوں کے رئیس اعلیٰ کا خطاب بھی دیا گیا۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ مصر صفحہ ۶۰)

پس قرآن کریم نے جس شخص کو ھامان قرار دیا ہے وہ کوئی فرضی وجود نہیں بلکہ ایک اہم تاریخی شخصیت ہے جسے مصر قدیم میں ھَمْ آمان یا ھَمْ آمون کہا جاتا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائیبل نے موسیٰؑ اور فرعون کے حالات بیان کرتے ہوئے ہامانؔ کا کہیں ذکر نہیں کیا لیکن جبکہ تاریخی شواہد نے ہمیں ایک ایسے وجود کا پتہ دے دیا ہے جو فرعونِ مصر سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا اور جس کے نام پر اس نے ایک بڑا بھاری لشکر بھی رکھا ہوا تھا اور جس کے سپرد تمام مذہبی عمارات کی تعمیر کا بھی کام تھا تو بائیبل میں اس کا ذکر نہ آنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم نے نعوذ باللہ کوئی غلط بات کہی ہے بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بائیبل جو موسیٰؑ کے زمانہ میں لکھی گئی اور جو اس زمانہ کے صحیح واقعات بیان کرنے کی دعویدار ہے اس نے تو ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا اور ھامان جیسی شخصیت کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن قرآن کریم نے جو تورات کے دو ہزار سال کے بعد نازل ہوا تھا اس نے تورات کی اس غلطی کی طرف اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ صحیح بات وہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں وہ بات صحیح نہیں جو بائیبل نے بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے اس سورۃ کے شروع میں ہی فرما دیا تھا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو تمام حقائق کو روشن کرنے والی اور تمام اسرار کو کھولنے والی ہے اور پھر فرمادیا تھا کہ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ہم بائیبل کے واقعات کو نہیں دوہرا رہے بلکہ موسیٰ اور فرعون کے زمانہ کے سچے واقعات بیان کر رہے ہیں۔ مگر اس سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جن کا کام صرف اعتراض کرنا ہے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو سیلؔ اور وھیریؔ نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور انہوں نے لکھ دیا کہ اس جگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے مسیحؑ سے پانچ سو سال پہلے گزرے ہوئے ایک ایرانی بادشاہ کے وزیر ہامان کو موسیٰؑ کا ہم عصر قرار دے دیا مگر تاریخی کتب نے ظاہر کر دیا کہ ان کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے اور سچی بات وہی ہے جو قرآن نے بیان کی۔

وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ

اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی تھی کہ اس کو (یعنی موسیٰ کو) دودھ پلا۔ پس جب تو اس (کی جان) کے متعلق

فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ

خائف ہو تو اس کو دریا میں ڈال دے اور ڈر نہیں اور نہ کسی پچھلے واقعہ کی وجہ سے غم کر۔ ہم اس کو تیری طرف لوٹا کے

اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۸﴾ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ

لائیں گے اور اس کو رسولوں میں سے ایک رسول بنائیں گے۔ (چنانچہ موسیٰؑ کی ماں نے اس وحی کے مطابق عمل کیا

لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ

اور موسیٰؑ کو دریا میں ڈال دیا) سو اس کے بعد اس (یعنی موسیٰ) کو فرعون کے خاندان میں سے ایک نے اٹھا لیا۔ جس کا

جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِیْنَ ﴿۹﴾

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ ان کے لئے دشمن ثابت ہوا اور غم کا موجب بنا۔ فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکر غلطی میں مبتلا تھے۔

حلّ لُغات۔ اَلْیَمُّ اَلْیَمُّ کے معنے ہیں اَلْبَحْرُ۔ سمندر۔ (اقرب)

فَالْتَقَطَهٗ اِلْتَقَطَهٗ کے معنے ہیں عَثَرَ عَلَیْهِ مِنْ غَیْرِ قَصْدٍ وَّلَا طَلَبٍ۔ کوئی چیز بغیر قصد اور تلاش کے مل گئی اور اس نے اسے اٹھا لیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ موسیٰؑ کی پیدائش پر ہم نے اس کی والدہ کی طرف وحی نازل کی کہ کچھ مدت تک تو تو اسے دودھ پلاتی رہ۔ مگر جب تجھے اس کی جان خطرے میں نظر آئے اور اس راز کے ظاہر ہو جانے کا ڈر ہو تو تو اسے دریا میں ڈال دے اور ڈر نہیں اور نہ ہی غم کر۔ کیونکہ ہم اسے ایک دن تیری طرف لوٹا کر لے آئیں گے اور اس کو اپنا رسول بنا دیں گے۔ چنانچہ موسیٰؑ کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ اور اسے سمندر میں ڈال دیا۔ اور چونکہ موسیٰؑ کے ہم خود محافظ تھے اس لئے بجائے اس کے کہ وہ غرق ہوتا۔ فرعون کے خاندان کے بعض آدمیوں نے اسے اٹھا لیا تاکہ وہ ان کا دشمن بنے اور آنے والے دور میں ان کے لئے غم کا موجب ثابت ہو۔ (اس جگہ لام لامِ عاقبت ہے)

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے سورۃ طٰہٰ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کی والدہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ انہیں ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈالا جائے یونہی نہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں قرآنی الفاظ یہ ہیں کہ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ (طٰہٰ: ۴۰) یعنی موسیٰ ؑ کی والدہ سے ہم نے کہا کہ اسے تابوت میں رکھ دے اور پھر اس تابوت کو دریا میں ڈال دے۔ دریا ہمارے حکم سے اسے ساحل کی طرف دھکیل دے گا۔ اور اس کو وہ شخص اٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا۔ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ اور بچے کو سمندر میں ڈال دیا۔

بائیبل بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا اور اسے دریا کے کنارے چھوڑ آئی۔ (خروج باب ۲ آیت ۳)

سرکنڈوں کا ٹوکرا اور تابوت دراصل ایک ہی چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تابوت سے مراد لکڑی کا بکس ہی ہو۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ وہ چیز جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھا جائے ایسی ہو جس کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے۔ اسی لئے بائیبل بتاتی ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ نے چکنی مٹی اور رال لگا کر ٹوکرے کے سوراخوں کو بند کیا اور جب اسے پوری طرح محفوظ کر لیا گیا تو وہ ٹوکرا نہ رہا بلکہ تابوت بن گیا۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ کی تشریح میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے آسیہ امرأۃ فرعون مراد ہے۔ وہ اس دن دریا پر غسل کرنے آئی تھی اس نے جب پانی پر ایک چھوٹا سا تابوت تیرتے ہوئے دیکھا تو اسے اٹھا لیا اور جب اسے کھولا اور اس میں ایک خوبصورت بچہ دکھائی دیا تو اسے رحم آ گیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئی اور اس نے بچہ کو پالنا شروع کر دیا (طبری) لیکن بائیبل کا یہ بیان ہے کہ فرعون کی بیٹی دریا پر غسل کرنے آئی اور اس نے جھاؤ میں ایک ٹوکرا پڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو بھیجا کہ وہ جا کر اس ٹوکرے کو اٹھا لائے۔ جب وہ ٹوکرا اس کے پاس پہنچا۔ اور اس نے اسے کھولا تو اسے ایک خوبصورت بچہ دکھائی دیا اسے بچے کو دیکھتے ہی رحم آ گیا۔ اور اس نے موسیٰ ؑ کی پرورش شروع کر دی (خروج باب ۱ آیت ۱۶)۔ چونکہ قرآن کریم نے فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس میں صاف طور پر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اسے فرعون کے خاندان اور قبیلہ میں سے کسی نے اٹھایا تھا۔ اس لئے یہاں آلِ فرعون سے اس کی بیٹی ہی مراد ہے بیوی مراد نہیں۔

وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ ؕ

اور فرعون کی عورت (یعنی فرعون کے خاندان کی ایک عورت) نے کہا۔ یہ تیرے لئے اور میرے لئے آنکھ کی

لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ

ٹھنڈک کا موجب ہوگا اس کو قتل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ایک دن وہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں۔ اور ان کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۰

اصل حقیقت معلوم نہ تھی۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیٹی اپنے گھر لے گئی تو فرعون کی بیوی نے اس کے متعلق فرعون سے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔ اور اے فرعون! تیری آنکھوں کی بھی ٹھنڈک ہوگا۔ اس لئے اسے ماریں نہیں ممکن ہے یہ ہم کو نفع دے اور ایک اچھا غلام ثابت ہو۔ یا اگر بہت ہی ذہین نکلے تو ہم اسے بیٹا بنا کر پال لیں۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس میں کیا الٰہی راز ہے اور آئندہ چل کر کیا ظاہر ہونے والا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیٹی نے ہی اٹھایا تھا اور وہی انہیں اپنے گھر لے گئی تھی۔ لیکن چونکہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو اس طرح دریا میں نہیں پھینک سکتی تھی جب تک کوئی شدید خطرہ لاحق نہ ہو اور وہ شدید خطرہ صرف بنی اسرائیل کے لوگوں کو ہی لاحق تھا جن کے بیٹے مارنے کا فرعون نے دائیوں کو حکم دیا ہوا تھا (خروج باب ۱ آیت ۱۶)۔ اس لئے جب وہ موسیٰؑ کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئی تو فرعون نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اسرائیلی لڑکا ہے اور وہ اسے قتل کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر فرعون کی بیوی نے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی جو کچھ کرتی ہے اسے کرنے دیں اور اسے میری خاطر مت ماریں۔ ممکن ہے کہ یہ آگے چل کر ہمارے لئے نفع رساں وجود ثابت ہو یا اس کی اعلیٰ قابلیت ظاہر ہونے پر ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ آئندہ زندگی میں کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ اِنۡ کَادَتۡ لَتُبۡدِیۡ بِہٖ لَوۡ

اور موسیٰؑ کی ماں کا دل (غم سے) فارغ ہو گیا۔ قریب تھا کہ اگر ہم اس کے دل کو مومن بنانے کے لئے مضبوط

لَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰی قَلۡبِہَا لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ

نہ کرتے تو وہ اس واقعہ کی سب حقیقت ظاہر کر دیتی۔ اور اس (یعنی موسیٰؑ کی ماں) نے اس (یعنی موسیٰؑ) کی بہن سے

قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۫ فَبَصُرَتۡ بِہٖ عَنۡ جُنُبٍ وَّ ہُمۡ لَا

کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جا۔ پس وہ اس کو دور سے دیکھتی رہی اور وہ (یعنی فرعون کے لوگ) بے خبر تھے۔ اور ہم نے

یَشۡعُرُوۡنَ ﴿ۙ۱۲﴾ وَ حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ فَقَالَتۡ

اس (یعنی موسیٰؑ) پر اس سے پہلے دودھ پلانے والیوں کو حرام کر دیا پس اس (یعنی موسیٰؑ کی بہن) نے کہا کہ

ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَہۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَہٗ لَکُمۡ وَ ہُمۡ لَہٗ

کیا میں تمہیں ایک ایسے گھر والوں کی خبر دوں جو اس کو تمہارے لئے پال دیں۔ اور وہ اس کے خیر خواہ

نٰصِحُوۡنَ ﴿۱۳﴾ فَرَدَدۡنٰہُ اِلٰۤی اُمِّہٖ کَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُہَا وَ لَا تَحۡزَنَ

ثابت ہوں گے۔ اس طرح ہم نے اس (یعنی موسیٰؑ) کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں

وَ لِتَعۡلَمَ اَنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴﴾ ع

اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے لیکن (منکروں میں سے) اکثر جانتے نہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَلْفُؤَادُ اَلْفُؤَادُ کے معنے ہیں اَلْقَلْبُ لِتَوَقُّدِہٖ۔ یعنی فُؤَاد دل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ جذبات کا محل ہونے کی وجہ سے بھڑکتا اور جلتا ہے۔ فُؤَادٌ فَأَدَ سے ہے۔ اور فَأَدَ اللَّحْمَ فِي النَّارِ کے معنے ہوتے ہیں شَوَّاہُ گوشت کو آگ میں بھونا۔ وَقِیْلَ لِتَحَرُّکِہٖ لِاَنَّ اَصْلَ الْفَأْدِ الْحَرَکَۃُ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل کو فُؤَاد اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ فَأَدَ کے اصل معنے حرکت کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر جب اللہ تعالیٰ کی یہ وحی نازل ہوئی اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اب اللہ تعالیٰ اس بچہ کو خود حفاظت کرے گا اور فرعون اسے قتل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے گا تو اس کے دل پر سے غم کا بوجھ اٹھ گیا۔اور اسے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر ہم اس کے دل کو مومن بنانے کے لئے مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی۔

مفسرین تو اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اپنے بیٹے کو دریا میں بہادیا تو ان کو ہر وقت موسیٰؑ کا خیال ہی رہنے لگ گیا۔اَور کوئی بات انہیں سوجھتی ہی نہیں تھی۔ یہی فکر تھا جو آٹھوں پہر انہیں بے تاب رکھتا تھا (الرازی)۔مگر یہ معنے بالکل غلط ہیں۔وَ اَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا کے صحیح معنے یہ ہیں کہ جب موسیٰؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری دی کہ فرعون کے حملہ سے وہ محفوظ رہے گا تو ان کا دل مطمئن ہو گیا اور ان کا تمام غم جاتا رہا۔ بلکہ انہیں اس بشارت سے اس قدر خوشی ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ بول اٹھتیں اور کہتیں کہ یہ میرا بچہ ہے ۔جس کی حفاظت کا خدا نے وعدہ فرمایا ہے۔لِتُبۡدِیۡ بِہٖ میں ضمیر موسیٰؑ کی طرف بھی جاسکتی ہے۔یعنی ان کا حال بتادیتی اور اس امر کی طرف بھی جاسکتی ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کو سناتی پھرتیں کہ مجھے اس طرح الہام ہوا اور پھر میں نے اس کی تعمیل میں اس اس طرح کیا۔اگر ان کو موسیٰؑ کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو ان کے بول اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بولنے کا خیال تو انہیں تبھی آسکتا تھا جبکہ وہ خوش ہوتیں اور موسیٰؑ کی زندگی کے متعلق وہ پوری طرح مطمئن ہوتیں۔

وَ قَالَتۡ لِاُخۡتِہٖ قُصِّیۡہِ ۔پھر انہوں نے موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ تُو اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ دور سے اس کو دیکھتی رہی اور فرعونیوں کو اس کا پتہ نہ لگا۔

وَ حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِ الۡمَرَاضِعَ مِنۡ قَبۡلُ ۔اور ہم نے اس سے پہلے اس پر دودھ پلانے والیوں کو حرام کر دیا۔اس آیت کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔یہ بھی کہ کوئی دائی اس وقت میسر نہ آئی اور یہ بھی کہ موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوسری دائیوں کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔اس پر موسیٰؑ کی بہن نے کہا کہ میں تمہیں ایک گھر کا پتہ دیتی ہوں جس کے افراد اس کو پال لیں گے اور وہ اس کی ہر طرح خیر خواہی کریں گے۔اس طرح ہم نے موسیٰؑ کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔لیکن اکثر لوگ اپنی بیوقوفی سے ان باتوں کو نہیں جانتے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤی اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ

اور جب وہ اپنی پختہ جوانی کو پہنچا اور (اپنے اعلیٰ اخلاق پر) مضبوطی سے قائم ہو گیا تو ہم نے اسے حکم اور علم بخشا

كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۵﴾

اور ہم محسنوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

حلّ لُغات۔اَشُدَّهٗ محاورہ میں کہا جاتا ہے بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّهٗ اور اس کے معنے ہوتے ہیں قُوَّتَهٗ وَھُوَ مَابَیْنَ ثَمَانِیْ عَشْرَۃَ اِلٰی ثَلَاثِیْنَ سَنَۃً۔یعنی فلاں اپنی جوانی کو پہنچا اور یہ زمانہ ۱۸ سے ۳۰ سال کی عمر کا ہوتا ہے۔(اقرب)

تفسیر۔فرماتا ہے جب موسیٰ ؑ اپنی جوانی کو پہنچا۔اور وہ اپنے اعلیٰ اخلاق پر مضبوطی سے قائم ہو گیا تو ہم نے اسے حکم اور علم بخشا اور ہم محسنوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

جہاں تک لغت کا تعلق ہے بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّهٗ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ ۱۸ سال سے ۳۰ سال کی عمر تک پہنچ گیا۔(اقرب) لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی خاص عمر نبوت پر فائز ہونے کے لئے مقرر ہے۔

انبیاء کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف زمانوں میں مبعوث ہوتے رہے ہیں۔مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے (بخاری کتاب مناقب الانصار باب مبعث النبیؐ)۔اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسیحیوں اور مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ وہ تیس سال کے تھے (البدایۃ و النھایۃ بیان نزول کتب الاربعۃ)۔جب خدا نے ان کو نبی بنایا۔اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی جب ان کو نبوت ملی (الخازن قولہ تعالیٰ و اتینہ الحکم صبیا)۔پس تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر زمانہ کے حالات کے ماتحت ہر مامور کا زمانہ بعثت الگ الگ ہوتا ہے۔پس بَلَغَ اَشُدَّهٗ کے زمانہ کی تعیین نہ تو لغوی طور پر ہم کر سکتے ہیں اور نہ ہی تاریخی طور پر۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا

اور (ایک دن) وہ شہر میں ایسے وقت میں آیا کہ لوگ غفلت کی حالت میں تھے (یعنی آرام سے اپنے گھروں

فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ

میں سو رہے تھے دوپہر کو یا آدھی رات کو) اس نے اس شہر میں دو آدمیوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے تھے ایک اس

وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ

کے دوستوں کے گروہ میں سے تھا اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا۔ پس اس نے جو اس کی جماعت میں سے تھا

عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ

اس شخص کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا اس کی مدد طلب کی۔ اس پر موسیٰؑ نے اس (یعنی دشمن) کو ایک

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ

گھونسا مارا۔ اور اس (گھونسے) نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر موسیٰ نے کہا یہ سب واقعہ شیطانی کرتوت سے ہوا

مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ

ہے۔ وہ (یعنی شیطان) (مومن کا) دشمن اور اسے امن کے راستہ سے کھلا کھلا بہکانے والا ہے۔ پھر (موسیٰؑ نے

فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷﴾

دعا کی کہ) اے میرے رب میں نے اپنی جان کو تکلیف میں ڈال دیا ہے پس تو میرے اس فعل پر پردہ ڈال دے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا

سو اس نے اس فعل پر پردہ ڈال دیا۔ وہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ تب اس (یعنی موسیٰؑ) نے

لِّلْمُجْرِمِيْنَ ⑱

عرض کی اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے میں بھی کبھی مجرموں میں سے کسی مجرم کی مدد نہیں کروں گا۔

حلّ لُغَات۔ **وَكَزَ** وَكَزَهٗ کے معنے ہیں دَفَعَهٗ۔ اس کو ہٹایا۔ وَكَزَ فُلَانًا کے معنے ہیں۔ ضَرَبَهٗ بِجُمْعِ الْكَفِّ۔ مٹھی بھینچ کر اس کو مارا۔ وَقَالَ الْكِسَائِیُّ: ''وَكَزَهٗ لَكَمَهٗ''۔ کسائی کہتے ہیں کہ وَكَزَ کے معنے ہیں مکا مارا۔

ظَهِيْر اَلظَّهِيْرُ کے معنے ہیں اَلْمُعِيْنُ مددگار۔ (اقرب)

تفسیر۔ یہ آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ ترتیب زمانی کا ذکر نہیں کیونکہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت مدین سے واپسی کے وقت ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ جو اس آیت میں بتایا گیا ہے مدین جانے سے پہلے کا ہے۔ پس اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا بیان کرنا مقصود ہے جو آپ کی بعثت کا موجب تھا۔ نہ کہ ترتیب زمانی کا بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ واقعہ اس طرح پر ہوا کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رات کے وقت (عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ) شہر میں داخل ہوئے اور انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک ان کی قوم کا تھا اور ایک ان کے دشمنوں میں سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ شخص جوان کا ہم قوم تھا عبرانی زبان بولتا تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتہ لگ گیا کہ یہ شخص میری قوم میں سے ہے اور آپ نے اس کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔

یہاں اَعْدَآئِهٖ کی جگہ عَدُوِّهٖ کا لفظ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عَدُوِّهٖ سے قوم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور قوم کی صفت مفرد بھی آسکتی ہے۔ پس هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ سے یہ مراد ہے کہ دوسرا شخص ان کی دشمن قوم میں سے تھا۔ تب ان کو دیکھ کر وہ شخص جوان کی قوم میں سے تھا اس نے اس شخص کے خلاف جوان کی دشمن قوم میں سے تھا۔ مدد کی درخواست کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ اگر میں نے مدد نہ کی تو فرعونی قوم کا آدمی اسرائیلی کو مارنے پر تُلا ہوا ہے آگے بڑھ کر اس شخص کو ایک گھونسہ مارا۔ یا تو موقعہ کی نزاکت کی وجہ سے انہوں نے گھونسہ بہت زور سے مارا یا اس شخص کا دل یا جگر طبعی طور پر کمزور تھا اور وہ گھونسہ اس کے دل یا جگر کے مقام پر لگا۔ اور وہ مر گیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے کہا کہ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ یہ بات غصہ میں ہوگئی ہے۔ شیطان کے معنے غضب کے بھی ہوتے ہیں کیونکہ شیطانؑ کا مادہ شَطَنَ بھی ہے اور شَاطَ بھی۔ اگر شَاطَ اس کا مادہ مانا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ شخص جو غصہ سے آگ بگولہ ہو جائے۔ چنانچہ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں اِحْتَرَقَ کوئی چیز

جل گئی اور اِسْتَشَاطَ عَلَيْهِ: اِلْتَهَبَ غَضَبًا کے معنے ہوتے ہیں غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔پس اس جگہ شَیْطَان کا لفظ غضب کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ۔ یہ غصہ انسان کا بڑا دشمن ہے اور اس پر نسیان غالب کر دیتا ہے۔ چنانچہ ضَلَّ النَّاسِیْ کے معنے ہوتے ہیں غَابَ عَنْهُ حِفْظُ الشَّیْءِ کوئی بات یاد نہ رہی یا ذہن سے نکل گئی (اقرب) تب انہوں نے سوچا کہ اب فرعون اور اس کی قوم تو میرے دشمن ہو جائیں گے۔اور دعا کی کہ اے میرے رب! اپنی قوم کے ایک آدمی کو مصیبت میں دیکھ کر میں نے اپنے نفس کو تکلیف میں ڈال دیا ہے پس میری خاطر اس مصیبت پر پردہ ڈال دے۔غَفَرَ کے اصل معنے پردہ ڈالنے کے ہوتے ہیں۔خواہ مصیبت پر پردہ ڈالنے کے ہوں۔خواہ گناہ پر پردہ ڈالنے کے۔ چنانچہ غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کے معنے ہوتے ہیں سَتَرَهٗ اس کو ڈھانپ دیا (اقرب) اس جگہ فَاغْفِرْلِیْ کے معنے مصیبت پر پردہ ڈالنے کے ہی ہیں ۔چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس مصیبت پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ گورنمنٹ کا کوئی آدمی اس موقعہ پر نہ آیا۔اور پھر بعد میں بھی خدا تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور فرعونی حکومت آپ کو قتل کرنے کے ارادہ میں ناکام رہی اور خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی مصیبت کو دور کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے خدا! چونکہ تُو نے مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہے آئندہ میں کبھی مجرم کا مددگار نہیں ہوں گا۔واقعہ سے تو ظاہر ہے کہ جس شخص کی انہوں نے مدد کی تھی وہ مجرم نہیں تھا۔لیکن اس آیت میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لئے مجرم کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روحانی طور پر یہ اندازہ لگایا نہ کہ واقعاتی طور پر۔انہوں نے سمجھا کہ میں نے تو نیک دلی سے اس شخص کی مدد کی تھی۔مگر نتیجہ یہ نکلا کہ فرعونی قوم کا ایک آدمی مارا گیا ۔اور میں مصیبت میں پڑ گیا۔پس یہ نتیجہ بتاتا ہے کہ شائد خدا تعالیٰ کی نظر میں اس شخص کا کوئی جرم تھا۔

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی

اس کے بعد وہ شہر میں صبح کے وقت دشمنوں سے خوف کرتا ہوا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا نکلا۔تو کیا دیکھتا ہے کہ

اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ

جس نے اس سے کل مدد طلب کی تھی وہ پھر اسے مدد کے لئے بلا رہا ہے۔اس پر موسیٰ نے اس سے کہا۔

لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۹﴾ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ

تو یقیناً ایک کھلا کھلا گمراہ ہے۔ پس جب اس نے ارادہ کیا کہ اس شخص کو پکڑے جو ان دونوں

عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ

کا دشمن تھا تو اس (شخص) نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تو چاہتا ہے۔ کہ تُو مجھے قتل کر دے جس طرح تو نے

نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي

کل ایک اَور شخص کو قتل کیا تھا۔ تُو صرف یہ چاہتا ہے کہ کمزوروں کو ملک میں دبا دے۔ اور اصلاح کرنے والوں

الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

میں شامل ہونا تیری غرض نہیں۔

حل لغات۔ يَتَرَقَّبُ يَتَرَقَّبُ تَرَقَّبَ سے مضارع معروف واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَرَقَّبَهٗ کے معنے ہیں اِنْتَظَرَهٗ۔ اس کا انتظار کیا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے۔ تَرَقَّبَ: اِحْتَرَزَ رَاقِبًا یعنی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی حفاظت کی۔ پس يَتَرَقَّبُ کے معنے ہوں گے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی حفاظت کرتا ہے۔

يَسْتَصْرِخُهٗ يَسْتَصْرِخُهٗ اِسْتَصْرَخَ سے فعل مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَصْرَخَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَغَاثَهٗ اسے مدد کے لئے بلایا (اقرب) پس يَسْتَصْرِخُهٗ کے معنے ہیں وہ دوسرے کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صبح کے وقت پھر شہر کی گشت کے لئے نکلے۔ اور اس بات کو تاڑ رہے تھے کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کرتا۔ اس وقت انہوں نے اچانک دیکھا۔ کہ وہ شخص جو کل ان سے مدد مانگ رہا تھا پھر ان کو مدد کے لئے بلا رہا ہے۔ چونکہ وہ روحانی طور پر سمجھ چکے تھے کہ غالباً پہلے دن بھی اس کا کوئی قصور تھا۔ دوسرے انہوں نے یہ سمجھا کہ ایک ہی شخص کو ساری دنیا مارنے پر کیوں تیار ہو گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی جوشیلا ہے اور لوگوں کو بھڑکا دیتا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ۔ اے شخص تو بڑا فسادی معلوم ہوتا ہے۔ غَوِيٌّ غَوِيَ

سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔جس کے ایک معنے فساد کے بھی ہوتے ہیں (لسان العرب) پھر جب انہوں نے یہ سمجھ کر کہ بظاہر حالات میں تو دوسرا شخص ہی ظالم ہے۔اس دوسرے شخص کو پکڑنے کے لئے قدم اٹھایا تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مونہہ سے اپنی قوم کے آدمی کو کہا تھا کہ تو بڑا فسادی معلوم ہوتا ہے اس نے سمجھا کہ شاید مجھے مارنے کے لئے موسیٰؑ آگے بڑھ رہا ہے۔اور بے سوچے سمجھے چلّا اٹھا کہ اے موسیٰؑ! کیا تو چاہتا ہے کہ آج مجھے مار دے جس طرح کل تو نے ایک اَور شخص کو مارا تھا۔تُو کمزور لوگوں کو دبا کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔اور اصلاح تیری نیت نہیں۔

جَبَّار اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کے معنے لوگوں کی حاجات پوری کرنے والے کے ہوتے ہیں۔لیکن جب کسی غیر اللہ کے متعلق جبّار کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے سرکش اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے ہوتے ہیں (اقرب) اس کے شور مچانے پر ارد گرد کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ موسیٰؑ ہی پہلے دن یعنی رات کے پہلے حصہ میں ایک شخص کو مار چکے ہیں۔اور چونکہ وہ مقتول فرعونی قوم کا تھا۔جس طرح آج کا حملہ آور بھی فرعونی قوم کا تھا۔اس لئے یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور فرعونیوں میں جوش پیدا ہو گیا۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰۤى

اور اس وقت ایک شخص شہر کے دور کے حصہ سے دوڑتا ہوا آیا۔اور کہا اے موسیٰ (ملک کے) رؤساء مشورہ

اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ

کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔پس (میری بات سن اور) اس شہر سے نکل جا۔میں تیرے خیر خواہوں میں سے

النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ

ہوں تب وہ اس شہر سے ڈرتے ہوئے نکل گیا۔اور وہ ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا۔اس وقت اس نے

رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ ع

۲ ع ۸ ۵

دعا کی اور کہا اے میرے رب! مجھے ظالم قوم سے نجات دے۔

تفسیر۔تب ایک شخص شہر کے دوسرے علاقہ سے دوڑتا ہوا آیا۔جہاں یہ خبر پہلے پہنچ گئی تھی اور اس نے

موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ ! سرداران قوم تیرے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ پس میں ایک خیر خواہ کے طور پر تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ شہر سے بھاگ جا۔ اس پر موسیٰؑ اسی وقت شہر سے بھاگ گئے۔ اور چاروں طرف دیکھتے بھی جاتے تھے کہ میرا کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ اور دعا کرتے جاتے تھے کہ الٰہی فرعون کی قوم ظالم ہے۔ میں دو دفعہ دیکھ چکا ہوں کہ فرعونیوں کا آدمی ایک اسرائیلی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ پس تُو مجھے ان کے مظالم سے نجات دے اور وہاں سے انہوں نے مدین کا رخ کیا۔

مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام تھا جو قتورہ کے بطن سے تھے۔ ان کا ذکر بائیبل کی کتاب پیدائش باب ۲۵ میں آتا ہے۔ جہاں لکھا ہے کہ:۔

''ابراہام نے پھر ایک اَور بیوی کی ۔جس کا نام قطورہ تھا۔ اور اس سے زمرانؔ اور لُقیان اور مدانؔ اور مدیانؔ اور اسباقؔ اور سُوخ پیدا ہوئے۔'' (آیت ا و ۲)

چونکہ قدیم زمانہ میں اولاد بھی اپنے باپ کے نام سے پکاری جاتی تھی اس لئے مدین سے جو نسل پیدا ہوئی وہ بھی مدین ہی کہلائی اور پھر اس قوم نے جو مرکزی شہر بنایا اس کا نام بھی مدین ہی رکھا۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے پاس تھا۔ یعنی بحیرہ احمر جہاں ختم ہونے لگتا ہے وہاں اس کی ایک شاخ مصر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے اور دوسری شاخ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔ جو شاخ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے اس کو خلیج عقبہ کہتے ہیں۔ مدین شہر خلیج عقبہ کے پاس عرب کی طرف سمندر کے بالکل قریب واقعہ تھا۔ عرب سے جو قافلے مصر کو جاتے تھے وہ بھی مدین کے راستے سے ہی ہو کر جاتے تھے۔ اصل مدین شہر تو اب موجود نہیں لیکن اس نام کی کئی بستیاں چھوٹے چھوٹے قصبات کی شکل میں اب بھی وہاں ملتی ہیں (اطلس القرآن صفحہ ۹۲، ۹۳ و تاریخ ارض القرآن اردو جلد دوم صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱)۔

وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ

اور جب وہ مدین شہر کی طرف چلا۔ تو اس نے کہا۔ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھا راستہ دکھا دے گا۔

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۳﴾ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ

اور جب وہ مدین شہر کے چشمہ کے پاس آیا۔ تو اس نے اس پر لوگوں کا ایک گروہ کھڑا دیکھا جو اپنے جانوروں کو پانی

اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۟ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ

پلا رہے تھے۔ اور ان سے پیچھے ہٹ کر کھڑی دو عورتیں دیکھیں جو اپنے جانوروں کو (ہجوم سے پرے)

تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ

ہٹا رہی تھیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا تم دونوں کو کیا اہم کام درپیش ہے۔ اس پر دونوں عورتوں نے کہا۔

الرِّعَآءُ ٚ سکتة وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝۲۴ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى

ہم پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ دوسرے چرواہے چلے نہ جائیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے (اس لئے ہمارے

اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ

ساتھ نہیں آسکا) پس اس نے ان دونوں کی خاطر (جانوروں کو) پانی پلایا۔ پھر ایک سایہ کی طرف ہٹ گیا۔ پھر کہا

فَقِيْرٌ ۝۲۵ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۟

۔ اے میرے رب! اپنی بھلائی میں سے جو کچھ تُو مجھ پر نازل کرے۔ میں اس کا محتاج ہوں۔ اس کے بعد ان

قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ؕ

دونوں لڑکیوں میں سے ایک چلتی ہوئی آئی اور وہ شرما رہی تھی۔ اور اس نے کہا۔ میرا باپ تجھے بلاتا ہے تا کہ تجھے

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ قف وقفة

ہماری جگہ پر (جانوروں کو) پانی پلانے کا اجر عطا کرے۔ پس جب وہ اس (یعنی لڑکیوں کے باپ) کے پاس آیا

نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۶

اور اس کے آگے (اپنا) سارا واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا۔ ڈر نہیں۔ تو اب ظالم قوم کے پنجہ سے نجات پا گیا ہے۔

حل لغات۔ تَذُوْدٰنِ تَذُوْدٰنِ ذَادَ يَذُوْدُ (ذَوْدًا و ذِيَادًا) سے مضارع تثنیہ مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور ذَادَ کے معنے ہیں طَرَدَهٗ وَدَفَعَهٗ۔ اسے دھتکارا اور ہٹایا (اقرب) پس تَذُوْدٰنِ کے معنے ہوں گے۔ وہ دونوں

ہٹا رہی تھیں۔

خَطْبُكُمَا اَلْخَطْبُ کے معنے ہیں اَلْاَمْرُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ يَكْثُرُ فِيْهِ التَّخَاطُبُ (مفردات راغب) ایسا اہم معاملہ جس میں کثرت سے باہم گفت وشنید کی جائے۔

يُصْدِرُ يُصْدِرُ اَصْدَرَ سے فعل مضارع ہے۔اور اَصْدَرَ فُلَانًا کے معنی ہیں ذَهَبَ بِهٖ۔اسے لے گیا (اقرب) پس يُصْدِرُ کے معنے ہوں گے۔وہ لے جاتا ہے یا لے جائے گا۔

اَلرِّعَاءُ اَلرِّعَاءُ اَلرَّاعِيْ کی جمع ہے۔رَاعِيْ چرواہے کو کہتے ہیں۔نیز اس کے معنے ہیں كُلُّ مَنْ وَلِيَ اَمْرَ قَوْمٍ۔ہر وہ شخص جو قوم کے کسی معاملہ کا ذمہ وار ہو۔(اقرب) پس اَلرِّعَاءُ کے معنے ہوں گے۔چرواہے۔

تفسیر۔حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین کی طرف چلے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف:۹۵) یعنی اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہنا شروع کر دو کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے اور اسے ہر وقت یوسف کا ہی خیال رہتا ہے۔تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اب یوسف کی ہوا آ رہی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ملاقات کے دن اب دروازہ پر کھڑے ہیں۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس وقت مدین کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آئی اور آپ نے فرمایا۔عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔مجھے امید ہے کہ اب میرا رب مجھے اس منزل پر پہنچا دے گا۔جو میرے لئے خیر اور برکت کا موجب ہوگی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی اور جب وہ مدین کے چشمہ پر پہنچے تو اس کے اردگرد انہوں نے ایک جماعت دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہی تھی۔اور اس جماعت سے پرے کھڑی ہوئی انہوں نے دو عورتیں دیکھیں جو اپنے جانوروں کو پانی سے ہٹا رہی تھیں تا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں گھس کر کہیں گم نہ ہو جائیں اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان عورتوں کی طرف بڑھے اور ان سے کہا کہ مَا خَطْبُكُمَا تم دونوں کو کیا اہم کام درپیش ہے جس کا تمہیں فکر لاحق ہے۔خَطْبٌ کے معنے خاص حالت کے بھی ہوتے ہیں اور خَطْبٌ ہر اہم امر کو بھی کہتے ہیں۔خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔(اقرب)

ان دونوں نے کہا کہ ہماری عادت ہے کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر اپنے جانوروں کو واپس نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلایا کرتیں۔کیونکہ ان اوباشوں کے گروہ میں ملنا ہمیں پسند نہیں۔پھر انہوں نے خیال کیا کہ ہماری اس بات سے یہ نو وارد ہمارے باپ یا ہمارے رشتہ داروں کی نسبت بدظنی کرے گا کہ وہ آپ کیوں نہیں آتے اور لڑکیوں کو کیوں بھیجتے ہیں۔اس لئے انہوں نے جھٹ یہ فقرہ اپنی پہلی بات پر زائد کر دیا۔کہ ہمارا صرف باپ ہے اور وہ

بوڑھا ہے۔ وہ یہ کام نہیں کرسکتا۔ اس پر موسیٰؑ کو ان لڑکیوں پر رحم آیا۔ اور انہوں نے لڑکیوں کے جانور لے کر اس چشمہ سے ان کو پانی پلوا دیا۔ پھر بغیر کسی مزدوری یا کسی شکریہ کی امید ظاہر کرنے کے ایک درخت کی طرف چلے گئے اور اس کے سایہ میں بیٹھ گئے اور خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔ یعنی اے میرے رب! میں تو اس ملک میں مسافر اور اکیلا ہوں۔ اور میرے پاس کچھ نہیں تُو جو کچھ بھی بھلائی کا سامان میرے لئے کرے میں اس کا محتاج ہوں۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ان دونوں بہنوں میں سے ایک شرماتی ہوئی ان کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے تا کہ تیرے پانی پلانے کی اُجرت تجھے دے۔

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔ جب موسیٰ علیہ السلام اس کے باپ کے پاس آئے۔ تو باتوں باتوں میں انہوں نے اپنا سارا واقعہ سنا ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کا واقعہ سن کر ان لڑکیوں کے باپ نے کہا۔ کہ اب تُو کسی بات سے مت ڈر تو ظالم قوم سے نجات پا چکا ہے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَیْرَ مَنِ

اس پر ان دونوں (لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا۔ اے میرے باپ! اس کو تو ملازم رکھ لے کیونکہ

اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۷﴾ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ

جن کو تو ملازم رکھے ان میں سے بہتر شخص وہی ہوگا جو مضبوط بھی ہو اور امانت دار بھی۔ تب وہ شخص بولا

اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ

(اے موسیٰ) میں چاہتا ہوں کہ اس شرط پر اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا تجھ سے نکاح کردوں۔

حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ

کہ تو آٹھ سال تک میری خدمت کرے۔ پس اگر تو آٹھ کے عدد کی جگہ پر دس کے عدد سے

اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۸﴾

اپنے وعدہ کو مکمل کردے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ اور میں تجھ پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر اللہ نے چاہا تو تُو مجھے

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا

نیک معاملہ کرنے والوں میں سے پائے گا۔(اس پر موسیٰؑ نے) کہا۔ یہ بات میرے اور تیرے درمیان پختہ ہوگئی۔

عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٢٩﴾

ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں مجھ پر کوئی الزام نہیں ہوگا اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اللہ اس پر گواہ ہے۔

حل لغات۔حِجَجٌ حِجَجٌ حِجَّةٌ کی جمع ہے اور اَلْحِجَّةُ کے معنے ہیں اَلسَّنَةُ ۔سال (اقرب) پس حِجَجٌ کے معنے ہوں گے کئی سال۔

تفسیر ۔ان دونوں بہنوں میں سے ایک نے یہ خیال کر کے کہ ہمیں ہر روز چشمہ پر جانے کی وجہ سے یہاں کے اوباش آدمیوں سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔وہ قسم قسم کی بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں اور مذاق اور چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ اگر ہمارا باپ اس آدمی کو نوکر رکھ لے تو ہم اس مصیبت سے نجات پا جائیں گی۔اپنے باپ سے کہا کہ اے باپ! اس کو نوکر رکھ لیں ۔ کیونکہ سب سے زیادہ نوکر رکھنے کے قابل وہی شخص ہوتا ہے جو کہ مضبوط بھی ہو اور امانت دار بھی ۔معلوم ہوتا ہے جس دلیری سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اوباش چرواہوں کو دھکے دے کر چشمہ کے پاس جانوروں کو لے گئے تھے اس سے ان لڑکیوں نے نتیجہ نکالا کہ موسیٰ مضبوط آدمی ہے اور جس طرح اس کے بعد آنکھیں جھکائے درخت کے نیچے جا بیٹھے تھے اور ان لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص امانت دار ہے۔ باپ لڑکیوں سے واقعہ سن کر پہلے ہی یہ نتیجہ نکال چکا تھا۔اور چونکہ وہ بھی سکّوں کے لحاظ سے مالدار نہیں تھا گو کچھ جانور اس کے پاس تھے۔اس لئے اس نے فوراً تجویز پیش کر دی کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا تجھ سے نکاح کر دوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال میری خدمت کرے پھر اگر آٹھ کو بڑھا کر دس کا عدد پورا کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔اور میں تجھ پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔یعنی میں آٹھ پر ہی قائم رہوں گا اور اس پر زور نہیں دوں گا کہ تُو دس سال ضرور پورے کرے۔تو انشاءاللہ معاملہ پڑنے پر دیکھے گا کہ میں ہمیشہ نیک سلوک کیا کرتا ہوں۔کبھی سختی نہیں کیا کرتا۔اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چلیئے میرے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔میں ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کروں وہ جائز ہوگی اور مجھ سے یہ امید نہ رکھی جائے گی کہ میں ضرور دس سال والی مدت پوری کروں۔اور چونکہ ایسے امور کے لئے گواہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ہم دونوں اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اپنے اس عہد کا گواہ قرار دیتے ہیں۔

انہیں آیات سے استدلال کرتے ہوئے اگر کوئی مخلص مہر کے متعلق مجھ سے مشورہ لے تو میں اسے یہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنی چھ ماہ کی آمد سے ایک سال تک کی آمد بطور مہر مقرر کردو۔ اور میرا یہ مشورہ دو وجوہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اول تو اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ''الوصیت'' کے قوانین میں دسویں حصہ کی شرط رکھوائی ہے گویا اسے بڑی قربانی قرار دیا ہے۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ باقی اخراجات کو پورا کرتے ہوئے مخصوص کر دینا معمولی قربانی نہیں بلکہ ایسی بڑی قربانی ہے کہ جس کے بدلہ میں ایسے شخص کو جنت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس حساب سے ایک سال کی آمد جو گویا متواتر دس سال تک کی آمد کا دسواں حصہ ہوتا ہے بیوی کے مہر میں مقرر کر دینا مہر کی اغراض کو پورا کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ بلکہ میرے نزدیک انتہائی حد ہے۔ لیکن ''الوصیت'' کے ارشاد کے علاوہ قرآن مجید کی ان آیات سے بھی اس کی تائید ملتی ہے۔ ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آٹھ سال بطور مہر کام کرنے کا ذکر آتا ہے اور انہیں بڑھا کر دس سال بھی کام کرنے کی اجازت ہے۔ گویا اس واقعہ میں بھی آٹھویں حصہ بلکہ دسویں حصہ کی آمد کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی قربانی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس سے یہ مراد تو نہیں کہ اس آٹھ یا دس سال کے عرصہ تک حضرت موسیٰ علیہ السلام خود کچھ کھاتے پیتے اور پہنتے نہیں تھے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر ان کے اور ان کی بیوی کے اخراجات ادا کرتے ہوں گے۔ ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس تنخواہ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام حقدار تھے اس کا دسواں حصہ بطور امانت ان کے خسر کے پاس رہتا تھا اور اسے انہوں نے لڑکی کا مہر قرار دیا تھا۔

بائیبل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا نام کہیں تو یترو بتایا ہے (خروج باب ۳ آیت ۱) جیسا کہ خروج باب ۳ سے ظاہر ہے اور کہیں رعوایل بتایا ہے جیسا کہ خروج باب ۲ آیت ۱۸ سے ظاہر ہے۔ لیکن قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا کہیں نام نہیں بتایا۔ البتہ مسلمان مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ خسر حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو مدین قوم کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے (ابن کثیر)۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں اس لئے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت قومِ شعیبؑ کی تباہی کے بعد ہوئی تھی جیسا کہ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ قومِ شعیبؑ کی ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا (الاعراف: ۱۰۴) یعنی اس قوم کی ہلاکت کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف کھلی کھلی آیات کے ساتھ مبعوث کیا مگر انہوں

نے ظلم سے کام لیا۔ پس جبکہ قرآن کریم بوضاحت بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت شعیبؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ہوئی تھی تو حضرت شعیب علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر قرار دینا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ۔ (ھود:۹۰) یعنی اے میری قوم دیکھنا کہیں میری دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اپنے لئے ویسی ہی مصیبت سہیڑ لو جیسی نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آئی تھی۔ اور لوطؑ کی قوم تو تم سے کچھ ایسی دور بھی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت لوطؑ کے قریب عرصہ بعد میں ہوئے ہیں۔ پس حضرت شعیب کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قرار دینا اور انہیں آپ کا خسر بتانا ان آیات کی رو سے درست نہیں ہوسکتا۔ پس میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام ان کے خسر تھے۔ آپ کے خسر کا یترو نام ہو یا رعوایل یا کچھ اَور بہرحال وہ اَور شخص ہیں اور حضرت شعیب علیہ السلام اَور شخص ہیں۔ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک تباہ ہوچکی تھی۔ اور آپ کے زمانہ میں صرف اس کی نسل کا کچھ بقیہ موجود تھا۔ اس کی اصل شان وشوکت بالکل زائل ہوچکی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ نبوت سے پہلی زندگی کے یہ حالات جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں ان کے متعلق قرآن کریم نے اس سورۃ کے ابتداء میں یہ امر واضح فرمادیا تھا کہ ہم یہ واقعات بائیبل کی نقل کے طور پر بیان نہیں کررہے بلکہ موسیٰؑ کی زندگی کے صحیح واقعات بیان کررہے ہیں اور پھر یہ واقعات صرف ایک قصہ کے طور پر نہیں بلکہ ان واقعات میں مومن قوم کے لئے بڑے بھاری نشانات ہیں یعنی انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس طرح موسیٰؑ کی خدا تعالیٰ نے تائید فرمائی اور ان کے ذریعہ اس نے ایک بے کس اور مظلوم قوم کو بادشاہ بنادیا۔ اسی طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے بیشک انہیں اسرائیلیوں کی طرح مارا پیٹا جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں انہیں اپنی جانوں اور اموال کے علاوہ اپنی آئندہ نسلوں کی بھی قربانی کرنی پڑے گی۔ مگر جس طرح خدا تعالیٰ نے فرعون کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا اور بنی اسرائیل کو اسی قسم کی نعماء کا وارث کردیا تھا جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو میسر تھیں اسی طرح اللہ تعالیٰ اس زمانہ کے طاقتور بادشاہوں کو بھی جو فرعون کی طرح خدائی احکام کے سامنے اپنا سر جھکانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے سزا دے گا اور ان کی حکومتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق اس پیشگوئی کی تصدیق کررہا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت واضح کررہا ہے۔

ان واقعات قرآنی کا بائیبل کے جن امور میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں:۔

اول:۔ بائیبل نے اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً یہ حکم دیا تھا کہ جب موسیٰؑ کی جان کے متعلق تمہیں خطرہ لاحق ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ بلکہ وہ اس تدبیر کو خود امِ موسیٰؑ کی طرف منسوب کرتی ہے۔لیکن قرآن کریم اس امر کو واضح فرماتا ہے کہ امِ موسیٰؑ کو یہ خیال خود بخود نہیں آیا۔ بلکہ ہمارے حکم سے اس نے ایسا کیا۔اگر امِ موسیٰؑ کا یہ ذاتی فعل ہوتا اور خدائی تائید اس کے پیچھے کام کر رہی نہ ہوتی تو موسیٰؑ کی سلامتی اور اس کی شاہی گھرانے میں پرورش کے جو واقعات بعد میں ظاہر ہوئے وہ کبھی نہ ہوتے۔ یہ واقعات خود اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا الٰہی منشاء کے ماتحت ہوا۔

دوم:۔بائیبل یہ بیان کرتی ہے کہ موسیٰؑ کی والدہ نے

''سرکنڈوں کا ایک ٹوکرہ لیا۔اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا اور اسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی''۔ (خروج باب ۲ آیت ۳)

گویا بائیبل کے نزدیک انہیں یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ہاتھ سے انہیں دریا میں ڈال دیں۔زیادہ سے زیادہ انہوں نے یہ کیا کہ دریا کے کنارے ایک جھاؤ میں جا کر انہیں چھپا دیا۔اور پھر بائیبل یہ بھی بیان کرتی ہے کہ فرعون کی بیٹی جب دریا پر غسل کرنے گئی اور اس نے جھاؤ میں ایک ٹوکرا پڑا دیکھا تو اس نے اپنی سہیلی کو بھیجا کہ وہ جا کر ٹوکرا اٹھالائے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

'' فرعون کی بیٹی دریا پر غسل کرنے آئی اور اس کی سہیلیاں دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگیں۔ تب اس نے جھاؤ میں وہ ٹوکرا دیکھ کر اپنی سہیلی کو بھیجا کہ اسے اٹھالائے۔ جب اس نے اسے کھولا تو لڑکے کو دیکھا اور وہ بچہ رو رہا تھا۔اسے اس پر رحم آیا اور کہنے لگی کسی عبرانی کا بچہ ہے۔تب اس کی بہن نے فرعون کی بیٹی سے کہا۔کیا میں جا کر عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تیرے پاس بلالاؤں جو تیرے لئے اس بچہ کو دودھ پلایا کرے۔فرعون کی بیٹی نے کہا۔ جا۔وہ لڑکی جا کر بچے کی ماں کو بلالائی۔فرعون کی بیٹی نے اسے کہا۔تو اس بچے کو لے جا کر میرے لئے دودھ پلا۔میں تجھے اجرت دیا کروں گی وہ عورت اس بچے کو لے جا کر دودھ پلانے لگی۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوا تو وہ اسے فرعون کی بیٹی کے پاس لے گئی۔اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا۔اور اس نے اس کا نام موسیٰ یہ کہہ کر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔'' (خروج باب ۲ آیت ۵ تا ۱۰)

لیکن تعجب ہے کہ بائیبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ موسیٰ ؑ کی والدہ نے اپنے بچے کو جھاؤ میں جا کر چھپا دیا اور یہ بھی کہتی ہے کہ فرعون کی بیٹی نے بھی اسے جھاؤ میں سے ہی اٹھایا۔ مگر دوسری طرف وہ یہ بھی بیان کر رہی ہے کہ فرعون کی بیٹی نے ''اس کا نام موسیٰ یہ کہہ کر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا''۔ جب موسیٰ پانی میں ڈالا ہی نہیں گیا تھا بلکہ ایک جھاؤ میں چھپا کر رکھ دیا گیا تھا اور جب فرعون کی بیٹی نے بھی اسے پانی سے نہیں نکالا بلکہ اسے جھاؤ میں سے اٹھایا تو اس کا نام موسیٰ ؑ کیوں رکھا گیا۔ اور اس نے یہ کیوں کہا کہ میں نے اس کا نام موسیٰ اس لئے رکھا ہے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا ہے۔ بائیبل کے اس حوالہ کا آخری فقرہ صاف بتا رہا ہے کہ موسیٰ ؑ پانی سے نکالا گیا تھا۔ جس کے دوسرے لفظوں میں یہی معنے ہیں کہ موسیٰ کی والدہ نے بھی انہیں دریا میں ہی ڈالا تھا۔ اور یہی حقیقت قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ پس قرآن کریم بائیبل کی اس غلطی کو واضح کرتا ہے کہ موسیٰ ؑ کو ان کی والدہ نے جھاؤ میں جا کر رکھ دیا تھا اور بتاتا ہے کہ انہیں جھاؤ میں جا کر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک تابوت میں بند کر کے دریا میں بہا دیا گیا تھا۔

سوم:۔ بائیبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ انہوں نے عمداً ایک مصری کو مار کر ریت میں چھپا دیا۔ چنانچہ بائیبل کہتی ہے:۔

''جب موسیٰ بڑا ہوا تو باہر اپنے بھائیوں کے پاس گیا۔ اور ان کی مشقتوں پر اس کی نظر پڑی اور اس نے دیکھا کہ ایک مصری اس کے ایک عبرانی بھائی کو مار رہا ہے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ کی۔ اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔ پھر دوسرے دن وہ باہر آ گیا اور دیکھا کہ دو عبرانی آپس میں مار پیٹ کر رہے ہیں۔ تب اس نے اسے جس کا قصور تھا کہا کہ تُو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے؟ اس نے کہا تجھے کس نے ہم پر حاکم یا منصف مقرر کیا؟ کیا جس طرح تو نے اس مصری کو مار ڈالا مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے؟ تب موسیٰ یہ سوچ کر ڈرا کہ بلاشک یہ بھید فاش ہو گیا۔ جب فرعون نے یہ سنا تو چاہا کہ موسیٰ کو قتل کرے پر موسیٰ فرعون کے حضور سے بھاگ کر ملکِ مدیان میں جا بسا۔'' (خروج باب ۲ آیت ۱۱ تا ۱۵)

بائیبل کے اس بیان میں بعض باتیں قرآنی بیان سے مختلف دکھائی دیتی ہیں لیکن ہر شخص جو معمولی عقل و سمجھ بھی اپنے اندر رکھتا ہو دونوں بیانات پر نظر ڈالنے سے فوراً اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان دونوں بیانات میں سے قرآنی بیان عقلی لحاظ سے صحت اور سچائی کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً پہلی بات تو یہی ہے کہ بائیبل کہتی ہے۔ جب موسیٰ ؑ نے ایک مصری شخص کو اپنی قوم کے ایک فرد سے لڑتے دیکھا تو موسیٰ ؑ نے پہلے ادھر ادھر جھانکا کہ کوئی پولیس مین تو نہیں

کھڑا۔ اور جب تسلی ہوگئی تو آگے بڑھ کر اس مصری کو مار دیا۔ اور اسے ریت میں چھپا دیا۔ گویا بائیبل موسیٰ ؑ پر قتل عمد کا الزام لگاتی ہے اور کہتی ہے کہ موسیٰ ؑ کا ارادہ ہی اسے مار ڈالنے کا تھا۔ چنانچہ اس نے احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے ادھر ادھر دیکھا تا کہ گرفت نہ ہو سکے اور پھر اسے قتل کر کے ریت میں چھپا دیا۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ موسیٰ ؑ نے جب دونوں کو لڑتے دیکھا تو موسیٰ ؑ خود بخود آگے نہیں بڑھے بلکہ پہلے ان کی قوم سے تعلق رکھنے والے فرد نے انہیں اپنی مدد کے لئے آواز دی۔ اس پر موسیٰ ؑ بغیر ادھر ادھر دیکھنے کے فوری طور پر اس کی مدد کے لئے پہنچ گئے اور آپ نے مصری کو ایک گھونسہ مارا اور آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اسے قتل کریں مگر سوء اتفاق سے وہ کسی نازک مقام پر جا لگا اور اس کی موت واقع ہوگئی۔

پس قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل عمد کے الزام سے بری ٹھہراتا ہے مگر بائیبل جو موسیٰ ؑ کو خدا کا نبی بھی قرار دیتی ہے وہ بڑی دلیری سے کہتی ہے کہ موسیٰ ؑ نے جان بوجھ کر اس مصری کو قتل کیا۔ پھر دوسرے دن جو واقع ہوا اس میں بھی قرآن یہ کہتا ہے کہ اس روز پھر وہی عبرانی اور ایک مصری آپس میں لڑ رہے تھے مگر بائیبل کہتی ہے کہ اس روز کسی مصری سے لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ دو عبرانی آپس میں لڑ رہے تھے۔ حالانکہ اگر دونوں عبرانی تھے تو موسیٰ ؑ کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ موسیٰ ؑ کا دخل دینا بتاتا ہے کہ پھر یہ جھگڑا ایک قومی سوال بن گیا تھا جس کے لئے انہیں دخل دینا پڑا۔ اسی طرح بائیبل کہتی ہے کہ

’’تب اس نے اسے جس کا قصور تھا کہا کہ تُو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے۔‘‘

حالانکہ موسیٰ ؑ کو کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ دونوں میں سے قصوروار کون ہے۔ جب دونوں ان کی اپنی قوم کے افراد تھے اور دونوں آپس میں الجھ رہے تھے تو موسیٰ ؑ کو یہ کس طرح پتہ لگ گیا کہ قصوروار کون ہے اور انہوں نے کس بنا پر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ بائیبل سے اس واقعہ کے بیان کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل واقعہ وہی تھا جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے کہ اس روز بھی مصری قوم کے ایک فرد سے لڑائی ہو رہی تھی۔ مگر بائیبل جو انسانی دست بُرد کا شکار ہو چکی ہے اس میں یہ لڑائی دو عبرانیوں کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ انجیل نے بھی سچا واقعہ بیان کرنے کی بجائے موسیٰ ؑ کو ہی ملزم قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

’’پھر دوسرے دن وہ باہر گیا۔ اور دیکھا کہ دو عبرانی آپس میں مار پیٹ کر رہے ہیں۔ تب اُس نے اُسے جس کا قصور تھا کہا کہ تو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے؟ اُس نے کہا۔ تجھے کس نے ہم پر حاکم یا منصف مقرر کیا؟ کیا جس طرح تو نے اس مصری کو مار ڈالا مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے؟‘‘ (خروج باب ۲ آیت ۱۳، ۱۴)

اسی طرح اعمال میں لکھا ہے۔

’’پھر دوسرے دن وہ ان میں سے دولڑتے ہوؤں کے پاس آنکلا اور یہ کہہ کر انہیں صلح کرنے کی ترغیب دی کہ اے جوانو! تم تو بھائی بھائی ہو کیوں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہو؟ لیکن جو اپنے پڑوسی پر ظلم کر رہا تھا اُس نے یہ کہہ کر اُسے ہٹا دیا کہ تجھے کس نے ہم پر حاکم اور قاضی مقرر کیا؟ کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح کل اس مصری کو قتل کیا تھا؟ موسیٰ یہ بات سن کر بھاگ گیا اور مدیان کے ملک میں پردیسی رہا کیا۔ اور وہاں اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔‘‘

(آیت ۲۶ تا ۲۹)

مگر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ دوسرے دن بھی ایک مصری اور عبرانی ہی لڑ رہے تھے اور پھر یہ کہ وہی عبرانی لڑ رہا تھا جس سے کل جھگڑا ہوا تھا۔ کوئی نیا عبرانی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے موسیٰؑ سے کہا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ جس طرح تو نے کل اس مصری کو مار دیا تھا اسی طرح آج مجھے مار ڈالے۔ اگر کوئی اور عبرانی ہوتا تو اسے کل کے اس واقعہ کا کس طرح علم ہو سکتا تھا اور اسے کیونکر پتہ لگ سکتا تھا کہ کل جو واقعہ ہوا تھا وہ موسیٰؑ کے ہاتھ سے ہی ہوا تھا۔ یہ الفاظ جو توراۃ اور انجیل دونوں میں نقل کئے گئے ہیں خود اس بات کی اندرونی شہادت ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جس نے کل لڑائی کی تھی کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ بائیبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ موسیٰؑ نے جس آدمی کو مارا تھا۔ اسے اس نے ریت میں چھپا دیا تھا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ معاملہ بالکل مخفی رہا۔ مگر پھر وہی بائیبل یہ بیان کرنا شروع کر دیتی ہے کہ دوسرے دن ایک اور عبرانی نے کہہ دیا کہ کیا تو مجھے بھی اسی طرح مارنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک آدمی کو مار دیا تھا۔ گویا یہ واقعہ تمام لوگوں میں مشہور ہو چکا تھا۔ حالانکہ جس شخص کو نظروں سے بچا کر ریت میں چھپا دیا گیا ہو اس کی موت کا دوسروں کو علم ہی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کا علم تو صرف ایک شخص کو تھا پس یہ فقرہ لازماً اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا تھا جس نے پہلے دن کے واقعہ کو دیکھا تھا ورنہ کوئی دوسرا شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ بائیبل کے نزدیک مقتول کو ریت میں چھپا دیا گیا تھا اور اس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔

چہارم:۔ بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بھاگ کر مدین پہنچے تو

’’وہاں وہ ایک کنوئیں کے نزدیک بیٹھا تھا۔ اور مدیان کے کاہن کی سات بیٹیاں تھیں وہ آئیں اور پانی بھر بھر کر گھڑوں میں ڈالنے لگیں تا کہ اپنے باپ کی بھیڑ بکریوں کو پلائیں۔ اور گڈریے آ کر

ان کو بھگانے لگے لیکن موسیٰ کھڑا ہو گیا اور اس نے ان کی مدد کی اور ان کی بھیڑ بکریوں کو پانی پلایا۔‘‘

(خروج باب ۲ آیت ۱۵ تا ۱۷)

ا۔ گویا بائیبل کہتی ہے کہ مدین کے کاہن کی سات بیٹیاں پانی لینے کے لئے آئیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ اس کی صرف دو لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے آئی تھیں۔ یہ فرق اس لئے ہے کہ قرآن کریم میں صرف بڑی لڑکیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آگے چل کر ان کے بیاہ کا معاملہ پیش آنے والا تھا۔ لیکن بائیبل نے اس کے خلاف چھوٹی بڑی سب لڑکیوں کا ذکر کر دیا۔

ب۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ وہ لڑکیاں آگے نہیں بڑھیں بلکہ شرم و حیا کی وجہ سے اپنے جانوروں کو روک کر الگ کھڑی رہیں تا کہ دوسرے لوگ فارغ ہو لیں تو پھر وہ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ وہ پہلے سے پانی بھر رہی تھیں مگر گڈریوں نے آ کر انہیں روک دیا۔ حالانکہ جب وہ کنوئیں پر ان سے پہلے پہنچ چکی تھیں اور پانی بھی بھر رہی تھیں تو بعد میں آ کر گڈریوں کا انہیں روکنا خلاف عقل بات ہے۔

ج۔ بائیبل کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ جب گڈریوں نے ان لڑکیوں کو بھگایا تو موسیٰؑ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے لڑکیوں کی مدد کی۔ گویا دوسرے الفاظ میں انہوں نے گڈریوں سے لڑائی کی اور سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ اس وقت موسیٰؑ نے کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ لڑکیوں کی صرف اس رنگ میں مدد کی کہ ان کے جانوروں کو آگے بڑھ کر پانی پلا دیا۔ اور عقل بھی قرآن کریم کے بیان کی ہی تصدیق کرتی ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اس وقت ایک اجنبی علاقہ میں تھے بالکل بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ کوئی دوست اور مددگار ان کا نہیں تھا ایسی حالت میں وہ ان سے لڑائی کس طرح مول لے سکتے تھے۔ انہوں نے صرف ہمدردی اور خدمت خلق کے نقطۂ نگاہ سے ان لڑکیوں کی مدد کی اور ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔

پھر بائیبل نے یہ نہیں بتایا کہ جب لڑکیوں نے اپنے باپ سے یہ واقعہ بیان کیا اور ان کے باپ نے کہا کہ

’’تم اسے کیوں چھوڑ آئیں۔ اسے بلا لاؤ کہ روٹی کھائے۔‘‘ (خروج باب ۲ آیت ۲۰)

تو آیا ساتوں لڑکیاں انہیں بلانے کے لئے آئی تھیں یا دو یا چار۔ مگر قرآن کریم بتاتا ہے کہ صرف ایک لڑکی آئی تھی اور وہ بھی شرماتی ہوئی۔ اور اس نے اپنے باپ کا آپ کو پیغام دیا۔

اسی طرح بائیبل نے اس معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا جو موسیٰؑ اور ان کے خسر کے درمیان ہوا تھا۔ صرف اتنا لکھ دیا کہ

''موسیٰ اس شخص کے ساتھ رہنے کو راضی ہو گیا۔'' (خروج باب ۲ آیت ۲۱)

حالانکہ بتانا یہ چاہیے تھا کہ موسیٰؑ کا خسر انہیں رکھنے پر راضی ہو گیا۔ ورنہ موسیٰؑ تو چاہتے ہی تھے کہ انہیں کوئی ٹھکانہ مل جائے جہاں وہ رہائش اختیار کر سکیں۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ موسیٰؑ اور ان کے خسر کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ یا دس سال تک اس کی خدمت کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ چنانچہ بائیبل نے اس معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مگر اتنا اسے بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ

''موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا۔'' (خروج باب ۳ آیت ۱)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس معاہدہ کا ذکر کیا ہے اسی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کام کیا کرتے تھے۔

غرض قرآن کریم کو یہ عظیم الشان فضیلت حاصل ہے کہ اس نے دو ہزار سال کے بعد نازل ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صحیح واقعات دنیا کے سامنے پیش کئے جب کہ تورات نے موسیٰؑ کی کتاب کہلا کر کئی واقعات کو چھوڑ دیا اور کئی واقعات کو غلط بیان کر دیا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے اس سورۃ کے شروع میں ہی یہ بیان فرما دیا تھا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو تمام ضروری باتوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔ یعنی بے شک تورات بھی کتاب ہے مگر انسانی دست بُرد کا شکار ہونے کی وجہ سے اب اس سے استفادہ ناممکن ہے کتاب مبین جو تمام سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے والی اور تمام احکام کو دلائل کے ساتھ پیش کرنے والی ہے وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ اور اسی کی اقتداء نوعِ انسانی کو نجات دلا سکتی ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ

جب موسیٰؑ نے وقت مقررہ کو پورا کر لیا اور اپنے گھر والوں کو لے کے چلا تو اس نے طور کی طرف سے ایک آگ

الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ

دیکھی۔ (اور) اپنے گھر والوں سے کہا تم یہاں ٹھہرو۔ میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے تمہارے

اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ

لئے کوئی (ضروری) خبر لاؤں۔ یا کوئی آگ کا انگارہ لاؤں تا کہ تم سینکو۔ پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس

تَصْطَلُوْنَ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ

پہنچا تو مبارک مقام کے ایک مبارک حصہ کی طرف سے ایک درخت کے پاس سے اسے پکارا گیا کہ اے موسیٰ!

الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى

میں اللہ ہوں سب جہانوں کا رب۔ اور یہ کہ تو اپنا عصا پھینک دے۔ پس جب اس نے اس (یعنی عصا)

اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا

کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ يُعَقِّبْ ؕ

(تب اسے کہا گیا) اے موسیٰ! آگے بڑھ اور ڈر نہیں۔

يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۲﴾ اُسْلُكْ

تو سلامتی پانے والے لوگوں میں سے ہے۔ (اور) اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال۔ وہ بغیر کسی بیماری کے سفید

يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ٝ وَّ اضْمُمْ

نکلے گا۔ اور اپنے بازو کو خوف کی وجہ سے (زور سے) کھینچ کر (اپنے جسم سے) ملا لے۔

اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ

یہ دو دلیلیں (علاوہ دوسری دلیلوں کے) جو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۳﴾

تیرے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہیں۔ کیونکہ وہ اطاعت سے نکلنے والے لوگ ہیں۔ (موسیٰ نے) کہا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ

اے میرے رب! میں نے فرعون کی قوم میں سے ایک شخص کو قتل کیا تھا پس میں ڈرتا ہوں

يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۴﴾ وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا

کہ وہ مجھے قتل نہ کردیں (اور تیرا پیغام نہ پہنچ سکے) اور میرا بھائی ہارون بات کرنے میں

فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ز اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ

مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ پس اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج۔ تا کہ وہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا

يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ

ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔ فرمایا۔ ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرے بازو کو مضبوط کریں گے اور

لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ

تم دونوں کے لئے غلبہ کے سامان پیدا کریں گے پس وہ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم دونوں اور جو تم دونوں کے

اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۶﴾

متبع ہوں گے ہماری آیات کے ذریعہ سے غالب ہوں گے۔

حل لغات۔ اٰنَسَ اٰنَسَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَہٗ۔ اسے دیکھا۔ نیز اٰنَسَ الصَّوْتَ کے معنے ہیں سَمِعَهٗ وَاَحَسَّ بِهٖ۔ آواز کو سنا اور محسوس کیا۔ پس اٰنَسْتُ کے معنے ہوں گے۔ میں نے دیکھا۔ (اقرب)

جَذْوَۃ اَلْجَذْوَۃُ کے معنے ہیں اَلْجَمْرَۃُ الْمُلْتَهِبَۃُ۔ سلگتا ہوا انگارہ۔ (اقرب)

تَصْطَلُوْنَ تَصْطَلُوْنَ اِصْطَلٰی سے فعل مضارع معروف جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اِصْطَلٰی بِالنَّارِ اِصْطِلَاءً کے معنے ہیں اِسْتَدْفَاَ بِهَا آگ سینکی۔ (اقرب)

شَاطِیءِ شَاطِیءُ الْوَادِیْ کے معنے ہیں جَانِبُهٗ وادی کا کنارہ۔ (المفردات)

تَهْتَزُّ تَهْتَزُّ اِهْتَزَّ سے فعل مضارع معروف واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِهْتَزَّتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں تَحَرَّكَتْ فِيْ سَيْرِهَا۔ یعنی اونٹ تیز رفتاری سے چلے۔ اور اِهْتَزَّ الْمَآءُ فِيْ جَرَيَانِهٖ کے معنے ہیں تَطَلَّقَ۔ پانی خوب بہ پڑا۔ (اقرب) پس تَهْتَزُّ کے معنے ہوں گے۔ وہ تیزی سے چلتا ہے۔

جَآنٌّ جَآنٌّ جَنَّ سے اسم فاعل ہے اور جَآنٌّ پوشیدہ رہنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اِسْمُ جَمْعٍ مِنَ الْجِنِّ۔ جنّ کا اسم جمع ہے۔ نیز جَآنٌّ کے معنے ہیں حَیَّةٌ بَیْضَآءُ کَحْلَاءُ الْعَیْنِ لَا تُؤْذِیْ۔ سفید رنگ کا سانپ جس کی آنکھیں سُرمگیں ہوتی ہیں اور کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

رِدْءً اَلرِّدْءُ کے معنے ہیں اَلْعَوْنُ۔ مدد کرنا اَلنَّاصِرُ۔ مددگار۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے جب موسیٰؑ نے پیش کردہ مدّت پوری کر لی اور اپنے اہل کو لے کر چل پڑا۔ تو راستہ میں طُور (طور کی تشریح کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ التین) کی طرف اس نے ایک آگ کا شعلہ دیکھا اور اپنے اہل سے کہا کہ ذرا یہیں ٹھہرو۔ میں نے ایک قسم کی آگ دیکھی ہے۔ مَیں وہاں جا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ مَیں وہاں سے تمہارے لئے کوئی خبر لاؤں۔ یا اُس آگ میں سے کوئی انگارہ لاؤں۔ جس سے تم سینکو۔ جب وہ اس آگ کے پاس آیا تو اُس مبارک زمین کے ایک مبارک حصّہ کی طرف سے ایک درخت کی جہت آواز آئی۔ (یعنی موسیٰ کو الہام ہوا) کہ اے موسیٰ! میں اللہ ربّ العالمین ہوں۔ پھر دوسرا الہام یہ ہوا کہ اے موسیٰ! تُو اپنا عصا پھینک دے موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا لیکن جب اس نے اسے ایک چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے ہلتے ہوئے دیکھا تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔ اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا۔ اے موسیٰ! آ اور ڈر نہیں۔ تو سلامتی پانے والوں میں سے ہے۔ پھر ہم نے کہا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا۔ اور اپنے بازو کو خوف کی وجہ سے اپنے جسم سے چمٹا لے۔ یہ دو دلیلیں تیرے رب کی طرف سے تجھے ملی ہیں تا کہ تو ان کو فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے پیش کرے۔ کیونکہ وہ ایک اطاعت سے نکلی ہوئی قوم ہے۔ موسیٰؑ نے کہا۔ اے میرے رب! فرعون کی قوم کا ایک آدمی میرے ہاتھ سے مارا جا چکا ہے اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے دیکھتے ہی قتل نہ کر دیں اور تیرا پیغام فرعون اور اس کے سرداروں کو نہ پہنچ سکے۔ اور اے میرے رب! میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصاحت رکھنے والا ہے۔ اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر مقرر فرما دیجئے۔ تا کہ وہ میرے دعاوی کی تصدیق کرے اور میری صداقت اور راستبازی پر گواہی دے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ صرف میری زبان سے اس پیغام کو سن کر وہ پرانی عداوت کی وجہ سے فوراً ہی جھٹلانے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تیرے بھائی کو تیرے ساتھ ہی مبعوث کر کے تیری مدد کریں گے اور تمہارے لئے اپنے پاس سے دلائل مہیا کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرعون اور اس کے ساتھی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ تم دونوں اور تمہارے اتباع ہمارے نشانوں کے ذریعہ غالب رہو گے۔

ان آیات میں نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ

الْعٰلَمِيْنَ سے یہ مراد نہیں کہ درخت نے کہا کہ میں اللہ سب جہانوں کی ربوبیت کرنے والا ہوں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت موسیٰ ؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہوا۔ اور انہیں یوں معلوم ہوا جیسے الہام کی آواز درخت کی طرف سے آرہی ہے۔

وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ میں بازو سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا بنی اسرائیل کو اپنے وجود سے دور رکھنا خطرے کا موجب ہوگا۔ پس تو اس خوف سے کہ وہ کہیں بے دین نہ ہو جائیں انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ چمٹائے رکھیو۔ اور ان کی نیک تربیت کی طرف توجہ رکھیو۔

یہ واقعہ بھی ایسا ہے جس میں بائیبل اور قرآن کریم کے بیان کردہ امور میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔

مثلاً اول۔ بائیبل کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی مدین میں ہی تھے کہ ایک دن اپنے خُسر کی بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے وہ حورِبؔ پہاڑ پر جا پہنچے اور وہاں

''خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں سے اس پر ظاہر ہوا۔''

(خروج باب ۳ آیت ۱، ۲)

اور خداوند تعالیٰ نے انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

''موسیٰ لوٹ کر اپنے خسر یترؔو کے پاس گیا اور اسے کہا کہ مجھے ذرا اجازت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں۔ جاؤں اور دیکھوں کہ وہ اب تک جیتے ہیں کہ نہیں۔ یترؔو نے موسیٰ سے کہا سلامت جا۔ اور خداوند نے مدیانؔ میں موسیٰ سے کہا کہ مصر کو لوٹ جا کیونکہ وہ سب جو تیری جان کے خواہاں تھے مر گئے۔ تب موسیٰ اپنی بیوی اور بیٹوں کو لے کر اور ان کو ایک گدھے پر چڑھا کر مصر کو لوٹا۔'' (خروج باب ۴ آیت ۱۸ تا ۲۰)

لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے نہیں گئے تھے۔ بلکہ میعاد مقررہ پوری ہو جانے کے بعد اپنے اہل کو لے کر کسی دوسری جگہ تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوا۔ اور اس نے انہیں رسالت کے مقام پر کھڑا کر کے فرعونِ مصر کی طرف جانے کا حکم دیا۔

دوم۔ بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا۔ تو انہوں نے بار بار انکار کیا اور کہا کہ۔

''میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں۔''

(خروج باب ۳ آیت ۱۱)

بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ

''اے خداوند! میں تیری منّت کرتا ہوں کہ کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج۔''

(خروج باب ۴ آیت ۱۳)

جب انہوں نے بار بار نکار کیا تو بائیبل کہتی ہے کہ:۔

''تب خداوند کا قہر موسیٰ پر بھڑکا۔'' (خروج باب ۴ آیت ۱۴)

گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا وہ قہر جس کے مورد خدا اور اس کے نبیوں کے دشمن ہوا کرتے ہیں اس کا پہلا نشانہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی بن گئے اور ان پر خدا تعالیٰ کا قہر بھڑکنا شروع ہو گیا۔ لیکن قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تمام الزامات سے بری قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ سے کہا کہ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ۔ اے موسیٰ! تجھے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تو سلامتی پانے والوں میں سے ہے۔ پھر اس نے نہ صرف موسیٰؑ اور ہارونؑ کو غلبہ کا وعدہ دیا بلکہ انہیں یہ بھی بشارت دی کہ وہ لوگ جو تم پر ایمان لائیں گے اللہ تعالیٰ انہیں بھی غلبہ عطا فرمائے گا غرض بائیبل نے تو موسیٰؑ کو مورد قہر قرار دیا ہے۔ مگر قرآن کریم انہیں خدائی انعامات اور برکات کا مورد قرار دیتا ہے۔

سوم۔ بائیبل کہتی ہے کہ

''پھر خداوند نے اسے یہ بھی کہا۔ کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔ اور جب اس نے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔'' (خروج باب ۴ آیت ۶)

لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا یعنی تیرا ہاتھ سفید تو ہو گا مگر کوڑھ کی وجہ سے نہیں جیسا کہ بائیبل کہتی ہے بلکہ ایک الٰہی نشان کے طور پر اس میں نور نظر آئے گا۔

چہارم۔ بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ کا قہر بھڑکا تو اس نے کہا:۔

''کیا لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی نہیں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ وہ فصیح ہے۔ اور وہ تیری

ملاقات کو آبھی رہا ہے۔اور تجھے دیکھ کر دل میں خوش ہوگا۔سوتو اسے سب کچھ بتانا اور یہ سب باتیں اسے سکھانا اور میں تیری اور اس کی زبان کا ذمہ لیتا ہوں اور تم کو سکھا تا رہوں گا کہ تم کیا کیا کرو۔اور وہ تیری طرف سے لوگوں سے باتیں کرے گا۔اور وہ تیرا منہ بنے گا۔اور تو اس کے لئے گویا خدا ہوگا۔‘‘

(خروج باب ۴ آیت ۱۴ تا ۱۶)

یہ عبارت بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اظہارِ ناراضگی کے طور پر موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کو بھی مبعوث کر دیا۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود یہ درخواست کی تھی کہ ہارونؑ کو میری تائید کے لئے میرے ساتھ کھڑا کیا جائے۔چنانچہ قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ بیان فرماتا ہے کہ وَ اَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۫ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ۔یعنی اے خدا! ہارون بات کرنے کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔پس تُو اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج دے تا کہ وہ میری تصدیق کرے۔میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو قبول فرماتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بھی ان کی معیت میں نبی بنا دیا۔پس قرآن کریم حضرت ہارونؑ کی بعثت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔اور اسے اپنا انعام اور احسان قرار دیتا ہے۔لیکن بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا قہر بھڑکا تو اس نے ہارونؑ کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم دے دیا۔

پنجم۔بائیبل کہتی ہے کہ حضرت ہارونؑ صرف خاندانِ بنی لاوی کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے حقیقی یا مادری بھائی نہیں تھے۔لیکن قرآن کریم حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سگا بھائی یا کم از کم ماں کی طرف سے بھائی قرار دیتا ہے۔جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

’’قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ‘‘ (طٰہٰ:۹۵)

یعنی حضرت ہارونؑ نے کہا۔اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو نہ پکڑ۔

غرض قرآن کریم نے جو اس سورۃ کے شروع میں ہی فرما دیا تھا کہ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔اس کی صداقت بائیبل اور قرآن کے بیان کردہ واقعات کے اختلاف سے بالکل ظاہر ہو جاتی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا

پس جب موسیٰؑ ہماری کھلی کھلی آیتیں لے کر آیا۔ تو فرعون کے لوگوں نے کہا۔ یہ تو ایک فریب ہے

سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ

جو بنالیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے باپ دادوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔ اور موسیٰؑ

قَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَ

نے کہا میرا رب اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لائے خوب جانتا ہے۔ اور اس کو بھی جس کا

مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۸﴾

انجام اچھا ہو۔ حق یہ ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ جب موسیٰؑ ان کے پاس ہماری کھلی کھلی آیات لے کر آیا تو بجائے اس کے کہ فرعون اور اس کے سرداران نشانات پر غور کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے انہوں نے ان نشانات کو سحر کہنا شروع کر دیا۔ لغت کے لحاظ سے سحر ہر ایسی بات کو کہا جاتا ہے جس کا ماخذ بہت دقیق ہو۔ اسی طرح جھوٹ کو سچ بنا کر دکھلانا بھی سحر کہلاتا ہے۔ اور سحر کا اطلاق ہر فریب اور چالاکی پر بھی کیا جاتا ہے اور سَحَرَہٗ کے معنے ہوتے ہیں خَدَعَهٗ یعنی دوسرے کو اپنی چالاکی سے دھوکا دے دیا۔ پس فرعون کا یہ کہنا کہ یہ تو ایک سحر ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ ایک بڑا دھوکا اور فریب ہے جو تمہیں دیا جا رہا ہے۔ یا یہ ایک بڑا جھوٹ ہے جو سچ کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ یا یہ ایک بڑی چالاکی ہے جس کے ذریعہ تمہیں ورغلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ چالاکیاں موسیٰؑ نے کہاں سے سیکھیں اس لئے اس نے کہا کہ یہ تمام فریب خود موسیٰؑ کا طبع زاد ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے یہ نشانات دیئے ہیں ایک افتراء ہے جس کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگوں کو ان کے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس نے لوگوں کو بھڑکانے کے لئے ایک دوسرا ہتھیار استعمال کیا اور کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ ہمارے باپ دادا کتنے عقلمند اور دانا تھے اور انہوں نے اپنی حکمت اور دانائی کے کیسے کیسے مظاہرے کئے مگر یہ شخص ہمارے ان باپ دادا سے بھی اپنے آپ کو بڑھ کر

سمجھنے لگا ہے اور ہمیں وہ رستہ بتاتا ہے جس کو ہمارے اسلاف نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اگر موسیٰ ؑ کا بتلایا ہوا راستہ ہی سچا راستہ ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے باپ دادا سب بیوقوف اور جاہل تھے اور انہیں وہ روشنی دکھائی نہ دی جو موسیٰ ؑ کو نظر آ گئی۔ اس طرح اس نے موسیٰ ؑ کے خلاف وہی حربہ استعمال کیا جو ہمیشہ سے حق کے مخالف لوگوں کو اشتعال دلانے کے لئے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا کیا ہی لطیف جواب دیا ہے۔ فرمایا۔ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ میرا رب اس شخص کو جو اس کی طرف سے ہدایت لایا ہے خوب جانتا ہے۔ اور اسے بھی خوب جانتا ہے جس کا انجام اچھا ہوگا۔ یقیناً ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی تم نے مجھے مفتری تو قرار دے دیا ہے لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا میں اپنے دعویٰ کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب میں بار بار اپنا دعویٰ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہوں تو مفتری ہونے کی صورت میں کیا خدا تعالیٰ مجھے سزا دینے کے لئے کافی نہیں؟ جب دنیوی گورنمنٹیں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ ان کی طرف سے کوئی جعلی افسر بن کر لوگوں کو دھوکا دے اور وہ ایسے شخص کو فوراً پکڑ کر جیل خانہ میں ڈال دیتی ہیں۔ تو یہ کس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر میں نے افتراء کیا ہے تو خدا کو اس کا علم نہیں اور وہ مجھے سزا نہیں دے گا۔ خدا تعالیٰ اس شخص کو جو اس کی طرف سے ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہے خوب جانتا ہے اور اُسے بھی خوب جانتا ہے جس کے لئے آخر میں فتح اور کامیابی مقدر ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ تم مجھے جھوٹا اور مفتری کہو تم اس معاملہ کو خدا تعالیٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دو۔ اگر میں مفتری ہوا تو خدا تعالیٰ کا ہاتھ میری رگِ جان کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اور میرا انجام وہی ہوگا۔ جو ہمیشہ سے افتراء کرنے والوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن اگر میں اس کے حکم سے تمہاری طرف آیا ہوں اور اس نے مجھے اپنی کامیابی کی بشارات دی ہیں تو تم خود سوچ لو کہ تم نے مجھے مفتری قرار دے کر کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مقام پر اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ۔

> ’’دنیا مجھ کو نہیں پہچانتی لیکن وہ مجھے جانتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ میں وہ درخت ہوں جس کو مالک حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ جو شخص مجھے کاٹنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ قارون اور یہودہ اسکریوطی اور ابوجہل کے نصیب سے کچھ حصہ لینا چاہتا ہے۔‘‘

(اربعین نمبر ۳ روحانی خزائن جلد ۱۸ ص ۵۱)

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ یقیناً ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی میری سچائی کا معیار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کامیاب کرے گا اور تم نے مجھے مفتری قرار دے کر جس ظلم کا ارتکاب کیا ہے اس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل ہوگا۔

اس جگہ ظالم سے مفتری علی اللہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور وہ شخص بھی مراد ہے جو کسی سچے مامور کا انکار کرنے والا ہو۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ (العنکبوت:۶۹) یعنی بڑے ظالم دنیا میں دو ہی شخص ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا تعالیٰ پر افتراء کرے اور دوسرا وہ جو کسی سچے مدعی نبوت کا انکار کرے۔ پس اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اس طرف توجہ دلائی کہ جہاں خدا تعالیٰ پر افتراء ایک قابل پاداش جرم ہے وہاں ایک سچے مدعی کا انکار بھی بڑا بھاری ظلم ہے۔ اس لئے صرف مجھے برا بھلا کہہ کر خوش نہ ہو جاؤ۔ بلکہ سوچو کہ کہیں تم ہی ایک سچے مامور کا انکار کر کے ظالم تو نہیں بن رہے۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰۤاَیُّہَا الۡمَلَاُ مَا عَلِمۡتُ لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ

اور فرعون نے کہا اے درباریو! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔ پس

غَیۡرِیۡ ۚ فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰہَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّیۡ

اے ہامان! میرے لئے گیلی مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں بنوا) پھر میرے لئے ایک قلعہ تیار کر۔ شاید میں اس

صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰہِ مُوۡسٰی ۙ وَاِنِّیۡ لَاَظُنُّہٗ مِنَ

پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو معلوم کر لوں۔ اور میں تو اس کو جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں۔ اور اس نے بھی اور اس کے

الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳۹﴾ وَاسۡتَکۡبَرَ ہُوَ وَجُنُوۡدُہٗ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ

لشکروں نے بھی ملک میں بغیر کسی حق کے تکبر سے کام لیا۔ اور خیال کیا کہ وہ ہماری طرف لوٹا

الْحَقِّ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَ

کر نہیں لائے جائیں گے۔ پس ہم نے اس کو بھی اور اس کے لشکروں کو بھی پکڑ لیا۔ اور ان کو

جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

سمندر میں پھینک دیا۔ پس دیکھ کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا؟

حل لغات ۔ صَرْحًا اَلصَّرْحُ کے معنے ہیں اَلْقَصْرُ ۔ مضبوط مکان ۔ وَكُلُّ بِنَآءٍ عَالٍ ۔ نیز ہر بلند عمارت کو بھی صَرْحٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر ۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی صداقت کے ثبوت میں بار بار خدا تعالیٰ کو پیش کیا۔ اور کہا کہ میرا رب جانتا ہے کہ میں اس کی طرف سے آیا ہوں اور میرا رب مجھے حسنِ انجام اور کامیابی کی بشارات دے رہا ہے اور اس کی تائیدات اور نشانات میری صداقت پر گواہ ہیں تو فرعون نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا۔ اور انہیں کہا کہ مجھے تو اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نظر نہیں آتا۔ پھر نہ معلوم یہ کونسا خدا ہے جس کا نام موسیٰ بار بار لے رہا ہے۔ پھر اسی جوش کی حالت میں اس نے ہامان کو بلوایا اور اسے حکم دیا کہ فوراً بڑے بڑے بھٹوں میں پختہ اینٹیں تیار کرواؤ۔ اور پتھیروں کو بلا کر ایک اونچا محل بناؤ۔ شاید اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں۔ اور آخر میں کہا کہ میں تو اسے بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یعنی کوئی یہ خیال نہ کرے کہ مجھے شبہ ہے کہ شاید جس خدا کا موسیٰؑ ذکر کرتا ہے وہ موجود ہے تبھی تو میں ایک اونچا محل اس کی تلاش کے لئے بنوانا چاہتا ہوں۔ میرے اس حکم کی غرض شبہ نہیں بلکہ میری غرض موسیٰؑ کو جھوٹا ثابت کر کے دکھانا ہے یعنی دنیا دیکھ لے گی کہ باوجود اس کے کہ میں نے اتنا بڑا محل بنوایا پھر بھی موسیٰؑ کا خدا کہیں نظر نہیں آیا۔ دراصل قدیم اقوام میں بڑی شدت سے یہ تصور پایا جاتا تھا کہ بلند میناروں پر آسمانی ارواح اترا کرتی ہیں۔ بلکہ بلند میناروں پر خود خدا تعالیٰ کے اُترنے کا تصور بھی ان میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں بائیبل کا ایک حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ کتاب پیدائش میں لکھا ہے:۔

’’ اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی۔ اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سِنعار (یعنی بیبلونیا) میں ایک میدان ملا۔ اور وہ وہاں بس گئے۔ اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ

سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا۔‘‘

(پیدائش باب ۱۱ آیت ۱ تا ۵)

غرض بلند اور اونچے میناروں پر خدا تعالیٰ کے نازل ہونے کا تصور چونکہ دیر سے چلا آتا تھا اس لئے فرعون نے بھی چاہا کہ موسیٰؑ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ایک اونچا سا محل بنائے اور پھر لوگوں کو بتائے کہ موسیٰؑ کے جھوٹا ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ میں نے اتنا اونچا محل بھی بنوایا اور پھر بھی اس کا خدا نیچے نہ اُترا۔

غرض موسیٰؑ کی تعلیم پر ایمان لانے کی بجائے فرعون نے بھی اور اس کے لشکروں نے بھی تکبر سے کام لیا۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لئے حاضر ہونا نہیں پڑے گا۔ آخر ایک دن اس بغاوت اور سرکشی کی سزا میں ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا۔ اور وہ جو اونچے محل پر چڑھ کر ہمیں دیکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا اسے ہم نے سمندر کی تہ میں اپنا جلوہ دکھا دیا۔ پس دیکھو کہ ظالموں کا کیسا عبرتناک انجام ہوا۔

یہی وہ انجام تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ مگر انہوں نے اپنی طاقت اور حکومت کے گھمنڈ میں اس انذار کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور خیال کر لیا کہ ہمیں کون تباہ کر سکتا ہے۔ کون ہمارا بال بھی بیکا کر سکتا ہے۔ مگر آخر وہی ہوا جس کی موسیٰؑ انہیں خبر دے چکے تھے۔ موسیٰؑ کامیاب ہوئے اور فرعون نے اپنا حسرتناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور ہم نے ان کو (یعنی فرعونیوں کو) سردار بنایا تھا جو (اپنی سرداری کے غرور میں) لوگوں کو دوزخ کی طرف

لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۴۲ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَ

بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اور اس دنیا میں بھی ہم نے ان پر لعنت بھیجی

یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ہُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ ﴿۴۳﴾ ع

اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال لوگوں میں سے ہوں گے۔

حل لغات۔اَلۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ اَلۡمَقۡبُوۡحِیۡنَ قَبَحَ سے اسم مفعول ہے۔اور قَبَحَہُ اللّٰہُ عَنِ الۡخَیۡرِ قَبۡحًا کے معنے ہیں نَحَّاہُ عَنۡہُ۔نیکی سے اسے دور رکھا (اقرب) پس مَقۡبُوۡحٌ کے معنے ہوئے۔نیکی سے دور رکھا ہوا۔بدحال۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔ہم نے تو ان کو اپنی قوم کا لیڈر اور راہنما بنایا تھا۔مگر انہوں نے لوگوں کو ہلاکت اور بربادی کی راہوں پر چلانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی وہ خدا کی مدد سے محروم رہے اور قیامت کے دن بھی ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی اور چونکہ وہ دنیا میں لوگوں کو ایسے راستوں پر چلاتے رہے جو ہلاکت اور بربادی تک پہنچانے والے تھے اس لئے ہم نے اس دنیا میں بھی ان پر لعنت بھیجی اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال لوگوں میں شامل ہوں گے۔چنانچہ دیکھ لو۔تین ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا مگر موسیٰؑ پر اب تک صلوٰۃ اور سلام بھیجا جا رہا ہے اور قیامت تک اس پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی چلی جائیں گی۔لیکن فرعون پر دنیا کی ہر قوم لعنت بھیجتی رہی ہے اور قیامت تک اس پر لعنت ہی برستی چلی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی پر لعنت ڈالتا ہے تو وہ لعنت اس وقت ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ چلتی چلی جاتی ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک غزوہ پر جا رہے تھے کہ حجر شہر آپ کے راستہ میں آیا۔اور اس جگہ پر تھوڑی دیر کے لئے آپ نے پڑاؤ کیا۔پڑاؤ کی صورت دیکھ کر صحابہؓ نے اپنے اپنے آٹے نکالے اور گوندھ کر روٹی پکانے کی تیاری کرنے لگے۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آٹا گوندھتے اور روٹی پکانے کی فکر کرتے دیکھا تو آپؐ گھبرا گئے اور آپ نے اپنے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔جلدی اپنی سواریوں پر چڑھ جاؤ۔اور اپنے آٹے پھینک دو۔کیونکہ اس جگہ خدا کا غضب نازل ہوا تھا۔وہ لوگ جن پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوا تھا مر گئے۔جس شہر پر غضب نازل ہوا تھا اجڑ گیا۔سالوں کے بعد سال اور صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی چلی گئیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اب بھی اس مقام پر عذاب نازل ہوتا نظر آ رہا تھا۔آپؐ نے نہ صرف صحابہؓ کو وہاں سے جلدی نکل جانے کا ارشاد کیا بلکہ ساتھ ہی مسلمانوں کی دولت کا ایک حصہ یعنی وہ آٹا جو انہوں نے روٹی پکانے کے لئے گوندھا تھا اسے بھی آپؐ نے پھینکنے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اس جگہ کے پانی سے گوندھا ہوا آٹا کھانا

بھی تمہارے لئے جائز نہیں ہے (بخاری کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ و الی ثمود اخاھم صالحا)۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے متعلق مجھے یاد ہے کہ وہ عبدالحکیم مرتد پٹیالوی سے جب وہ احمدی تھا بہت محبت کیا کرتے تھے اور وہ بھی آپ سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی۔ تو اس وقت بھی اس نے یہی لکھا کہ آپ کی جماعت میں سوائے حضرت مولوی نورالدینؓ صاحب کے اَور کوئی نہیں جو صحابہؓ کا نمونہ ہو۔ یہ شخص بے شک ایسا ہے جو جماعت کے لئے قابل فخر ہے عبدالحکیم پٹیالوی نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی اور اس میں بہت کچھ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر لکھا تھا۔ لیکن جب عبدالحکیم نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا۔ تو میں نے دیکھا آپ نے گھبرا کر اپنے شاگردوں کو بلایا اور ان سے فرمایا۔ جاؤ اور جلدی میرے کتب خانہ میں سے عبدالحکیم کی تفسیر نکال دو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے مجھ پر خدا کی ناراضگی نازل ہو۔ حالانکہ وہ قرآن کریم کی تفسیر تھی اور اس کی بہت سی آیات کی تفسیر اس نے خود آپ سے پوچھ کر لکھی تھی مگر اس وجہ سے کہ اس پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ اس کی لکھی ہوئی تفسیر کو بھی آپ نے اپنے کتب خانہ سے نکلوا دیا۔

اسی طرح فرعون جو اپنے آپ کو مصریوں کا خدا قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ معلوم نہیں یہ کون سا خدا ہے جس کو ماننے کی موسیٰؑ ہم کو تلقین کر رہا ہے۔ اس پر جب خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تو باوجود اس کے کہ تین ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اب تک فرعون پر لعنت برستی چلی جاتی ہے۔ اور ہر شخص جب اس کا نام لیتا ہے یا قاہرہ میں اس کی لاش دیکھتا ہے جو خدائی نشان کے طور پر اب تک محفوظ چلی آرہی ہے تو اس کے دل میں فرعون کے متعلق ادب اور احترام کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ واقعات خدا تعالیٰ نے اہل مکہ کے سامنے اس لئے بیان کئے تھے کہ جس طرح فرعون نے موسیٰؑ کا مقابلہ کیا اسی طرح مکہ کا ابوالحکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر لوگوں کو بھڑکا رہا ہے۔ مگر یاد رکھو جس طرح فرعون اپنے لشکروں کے ساتھ ہلاک ہوا اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی جو شخص اٹھے گا وہ تباہ کر دیا جائے گا اور قیامت تک آنے والی نسلیں اس پر اسی طرح لعنت ڈالیں گی جس طرح فرعون پر لعنت ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ ابوجہل اور دوسرے سرداران مکہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی بڑی تکالیف پہنچائی تھیں ان پر آج تک لعنت ڈالی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی نسلیں ان کی طرف منسوب ہونا اپنے لئے ہتک کا موجب سمجھتی ہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف دنیا کے کونہ کونہ میں ہو رہی ہے اور کوئی ملک اور کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں آپؐ پر درود و سلام بھیجنے والے اور آپؐ پر اپنی جانیں قربان کرنے والے لوگ موجود نہ ہوں۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَهۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ

اور ہم نے موسیٰؑ کو بعد اس کے کہ ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کر دیا تھا کتاب بخشی اس کی تعلیم لوگوں کو

الۡاُوۡلٰی بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ رَحۡمَةً لَّعَلَّهُمۡ

روحانی بینائی بخشتی تھی اور وہ ہدایت اور رحمت کا موجب تھی۔ (اور) اس غرض سے (دی گئی تھی)

یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَ مَا کُنۡتَ بِجَانِبِ الۡغَرۡبِیِّ اِذۡ قَضَیۡنَاۤ

کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور تُو (طور کے) مغربی جانب نہیں تھا جب ہم نے موسیٰؑ کے سپرد (رسالت کا)

اِلٰی مُوۡسَی الۡاَمۡرَ وَ مَا کُنۡتَ مِنَ الشّٰهِدِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ لٰکِنَّاۤ

کام کیا تھا۔ اور نہ تُو (اس وقت) گواہوں میں سے ایک گواہ تھا۔ لیکن ہم نے بہت سی قوموں کو پیدا کیا۔ پس ان

اَنۡشَاۡنَا قُرُوۡنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیۡهِمُ الۡعُمُرُ ۚ وَ مَا کُنۡتَ ثَاوِیًا

پر عمر لمبی ہوگئی (اور وہ اپنی پیشگوئیوں کو بھول گئے)۔ اور تُو اہل مدین کے ساتھ بھی نہیں رہتا تھا۔ کہ ان کے سامنے

فِیۡۤ اَهۡلِ مَدۡیَنَ تَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا ۙ وَ لٰکِنَّا کُنَّا

نشان پڑھ کر سناتا۔ لیکن ہم ہی رسول بھیجنے والے ہیں۔ اور اس وقت بھی تُو موسیٰؑ کے ساتھ نہیں تھا جبکہ طور پر

مُرۡسِلِیۡنَ ﴿۴۶﴾ وَ مَا کُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَیۡنَا وَ لٰکِنۡ

ہم نے موسیٰؑ پر وحی نازل کی۔ لیکن جو کچھ موسیٰؑ سے کہا گیا وہ اس لئے کہا گیا کہ تیری آمد پر اس قوم کو یقین ہو

رَّحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰهُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ

اور خدا تعالیٰ کی رحمت میں وہ بھی شریک ہو جائے اور اس لئے بھی کہ تُو اس قوم کو ہوشیار کرے جن کے پاس

قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۷

تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تھا۔تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

حل لغات۔ ثَاوِیًا ثَاوِیًا ثَوٰی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے ۔اور اَلثَّوَاءُ کے معنے ہیں اَلْاِقَامَۃُ مَعَ الْاِسْتِقْرَارِ ۔یعنی مستقل رہائش (مفردات)اور جب ثَوٰی بِالْمَکَانِ کا فقرہ استعمال کریں تو معنے ہوں گے اَقَامَ یعنی وہ کسی جگہ ٹھہرا۔(اقرب)

تفسیر ۔ فرماتا ہے قرونِ اولیٰ کی ہلاکت اور بربادی کے بعد جبکہ دنیا ایک نئی شریعت کی محتاج تھی اور وہ ہر قسم کی خیر اور برکت کے سامانوں سے محروم ہو چکی تھی ہم نے موسیٰ ؑ پر ایک آسمانی کتاب نازل کی جو لوگوں کو روحانی بینائی بخشنے والی تھی اور ان کے لئے ہدایت اور رحمت کا موجب تھی ۔ یہ کتاب انہیں اس لئے دی گئی تھی تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں اپنے اندر ایک نیک اور پاک تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تورات کے نزول کی صرف یہی غرض نہیں تھی کہ اس زمانہ کے لوگ اس کی تعلیم سے فائدہ اٹھائیں اور انہیں وہ روحانی بصیرت حاصل ہو جائے جس سے وہ خیر اور شر میں تمیز کر سکیں اور اپنے مخالفین پر انہیں غلبہ میسر آجائے ۔ بلکہ وہ اپنے اندر ہدایت اور رحمت کا ایک پیغام بھی رکھتی تھی ۔یعنی اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بھی پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں تا کہ جب وہ موعود آئے تو تورات کے ماننے والے اسے قبول کرنے سے محروم نہ رہیں ۔ چنانچہ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ انہی پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۔یعنی اے محمد رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) تُو اس وقت موسیٰ ؑ کے ساتھ نہیں تھا جبکہ ہم نے مغربی جانب کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کا کام اس کے سپرد کیا تھا۔اور نہ تُو اس وقت اس واقعہ کے چشم دید گواہوں میں سے تھا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نشان دہی فرمائی کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی دفعہ تجلّی الٰہی کو ایک آگ کی صورت میں دیکھا تھا وہ جانبِ غرب تھا۔ یہ جانبِ غرب اگر عرب سے سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تُو اس وقت عرب کے مغربی جانب نہیں تھا جبکہ موسیٰ ؑ کے سپرد ہم نے رسالت کا کام کیا۔اور اگر اس سے دشتِ سینا مراد لیا جائے جس میں یہودیوں کے نزدیک حورب پہاڑ تھا جیسا کہ خروج باب ۱۹ آیت ۱ تا ۳ سے ظاہر ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی مرتبہ الٰہی تجلّی دیکھی وہ دشتِ سینا کے مغرب میں تھا۔تورات

نے اس بارہ میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے

''بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک لے آیا اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا۔'' (خروج باب ۳ آیت ا و ۲)

اس حوالہ میں ''بیابان کی پرلی طرف'' کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں علماء بائیبل نے ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چراتے ہوئے بیابان یعنی دشتِ سینا کے مغرب میں خداوند کے پہاڑ حورب میں آئے تھے۔ (کنائز تفسیر بائیبل ص ۳۵۸)

پس اس جگہ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ سے یہ مراد بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الٰہی انوار نازل ہوئے عرب کے مغربی جانب تھا اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ وہ مقام دشتِ سینا کی مغربی جانب تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس آیت میں جو امر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ کلام الٰہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یوں امر کا لفظ قرآن کریم میں بعض اور معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے بعض جگہ پیدائش باذن اللہ کے معنے لئے گئے ہیں اور بعض جگہ قضاء الٰہی کا مفہوم لیا گیا ہے مگر اس جگہ امر کلام الٰہی کے معنے رکھتا ہے اور اس مفہوم میں لفظ امر کا استعمال قرآن کریم کی بعض اور آیات میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے کہ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (الجاثیة:۱۸) یعنی ہم نے انہیں کلام الٰہی کی بیّنات دی تھیں۔ اسی طرح فرماتا ہے فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (الحج:۶۸) یعنی چاہیے کہ اس کلام کے بارہ میں لوگ تجھ سے جھگڑا نہ کریں۔ کیونکہ اس میں ان کی ہدایت کا سامان ہے لیکن وہ چونکہ اس کلام الٰہی کی حقیقت سے ناواقف ہیں اس لئے تیرا فرض ہے کہ تُو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا چلا جا۔ پس قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ کے یہ معنے ہیں کہ جب موسیٰ ؑ کے سپرد ہم نے کلام الٰہی پہنچانے کا کام کیا۔

اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کی ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تُو تو اس وقت موسیٰ ؑ کے ساتھ نہیں تھا جب ہم نے رسالت کا کام اس کے سپرد کیا۔ اگر موسیٰ ؑ اس زمانہ کے آدمی ہوتے تو سمجھا جاسکتا تھا کہ تم دونوں نے منصوبہ کرلیا ہے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام تو تیری پیدائش سے سینکڑوں سال پہلے بلکہ دو ہزار سال پہلے گذر چکے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ موسیٰ نے اس منصوبہ کی وجہ سے رسالت کا دعویٰ کردیا ہو۔ تُو تو اس وقت دنیا میں تھا ہی نہیں جبکہ موسیٰ ؑ کے سپرد رسالت کا کام کیا گیا۔ پھر اگر موسیٰ ؑ کے کلام سے تیری صداقت ظاہر ہوتی ہے تو یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تُو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

ورنہ تیرے اندر یہ کہاں طاقت تھی کہ تو اپنی پیدائش سے بھی دو ہزار سال پہلے موسیٰ ؑ کو کہتا کہ تُو نبوت کا دعویٰ کر اور پھر دعویٰ کے بعد میرے متعلق پیشگوئیاں بھی کرتا کہ لوگ مجھے مان لیں۔اس نے اگر دعویٰ کیا تو اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اسے رسالت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔پس اس کے کلام میں جو پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں ان کا انکار صرف تیرا انکار نہیں بلکہ خود موسیٰ ؑ کا بھی انکار ہے جسے خدا نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔

پھر فرماتا ہے کہ ان پیشگوئیوں کی طرف لوگوں کو اس لئے توجہ نہیں رہی کہ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۔ہم نے موسیٰ ؑ کے بعد قوموں پر قومیں پیدا کیں اور ایک عرصۂ دراز گذر گیا۔جس کی وجہ سے یہ قومیں اپنی تاریخ کو بھول گئیں اور انہیں یاد ہی نہ رہا کہ موسیٰ ؑ پر ہم نے کہاں جلوہ گری کی تھی اور اس جلوہ میں ہم نے اس پر کیا کیا غیب ظاہر کئے تھے۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۔فرماتا ہے۔تُو اہل مدین میں بھی نہیں رہتا تھا کہ انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا۔بلکہ ہم نے ہی ان کی ہدایت کے لئے رسول بھیجا تھا۔اس آیت سے ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو خروجِ مصر کے بعد موسیٰ ؑ اور بنی اسرائیل کو پیش آئے اور بتایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکلے تو آپ دوبارہ اہل مدین میں آ کر ٹھہرے تھے۔ جہاں ایک لمبا عرصہ آپ اللہ تعالیٰ کے نشانات سے لوگوں کے ایمان کو جلا بخشتے رہے۔

بائبل کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر آئے تو آپ موآب اور مدین کے میدانوں میں ہی خیمہ زن ہوئے تھے۔آپ کا خسر بھی آپ کی ملاقات کے لئے آیا تھا اور اس نے بنی اسرائیل کی تنظیم کے سلسلہ میں آپ کو بہت سے مشورے بھی دیئے تھے (خروج باب ۱۸) لیکن جب مدین کی عورتیں بنی اسرائیل کو شرک میں مبتلا کرنے لگیں (گنتی باب ۲۵) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر چڑھائی کی اور ساری کی ساری قوم کو تباہ کر دیا (گنتی باب ۳۱) اسی طرح تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدین کی تباہی کے بعد ان کے خسر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہی آ گئے تھے اور وہیں انہیں رہائش کے لئے زمین دے دی گئی تھی۔ (قدامۃ الیہود کتاب ۵ باب ۲ بحوالہ ارض القرآن جلد دوم)۔

پس اس آیت میں اس زمانہ قیام کا ذکر ہے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ مدین تشریف لائے تھے۔ اور وہاں آپ ایک لمبے عرصہ تک ٹھہرے رہے اور جماعت کی تربیت اور ان کی تنظیم کے کام میں مشغول رہے۔لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی مدین میں ہی تھے کہ ان پر

الہامات الٰہیہ نازل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور وہیں انہوں نے اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی پیشگوئی فرمادی تھی۔ گو فرعون کی طرف جانے کا انہیں بعد میں حکم دیا گیا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور والی پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دو دفعہ اُتری ہو۔ ایک دفعہ مدین میں اور ایک دفعہ طور پر۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بھی کئی سورتیں دو دفعہ اتری ہیں۔ ایک دفعہ مکہ میں، ایک دفعہ مدینہ منورہ میں۔ بہرحال یہ کسی دوسرے نبی کا ذکر معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اول و آخر موسیٰؑ کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے ثبوت میں موسیٰؑ کے اس واقعہ کو پیش فرماتا ہے جبکہ وہ مدین میں ٹھہرے اور لوگوں کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰؑ کے ساتھ مدین میں نہیں رہے پھر بھی جو واقعات موسیٰؑ کو پیش آئے وہی اس کو بھی پیش آئیں گے اور جس طرح وہ مظفر و منصور ہوا اسی طرح یہ بھی مظفر و منصور ہوگا۔ چنانچہ مدین میں موسیٰؑ کے قیام کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام مصری قوم کے مظالم سے تنگ آکر مصر سے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مدین میں پناہ دی اور وہاں کے ایک نیک دل انسان نے اپنے گھر کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے اور وہ وہاں آٹھ یا دس سال رہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی قوم ایک دن مکہ سے نکال دے گی اور جس طرح موسیٰؑ کو مدین میں پناہ دی گئی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ مدینہ میں لے جائے گا اور وہاں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کھڑا کر دے گا جو اس کے لئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیں گے اور اس پر اپنی جانیں اور اپنے اموال قربان کر دیں گے اور پھر جس طرح موسیٰؑ مدین میں آٹھ یا دس سال رہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام بھی مدینہ میں اتنا ہی ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مماثلت کو اس رنگ میں ظاہر فرمادیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح کیا اور مدینہ میں آپ کا کل قیام دس سال ہی رہا۔ مگر اس مماثلت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ فضیلت ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تو ہجرت کے بعد شادی ہوئی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی حضرت خدیجہؓ سے شادی ہو گئی تھی۔

پھر فرماتا ہے وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ اے محمد رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) تُو اس وقت بھی طُور کے پاس نہیں تھا۔ جب کہ ہم نے موسیٰؑ پر وحی نازل کی اور اسے ہم نے تیری بعثت کی خبر دی۔ ہاں یہ خبر تیرے رب کی طرف سے ایک بڑی بھاری رحمت تھی تا کہ تُو اس قوم کو ہوشیار کرے جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا۔ اور تا کہ وہ

لوگ نصیحت حاصل کریں۔ مکہ والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تو تھے مگر چونکہ ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم سے ناآشنا ہو چکے تھے اور شرک اختیار کر چکے تھے۔ اس آیت میں طور سینا پر نازل ہونے والی جس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ استثناء باب ۱۸ میں پائی جاتی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ

''میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔'' (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۱)

بائیبل تسلیم کرتی ہے کہ یہ خبر موسیٰ علیہ السلام کو خروجِ مصر کے بعد طور پر دی گئی تھی۔ پس یہی وہ عظیم الشان پیشگوئی ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والوں کو توجہ دلائی ہے کہ کیا یہ اس وقت طور کے پاس موجود تھا جب موسیٰؑ نے اس کے آنے کی پیشگوئی کی تھی۔ یا کیا اس پیشگوئی میں موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہمی سمجھوتے کا دخل ہے۔ اگر یہ پیشگوئی زمین و آسمان کے خدا کی طرف سے تھی جو دو ہزار سال کے بعد ٹھیک اسی طرح تمہاری آنکھوں کے سامنے پوری ہوئی تو تمہارا فرض تھا کہ تم دوڑتے ہوئے آتے اور اس موعود کے آگے اپنے سر جھکا دیتے تا کہ تم بھی ان رحمتوں اور برکتوں سے حصہ پاتے جو اس پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مگر تم نے موسیٰؑ کی اس عظیم الشان پیشگوئی کی بھی پرواہ نہ کی اور جب وہ موعود آ گیا جس کا دو ہزار برس سے انتظار کیا جا رہا تھا تو تم سب سے پہلے اس کے منکر ہو گئے اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

یہ پیشگوئی جو استثناء باب ۱۸ میں کی گئی ہے اپنی تفاصیل کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ اس پر جتنا بھی غور کیا جائے اتنا ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا نقشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ اس پیشگوئی میں سب سے پہلی بات تو یہ بتائی گئی تھی کہ یہ آنے والا موعود بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آئے گا۔ دوسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ موسیٰؑ کی طرح صاحبِ شریعت رسول ہوگا۔ اور اس کے واقعات زندگی موسیٰؑ کے واقعات زندگی کے ساتھ ملتے جلتے ہوں گے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

’’میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔‘‘

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ موسیٰؑ کی مانند نبی اس وقت تک نہیں کہلا سکتا جب تک وہ موسیٰؑ کی طرح صاحبِ شریعت نہ ہو۔ اور اس کے واقعات زندگی بھی موسیٰؑ سے نہ ملتے ہوں۔ تیسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا۔ یعنی اس کا الہام لفظی ہوگا۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو وہ اپنے الفاظ میں بیان کردے۔

چوتھی بات یہ بتائی گئی تھی کہ

’’جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔‘‘

یعنی باوجود اس کے کہ اس کی شدید مخالفت ہوگی اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے پر اُسے ہر قسم کے خطرات لاحق ہوں گے پھر بھی وہ ایک نڈر اور بہادر انسان کی طرح خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتا چلا جائے گا۔ اور اس راستہ میں کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرے گا۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ اس پیشگوئی کا موعود نبی اپنی تعلیم کو خدا تعالیٰ کا نام لے کر دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ جس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اس کا کلام شرک کی کامل طور پر تردید کرنے والا ہوگا۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی تھی کہ جو لوگ اس کی تعلیم کا انکار کریں گے وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا مورد بنیں گے۔

ساتویں بات اس میں یہ بتائی گئی تھی کہ اگر کوئی شخص افتراء کے طور پر اس پیشگوئی کا اپنے آپ کو مصداق قرار دے گا۔ تو وہ قتل کردیا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائیبل کے اردو تراجم میں اس جگہ یہ الفاظ ہیں کہ ’’وہ نبی قتل کیا جائے‘‘ مگر یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ انگریزی بائیبل میں اس جگہ یہ الفاظ ہیں کہ He shall die یعنی وہ ہلاک ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ قتل کیا جائے۔ جیسا کہ اردو بائیبل میں ہے۔

پیشگوئی کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشگوئی کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اَور کوئی شخص مصداق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جو بنو اسحاق کے بھائیوں یعنی بنو اسمٰعیل میں پیدا ہوئے۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جنہوں نے موسیٰؑ کی مانند ہونے کا دعویٰ کیا اور جن کے متعلق خداوند تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ (المزمل: ۱۶) یعنی ہم نے تمہاری طرف تم میں سے ہی ایک مقدس انسان کو اسی طرح رسول بنا کر کھڑا کیا ہے جس طرح فرعون کی

طرف ہم نے موسیٰ ؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ جس طرح حضرت موسیٰ ؑ کو تورات دی گئی جو ایک شریعت کی کتاب تھی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا گیا۔ جو ایک کامل شرعی قانون ہے۔ پھر آپؐ کی زندگی کے واقعات بھی موسیٰ ؑ کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح موسیٰ ؑ کے بعد امتِ موسوی کی اصلاح اور تجدید دین کے لئے متواتر مجدد دین اور انبیاء آتے رہے اور آخر تیرہ سو سال کے بعد حضرت مسیح ناصریؑ کو آپ کا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا گیا اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہر صدی میں مجدد دین کے ظہور کی خبر دی۔ پھر آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ آخر میں مسیح موعود آئے گا جو اسلام کے عروج اور اس کی نشأۃِ ثانیہ کا موجب ہوگا۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا گیا تو ایک فارسی الاصل انسان اسے واپس لے آئے گا۔ (بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ الجمعۃ)

(۳) پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جن کے مونہہ میں خدا تعالیٰ کا کلام ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴، ۵) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے خدا تعالیٰ کے منشاء کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتے بلکہ صرف وہی الفاظ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جو وحی کی شکل میں آپ پر نازل کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک نام کلام اللہ بھی رکھا گیا ہے۔ (بقرۃ ع ۹) کیونکہ اس میں شروع سے لیکر آخر تک صرف کلام اللہ ہی ہے۔ لیکن باقی انبیاء کی کتب میں خدا تعالیٰ کا کلام کم اور بندوں کا کلام زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۴) پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جنہوں نے دنیا کی شدید مخالفت کے باوجود خدا تعالیٰ کا کلام بلاکم و کاست لوگوں کو پہنچا دیا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپؐ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدۃ: ۴) آج میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو مکمل کر دیا ہے تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کو دوبارہ ان کے فرائض کی طرف توجہ دلائی اور آخر میں فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ ۔ هَلْ بَلَّغْتُ یعنی اے اللہ کیا میں نے تیرا پیغام پوری طرح پہنچا دیا ہے؟ اور سب مسلمانوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ رکھ کر کہتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم سب کو پہنچا دیا ہے۔ (سیرۃ ابن ھشام خطبۃ الرسول فی حجۃ الوداع)

(۵) پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جن کی الہامی کتاب کا ہر باب اس آیت سے شروع ہوتا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ گویا ہر مسلمان جب کسی سورۃ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے موسیٰ ؑ کی پیشگوئی آجاتی ہے کہ اس آنے والے موعود پر جو کلام نازل ہوگا وہ اسے خدا کا نام لے کر دنیا کے

سامنے پیش کرے گا۔

(۶) پھر کہا گیا تھا کہ جولوگ اس کی تعلیم کا انکار کریں گے وہ اس جرم کی پاداش میں خدا تعالیٰ سے سزا پائے بغیر نہیں رہیں گے چنانچہ پیشگوئی کا یہ حصہ بھی بڑی شان سے پورا ہوا۔اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے والے تباہ اور برباد کردیئے گئے۔ یہاں تک کہ قیصر وکسریٰ جیسے عظیم الشان بادشاہوں کی فوجیں مسلمانوں سے ٹکرائیں اور خدا تعالیٰ نے ان کی حکومتوں کو پاش پاش کردیا۔

(۷) پھر کہا گیا تھا کہ جو شخص افتراء کے طور پر اپنے آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق قرار دے گا۔اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کردے گا۔اور وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔پیشگوئی کا یہ حصہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا کے سامنے واضح کررہا ہے۔کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کو ہلاک کرنے کے لئے دشمنوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ہر ناجائز سے ناجائز طریق اختیار کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی مگر خدا تعالیٰ نے آپؐ کی مدد فرمائی اور دشمن آپؐ کا بال تک بیکا نہ کرسکا۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ رسول اللہ! جب طور پر ہم نے موسیٰؑ کو تیرے آنے کی خبر دی تھی تو کیا تُو اس وقت موسیٰؑ کے ساتھ تھا اور کیا تُو نے اسے اس پیشگوئی پر آمادہ کیا تھا ؟ یہ کام تو صرف عالم الغیب خدا کا تھا جس نے دو ہزار سال پہلے تیرے آنے کی خبر دے دی۔مگر ان لوگوں کو کیا ہوگیا کہ یہ ان پیشگوئیوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اور تیرا انکار کرتے چلے جاتے ہیں۔حالانکہ اتنا لمبا زمانہ پہلے یہ پیشگوئی اس لئے کی گئی تھی کہ بعد میں آنے والے اس نبی کو قبول کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حصہ پائیں اور تا کہ اے محمدؐ رسول اللہ! تُو اس قوم کو بھی خواب غفلت سے بیدار کرے مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا۔یعنی اہل مکہ کو۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کفار مکہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے تھے مگر حضرت ابراہیمؑ ان سے صدیوں پہلے گذر چکے تھے۔اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ بھی اس وقت مبعوث ہوئے جبکہ ابھی ان کی نسل ملک عرب میں نہیں پھیلی تھی۔پس ضروری تھا کہ کوئی نیا نبی آکر ان کو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلائے اور انہیں توحید حقیقی پر قائم کرے۔

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ

اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے کسی مصیبت کے آنے پر کہیں گے۔ اے ہمارے رب! تُو نے

فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ

ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تا کہ ہم تیری آیتوں کے پیچھے چلتے اور مومنوں میں سے بن جاتے (تو شاید ہم

نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۸﴾

تجھے رسول بنا کر نہ بھیجتے مگر کفار پر حجت قائم کرنا ضروری تھا)۔

تفسیر ۔فرماتا ہے کہ اگر ہمیں یہ خیال نہ ہوتا کہ ان لوگوں کو اپنے برے اعمال کی وجہ سے کوئی عذاب پہنچا تو یہ فوراً کہہ دیں گے۔ کہ اے ہمارے رب! تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا۔ ہم ذلیل اور خوار ہونے سے پہلے تیرے احکام کی تعمیل کرتے اور مومن بن جاتے تو ہم ان پر رسول بھیجنے کے بغیر ہی عذاب نازل کر دیتے۔ اس آیت کی یہ جزا کہ ''ہم ان پر رسول بھیجنے کے بغیر ہی عذاب نازل کر دیتے'' اس جگہ محذوف کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے بعض اور مقامات میں بھی جزا محذوف ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر نبی نہ آئیں تو قوموں پر حجت تمام نہیں ہوتی اور وہ خدا تعالیٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ تُو نے ہم میں نبی نہیں بھیجا اس لئے ہم ہدایت سے محروم رہیں۔ اگر ہم میں نبی آتا تو ہم اس کے احکام کی تعمیل کر کے تیری رضا حاصل کر لیتیں اور چونکہ یہ ایک معقول عذر ہوتا اس لئے ہم نے سلسلہ نبوت جاری کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اگر ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی آیات کی اتباع کرنے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بجائے ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا تو موسیٰ ؑ کی پیشگوئی کے مطابق اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر نازل ہو جائے گا اور پھر ان کا شور مچانا بیکار ہو جائے گا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَآ اُوْتِيَ مِثْلَ

پس جب (ان کے پاس) ہماری طرف سے حق آ گیا۔ تو انہوں نے کہا کیوں اس (یعنی محمد رسول اللہ) کو ویسی تعلیم

مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَ لَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ

نہیں ملی جیسی کہ موسیٰؑ کو ملی تھی۔ کیا انہوں نے موسیٰؑ کی تعلیم کا اس سے پہلے انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے تو کہہ دیا تھا کہ یہ

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا ٚ وَ قَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

دو بڑے جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اور کہہ دیا تھا کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے دعویٰ کے منکر ہیں۔

تفسیر ۔ اس آیت میں بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر بجائے اس کے کہ آپؐ کی قوم آپؐ کی پاک تعلیم سے فائدہ اٹھاتی اور آپؐ پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی وارث بنتی اس نے ایک نیا اعتراض کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰؑ کی طرح کی کوئی کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہیں اتاری گئی۔ یعنی جس طرح موسیٰؑ پر اکٹھی کتاب اتری تھی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہیں اتری۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم نے اس اعتراض کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کفار یہ اعتراض کرتے ہیں کہ لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان : ۳۳) اس پر قرآن ایک دفعہ ہی کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں اتارا گیا ہے حالانکہ ان کی یہ بات بالکل غلط تھی کہ موسیٰ پر اکٹھی کتاب اتری ہے۔ جتنے عرصہ میں قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا ہے اس سے بہت زیادہ عرصہ میں تورات موسیٰؑ پر اُتری ہے۔ چنانچہ بائیبل کے بیان کے مطابق شروع میں تو صرف دس احکام موسیٰ پر نازل ہوئے لیکن باقی تورات کئی سالوں میں مکمل ہوئی۔ اور دشتِ سینا کے مختلف مقامات میں اس کی متعدد آیات اتریں۔ پس یہ اعتراض تو غلط ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہاری یہ بات درست بھی مان لی جائے کہ اکٹھی کتاب نازل ہوتی تو تم مان لیتے تو سوال یہ ہے کہ موسیٰؑ کو ان کے مخاطبوں نے کب مان لیا تھا؟ اس پر تو تمہارے نزدیک اکٹھی کتاب اتری تھی۔ مگر اس کے زمانہ کے لوگوں نے بھی یہی کہا تھا کہ سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا ہارونؑ اور موسیٰؑ دو بڑے جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں اور کہہ دیا تھا کہ اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ہم موسیٰؑ کے بھی منکر ہیں۔ اور ہارونؑ کے بھی۔ یعنی

گو یہ کتاب اکٹھی اتری ہے مگر پھر بھی ہم انکار کرتے ہیں۔ پس اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اکٹھا قرآن اترتا تو تم نے کب مان لینا تھا تم پھر بھی اعتراض کرتے چلے جاتے۔

سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا میں موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔یعنی جب ان کے تمام اعتراضات کو واضح طور پر ردّ کر دیا جاتا ہے اوران کا بوداپن کھل جاتا ہے تو وہ جھنجلا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم موسیٰؑ کو بھی نہیں مانتے موسیٰؑ بھی نعوذ باللہ جھوٹا تھا اور تم بھی نعوذ باللہ جھوٹے ہو۔تم بار بار موسیٰؑ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہو اور موسیٰؑ اپنی کتاب میں تمہارے متعلق پیشگوئیاں کرتا ہے۔پس درحقیقت تم دونوں ہی جھوٹے ہو جو ایک دوسرے کی تائید کر رہے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ جب انسان ایک سچائی کا انکار کرتا ہے تو اسے دوسری سچائی کا بھی لازماً انکار کرنا پڑتا ہے۔ جب انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا تو چونکہ موسیٰؑ کے کلام میں آپؐ کے متعلق پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں اس لئے انہیں موسیٰؑ کا بھی انکار کرنا پڑا اور انہوں نے کہہ دیا کہ یہ سب جھوٹ اور فریب کا ایک چکر ہے جو چلایا جا رہا ہے۔اس میں ہمیں کوئی سچائی نظر نہیں آتی۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ

تُو کہہ دے کہ (اگر موسیٰؑ اور ہارونؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کی باتیں جھوٹی ہیں تو) اگر تم سچے ہو تو اللہ

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۵۰

کے پاس سے ایک ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت دیتی ہو تا کہ میں اس کی اتباع کروں۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔اے محمد رسول اللہ تم اپنے دشمنوں کو کہو کہ تورات کا تو اس لئے انکار ہوا کہ وہ اکٹھی نازل ہوئی تھی اور قرآن کا انکار اس لئے ہوا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوا ہے تو اب تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جس نے دنیا میں ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت پھیلائی ہو اور کسی تیسرے طریق پر نازل ہوئی ہو۔مگر تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ تم جھوٹے ہو۔باقی رہا میں۔سو مَیں تو ہر صداقت کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔تم کوئی صداقت میرے سامنے لاؤ پھر دیکھو کہ میں اسے مانتا ہوں یا نہیں مانتا۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ

پھر اگر وہ کوئی جواب نہ دیں۔تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔اور اس سے

اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى

زیادہ کون گمراہ ہے جو اللہ کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے۔اللہ (تعالیٰ)

مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ؑ ﴿۵۱﴾ ع۸

یقیناً ظالم قوم کو کامیابی کا راستہ نہیں دکھاتا۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔اگر وہ تیرے اس مطالبہ کو پورا نہ کریں۔تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ کسی سچائی کی تلاش میں نہیں بلکہ جو بھی پراگندہ خیال ان کے دل میں آتا ہے اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔اور پراگندہ خیالات اور خواہشوں کے پیچھے چلنے والا تو نہایت گمراہ اور ظالم ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی کامیابی کا راستہ نہیں دکھاتا۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ؕ ﴿۵۲﴾

اور ہم ان کے لئے پے در پے وحی اتارتے رہے۔تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر۔وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ کے دو معنے ہیں۔ایک تو یہ کہ ہم ان کے لئے پے در پے اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں۔یا پے در پے ان کے لئے کلام الٰہی نازل کرتے رہے ہیں۔اور دوسرے یہ کہ ہم نے اس قول یعنی قرآن کریم کو ان کے لئے مربوط طور پر نازل کیا ہے یعنی سارے قرآن میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

پہلے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ آیت اس مضمون کی حامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یا اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون:۴۵) وغیرہ آیات میں بیان فرمایا ہے۔یعنی دنیا کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔یہاں تک کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی ہادی اور راہنما نہ گذرا ہو۔اور جس نے انہیں نیکی اور ہدایت کے راستے پر چلانے کی کوشش نہ کی ہو۔چنانچہ جب ہم مختلف اقوام کے

متعلق تحقیق کرتے ہیں تو وہ سب کی سب اس بات کی متفقہ طور پر قائل نظر آتی ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی مصلح ضرور آیا تھا۔ جب ہم ہندوؤں سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں حضرت کرشن اور رامچندر جی خدا تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ہم عیسائیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام بتاتے ہیں۔ ہم یہودیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت موسیٰ اور ہارونؑ کا نام بتاتے ہیں۔ ہم ایرانیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت زرتشت علیہ السلام کا نام بتاتے ہیں۔ ہم چینیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت کنفیوشس کا نام لیتے ہیں۔ ہم یونانیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ سقراط کا نام لیتے ہیں۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں جس کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ نے سامان نہ کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جیسے عرب کا خدا ہے ویسا ہی وہ ہندوستان اور چین اور شام اور مصر اور ایران اور یونان کا بھی خدا ہے۔ جب اس نے تمام دنیا کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کیا ہے تو وہ ان کی روحانی ضرورتوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا جبکہ روح کی حفاظت جسم کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری تھی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اسی احسان کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے ہمیشہ اپنی مخلوق پر رحم فرمایا اور اس کی ہدایت کا خیال رکھا اور اس کی طرف پے در پے اپنے رسول بھیجے۔ پے در پے ان کے لئے وحی نازل کی تا کہ کوئی شخص نادانستہ طور پر ہلاک نہ ہو۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے اس قول یعنی قرآن کریم کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کے تمام مضامین میں نہایت اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے ترتیب قرآن کے مسئلہ کو ہی نظر انداز کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ نعوذ باللہ یہ ایک بے جوڑ کلام ہے جس کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ گویا ان کے نزدیک مسلمانوں کو یہ تو ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ انسانی کلام میں جو یہ خوبی ہوتی ہے کہ اس میں ربط پایا جاتا ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مفسرین میں سے ابن حیّانؒ کے سوا کسی نے ترتیب کے مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن کریم کی فضیلت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ تا کہ لوگ اس پر غور کر کے نصیحت حاصل کریں۔ لیکن یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ الہامی کتابوں کی ترتیب عام کتابوں کی ترتیب سے جداگانہ رنگ رکھتی ہے۔ عام کتابوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ مثلاً پہلے مسائل وضو بیان کئے جائیں گے۔ پھر مسائل عبادت بیان کئے جائیں گے پھر ایک باب میں مسائل نکاح بیان کئے جائیں گے اسی طرح کسی باب میں طلاق و خلع کا اور کسی باب میں کسی اور چیز کا ذکر ہوگا۔ مگر الہامی کتابوں میں یہ رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی ترتیب بالکل اَور قسم کی ہوتی ہے۔ جو دنیا کی ترتیب سے بالکل نرالی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جاہل لوگ کہہ دیتے

ہیں کہ اس میں کوئی ترتیب ہے ہی نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ الہامی کتابوں میں دنیا کی تمام کتابوں سے نرالی ترتیب کیوں رکھی جاتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں بھی کئی حکمتیں ہیں:۔

(الف) اس ترتیب سے سارے کلام سے دلچسپی پیدا کرنی مدنظر ہوتی ہے۔اگر الہامی کتاب کی ترتیب اس طرح ہو جس طرح مثلاً ھدایۃ کی ترتیب ہے کہ وضو کے مسائل یہ ہیں۔نکاح کے مسائل وہ،تو عام لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق انہی حصوں کو الگ کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیتے اور باقی قرآن کو نہ پڑھتے۔مگر اللہ تعالیٰ نے سارے مسائل کو اس طرح پھیلا کر رکھ دیا ہے کہ جب تک انسان سارے قرآن کو نہ پڑھ لے مکمل علم اسے حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

(باء) لوگوں کو غور و فکر کی عادت ڈالنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب اختیار کی ہے۔اگر عام کتابوں کی طرح اس میں مسائل بیان کر دیئے جاتے تو لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوتا کہ ان مسائل کے باریک مطالب بھی ہیں۔وہ صرف سطحی نظر رکھتے اور غور اور فکر سے محروم رہتے۔مگر اب اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کو اس طرح پھیلا دیا ہے اور ایک دوسرے میں داخل کر دیا ہے کہ انسان کو ان کے نکالنے کے لئے غور اور فکر کرنا پڑتا ہے۔اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سمندر ہے۔

(ج) یہ ترتیب اس لئے بھی اختیار کی گئی ہے۔تا خشیت الٰہی پیدا ہو۔مثلاً اگر یوں مسائل بیان ہوتے کہ وضو یوں کرو اور کلی اس طرح کرو۔عبادت اس طرح کرو۔اتنی رکعتیں پڑھو تو خشیت الٰہی پیدا نہ ہوتی۔جیسے عبادت وغیرہ کے تمام مسائل قدوری اور ہدایۃ وغیرہ میں موجود ہیں مگر قدوری اور ہدایۃ پڑھ کر کوئی خشیت اللہ پیدا نہیں ہوتی۔لیکن وہی مسئلہ جب قرآن میں آتا ہے تو انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہو جاتا ہے اس لئے کہ قرآن ان مسائل کو خشیت اللہ کا ایک جز بنا کر بیان کرتا ہے۔اور دراصل نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ مسائل کا اصل مقصد تقویٰ ہی ہے۔پس قرآن تقویٰ کو مقدم رکھتا ہے۔تا کہ جب انسان کو یہ کہا جائے کہ وضو کرو تو وہ وضو کرنے کے لئے پہلے ہی تیار ہو۔اسی طرح جب کہا جائے کہ نماز پڑھو تو انسان نماز پڑھنے کے لئے پہلے ہی تیار ہو۔اگر قرآن میں نماز کا ایک باب ہوتا تو اسے پڑھ کر خشیت اللہ پیدا نہ ہوتی۔

غرض الہامی کتاب چونکہ اصلاح کو مقدم رکھتی ہے اس لئے وہ سطحی ترتیب کو چھوڑ کر ایک نئی ترتیب اختیار کرتی ہے جو جذباتی ہوتی ہے یعنی قلب میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں الہامی کتاب ان کا ذکر کرتی ہے یہ نہیں کہ وہ وضو کے

بعد نماز کا ذکر کرے بلکہ وہ وضو سے روحانیت طہارت اور خدا تعالیٰ کے قرب کی طرف انسان کو متوجہ کرے گی۔ کیونکہ وضو سے طہارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جب نماز کا مسئلہ آئے گا تو یہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے مسائل بیان کرنا شروع کردے بلکہ سجدہ اور رکوع کے ذکر سے جو جذبات انسانی قلب میں پیدا ہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ تا کہ جو جذبات بھی انسان کے اندر پیدا ہوں ان سے وہ ایسا اثر لے جو اسے خدا تعالیٰ کے قریب کردے۔

غرض ترتیب قرآن ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ قلب کے جذبات کی لہروں پر مبنی ہے۔ اور یہ لہریں مختلف ہوتی ہیں۔ مَیں اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال دے دیتا ہوں۔ کہتے ہیں کسی مسجد کا مُلّا ایک دن جماعت کرانے لگا۔ تو اس نے دیکھا کہ مقتدی آسودہ حال ہیں۔ اس پر نماز میں ہی اسے خیال آیا کہ اگر یہ مجھے تحفے تحائف دیں تو میرے پاس بہت سامال اکٹھا ہوجائے گا۔ پھر جب مال جمع ہوجائے گا تو میں اس سے تجارتی سامان خریدوں گا۔ خوب تجارت کروں گا۔ کبھی دلّی میں اپنی اشیاء لے جاؤں گا کبھی کلکتے چیزیں لے جاؤں گا۔ غرض وہ اس طرح خیالات دوڑاتا چلا گیا۔ پھر ہندوستان اور بخارا کے درمیان اس نے تجارت کی سکیم بنانی شروع کردی۔ اب بظاہر وہ رکوع اور سجود کر رہا تھا مگر خیالات کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ ایک بزرگ بھی ان مقتدیوں میں شامل تھے۔ ان پر کشفی حالت طاری ہوئی اور انہیں امام کے تمام خیالات بتا دیئے گئے۔ اس پر وہ نماز توڑ کر الگ ہوگئے۔ جب اس ملّا نے نماز ختم کی تو وہ ان پر ناراض ہوا اور کہنے لگا تمہیں معلوم نہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے اسے بلا وجہ توڑا نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگے۔ مسئلہ تو مجھے معلوم ہے مگر میری صحت کچھ کمزور ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلا اور دلّی تک گیا۔ پھر دلی سے بخارا گیا اور میں تھک کر رہ گیا اور چونکہ اتنے لمبے سفر کی میں برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لئے آپ سے الگ ہوگیا۔ اس پر وہ شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا۔ اب یہ بیہودہ خیالات تھے جو اس کے دل میں پیدا ہوئے مگر ان خیالات میں بھی وہی ترتیب رہی جو اس کے جذباتِ قلب کی تھی۔ یہی حال نیک خیالات کا ہے اور وہ بھی اسی رنگ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً تم سجدہ میں گئے اور تم نے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا۔ تو اگر اس وقت تمہارا دل بھی حاضر ہے تو اللہ تعالیٰ کی سبّوحیت کا نقشہ تمہارے سامنے آنے لگتا ہے گو اس وقت تمہارے مونہہ سے دوسری اور تیسری دفعہ بھی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی نکل رہا ہوتا ہے مگر تمہارا دل پہلے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کو ہی چھوڑنے کو نہیں چاہتا یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے ہو اور تمہارا دل اس وقت حاضر ہوتا ہے۔ تو اس وقت حمد کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے احسانات تمہارے سامنے یکے بعد دیگرے آنے شروع ہوجاتے ہیں اور تم انہی احسانات کی یاد میں محو ہوجاتے ہو۔ اب اگر ایسی حالت میں تم

کسی کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہو تو گو تم اس کی اقتداء میں کبھی سجدہ کرو گے کبھی رکوع میں جاؤ گے اور مونہہ سے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وغیرہ بھی کہو گے۔ مگر تمہارے دل پر حمد ہی جاری ہوگی۔ تو قلوب پر بعض روحانی واردات آتی ہیں اور وہی حقیقی نماز ہوتی ہیں۔ اس وقت انسان گو الفاظ مونہہ سے نکال رہا ہوتا ہے مگر اس کے جذبات روحانیت کے لحاظ سے ایک خاص راستہ پر چل رہے ہوتے ہیں۔ پس وہ واردات جو انسانی قلب پر آتی ہیں قرآن کریم کی ترتیب اس پر مبنی ہے۔ وہ نماز کے بعد روزہ کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری یہ آیت پڑھنے کے بعد کیا کیا خیالات انسان کے اندر پیدا ہوں گے۔ پس وہ خیالات جو اس کے نتیجہ میں انسانی قلب میں پیدا ہو سکتے ہیں قرآن کریم ان کو بیان کرے گا۔ پس قرآن کریم کی ترتیب ان جذبات پر ہے جو قرآن کریم پڑھتے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ فلاں آیت یا فلاں حکم کے نتیجہ میں کس قسم کے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے بجائے ظاہری ترتیب کے اس نے قرآن کریم کی ترتیب ان جذبات پر رکھی جو قلبِ مومن میں پیدا ہوتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ جو لوگ محبت اور اخلاص سے قرآن مجید کو نہیں پڑھتے انہیں یہ کتاب پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ کیا ہوا کہ ابھی موسیٰؑ کا ذکر تھا پھر نوحؑ کا ذکر شروع کر دیا۔ پھر شعیبؑ کے حالات بیان ہونے لگ گئے۔ ابھی سُود کا ذکر تھا کہ ساتھ نماز کا ذکر آ گیا۔ ان کے نزدیک یہ باتیں اتنی بے جوڑ ہوتی ہیں کہ وہ ان کا آپس میں کوئی تعلق سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر وہی مضمون جب کسی عالم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ سنتا ہے اور سر دُھنتا ہے۔ اگر کہو کہ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا پہلا علاج تو یہ ہے کہ انسان سارے کلام کو پڑھے اور بار بار پڑھے۔ یہ نہیں کہ کوئی خاص حصہ چن لیا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ دوم جن لوگوں کا جذبہ محبت ہر وقت کامل رہتا ہے ان کے لئے تو یہ کافی ہے کہ وہ صبح یا شام کا وقت تلاوت کے لئے مقرر کریں۔ مگر جن کا جذبہ محبت ایسا کامل نہ ہو وہ صبح یا شام کو تلاوت کرنے کے علاوہ خصوصیت سے اس وقت بھی تلاوت کیا کریں جب ان کے دل میں محبت کے جذبات ابھر رہے ہوں چاہے دوپہر کو ابھریں یا کسی اور وقت۔ سوم قرآن کریم کو اس یقین کے ساتھ پڑھا جائے کہ اس کے اندر غیر محدود خزانہ ہے۔ جو شخص خیال کرتا ہے کہ جو کچھ علماء مجھے اس کا مطلب بتائیں گے یا جو کچھ پہلی تفسیروں میں لکھا ہوا ہے وہیں تک اس کے معارف ہیں اس کے لئے یہ کتاب بند رہتی ہے مگر جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں علوم اور معارف کے غیر محدود خزانے موجود ہیں۔ اس کے لئے یہ کتاب معرفت کا ایک بحر بیکراں ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح اگر تم کسی جنگل میں سے گذر رہے ہو تو تمہارے سامنے ہزاروں درخت آئیں گے مگر تم کسی کو غور سے نہیں دیکھو گے۔ لیکن اگر محکمہ جنگلات کا کوئی افسر معائنہ کرنے کے لئے آ جائے تو وہ بیسیوں نئی باتیں

معلوم کر لیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اس نیت سے قرآن پڑھتا ہے کہ یہ غیر محدود خزانہ ہے اور اس کی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ مگر جو اس نیت سے نہیں پڑھتا وہ فائدہ اٹھانے سے محروم رہتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۳﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر (دل میں) ایمان رکھتے ہیں۔

وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا

اور جب وہ (یعنی قرآن) ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ

كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ

ہمارے رب کی طرف سے برحق کلام ہے ہم تو آج سے پہلے ہی اس (کتاب کے مضامین) کے متبع تھے

مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا

(گو خفیہ)۔ ان لوگوں کو ان کا بدلہ ان کے صبر کی وجہ سے دو دفعہ ملے گا اور وہ نیکی سے بدی کا مقابلہ کرتے ہیں اور

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ

جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس کو خرچ کرتے ہیں۔ اور (یہودیوں سے جب مسلمان) کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس

قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا

سے اعراض کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں (اے کافرو!) ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے

نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۶﴾

ہیں۔ تم پر سلامتی نازل ہو (یعنی خدا تمہیں ایمان نصیب کرے) ہم جاہلوں سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔

حلّ لُغات۔ يَدْرَءُوْنَ يَدْرَءُوْنَ دَرَأَ سے فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دَرَأَهٗ (دَرْأً وَدَرْأَةً) کے معنے ہیں دَفَعَهٗ۔ اس کو ہٹایا۔ وَقِيْلَ دَفَعَهٗ شَدِيْدًا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنے زور سے ہٹانے

کے ہیں (اقرب) پس یَدْرَءُوْنَ کے معنے ہوں گے وہ سختی سے ہٹاتے ہیں۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ وہ لوگ جن کو قرآن کریم سے پہلے صرف نام کے طور پر کتاب نہیں ملی بلکہ حقیقی طور پر ملی ہے اور اس پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کریم کی سچائی پر بھی صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ خود ان کی کتاب میں قرآن کریم کے متعلق پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ جب ان کے سامنے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ یقیناً ہمارے رب کی طرف سے ایک سچی کتاب ہے اور ہم اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے فرماں بردار رہے ہیں اور اب بھی اس کے فرمانبردار ہیں۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا فرماتا ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ یہ نمونہ دکھائیں گے اور اس کی وجہ سے اپنی قوم سے مختلف قسم کی تکلیفیں پائیں گے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوہرا اجر دیا جائے گا۔ یعنی ایک تو اس بات کا اجر کہ وہ تورات پر قائم رہے اور دوسرے اس بات کا اجر کہ انہوں نے قرآن کریم کو مان لیا یا ایک تو وہ اجر جو دنیا میں ان کو دیا جائے گا اور دوسرا وہ اجر جو اگلے جہان میں دیا جائے گا۔

صَبَرُوْا میں بتایا کہ ان کو یہ دوہرا اجر ان کے صبر کی وجہ سے دیا جائے گا۔ صبر کے عربی زبان میں تین معنے ہوتے ہیں۔ اول۔ گناہ سے بچنا۔ دوم۔ نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہنا۔ سوم۔ تکالیف پر شکوہ اور جزع فزع کے اظہار سے اجتناب کرنا۔ پس صَبَرُوْا کہہ کر بتایا کہ یہ لوگ اس لئے دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے اس کے مامور کی آواز پر لبیک کہہ دیا۔ دوسرے یہ لوگ اس لئے دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ یہ نیک اعمال پر استقلال سے قائم رہے۔ اور خدا تعالیٰ کو ان کی یہ نیکی ایسی پسند آئی کہ اس نے انہیں اس دوسری نیکی کی بھی توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرلیا۔ تیسرے یہ لوگ اس لئے دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تورات کو مان کر بھی دشمنوں سے تکلیفیں سہیں۔ اور اب قرآن کریم کو مان کر بھی اپنی قوم کی لعن طعن کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ مگر ان تمام تکالیف کے باوجود ان کی زبانوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ بلکہ ہمیشہ یہ اپنے رب کی رضاء پر راضی رہے۔ پس یہ نیکیاں ایسی نہیں جو ضائع ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کا اس جہان میں بھی بدلہ دے گا اور آخرت میں بھی انہیں اپنی رضا کا مقام عطا فرمائے گا۔

پھر بتایا کہ اہل کتاب میں بعض اور خوبیاں بھی ہیں چنانچہ ایک خوبی تو یہ ہے کہ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وہ بدی کو نیک سلوک کے ساتھ دور کرتے ہیں یعنی اول بدی کو مٹانے کے لئے وہ اپنا نیک نمونہ لوگوں کے سامنے پیش

کرتے ہیں۔اوراس طرح لوگوں کو جرأت دلاتے ہیں کہ بدیوں سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں اگر ہم نے بدیوں کوترک کردیا توتمہارے لئے ان پر غالب آنا کون سا مشکل امر ہے۔ دوم وہ نیکی پھیلانے کے لئے متواتر وعظ و نصیحت سے کام لیتے ہیں۔تاکہ برائیوں کا لوگوں کے ذہنوں سے خودبخود استیصال ہوتا چلا جائے۔اور برائیوں کی شناعت ان کے دلوں میں پیدا ہوجائے۔سوم۔وہ بدی کو مٹانے کے لئے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو نیک نتائج پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔یعنی اگر عفو میں اصلاح دیکھیں تو دوسرے کو معاف کردیتے ہیں۔اور اگر مجرم کی اصلاح سزا کے بغیر نہ ہوسکتی ہو تو اسے سزا دیتے ہیں۔تورات کی طرح نہ ہر موقعہ پر انتقام لینے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ انجیل کی طرح ہر جرم کو معاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ موقع اور محل کو دیکھ کر بدی کو اس طریق سے دور کرتے ہیں جو اچھے نتائج پیدا کرنے والا ہو۔

چہارم۔وہ ظلم کے مقابلہ میں ظلم اور بے انصافی کے مقابلہ میں بے انصافی اور شرارت کے مقابلہ میں شرارت سے کام نہیں لیتے بلکہ ہمیشہ سچائی اور انصاف اور خداترسی کو مدنظر رکھتے ہیں۔اور بدی کے مقابلہ میں بھی نیکی ہی اختیار کرتے ہیں۔

دوسری خوبی یہ بتائی کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ نے انہیں جو بھی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اسے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتے ہیں۔ وہ غرباء کے لئے صرف اپنا روپیہ ہی صرف نہیں کرتے بلکہ ہم نے ان کو جو کچھ بھی دیا ہے اس کا ایک حصہ وہ دوسروں کے لئے ہمیشہ خرچ کرتے ہیں۔عربی زبان میں رِزْق اللہ تعالیٰ ہر عطا کردہ چیز کو کہا جاتا ہے۔چنانچہ مال بھی رزق میں شامل ہے۔علم بھی رزق میں شامل ہے۔طاقت بھی رزق میں شامل ہے۔رزق بمعنیٰ اناج بھی رزق میں شامل ہے۔وقت بھی رزق میں شامل ہے۔غرض ہر وہ چیز جس سے انسان کو کسی نہ کسی رنگ میں فائدہ پہنچتا ہو وہ رزق ہے۔ پس مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ انسان کو جو کچھ بھی دے۔اسے لوگوں کے فائدہ کے لئے خرچ کرنا چاہیے۔اگر کوئی شخص ہنر تو جانتا ہے لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہنر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تو تم اس کی سرمایہ سے مدد کرو۔جس کے پاس کھانے کو نہیں ہے اس کو تم کھانے کے لئے دو۔جس کے پاس پینے کو نہیں ہے اسے پینے کے لئے دو۔جس کے پاس پہننے کو نہیں ہے اسے پہننے کے لئے مہیا کرو۔اسی کے مطابق ایک لطیفہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے۔کہ ایک بزرگ قرآن کریم پڑھتا جارہا تھا۔ وہ منہ سے بھی پڑھتا تھا۔آنکھوں سے بھی الفاظ کو دیکھتا تھا اور انگلی بھی الفاظ کے ساتھ ساتھ قرآن کریم پر پھیرتا جاتا

تھا۔کسی نے اسے کہا۔ کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہ تینوں چیزیں مجھے خدا تعالیٰ نے دی ہوئی ہیں۔اگر میں صرف زبان سے قرآن کریم پڑھوں گا تو خدا تعالیٰ کہے گا ہاتھوں اور آنکھوں سے کیوں کام نہ لیا۔اگر میں زبان اور ہاتھوں کو استعمال کروں گا۔تو اللہ تعالیٰ کہے گا آنکھوں کو کیوں نہ استعمال کیا۔اور اگر صرف آنکھوں سے قرآن کریم پڑھوں گا اور زبان اور ہاتھ نہ ہلاؤں گا تو خدا تعالیٰ کہے گا ان سے کیوں نہ کام لیا۔اس لئے میں ان تینوں اعضاء کو ایک ہی وقت میں استعمال کر لیتا ہوں۔

غرض اللہ تعالیٰ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کی یہ خوبی بیان فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں بنی نوع انسان کی اتنی گہری محبت ہے کہ انہیں جو کچھ بھی ملے اس کا ایک حصہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے ضرور صرف کرتے ہیں۔وہ صرف روپیہ دے کر یہ نہیں سمجھ لیتے کہ انہوں نے خدمت کا حق ادا کر دیا ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہر چیز میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور اس طرح ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے اپنی تائی صاحبہ مرحومہ کو دیکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کی اسّی پچاسی سال کی عمر ہوگئی تھی۔پھر بھی وہ سارا سال روئی کاتتیں۔پھر اٹیاں بناتیں پھر جولاہوں کو دے کر اس کا کپڑا بنواتیں اور پھر رضائیاں اور توشکیں بنوا کر غریبوں میں تقسیم کرتیں۔اور اس میں سے بہت سا کام وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتیں۔اور جب کہا جاتا کہ دوسروں سے کروالیا کریں تو کہتیں اس طرح مزا نہیں آتا۔تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چیز کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے۔وہ لوگ جو کسی غریب کو چند پیسے دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس پر عمل ہو گیا وہ غلطی کرتے ہیں۔ جو شخص پیسے تو خرچ کرتا ہے مگر زبان سے تبلیغ نہیں کرتا وہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس حکم پر پوری طرح عمل کر لیا ہے یا جو تبلیغ بھی کرتا ہے مگر بیواؤں اور یتیموں کی خدمت نہیں کرتا وہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس حکم پر پوری طرح عمل کر لیا ہے۔اسی طرح اپنے جذبات کو بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنا ضروری ہوتا ہے۔مثلاً کسی پر غصہ چڑھا تو معاف کر دیا۔اس حکم میں خدمت خلق سے تعلق رکھنے والے مختلف قسم کے کام بھی شامل ہیں جن کی طرف ہماری جماعت کے نوجوانوں کو خصوصیت سے توجہ کرنی چاہیے اور مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر تمام بنی نوع انسان کی احمدی معیار کے مطابق خدمت کرنی چاہیے تا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

تیسری خوبی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ٘ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ٘ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ۔ جب وہ خدائے واحد کا انکار کرنے والوں سے کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم ہماری دشمنی کیوں کرتے ہو۔ہمارے اعمال کا بدلہ ہم کو

ملے گا اور تمہارے اعمال کا بدلہ تم کو ملے گا۔ہم تو تمہارے خیر خواہ ہی ہیں لیکن ہم کسی جاہل مطلق غصیلے کی صحبت پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے لوگوں کی یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں۔مگر افسوس کہ آج مسلمان بھی جن کی کتاب قرآن ہے اور یوروپین امریکن نومسلم بھی جن کا اس آیت میں ذکر ہے سینما اور تھیٹروں کی طرف جاتے ہیں۔اور لغو سے اعراض کرنے کی بجائے لغو سے محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد و عورت کے اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور تھیٹر سارے کے سارے مرد و عورت کے اختلاط کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔اگر وہ اختلاط نہ کریں اور اگر وہ مل کر ناچیں نہیں تو فلم بن ہی نہیں سکتی۔فلم اسی طرح بنتی ہے کہ مرد بھی ناچتے ہیں اور عورتیں بھی ناچتی ہیں اور فلم تیار ہو جاتی ہے۔اور یہ چیز اسلامی نقطۂ نگاہ سے ناجائز ہے۔مگر آج کا مسلمان بھی اس لغو پر جان دے رہا ہے اور آج کا یوروپین اور امریکن نومسلم بھی اس لغو میں ملوّث ہے۔کاش وہ نصیحت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ

تُو جس کو پسند کرے ہدایت نہیں دے سکتا۔لیکن اللہ (تعالیٰ) جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔اور وہ ہدایت

یَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۷﴾

پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو جس کو چاہے اسے ہدایت نہیں دے سکتا۔ہاں اللہ تعالیٰ جسے پسند کرتا ہے اسے ہدایت دے دیتا ہے۔اور خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے مستحق ہیں۔یعنی تُو تو سب دنیا کا خیر خواہ ہے۔اور چاہتا ہے کہ سب کو ہدایت میسر آ جائے۔مگر تیری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ انہی لوگوں کے لئے ہدایت کے سامان پیدا کرتا ہے جو خود ہدایت کے جویاں ہوتے ہیں۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَ

اور وہ کہتے ہیں اگر ہم اس ہدایت کی جو تجھ پر نازل ہوتی ہے اتباع کریں تو اپنے ملک سے اچک لئے جائیں گے۔

لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ

(تو کہہ دے) کیا ہم نے ان کو محفوظ اور امن والے مقام میں جگہ نہیں دی۔ جس کی طرف ہر قسم کے پھل لائے

شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۸﴾

جاتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے عطیہ ہے۔ مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔

حل لغات۔ نُتَخَطَّفْ نُتَخَطَّفْ تَخَطَّفَهٗ کے معنے ہیں اِنْتَزَعَهٗ۔ اس جگہ کو سے ہلا دیا وَاجْتَذَبَهٗ اور اسے کھینچا۔ وَاسْتَرَقَهٗ وَاسْتَلَبَهٗ وَمَرَّبِهٖ سَرِيْعًا۔ اُسے اُچک لیا اور چھین کر جلدی سے چلا گیا۔ (اقرب) پس نُتَخَطَّفْ کے معنے ہوں گے ہم اُچک لئے جائیں گے۔

يُجْبٰى يُجْبٰى جَبٰى يَجْبِىْ (جِبَايَةً) جَبَا يَجْبُو (جَبْوَةً وَجَبَاوَةً) سے مضارع مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے اور جَبَا الْخَرَاجَ وَجَبَى الْمَالَ وَالْخَرَاجَ کے معنے ہیں جَمَعَهٗ۔ مال اور خراج اکٹھا کیا۔ اَلْجَابِيَةُ: اَلْحَوْضُ الَّذِىْ يُجْبٰى فِيْهِ الْمَآءُ لِلْاِبِلِ۔ جَابِيَه اس حوض کو کہتے ہیں جس میں اونٹوں کے لئے پانی جمع کیا جاتا ہے۔ (اقرب) پس يُجْبٰى کے معنے ہوں گے جمع کیا جاتا ہے۔

تفسیر۔ فرمایا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ان سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بھی تیرے ساتھ مل کر اسلام کو مان لیں تو لوگ ہم کو اُچک کر لے جائیں۔ یعنی تیری تعلیم تو امن والی ہے اگر ہم بھی امن کا راستہ اختیار کر لیں تو اردگرد کی قومیں ہمیں فوراً تباہ کر دیں گی۔ اور ہمیں غلام بنا کر لے جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتا ہے کہ کیا ہم نے ان کو حرم میں جگہ نہیں دی۔ جو محفوظ اور امن والا مقام ہے۔ اور جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں۔ جو ہماری طرف سے بطور رزق اور عطیہ کے ہیں۔ لیکن افسوس ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کی حفاظت فرمائی ہے۔ جس نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کر دیا اور بیت اللہ کو محفوظ رکھا۔ اور جو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں ساری دنیا کے پھل اور غلّے لا رہا ہے کیا اس زمانہ کی آئی ہوئی ہدایت کے ماننے پر وہ ان کی حفاظت نہیں کرے گا۔ اور انہیں بے یارو مددگار چھوڑ دے گا۔ یعنی یہ

کیسی نابینائی کی علامت ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ ابراہیمؑ کے زمانہ سے خدا تعالیٰ کے اس عظیم الشان نشان کو دیکھ رہے ہیں کہ جہاں گھاس کی ایک پتی تک نہیں پائی جاتی اور جہاں معمولی روٹی بھی انہیں کھانے کے لئے میسر نہیں آسکتی تھی وہاں دنیا بھر کے عمدہ سے عمدہ میوے اور اعلیٰ سے اعلیٰ پھل خدا تعالیٰ نے جمع کر دیئے ہیں۔ پھر بھی وہ اس خیالی خطرہ کی وجہ سے کہ اردگرد کی قومیں انہیں نوچ کر کھا جائیں گی اسلام کو قبول کرنے سے محروم ہو رہے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کا اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے کبھی ضائع نہیں کرتا۔ اگر وہ اسلام کو قبول کرلیں تو جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے ان کی تائید فرمائی ہے اور انہیں ایک بے آب و گیاہ جنگل میں اپنی نعمتیں پہنچائی ہیں۔ وہ اب بھی ان کی حفاظت کے سامان پیدا کر دے گا اور ان کے دشمنوں کو ان پر غالب نہیں آنے دے گا۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ

اور بہت سی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا جو اپنی معیشت (کے افراط) کی وجہ

مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا

سے متکبر ہو گئی تھیں۔ پس (دیکھ) یہ ان کی بستیاں ہیں جن میں ان کے

نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۹﴾

بعد کوئی نہیں رہا۔ اور ہم ہی ان کے وارث بنے۔

حل لغات۔ بَطِرَتْ بَطِرَتْ بَطِرَ (يَبْطَرُ بَطَرًا) کے معنے ہیں اَخَذَتْهُ دَهْشَةٌ وَ حَيْرَةٌ عِنْدَ هُجُوْمِ النِّعْمَةِ عَنِ الْقِيَامِ بِحَقِّهَا۔ نعمت کی فراوانی پر اس کے حقوق کی ادائیگی میں لا ابالی اور بے پرواہی برتنے لگا۔ اَوْ طَغٰى بِالنِّعْمَةِ اَوْ عِنْدَهَا۔ نیز اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ نعمت کے سبب سے یا نعمت کی موجودگی میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور سرکش بن گیا۔ نیز بَطِرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں كَرِهَهٗ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّسْتَحِقَّ الْكَرَاهَةَ۔ یعنی ایسی چیز کو ناپسند کیا جو ناپسندیدگی کے لائق نہیں تھی۔ کہتے ہیں۔ بَطِرَ الْحَقَّ اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ تَكَبَّرَ عَنْهُ فَلَمْ يَقْبَلْهُ۔ حق سے تکبر کیا اور اسے قبول نہ کیا۔ وَعِنْدَ بَعْضِهِمْ لَمْ يَرَهٗ حَقًّا فَتَكَبَّرَ عَنْ قُبُوْلِهٖ اور بعض نے اس

کا مفہوم یہ لیا ہے کہ اس نے اس چیز کو حق نہ سمجھا جس کی بنا پر اس کے قبول کرنے میں تکبر کیا اور بَطِرَ فُلَانٌ النِّعْمَةَ کے معنے ہیں اِسْتَخَفَّهَا فَكَفَرَهَا۔ نعمت کو خفیف سمجھا اور اس کی بناء پر اس کی ناقدری کی۔ اور اَبْطَرَهُ الْمَالُ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ بَطِرًا۔ مال نے اس کو متکبر بنادیا۔ (اقرب) پس بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا کے معنے ہیں۔ بستیاں اپنی معیشت کے افراط کی وجہ سے متکبر ہو گئیں۔

تفسیر۔ فرمایا۔ انہیں اپنی اس عزت کی وجہ سے جو ابراہیمی دعاؤں کی وجہ سے حاصل ہے مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں بہت سی بستیاں ایسی ہیں جو اپنی معیشت کے سامانوں کے افراط کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ مگر پھر دیکھ لو تمہارے سامنے ان کے گھر موجود ہیں جو اُجڑ گئے۔ اور ان کے بعد ان میں کوئی نہ رہا۔ اور ہم ہی ان ملکوں کے وارث ہو گئے یعنی ان کی اولادیں تک باقی نہ رہیں اور ان کے آباد مکانات ویران اور سنسان جنگلات کی طرح بن گئے۔ پھر مکہ والے کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور محض خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق پر کیوں اترا رہے ہیں۔ اور کیوں سچائی کو قبول نہیں کرتے جو اصل چیز ہے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا

اور تیرا رب جب تک (کسی بستیوں کے مجموعہ کی) مرکزی بستی میں ایسا رسول نہ بھیج دے جو ان کے سامنے ہماری آیتیں

رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَ

پڑھ کر نہ سنائے ان بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو ہلاک کرنے کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا (کیونکہ یہ انصاف کے

اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۶۰﴾

خلاف ہے) اور ہم کسی بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو کبھی ہلاک نہیں کرتے سوائے اس کے کہ ان کے رہنے والے ظالم ہو جائیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ جب تک کسی ملک کے مرکزی مقام پر یعنی اس مقام پر جو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں دین کا مرکز ہونے کے لائق ہو اللہ تعالیٰ کسی رسول کو نہ بھیج لے جو اس ملک کے لوگوں کو خدا تعالیٰ کے احکام سے آگاہ کرے اس وقت تک خدا تعالیٰ اس ملک پر عذاب نازل نہیں کیا کرتا۔

اور نہ خدا تعالیٰ کبھی کسی ملک کو اس وقت تک ہلاک کرتا ہے جبکہ اس ملک کے رہنے والے انصاف پسند ہوں۔ عذاب صرف قوم کے ظالم ہوجانے کی وجہ سے یا نبی کے ردّ کرنے کی وجہ سے آتا ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ طٰہٰ میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى (طٰہٰ:۱۳۵) یعنی اگر رسول کی بعثت سے پہلے ہم ان پر عذاب نازل کر دیتے تو یہ ہم پر اعتراض کرتے کہ جب ہم گمراہ تھے اور ہدایت کے محتاج تھے تو تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام کو قبول کر لیتے۔ اور خدا تعالیٰ ان کے اعتراض کو صحیح تسلیم کرتا ہے اور اس کا ردّ نہیں کرتا۔ بلکہ اس مضمون کو قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بیان کر کے اس کی اہمیت کو ثابت فرماتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (الانعام:۱۳۱، ۱۳۲) یعنی اے جنّوں اور انسانوں کی جماعتو! کیا تم میں سے ہی تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں آئے تھے۔ جو تمہیں ہمارے احکام پڑھ پڑھ کر سناتے اور تم پر جو یہ دن آنے والا تھا اس سے تمہیں ڈراتے تھے وہ کہیں گے۔ ہم اپنے خلاف آپ گواہی دیتے ہیں۔ اور درحقیقت انہیں ورلی زندگی نے دھوکا دے دیا۔ اور انہوں نے اپنے خلاف آپ گواہی دے دی کہ وہ کافر تھے۔ یہ (رسولوں کا بھیجنا اور کفار پر حجت قائم کرنا) اس لئے تھا کہ تیرا خدا شہروں کو اس حالت میں کہ لوگ غافل تھے ظالمانہ طور پر ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا ہوشیار کر دینے کے کسی قوم کی ہلاکت کا فتویٰ لگا دینا ظلم ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر کوئی قوم ہدایت کی محتاج ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہادی نہ بھیجے لیکن قیامت کے دن اسے سزا دے کہ تم نے کیوں احکامِ الٰہی پر عمل نہیں کیا تھا تو یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ اس وقت تک کوئی عالمگیر عذاب دنیا پر نازل نہیں کرتا جب تک کہ اس سے پہلے لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لئے وہ اپنا کوئی رسول مبعوث نہ کر دے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں بھی دنیا پر ایسی تباہیاں اور عذاب آرہے ہیں کہ جن کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس لئے یہ عذاب اور تباہیاں بھی بانی سلسلہ احمدیہ کی صداقت کا ثبوت ہیں۔ جنہیں خدا تعالیٰ نے رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور جنہوں نے دنیا کو قبل از وقت ہوشیار کرتے ہوئے فرما دیا تھا کہ

’’دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔لیکن خدا اسے قبول کرے گا۔اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔‘‘ (براہین احمدیہ جلد چہارم، روحانی خزائن جلد اول صفحہ ۵۵۷)

چنانچہ اس الہام کے بعد خدا تعالیٰ کے حملے مختلف زلازل اور لڑائیوں اور بیماریوں اور سیلابوں کی شکل میں اس زور سے ہوئے کہ ان کے نتیجہ میں لاکھوں لوگ ہلاک ہو گئے۔اور انہوں نے دنیا میں ہی قیامت کا نظارہ دیکھ لیا۔مگر افسوس کہ اتنی شدید تباہیوں کے بعد بھی بعض لوگوں کے دل ایسے سخت ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑی دلیری سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ ان زلازل اور طوفانوں اور بیماریوں اور لڑائیوں کا کیا ہے۔یہ مصائب تو ہمیشہ دنیا میں آتے رہے ہیں اور چونکہ پہلے زمانوں میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے نبیوں کے مقابلہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔اور ان کے نشانات کی تحقیر کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس اعتراض کا بھی ذکر کر دیا ہے۔اور فرمایا ہے کہ:۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ۔ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (الاعراف:۹۵،۹۶)۔ یعنی ہم نے کبھی کوئی رسول کسی بستی کی طرف نہیں بھیجا کہ اس کے بھیجنے کے ساتھ ہی وہاں کے لوگوں کو ہم نے مالی اور بدنی مصائب میں گرفتار نہ کیا ہو۔اور اس سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے حضور عاجزی کریں۔ پھر اس کے بعد ہم ان کی تکلیف کو سہولت سے بدل دیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ خوب ترقی کر جاتے ہیں تو یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ دُکھ اور سُکھ دونوں ہمارے باپ دادا کو بھی پہنچا کرتے تھے۔پھر ان دکھوں میں نبیوں کی صداقت کا کیا ثبوت ہے؟ پس ہم ان کو اچانک پکڑ لیتے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ ایسا کیوں ہوا۔(اعراف ع ۲ آیت ۹۵،۹۶)

پس یہ ایک خطرناک خیال ہے جو حق سے دور ہونے والے لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔حق یہی ہے کہ عالمگیر عذاب اسی وقت اور اسی زمانہ میں آتے ہیں جب پہلے کوئی رسول مبعوث ہو چکا ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (الاسراء:۱۶) یعنی ہم کبھی عذاب نہیں بھیجا کرتے جب تک کہ اس سے پہلے رسول نہ بھیج لیا کریں۔پس یہ عذاب اس قابل نہیں کہ ان کو معمولی سمجھا جائے بلکہ یہ اس بات کی علامت ہیں کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا کوئی رسول مبعوث ہو چکا ہے۔

وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَ

اور جو کچھ تمہیں دیا جاتا ہے وہ تو صرف ورلی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے۔ اور جو اللہ کے پاس ہے

مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؑ ﴿٦١﴾

ع ۶ ۹

وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم عقل نہیں کرتے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے لوگ بعض دفعہ اپنی نادانی سے دنیوی سامانوں کو ہی اپنی ترقی اور کامیابی کا معیار سمجھ لیتے ہیں اور وہ اسی پر اتراتے پھرتے ہیں کہ ان کے پاس بڑا مال ہے یا انہیں بڑی عزت یا رسوخ حاصل ہے۔ حالانکہ وہ سامان بہت تھوڑے عرصہ کے لئے ان کے آرام کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق جو قوم کو ترقی ملتی ہے وہ تھوڑی سی تجارت یا تھوڑے سے سونے چاندی کا نام نہیں ہوتا بلکہ وہ اس سے بہت بہتر چیز ہے اور باقی رہنے والی ہے یعنی اقتدار اور غلبہ۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم عقل نہیں رکھتے کہ اس بات کو سمجھ سکو اور انفرادی ترقی کی بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر قومی ترقی کے حصول کی کوشش کرو۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ

کیا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا (یعنی اخروی زندگی کی کامیابی کا) وعدہ کیا ہو اور وہ اسے (یقیناً) پا لینے والا ہو اس

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ

شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو ہم نے صرف دنیوی زندگی کا کچھ سامان دیا ہو۔ پھر وہ قیامت کے دن (خدا کے

الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٦٢﴾

روبرو جواب دہی کے لئے) پیش کیا جانے والا ہو۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ دنیوی دولت دیتا ہے۔ وہ باوجود دنیا کی دولت پر قابض ہونے کے اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جس سے اللہ تعالیٰ آئندہ روحانی برکات کا وعدہ کرتا ہے۔ کیونکہ اگر

وہ مومن ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے وعدے کو حاضر سے کم نہیں سمجھے گا۔ اور چونکہ اس کا حاضر مادی ہے اور اس کا موعود روحانی ہے اس لئے اس کے ایمان کی علامت یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اس موعود کو بڑا سمجھے اور اس کے حاضر کو حقیر سمجھے۔

وَعَدْنٰهُ کے ساتھ وَعْدًا حَسَنًا کے الفاظ اس لئے بڑھائے گئے ہیں کہ عربی زبان میں وعدہ کا لفظ بعض دفعہ عذاب کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۔ قَالُوْا نَعَمْ ۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۔ (الاعراف: ۴۵) یعنی جنتی لوگ دوزخیوں سے کہیں گے کہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا اس کو تو ہم نے سچا پا لیا۔ کیا تم نے بھی اس وعدہ کو جو تمہارے رب نے تمہارے ساتھ کیا تھا سچا پا لیا ہے؟ اس پر دوزخی کہیں گے ہاں ہاں! پس ایک پکارنے والا ان کے درمیان زور سے پکارے گا کہ ان ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔

پس چونکہ صرف وعدہ کا لفظ بعض دفعہ وعید کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے وَعَدْنٰهُ کے ساتھ وَعْدًا حَسَنًا کے الفاظ بھی بڑھا دیئے یہ بتانے کے لئے کہ اس جگہ وہ وعدہ مراد ہے جو مومنوں کی اخروی ترقی اور ان کے روحانی انعامات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ میں بتایا کہ اچھی بات تو وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو۔ لیکن جس کو دنیا میں مال و متاع مل گیا اور قیامت کے دن وہ جواب طلبی کے لئے بلایا گیا تو وہ اس شخص کے برابر کس طرح ہو سکتا ہے جس سے نیک سلوک کا وعدہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بسا اوقات بڑے وسیع مطالب صرف صیغوں کے ذریعہ ہی ادا کر دیتا ہے اس جگہ بھی مُحْضَرِيْنَ میں مجہول کا صیغہ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ خود تو حاضر ہونا نہیں چاہیں گے لیکن جس طرح مجرموں کو ہتھکڑی لگا کر عدالت میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں بھی کشاں کشاں لایا جائے گا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

اور (یاد کرو) جس دن وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان کو بلائے گا پھر پوچھے گا کہ میرے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم میرے

تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ

مقابل پر معبود قرار دیتے تھے۔ (تب) جن پر ہمارے عذاب کی خبر پوری ہو چکی ہو گی کہیں گے۔ اے ہمارے

الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ز

رب! یہ وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے بہکایا تھا۔ ہم نے ان کو اسی طرح بہکایا تھا جس طرح ہم خود بہک گئے تھے۔ آج ہم

مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ

تیرے پاس اپنی گمراہی سے برأت ظاہر کرتے ہیں وہ لوگ ہمارے عبادت گذار نہیں تھے (بلکہ اپنے خیالوں کے

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ

پیچھے چلتے تھے) اور (جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو پھر ان سے) کہا جائے گا کہ (اب تو تمہیں مہلت مل چکی ہے شاید

اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۵﴾

اب تم کو اپنے مزعومہ معبودوں کو بلانے کی طاقت ہو گئی ہو اگر ٹھیک ہے تو اب) اپنے جھوٹے معبودوں کو بلا کر دیکھ لو۔ اس پر وہ (لوگ) پھر ان (یعنی جھوٹے معبودوں) کو بلائیں گے۔ لیکن وہ ان کے بلانے کے نتیجہ میں آئیں گے نہیں۔ اور (سارے کے سارے مل کر) خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے۔ کاش کہ وہ (اس کو دیکھ کر ہی) ہدایت پا جاتے (مگر افسوس کہ ایسا بھی نہ ہوا)۔

تفسیر ۔اس آیت میں ان شرک کرنے والے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دنیا میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔ اور فرماتا ہے کہ اس دن کو بھی یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو بلائے گا اور کہے گا اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۔وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کے متعلق تم بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ یعنی وہ شریک تھے تو نہیں لیکن تم ان کو شریک قرار دیتے تھے۔

قَالَ الَّذِیۡنَ حَقَّ عَلَیۡهِمُ الۡقَوۡلُ اس پر وہ مزعومہ شریک جن کے خلاف ہمارے عذاب کی خبر پوری ہو چکی ہو گی کہیں گے کہ اے ہمارے رب! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔لیکن شرارتاً گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ ہم خود بھی گمراہ ہو چکے تھے۔آج ہم تیرے حضور اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہوا و ہوس کو انہوں نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔

اس مضمون سے ظاہر ہے کہ اس جگہ ایسے معبودوں کا ذکر ہے جو دنیا میں شرارتیں کر کے لوگوں کو بہکا دیتے تھے۔ نہ کہ کسی غیر مرئی وجود کا۔اور شریک سے مراد واقعہ میں خدا قرار دینا نہیں کیونکہ جن کو لوگ واقعہ میں خدا قرار دیتے ہیں وہ نہ تو خود گمراہ ہیں اور نہ کسی کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ ان کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ لوگ ان کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے متعلق آتا ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کیا تُو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا لو۔تو حضرت مسیح علیہ السلام جہاں اور جواب دیں گے وہاں ایک یہ جواب بھی دیں گے کہ وَ کُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ (المائدۃ:۱۱۸) یعنی جب تک میں ان میں موجود رہا میں ان کا نگران رہا۔مگر جب تو نے میری روح قبض کر لی۔اور مجھے اپنی طرف بلا لیا تو تُو ہی ان کا نگران تھا۔میں نہ تھا۔اور تُو ہی ہر چیز کا حقیقی نگران ہے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور ان کی والدہ جنہیں عیسائی خدا قرار دیتے ہیں ان کو تو پتہ بھی نہیں کہ لوگ ان کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔مگر آیت بتا رہی ہے کہ وہ شرکاء کہیں گے کہ خدایا ہم نے ان لوگوں کو خود گمراہ کیا تھا اور اس وجہ سے کیا تھا کہ ہم خود بھی گمراہ ہو چکے تھے۔پس یہاں ائمۃ الکفر مراد ہیں جو لوگوں کو اپنی وجاہت اور اپنے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اپنے پیچھے چلاتے تھے۔وہ یہ عذر پیش کریں گے کہ خدایا ہم نے ان کو وہی باتیں سکھا دیں جن کو ہم سچا سمجھتے تھے اور یہ لوگ ان کو اس لئے مانتے تھے کہ خود ان کا اپنا دل چاہتا تھا ورنہ ہمارا ان پر کیا زور تھا۔

اس کے بعد پھر دوسری قسم کے معبودوں کے متعلق سوال شروع ہو گا جن کی لوگ واقعہ میں عبادت کیا کرتے تھے اور پرستش کرنے والوں سے کہا جائے گا کہ ان شریکوں کو اب بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہیں اس مصیبت سے بچائیں وہ انہیں پکاریں گے مگر ان کے معبود ان کو کوئی جواب نہیں دیں گے اور خدائی عذاب کی علامتیں ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔

لَوْ اَنَّھُمْ کَانُوْا یَھْتَدُوْنَ کاش یہ لوگ ہدایت کا راستہ اختیار کرتے اور شرک کا ارتکاب کر کے عذاب الٰہی کا مورد نہ بنتے۔

وَ یَوْمَ یُنَادِیْھِمْ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۶۶﴾

اور اس دن (کو بھی یاد کرو جب) خدا ان کو پکارے گا اور کہے گا تم نے رسولوں (کے وعظ)

فَعَمِیَتْ عَلَیْھِمُ الْاَنْۢبَآءُ یَوْمَئِذٍ فَھُمْ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۷﴾

کا کیا جواب دیا تھا؟ پس اس دن ساری دلیلیں انہیں بھول جائیں گی۔ اور وہ ایک دوسرے سے کوئی سوال نہ

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ

کر سکیں گے۔ پس جو کوئی توبہ کرے گا اور ایمان لائے گا اور مناسب حال عمل کرے گا قریب ہو گا

مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ﴿۶۸﴾

کہ وہ بامراد لوگوں میں شامل ہو جائے۔

حل لغات۔ عَمِیَتْ عَمِیَتْ عَمِیَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور عَمِیَ کے معنے ہیں ذَھَبَ بَصَرُہٗ کُلُّہٗ مِنْ عَیْنَیْہِ کِلْتَیْھِمَا اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اور عَمِیَ فُلَانٌ کے معنے ہیں ذَھَبَ بَصَرُ قَلْبِہٖ وَجَھِلَ۔ اس کے دل کی بصیرت جاتی رہی۔ اور وہ جاہل رہ گیا۔ عَمِیَ عَلَیْہِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں اِلْتَبَسَ وَ اشْتَبَہَ وَمِنْہُ فَعَمِیَتْ عَلَیْھِمُ الْاَنْۢبَآءُ یَوْمَئِذٍ۔ یعنی ساری چیزیں ان پر مشتبہ ہو جائیں گی اور بھول جائیں گی اور عَمِیَتِ الْاَخْبَارُ عَنْ فُلَانٍ کہیں تو معنے ہوں گے خَفِیَتْ۔ فلاں شخص سے خبریں مخفی رہ گئیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ فرمایا۔ تم اس دوسرے وقت کو بھی یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ کفار کو اپنے سامنے حاضر کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ جو رسول میں نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے تھے تم نے ان کو کیا جواب دیا تھا؟ اس پر بجائے اس کے کہ وہ کوئی بات کریں جہنم کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایسے پریشان ہوں گے کہ تمام خیالات ان کے دماغ سے نکل جائیں گے اور انہیں کچھ یاد نہیں رہے گا کہ ہم کیا کچھ کرتے تھے بلکہ وہ ایسے گھبرا جائیں گے کہ ایک دوسرے سے بھی کچھ پوچھ نہیں سکیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ۔ہاں جو لوگ توبہ کی توفیق پا گئے اور ایمان لے آئے اور اس کے مطابق انہوں نے عمل بھی کئے وہ یقیناً اس دن کامیاب ہوں گے۔عَسٰی کا لفظ گو امید کے معنے دیتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ لفظ استعمال کیا جائے تو پھر اس کے معنے یقین اور قطعیت کے ہوتے ہیں (تفسیر قرطبی جلد ۱۳ ص ۳۰۴) پس عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ایسے لوگ یقیناً کامیاب ہوں گے۔

وَ رَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخْتَارُ ؕ مَا کَانَ لَھُمُ

اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔اور جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ان کو اس بارہ میں کوئی اختیار

الْخِیَرَۃُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَ رَبُّکَ

حاصل نہیں۔اللہ (تعالیٰ) پاک ہے اور ان کی مشرکانہ باتوں سے بلند ہے۔اور تیرا رب اس کو بھی جانتا ہے جس

یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۰﴾

کو وہ سینہ میں چھپاتے ہیں اور اسے بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔

حل لغات۔اَلْخِیَرَۃُ اَلْخِیَرَۃُ خَارَ کا مصدر ہے اور خَارَ الرَّجُلَ عَلٰی غَیْرِہٖ کے معنے ہیں فَضَّلَہٗ اس کو غیر پر فضیلت دی۔اور جب خَارَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہوں گے اِنْتَقَاہُ۔اس کو چن لیا۔اور خَیَّرَ فُلَانًا فِی الْاَمْرِ وَبَیْنَ الْاَمْرَیْنِ کے معنے ہیں فَوَّضَ اِلَیْہِ الْخِیَارَ۔دو کاموں میں اس کو اختیار دیا۔پس اَلْخِیَرَۃُ کے معنے ہوں گے۔فضیلت۔اختیار یا چننا۔

تُکِنُّ تُکِنُّ اَکَنَّ سے مضارع واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور اَکَنَّ الشَّیْءَ کے معنے ہیں سَتَرَہٗ فِیْ کِنِّہٖ وَغَطَّاہُ وَاَخْفَاہُ۔ایک چیز کو تھیلی میں چھپایا۔اَلْکِنُّ: وِقَآءُ کُلِّ شَیْءٍ وَسِتْرُہٗ اور کِنّ اس تھیلی وغیرہ کو کہتے ہیں جس میں چیزوں کو محفوظ کیا جائے اور انہیں چھپا کر رکھا جائے (اقرب) پس تُکِنُّ صُدُوْرُھُمْ کے معنے ہوں گے۔وہ باتیں جن کو وہ اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں۔

تفسیر۔اس آیت میں بتایا کہ تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔یعنی دنیا میں جس تغیر کو چاہتا ہے جاری

کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اسے دنیا کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیتا ہے۔لیکن ان کفار کے مزعومہ شرکاء کو اس تغیر و تبدل پر کچھ اختیار حاصل نہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقائص اور کمزوریوں سے منزّہ ہے اور وہ ان لوگوں کے مشرکانہ اعتقادات اور خیالات سے بہت بالا ہے۔

رَبُّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا بھی ردّ کر دیا ہے جو روح اور مادہ کو ازلی سمجھتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ کو خالق الاشیاء نہیں بلکہ محض روح اور مادہ کو جوڑ کر نئی نئی شکلیں قائم کرنے والا قرار دیتے ہیں۔اسی طرح رَبُّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے ان نیچریوں کا بھی ردّ کر دیا ہے جن کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں پیدا کر کے پھر چھوڑ دیا ہے اور اب اس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔گویا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حیثیت نعوذ باللہ ایک معمار کی سی ہے کہ جس طرح معمار مکان بنا کر اس سے الگ ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو تو پیدا کیا ہے مگر پھر اس سے الگ ہو گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ کہہ کر ان دونوں قوموں کا ردّ کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ خالق بھی ہے اور پھر وہ انسان کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اس کی ترقیات میں اس کی پوری پوری نگہداشت رکھتا اور ہر قدم پر اس کی خبر گیری کرتا ہے۔چنانچہ جب دنیا ہدایت کی پیاسی ہوتی ہے تو ربوبیت کی صفت کے ماتحت ہی وہ ان کی طرف اپنا رسول مبعوث کرتا ہے جو دنیا میں پھر ایک نیا تغیر پیدا کر دیتا ہے۔لیکن یہ مشرک بھی تو بتائیں کہ ان کے مزعومہ شرکاء دنیا میں کیا کر رہے ہیں اور کون سے تغیرات ہیں جو ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔اور اگر وہ کوئی ایک تغیر بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جو ان کے مزعومہ شرکاء کی وجہ سے ظہور میں آیا ہو تو ان کا دوسروں کو شریک باری ٹھہرانا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

پھر فرمایا وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ۔تیرا رب ان کے سینوں کی چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے اور ان تدبیروں کو بھی جانتا ہے جنہیں وہ ظاہر کر رہے ہیں۔مگر وہ یاد رکھیں کہ نہ ان کے منصوبے ان کے کسی کام آ سکتے ہیں اور نہ ان کی تدبیریں انہیں کامیابی کا مونہہ دکھا سکتی ہیں۔زمین و آسمان کا خدا اب فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ اپنی توحید کو دنیا میں پھیلائے اور شرک کو مٹا دے۔پس اب شرک کی تائید میں ظاہری اور مخفی تدابیر انہیں کامیاب نہیں کر سکتیں۔

وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَةِ ۫

اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ (تعالیٰ) کی ذات ایسی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ابتدائے آفرینش میں بھی وہی

وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

تعریف کا مستحق تھا اور آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا۔ سب بادشاہت اسی کے قبضہ میں ہے اور تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا۔

تفسیر۔ شرک کی تردید کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ توحید حقیقی کا مقام دنیا کے سامنے واضح کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ ابتداء میں بھی وہی تعریف کا مستحق تھا اور آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا۔ تمام بادشاہت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا پڑے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت یہ ہے کہ ابتداء اور انجام سب اسی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جہاں جہاں اس کا ہاتھ کام کرتا دکھائی دیتا ہے وہاں تعریف کے پہلو ہی نکلتے ہیں اور پھر سب چیزیں آخر میں فنا ہو جاتی ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی باقی رہتی ہے جو اس کی احدیت کا ثبوت ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَةِ میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رحمانیت آغاز کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور رحیمیت انجام کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ بنی نوع انسان کے تمام تعلقات خواہ وہ خدا تعالیٰ سے ہوں یا بنی نوع انسان سے ان میں پہلا واسطہ رحمانیت سے ہی ہوتا ہے اور اس پر جتنا بھی غور کیا جائے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ثابت ہوتی ہے۔ ماں بچے کو پیٹ میں رکھ کر اور پھر دودھ پلا کر بچے کی محسن سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ پیٹ میں پرورش کے سامان کس نے پیدا کئے اور چھاتیوں میں دودھ کس نے بنایا تو اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ بچہ کی کفالت کرتا اور اس پر خرچ کرنے کی وجہ سے اس کا محسن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جن قوتوں سے وہ کماتا ہے اور جن سامانوں سے وہ کام لیتا ہے انہیں وہ خود نہیں بناتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہی عطیہ ہوتے ہیں۔ پس اصل تعریف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوتی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔ دنیا حسن کی تعریف کرتی ہے مگر کیا کوئی شخص اپنی شکل خود بناتا ہے۔ دنیا علم کی تعریف کرتی ہے مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ علم جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ نے بنائی ہیں اور جس حافظہ سے یاد رکھا جاتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ نے

بنایا ہوتا ہے۔ دنیا ذہین اور عقلمند لوگوں کی تعریف کرتی ہے مگر ذہن اور عقل دونوں کسب سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ یہ دونوں چیزیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں۔ پس حمد کا اصل مستحق وہی ہے جس نے وہ سامان پیدا کئے۔ کم عقل انسان خیال کرتا ہے کہ دنیا میں مخلوق کی تعریف ہو رہی ہے لیکن حقیقت شناس انسان جانتا ہے کہ یہ سب عقل کا دھوکا ہے اصل تعریف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے۔ اور وہی اس کا مستحق ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہے۔ یعنی وہ صرف رحمٰن ہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہے اور رحیم کے معنے بار بار رحم کرنے والے کے ہیں۔ اور بار بار رحم کا سلسلہ تبھی جاری رہ سکتا ہے جبکہ انسان کو ابدی زندگی عطا ہو۔ اور ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو آخر خدا تعالیٰ کی رحمت کی آغوش میں آجائے اور اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ مسیحیت دنیا کے سامنے یہ عقیدہ پیش کرتی ہے کہ دوزخ ابدی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت اس عقیدہ کو ردّ کرتی ہے۔ کیونکہ بدیاں اگر اپنی جگہ پر کھڑی رہیں اور بار بار خدا تعالیٰ کا رحم نازل ہوتا رہے اور نیکیاں ترقی کرتی چلی جائیں تو یقیناً اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ایک دن ہر جہنمی کی نیکیاں اس کی بدیوں سے زیادہ ہو جائیں گی اور جب نیکیاں بڑھ جائیں گی تو ایسے شخص کو جہنم میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ یقیناً جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور اس طرح آخر میں بھی اللہ تعالیٰ ہی تعریف کا مستحق ثابت ہوگا۔ جس نے اپنی صفت رحیمیت کے ماتحت دوزخیوں کی نیکیوں کو بھی بڑھایا اور ان پر اس طرح متواتر اور بار بار رحم نازل کیا کہ آخر وہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے مستحق ہو گئے اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ يَأْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَنَسِيْمُ الصَّبَاءِ تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا۔ یعنی جہنم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی شخص بھی نہیں ہوگا اور نسیم صبا اس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ اسی وجہ سے جنتیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۱۱) یعنی وہ آخر میں یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب تعریفوں کا مستحق ہے جس نے ہماری نیکیوں کو اتنا بڑھایا کہ ایک ایک نیکی کا دس دس گنا بدلہ دیا۔ اور جس نے دوزخیوں کی نیکیوں کو بھی اتنا بڑھایا کہ آخر وہ بھی جنت میں آ گئے اور خدا تعالیٰ کی رضا انہیں حاصل ہو گئی۔

غرض لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح ہر کام کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہی انسان کے لئے سامان مہیا کرتا ہے اور اگر اس کی طرف سے سامان مہیا نہ ہوں تو کوئی انسان کام نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آخر میں بھی وہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے کیونکہ نتائج کا ظہور بھی اسی کی

طرف سے ہوتا ہے اور پھر اس کی رحیمیت تھوڑی سی نیکیوں کو بطور بیج کے قبول کر کے بڑھاتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے نبیوں کا انکار کرنے والے اور جہنم میں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے والے بھی اس کی رحیمیت کے نتیجہ میں آخر دوزخ سے نکل آئیں گے اور خدا تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے گا۔غرض اللہ تعالیٰ ہی اول ہے اور اللہ تعالیٰ ہی آخر ہے۔اور ایک مومن اس کے گرد اس طرح چکر کاٹ رہا ہوتا ہے جیسے حاجی حج کے ایام میں حجرِ اسود کے گرد طواف کرتے ہیں اور جہاں سے وہ چلتے ہیں وہیں آکر اپنا چکر ختم کرتے ہیں۔اسی طرح انسان خدا تعالیٰ کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے اور وہیں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور وہیں آخر میں جا کر گرتا ہے۔جیسے نہریں دریا سے نکلتی ہیں اور پھر دریا میں ہی جا پڑتی ہیں یا جیسے رہٹ ایک طرف سے کنوئیں سے پانی نکالتا جاتا ہے اور دوسری طرف پھر کنوئیں میں ڈوبنا شروع ہو جاتا ہے یہی حال مومن کا ہے۔وہ خدا تعالیٰ سے نکلتا اور پھر خدا تعالیٰ کی طرف واپس چلا جاتا ہے اور ہر حالت میں اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی تعریف ہی جاری ہوتی ہے۔

اسی طرح لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَ الْاٰخِرَةِ میں ایک یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کی تعریف ہوگی اور آخری زمانہ میں بھی جبکہ یاجوج و ماجوج نکلیں گے اور ان کو زیر کیا جائے گا خدا تعالیٰ کی تعریف ہوگی۔اور اس کی بادشاہت دنیا میں قائم کر دی جائے گی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى

تو ان سے کہہ۔مجھے بتاؤ تو سہی اگر اللہ (تعالیٰ) تمہارے لئے قیامت کے دن تک رات کو لمبا کر دے تو

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۲﴾

اللہ کے سوا اور کون ہے جو تمہارے پاس روشنی لائے گا؟ کیا تم سنتے نہیں۔

حلّ لُغَات۔سَرْمَدًا اَلسَّرْمَدُ کے معنے ہیں اَلدَّائِمُ۔ دائمی۔اَلطَّوِيْلُ مِنَ اللَّيَالِيْ يُقَالُ لَيْلٌ سَرْمَدٌ۔طویل یعنی لمبی رات۔اَلسَّرْمَدِيُّ: مَالَا اَوَّلَ لَهٗ وَلَا اٰخِرَ۔سرمدی اس کو کہتے ہیں جس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو۔(اقرب)

تفسیر۔فرمایا۔اے محمد رسول اللہ! تو ان مشرکین سے کہہ دے کہ رات بے شک ایک فائدہ بخش چیز ہے لیکن اگر رات کو خدا تعالیٰ قیامت تک کے لئے لمبا کر دے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو تمہارے لئے سورج

چڑھا سکتا ہے۔ تمہارے سارے معبود مل کر بھی رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مباحثہ میں یہ کہا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (البقرة:۲۵۹) اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تُو اسے مغرب کی طرف سے لے آ۔ تو فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وہ کافر جو آپ سے بحث کر رہا تھا مبہوت ہو کر رہ گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ کیونکہ کوئی مشرک نہیں ہے جو یہ مانتا ہو کہ سورج کو اس کا معبود چڑھاتا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ تیرا خدا سورج کو مشرق سے نہیں چڑھاتا بلکہ میں چڑھاتا ہوں تو خود اس کی قوم جو ستارہ پرست تھی اس کی مخالف ہو جاتی اور کہتی کہ کیا تُو اپنے آپ کو سورج دیوتا سے بھی بڑا قرار دیتا ہے جو ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ پس اس کے لئے سوائے خاموشی کے اَور کوئی چارہ نہ رہا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى

تُو کہہ دے۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ (تعالیٰ) دن کو قیامت کے دن تک تمہارے لئے لمبا

يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ

کر دے تو اللہ (تعالیٰ) کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہارے پاس رات کو لے آئے۔

فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۳﴾

جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔

تفسیر۔ پھر فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ قیامت تک کے لئے دن کو لمبا کر دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اَور کون ہے جو تمہارے لئے رات کا وقت لائے گا جس میں تم آرام حاصل کر سکو۔ یہ دلیل بھی مشرکین پر اتمام حجت کرنے والی ہے۔ مشرک لوگ سورج کے ڈوبنے کو بھی کسی بت یا کسی معبود باطلہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔

ان آیات میں رات کے لئے اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ اور دن کے لئے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کے الفاظ اس حکمت کے ماتحت رکھے گئے ہیں کہ رات کو انسان زیادہ تر آنکھوں کی بجائے کانوں سے کام لیتا ہے اور دن کو کانوں کی بجائے آنکھوں سے کام لیتا ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ

اور یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے ہیں کہ اس (یعنی رات) میں تم سکون

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۴﴾

حاصل کرو اور اس (یعنی دن) میں تم اس کا فضل تلاش کرو۔ تا کہ تم شکر گذار بنو۔

تفسیر ۔اس آیت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے رحم سے کام لیتے ہوئے تمہارے لئے رات اور دن بنائے ہیں تا کہ رات کو سو کر تم آرام اور سکون حاصل کرو اور دن میں دولت کما کر اللہ تعالیٰ کے فضل کو حاصل کرو۔ اور پھر یہ رات اور دن کا سلسلہ اس لئے بھی جاری کیا گیا کہ تم ہمیشہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔ رات کے آنے پر بھی تمہارے اندر جذبہء شکر گذاری پیدا ہو اور دن کے آنے پر بھی تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے شکر سے تر ہو۔ پھر جس طرح مادی عالم میں اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی ایک وقت انسان پر ایسا آتا ہے کہ جب اس پر قبض کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اس پر بسط کی حالت ہوتی ہے اور یہ قبض اور بسط کا سلسلہ بھی رات اور دن کے سلسلہ کی طرح انسانی ترقی کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اگر روحانی واردات میں بھی اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری نہ ہو تو اس کی ترقی رک جائے اور وہ اپنے پہلے مقام کو بھی کھو بیٹھے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابیؓ آئے اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہ! میں تو منافق ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ تمہیں کس طرح پتہ لگا کہ تم منافق ہو۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! جب میں آپ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف دوزخ۔ لیکن جب میں آپؐ کی مجلس سے واپس چلا جاتا ہوں تو یہ کیفیت نہیں رہتی۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم پر ہر وقت ایک ہی حالت رہے تو تم زندہ ہی نہ رہو۔ غرض جس طرح رات کو اللہ تعالیٰ نے سکون کے لئے اور دن کو سامانِ معیشت کی فراہمی کے لئے بنایا ہے اور دانا انسان وہی ہوتا ہے جو رات سے بھی فائدہ اٹھائے اور دن سے بھی۔ رات کو سو کر اپنے اندر نئی طاقتیں پیدا کرے۔ اور دن کو کام کر کے پہلے سے بھی زیادہ ترقی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قبض اور بسط کا سلسلہ انسان کی روحانی ترقی کے لئے جاری کیا ہے تا کہ ہر حالتِ قبض کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ آسمان روحانی کی طرف پرواز کرے اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کی

شکر گذاری کا زیادہ سے زیادہ مادہ اس کے اندر پیدا ہو۔

وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

اور جس دن وہ ان کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ میرے مزعومہ شرکاء جس کو تم (معبود) خیال کرتے

تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا

تھے۔اور (اس وقت) ہم ہر ایک (مشرک) امت میں سے (ایسے) گواہ کھڑے کریں گے (جن کو یہ لوگ

بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

معزز سمجھتے تھے) پھر ہم (ان سے) کہیں گے کہ اپنی (وہ) دلیلیں لاؤ (جن سے تم شرک کو جائز قرار دیتے تھے)

يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۶﴾ ع

ع ۱۵ ۱۰ ۷

تب وہ جان لیں گے کہ کامل حق اللہ (تعالیٰ) ہی کے پاس ہے۔اور ان کا سب افتراء ان سے کھو یا جائے گا۔

تفسیر۔فرمایا۔تم اس وقت کو بھی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ مشرکین سے کہے گا کہ وہ میرے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم معبود خیال کرتے تھے؟ اس وقت ہم ہر قوم میں سے گواہ کھڑے کریں گے اور پھر ہم ان سے کہیں گے کہ لاؤ اپنی اپنی دلیلیں پیش کرو۔تب مشرک جان لیں گے کہ حق بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہی تھی۔اور سب افتراء ان کو بھول جائیں گے۔

اس آیت میں نَزَعْنَا اور فَقُلْنَا دونوں جگہ نا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع کا صیغہ ہے۔یہ کلام الملوک کہلاتا ہے۔یعنی بادشاہوں کا طریق کلام۔بادشاہ اپنی طاقت کے اظہار کے لئے ہم کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں کیونکہ بادشاہوں کے احکام کے جاری کرنے میں اور لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔

نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا میں شہید سے مراد ہر قوم کا نبی ہے۔جیسے حضرت مسیح ناصریؑ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور کہیں گے کہ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (المائدۃ:۱۱۸) میں جب تک ان میں رہا ان کا شہید یعنی نگران رہا۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ (المزمل:۱۶) یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے لغت میں بھی شہید

کے ایک معنے اَلشَّاھِدُ یعنی نگران کے کئے گئے ہیں۔پس اس جگہ شہید سے مراد قوم کا نبی ہے جسے مشرکوں کے خلاف بطور گواہ کے کھڑا کیا جائے گا اور اس کے نمونہ کو پیش کر کے مشرکوں کو شرمندہ کیا جائے گا کہ دیکھو تم نے اپنے نبیوں کی تعلیم کے خلاف کیسا غلط راستہ اختیار کر لیا۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رات دن شرک کے خلاف تعلیم دی۔مگر تم نے ان کی تعلیم کو بھلا دیا اور تم خدائے واحد کو چھوڑ کر بتوں کے آستانہ پر جا گرے۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی نمونہ مقرر کیا ہوا ہے جب ہم اس نمونہ کی نقل کر لیتے ہیں تو ہم اپنے کام میں کامیاب سمجھے جاتے ہیں ورنہ نہیں۔مثلاً ہمارے ملک میں روزانہ لین دین کے معاملات میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ یہ سو روپے لو اور اس کے عوض مجھے گندم دے دو۔ جب گندم والا اسے گندم بھجواتا ہے تو وہ کہتا ہے میں نے تو ایسی گندم بھجوانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو اَور قسم کی گندم کا مطالبہ کیا تھا۔ یوروپین قوموں نے انہی جھگڑوں کو دیکھتے ہوئے ہر قسم کے نمونے اپنے پاس رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور انہی نمونوں کے مطابق وہ اجناس کی خرید و فروخت کرتے ہیں ۔اچھی گندم ۔اچھی کپاس۔ اچھی جوار اور اچھے چاولوں وغیرہ کے نمونے انہوں نے شیشے کے بڑے بڑے مرتبانوں میں بند کر کے رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر لیبل لگا کر لکھ دیتے ہیں کہ گندم یا کپاس فلاں قسم کی ہے یا یہ خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور جب وہ اس قسم کی جنس کہیں سے خریدنا چاہتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں یہ نمونہ موجود ہے ہمیں ایسی گندم یا کپاس چاہیے۔اور اگر کوئی تاجر گندم یا کپاس بھجوائے تو ماہرین فن نمونہ کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں کہ آیا یہ گندم یا کپاس نمونہ کے مطابق ہے یا نہیں اور اگر نہ ہو تو گورنمنٹ اس مال کو ردّ کر دیتی ہے۔غرض یقینی طور پر کسی چیز کے اعلیٰ ہونے کا تبھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے جب ہمارے پاس کوئی نمونہ موجود ہو۔اور اسے دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ آیا مطلوبہ جنس نمونہ کے مطابق ہے یا نہیں۔

جس طرح دنیا کی اَور چیزوں کے متعلق نمونہ کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے اسی طرح اخلاقی اور روحانی امور میں بھی کسی نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ نمونہ ہمیشہ ہی انبیاء کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے جو شخص اس نمونہ کے مطابق اپنے آپ کو بنا لیتا ہے اسے قبول کر لیا جاتا ہے اور جو اس نمونہ کے مطابق نہ ہو اسے ردّ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی زمانہ میں اس نے آدمؑ کو بھیج کر یہ اعلان کرا دیا کہ جو شخص آدمؑ کے نمونہ کے مطابق ہوگا اسے قبول کر لیا جائے گا اور جو آدم کے مطابق نہیں ہوگا اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔اور کسی زمانہ میں اس نے نوحؑ کو لوگوں کے لئے نمونہ بنا کر بھیج دیا۔اسی طرح کسی زمانہ میں اس نے ابراہیمؑ کو نمونہ بنا کر بھیج دیا۔کسی زمانہ میں اس نے

کرشنؑ کو اور رامچندرؑ جی کو نمونہ بنا کر بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں زرتشت کو نمونہ بنا کر بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں ایوبؑ کو نمونہ بنا کر بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کو نمونہ بنا کر بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں مسیح ناصریؑ کو نمونہ بنا کر بھیج دیا اور جب آخری زمانہ آیا تو اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرما کر اعلان فرما دیا کہ اب قیامت تک صرف یہی ہمارا نمونہ ہے۔ اگر تم اپنی زندگیاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے مطابق بناؤ گے تو میں تمہیں قبول کرلوں گا ورنہ نہیں۔ اسی امر کی طرف اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت میں اشارہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہم ہر امت کے سامنے ان کے نبی کو جسے نمونہ کے طور پر بھیجا گیا تھا پیش کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے یہ نمونہ تمہاری طرف بھیجا تھا اب تم جو کہتے ہو کہ ہمیں جنت میں داخل کیا جائے تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو کہاں تک اس نمونہ کے مطابق بنایا۔

ضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ میں بتایا کہ وہ لوگ جو دنیا میں بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے قیامت کے دن ان کے سب دعاوی غائب ہو جائیں گے۔ یعنی وہ تمام افتراء جو ذات باری تعالیٰ کے متعلق کیا کرتے تھے اس روز ان کے ذہن سے ایسے نکل جائیں گے کہ انہیں یاد ہی نہیں رہے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کے وہ تمام اعمال جن کی افتراء پر بنیاد تھی رائیگاں چلے جائیں گے اور ان عبادتوں اور ریاضتوں کا جو وہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اِنَّ قَارُوۡنَ كَانَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰى فَبَغٰى عَلَيۡهِمۡ ۖ وَ

قارون (دراصل) موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا۔ مگر وہ انہی کے خلاف ظلم پر آمادہ ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے

اٰتَيۡنٰهُ مِنَ الۡكُنُوۡزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوۡٓاُ بِالۡعُصۡبَةِ

دیئے تھے کہ جن کی کنجیاں ایک مضبوط جماعت کے لئے بھی اٹھانا مشکل تھیں۔ (یاد کر) جب اس کی قوم نے اسے کہا

اُولِى الۡقُوَّةِ ۗ اِذۡ قَالَ لَهٗ قَوۡمُهٗ لَا تَفۡرَحۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡفَرِحِيۡنَ ۝۷۷

کہ (اتنا) فخر مت کر۔ اللہ (تعالیٰ) فخر کرنے والوں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔

حل لغات۔ اَلۡكُنُوۡزُ اَلۡكُنُوۡزُ كَنۡزٌ کی جمع ہے اور اَلۡكَنۡزُ کے معنے ہیں اَلۡمَالُ الۡمَدۡفُوۡنُ فِيۡ

الْاَرْضِ۔ زمین میں دفن کیا ہوا مال۔ وَقِیْلَ اِسْمٌ لِلْمَالِ اِذَا اُحْرِزَ فِیْ وِعَاءٍ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کَنْزٌ اس مال کا نام ہے جسے کسی حفاظت کے سامان میں محفوظ کر لیا جائے۔ اَلذَّھَبُ وَالْفِضَّۃُ۔ سونا اور چاندی۔ مَا یُحْرَزُ فِیْہِ الْمَالُ کَالْمَخْزَنِ وَالصَّنْدُوْقِ۔ وہ چیز جس میں مال سنبھال کر رکھا جائے جیسے خزانہ اور صندوق۔ (اقرب)

مَفَاتِحَ مَفَاتِحَ مِفْتَحٌ وَمِفْتَاحٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور مَفْتَحٌ کی بھی۔ مِفْتَحٌ اور مِفْتَاحٌ کے معنے ہیں چابی۔ اور مَفْتَحٌ کے معنے ہیں اَلْخَزَانَۃُ۔ خزانہ۔ اَلْکَنْزُ۔ محفوظ کیا ہوا مال۔ اَلْمَخْزَنُ۔ خزانہ گاہ (اقرب)

تَنُوْٓاُ تَنُوْاُ نَاءَ سے مضارع مؤنث کا صیغہ ہے اور نَاءَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں نَھَضَ بِجَھْدٍ وَّ مَشَقَّۃٍ۔ کوئی شخص محنت و مشقت سے اٹھا۔ اور نَاءَ بِالْحِمْلِ کے معنے ہیں نَھَضَ بِہٖ مُثْقَلًا۔ بھاری بوجھ کو مشکل سے لے کر اٹھا۔ اور جب نَاءَ بِہِ الْحِمْلُ کہیں تو معنے ہوں گے اَثْقَلَہٗ وَاَمَالَہٗ۔ اسے بوجھل بنا دیا اور جھکا دیا۔ (اقرب) پس تَنُوْٓاُ کے معنے ہوں گے۔ جنہیں مشکل سے اٹھایا جاتا تھا۔

العصبة العصبة کے لئے تفسیر کبیر سورۃ النور آیت نمبر ۱۲۔

عُصْبَۃٌ جماعت کو کہتے ہیں لیکن بعض کے نزدیک تین سے دس افراد تک کی جماعت کو عُصبہ کہتے ہیں اور بعض صرف دس افراد کی جماعت کو عصبہ کہتے ہیں۔ بعض دس سے پندرہ افراد تک کی جماعت کو عصبہ کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دس سے لے کر چالیس تک کی جماعت کو عُصبہ کہا جاتا ہے۔ (اقرب و فتح البیان)

تفسیر ۔ قارون کا نام بائیبل میں قورح آتا ہے اور اس کا ذکر گنتی باب ۱۶ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ

> ’’وہ اور بنی اسرائیل میں سے اڑھائی سو اَور اشخاص جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے موسیٰؑ کے مقابلہ میں اٹھے اور وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر ان سے کہنے لگے تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے۔ کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند ان کے بیچ رہتا ہے۔ سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیونکر ٹھہراتے ہو۔ موسیٰ یہ سن کر منہ کے بل گرا۔ پھر اس نے قورح اور اس کے کل فریق سے کہا کہ کل صبح خداوند دکھا دے گا کہ کون اس کا ہے اور مقدس ہے۔ اور وہ اس کو اپنے نزدیک آنے دے گا کیونکہ جسے وہ خود چنے گا اسے وہ اپنی قربت بھی دے گا۔ سوائے قورح اور اس کے فریق کے لوگو! تم یوں کرو کہ اپنا اپنا بخوردان لو اور اس میں آگ بھرو۔ اور خداوند کے حضور کل ان میں بخور جلاؤ۔ تب جس شخص کو خداوند چن لے وہی مقدس ٹھہرے گا۔ اے لاوی کے بیٹو! بڑے بڑے دعوے تو تمہارے ہیں۔ پھر موسیٰ نے قورح کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے

بنی لاوی سنو! کیا یہ تم کو چھوٹی بات دکھائی دیتی ہے کہ اسرائیل کے خدا نے تم کو بنی اسرائیل کی جماعت میں سے چن کر الگ کیا تا کہ تم کو وہ اپنی قربت بخشے اور تم خداوند کے مسکن کی خدمت کرو۔ اور جماعت کے آگے کھڑے ہو کر اس کی بھی خدمت بجالاؤ اور تجھے اور تیرے سب بھائیوں کو جو بنی لاوی ہیں اپنے نزدیک آنے دیا سو کیا اب تم کہانت کو بھی چاہتے ہو۔ اس لئے تُو اور تیرے فریق کے لوگ یہ سب کے سب خداوند کے خلاف اکٹھے ہوئے ہیں اور ہارون کون ہے جو اس کی تم شکایت کرتے ہو۔ پھر موسیٰ نے داتن اور ابیرام کو جو الیاب کے بیٹے تھے بلوا بھیجا۔ انہوں نے کہا۔ ہم نہیں آتے کیا یہ چھوٹی بات ہے کہ تو ہم کو ایک ایسے ملک سے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے نکال لایا ہے کہ ہم کو بیابان میں ہلاک کرے۔ اور اس پر بھی یہ طرّہ ہے کہ اب تو سردار بن کر ہم پر حکومت جتاتا ہے۔ ماسوا اس کے تُو نے ہم کو اس ملک میں بھی نہیں پہنچایا جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ اور نہ ہم کو کھیتوں اور تاکستانوں کا وارث بنایا۔ کیا تُو ان لوگوں کی آنکھیں نکال ڈالے گا۔ ہم تو نہیں آنے کے۔ تب موسیٰ نہایت طیش میں آکر خداوند سے کہنے لگا۔ تُو ان کے ہدیہ کی طرف توجہ مت کر۔ میں نے ان سے ایک گدھا بھی نہیں لیا۔ نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔ پھر موسیٰ نے قورح سے کہا۔ کل تُو اپنے سارے فریق کے لوگوں کو لے کر خداوند کے آگے حاضر ہو۔ تُو بھی ہو اور وہ بھی ہوں۔ اور ہارون بھی ہو۔ تم میں سے ہر شخص اپنے بخوردان کو جو شمار میں اڑھائی سو ہوں گے خداوند کے حضور لاؤ۔ اور تُو بھی اپنے بخوردان لانا اور ہارون بھی لائے۔ سو انہوں نے اپنا اپنا بخوردان لے کر اور ان میں آگ رکھ کر اس پر بخور ڈالا۔ اور خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر موسیٰ اور ہارون کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ اور قورح نے ساری جماعت کو ان کے خلاف خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر جمع کر لیا تھا۔ تب خداوند کا جلال ساری جماعت کے سامنے نمایاں ہوا۔

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا۔ کہ تم اپنے آپ کو اس جماعت سے بالکل الگ کر لو۔ تا کہ میں ان کو ایک پل میں بھسم کر دوں تب وہ منہ کے بل گر کر کہنے لگے۔ اے خدا! سب بشر کی روحوں کے خدا! کیا ایک آدمی کے گناہ کے سبب سے تیرا قہر ساری جماعت پر ہوگا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ تو جماعت سے کہہ کہ تم قورح اور داتن اور ابیرام کے خیموں کے آس پاس سے دور ہٹ جاؤ۔ اور موسیٰ اٹھ کر داتن اور ابیرام کی طرف گیا اور بنی اسرائیل کے بزرگ اس کے پیچھے پیچھے گئے۔

اوراس نے جماعت سے کہا۔ان شریر آدمیوں کے خیموں سے نکل جاؤ۔اوران کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ تا ایسا نہ ہوتم بھی ان گناہوں کے سبب سے نیست ہو جاؤ۔سو وہ لوگ قورح اور داتن اور ابیرام کے خیموں کے آس پاس سے دور ہٹ گئے اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔تب موسیٰ نے کہا۔اس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ یہ سب کام کروں۔کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔اگر یہ آدمی ویسی ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے۔یا ان پر ویسے ہی حادثے گذریں جو سب پر گذرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو اور ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا۔اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال واسباب کو نگل گئی۔سو وہ اور ان کا سارا گھر بار جیتے جی پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیل جو ان کے آس پاس تھے ان کا چلّانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نگل نہ لے۔اور خداوند کے حضور سے آگ نکلی اور ان اڑھائی سو آدمیوں کو جنہوں نے بخور گذرانا تھا بھسم کر ڈالا۔‘‘

(گنتی باب ۱۶ آیت ۲ تا ۳۵)

بائیبل کے ان بیان کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ فرعونِ مصر کی تباہی کے بعد دشتِ سینا میں قارون اور اس کے بعض ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ کھڑا کیا۔اور انہوں نے آپ پر قسم قسم کے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰؑ کا کیا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہم سے بڑا سمجھے اور ہم پر اپنی حکومت جتائے۔اس جماعت کا ایک ایک فرد مقدس ہے اور پھر انہوں نے یہ بھی پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ موسیٰ ہمیں ایک ایسے ملک سے نکال لایا۔جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں اور پھر اس نے ہمیں ایک جنگل میں لا کر ڈال دیا اور کنعان کی حکومت دلانے کا وعدہ بھی اس نے پورا نہیں کیا۔بائیبل بتاتی ہے کہ قارون کے ساتھ اس فتنہ انگیزی میں اڑھائی سو آدمی ملوث ہو گئے تھے۔آخر موسیٰؑ نے دونوں گروہوں کو الگ الگ کھڑا کر دیا۔اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی جس کے نتیجہ میں زمین پھٹی اور قارون اور اس کے ساتھیوں کو نگل گئی۔اگر بائیبل کا یہ بیان

درست ہوتو اس کے معنے یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے ساتھ مباہلہ کیا تھا۔جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہوگیا لیکن قرآن کریم نے قارون اور فرعون اور ہامان کا اکٹھا ذکر کیا ہے (سورۂ عنکبوت آیت ۴۰) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا نہیں بلکہ اس سے پہلے کا ہے۔اور قارون جو اسرائیلی قوم کا ہی ایک فرد تھا فرعون کا افسرِ خزانہ تھا اور بہت مالدار شخص تھا لیکن دولت کے نشہ میں اس نے اپنی قوم پر ہی سختی شروع کردی اور یہ خیال کرلیا کہ میں اپنی قوم پر جتنا بھی ظلم کروں گا فرعون مجھ پر اتنا ہی خوش ہوگا اور اتنا ہی میرا اعزاز بڑھائے گا۔

ہم نے اس کے افسر خزانہ ہونے کا استنباط اس سے کیا ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ قارون اپنی قوم پر ہی ظلم کرنے لگ گیا تھا۔اور محض مالدار ہونا کوئی ایسی وجہ نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوم پر ظلم کرنے لگ جائے ہاں سرکاری عہدیدار ہونے کی وجہ سے بیشک کوئی شخص ظلم کرسکتا ہے۔ پھر قرآن کریم کا اٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ کہنا بھی بتاتا ہے کہ یہ اس کے ذاتی خزانے نہیں تھے بلکہ سرکاری خزانے تھے جو اس کی تحویل میں رہتے تھے۔

وَ اٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَۃِ اُولِی الْقُوَّۃِ میں بتایا کہ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیاں اٹھانا ایک مضبوط جماعت پر بھی دوبھر ہوتا تھا۔اصل بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں لکڑی کے تالے ہوا کرتے تھے بلکہ آج سے چالیس سال پہلے تک مکہ مکرمہ میں بھی لکڑی کے تالے ہی استعمال ہوتے تھے اگر لوہے کے تالے بھی ہوں تو چونکہ اس وقت تک صنعتِ قفل سازی ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔بڑے بڑے موٹے تالے اور بڑی بڑی موٹی موٹی کنجیاں بنائی جاتی تھیں۔اور بادشاہ جب سفر کرتا تھا تو خزانے کے بہت سے صندوق ساتھ رکھتا تھا۔تا کہ مزدوروں کو تنخواہیں دی جاسکیں اور فوج کے لئے رسد خریدی جاسکے پس ان سینکڑوں ہزاروں صندوقوں کے ہزارہا تالوں کی موٹی کنجیوں کو اٹھانا جن کا مجموعی طور پر کئی سو من وزن ہوجاتا تھا ایک مضبوط جماعت کے لئے بھی مشکل ہوتا تھا۔خصوصاً جبکہ انہوں نے لگاتار لمبا سفر کرنا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ ان کنجیوں کو صندوقوں میں بند کرکے اونٹوں پر لادا جاتا ہو۔کیونکہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ آدمی ان کنجیوں کو اٹھاتے تھے بلکہ یہ کہا کہ اگر آدمی اٹھاتے تو ان کی ایک مضبوط جماعت کے لئے بھی ان کا اٹھانا بارگراں بن جاتا۔یعنی دس بارہ مضبوط آدمی بھی بمشکل ان کو اٹھا سکتے۔

اِذْ قَالَ لَہٗ قَوْمُہٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ۔جب یہ شخص فرعون کا افسر خزانہ ہونے کی وجہ سے خود بھی مالدار ہوکر متکبر ہوگیا۔اور بنی اسرائیل پر ہی جو اس کی اپنی قوم تھی محض فرعون کی خوشنودی کے لئے ظلم کرنے لگ گیا تو اس کی قوم نے اسے کہا کہ تکبر نہ کر۔اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَ ابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ

اور جو کچھ تجھے اللہ (تعالیٰ) نے دیا ہے اس سے اخروی زندگی کے گھر کی تلاش کر۔ اور دنیوی زندگی سے تجھے جو حصہ

نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ

ملا ہے اسے بھی بھول نہیں اور (ہم تجھے ایک حد تک دنیا کی آسائشوں کے استعمال سے نہیں روکتے) اور جس طرح

لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۸﴾

اللہ (تعالیٰ) نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی لوگوں پر احسان کر۔ اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر۔ اس کی قوم نے اسے یہ بھی کہا۔ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دولت بخشی ہے اس سے اپنے اخروی گھر کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کر۔ ہاں دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نہ چھوڑ کیونکہ سچا مذہب میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان دنیا کو بالکل ہی چھوڑ دے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا بھی کمائے اور دینی کاموں میں بھی حصہ لے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک صوفی کا یہ قول بہت پسند ہے کہ

''دست در کار و دل بایار''

یعنی اصل طریق یہی ہے کہ انسان دنیا کے کام بھی کرے اور خدا تعالیٰ کو بھی یاد رکھے۔ لیکن پرانے لوگوں میں سے بعض نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ دست درکار نہیں ہونا چاہیے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی زندگی کو ضائع کر دیا اور بعض نے یہ سمجھ لیا کہ دل بایار نہیں ہونا چاہیے صرف دست درکار ہونا کافی ہے۔ گویا دنیا میں دو کیمپ بن گئے۔ ایک کیمپ والے دین کو بیکار سمجھنے لگ گئے اور دوسرے کیمپ والے دنیا کو بے کار سمجھنے لگ گئے حالانکہ صداقت ان دونوں کے درمیان درمیان تھی۔ صداقت یہ تھی کہ دین کے ساتھ دنیا کی طرف بھی توجہ رکھی جائے اور دنیا سے بالکل ہی منہ نہ موڑ لیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک فریق تو خالص دنیا ساتھ لے گیا۔ اور ایک فریق نے خالص دین لے لیا اور انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ اگر خالص دین کی طرف ہی توجہ رکھنی ضروری ہوتی تو خدا تعالیٰ یہ کیوں فرماتا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: ۹۸) کہ جو لوگ استطاعت رکھیں ان پر حج بیت اللہ کرنا فرض

ہے۔ پھر زکوٰۃ کے متعلق اسلام یہ کیوں ہدایت دیتا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبۃ:۱۰۳) یعنی اے رسول! ان کے مالوں میں سے صدقہ لے تا کہ تُو انہیں پاک کرے اور ان کی ترقی کے سامان مہیا کرے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ یہ چاہتا کہ صرف دین ہی اختیار کیا جائے اور دنیا سے مونہہ موڑ لیا جائے تو وہ یہ کیوں فرماتا کہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم ان میں سے ایک کو ڈھیروں ڈھیر سونا بھی دے چکے ہو تو اس سے واپس مت لو (النساء آیت ۲۱) اگر مال اپنے پاس رکھنا ہی نہیں تو حج کس طرح کیا جا سکتا ہے زکوٰۃ کس طرح کی جا سکتی ہے اور اپنی بیوی کو ڈھیروں ڈھیر سونا کس طرح دیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے لوگوں کے لئے نمونہ کے طور پر پیدا کیا ہوتا ہے۔ میں نے خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا ہے کہ کسی نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ کتنے روپوؤں پر زکوٰۃ فرض ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے لئے یہ مسئلہ ہے کہ تم چالیس روپے میں سے ایک روپیہ زکوٰۃ دو۔ اس نے کہا۔ ''تمہارے لئے'' کا کیا مطلب ہے۔ کیا زکوٰۃ کا مسئلہ بدلتا رہتا ہے؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ تمہارے پاس چالیس روپے ہوں تو ان میں سے ایک روپیہ زکوٰۃ دینا تمہارے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر میرے پاس چالیس روپے ہوں تو مجھ پر اکتالیس روپے دینے لازمی ہیں کیونکہ تمہارا مقام ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم کماؤ اور کھاؤ۔ لیکن مجھے وہ مقام دیا ہے کہ میرے اخراجات کا وہ آپ کفیل ہے۔ اگر بیوقوفی سے میں چالیس روپے جمع کر لوں تو میں وہ چالیس روپے بھی دوں گا اور ایک روپیہ جرمانہ بھی دوں گا۔

غرض بعض لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ صرف دین کی طرف اپنی توجہ رکھیں۔ لیکن باقی دنیا کا صرف یہی مقام ہے کہ وہ دنیا کمائیں اور اپنے مال اور وقت کا کچھ حصہ مناسب نسبت کے ساتھ عبادت اور دین کے کاموں میں بھی لگائیں۔ وہ ذکر الٰہی کریں۔ وظائف کریں۔ تہجد پڑھیں اور استغفار اور دعاؤں سے کام لیں۔ قارون کو بھی اس کی قوم کے نیک افراد نے بھی یہی نصیحت کی کہ ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تم اپنی دولت خدا تعالیٰ کے لئے خرچ کر دو بلکہ ہماری نصیحت یہ ہے کہ تمہارا اصل مقصد تو دارِ آخرت ہونا چاہیے۔ اور اسی کے لئے تمہیں اپنے اموال خرچ کرنے چاہئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی ترقی کے لئے بھی بیشک کوشش کرو۔ اور اپنے اموال کا ایک حصہ اس کے لئے مخصوص کر لو۔ یہ ناجائز امر نہیں۔ ناجائز امر یہ ہے کہ تم خدا کو بھول جاؤ۔ اور صرف دنیا کو ہی اپنا مطلوب قرار دے دو۔ پھر انہوں نے کہا۔ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ تُو لوگوں سے نیک سلوک کر۔ اور ان کو اپنے مال اور اپنے علم اور اپنے رسوخ میں شریک کر۔ کیونکہ تجھ پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے۔ یعنی جن قوتوں

اور طاقتوں سے تو نے کمایا ہے اور جن چیزوں کے ذریعہ سے تو نے عزت اور شہرت حاصل کی ہے وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اور تجھے بطور احسان ملی ہیں۔ پس جس طرح تجھ پر احسان کیا گیا ہے۔ تیرا بھی فرض ہے کہ تُو لوگوں سے احسان کے ساتھ پیش آ۔ اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ اللہ تعالیٰ شریر اور مفسد لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ آخر یہ سیدھی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق اور اس کا رب ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس مخلوق کا خالق اور رب فساد کرنے والے سے کس طرح محبت کرے گا؟ اگر کسی بچہ سے انسان کو نفرت ہو تو اس کی ماں کبھی نفرت کرنے والے سے پیار نہیں کر سکتی۔ جب تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو شخص فساد ڈلواتا ہے اور لوگوں کی آپس میں لڑائیاں کرواتا رہتا ہے خدا تعالیٰ اسے کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ انگریزی میں ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی شخص کو ایک عورت سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت بیوہ تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر یوروپین طریق کے مطابق خالی پیغام سے شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ پہلے اسے اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔ کیونکہ یورپ کے لوگوں میں مرد عورت کی دوستی کے بعد شادی ہوتی ہے پہلے نہیں۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی بڑی کوشش کرتا مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ آخر اس نے اپنے کسی دوست سے ذکر کیا کہ مجھے اس اس طرح فلاں عورت سے محبت ہے اور میں اسے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کرتی۔ اس نے کہا۔ عورت کا کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ اس نے کہا بچہ تو ہے۔ اس نے کہا تو پھر محبت میں کون سی مشکل ہے۔ بچہ کو اٹھا کر اس سے چند دن پیار کرو۔ عورت تم سے خود بخود بے تکلف ہو جائے گی۔ تو جس سے کسی کو محبت ہو اس سے نفرت رکھنے سے کبھی اس شخص کی محبت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ

''خاکم نثارِ کوچہء آلِ محمدؐ است''

(درثمین فارسی صفحہ ۸۹)

اب آلِ محمدؐ میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حصول کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ انسان ان سے محبت کرے۔ یہ خیال کرنا کہ آلِ محمدؐ سے بے شک محبت نہ ہو لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مجھے حاصل ہو جائے گی غلط ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم فساد کرو گے تو تمہیں

یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تم سے محبت نہیں کرے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے پیارے ہیں۔ جو ان سے محبت نہ کرے گا اور ان کا بدخواہ ہو اللہ تعالیٰ اس سے کبھی محبت نہیں کرسکتا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَ لَمْ يَعْلَمْ اَنَّ

اس (یعنی قارون) نے کہا۔ یہ سب رتبہ مجھے ایک ایسے علم کی وجہ سے ملا ہے جو صرف مجھے حاصل ہے۔ کیا وہ

اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ

جانتا نہیں تھا کہ اس سے پہلے اللہ (تعالیٰ) نے بہت سی نسلوں کو جو اس سے زیادہ طاقت ور اور اس سے زیادہ مالدار تھیں

مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۷۹

ہلاک کر دیا تھا اور مجرموں کو (جب عذاب دیا جاتا ہے تو) ان کے گناہوں کے متعلق ان سے پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔

تفسیر۔ قارون کو جب اس کی قوم نے یہ نصیحت کی تو اس احمق نے تکبر میں آکر کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ مال مجھے یونہی مل گیا ہے۔ یہ مال مجھے ذاتی علم اور ذہانت اور محنت کی وجہ سے ملا ہے۔ اس نادان نے یہ نہ سوچا کہ جس دماغ سے وہ کام لے رہا ہے وہ اس کا پیدا کردہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ جن ذرائع اور اسباب سے اس نے دولت حاصل کی ہے وہ ذرائع اور اسباب بھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کئے ہیں۔ اس نے خود پیدا نہیں کئے۔ وہ خدا تعالیٰ کو بھول گیا اور اس نے اپنی تمام ترقی کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ گندھک خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ سنکھیا خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ پارہ خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میں نے آتشک کا ٹیکہ ایجاد کیا ہے۔ حالانکہ یہ ٹیکے بعض چیزوں کے مرکب ہیں اور وہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔ پھر تارکول خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور اس سے عام استعمال میں آنے والی آدھی سنتھیٹک دوائیں بنتی ہیں لیکن انسان بڑے غرور سے کہتا ہے کہ یہ دوا میں نے ایجاد کی ہے یا فلاں نے ایجاد کی ہے اور وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ جن چیزوں سے اس نے یہ دوا بنائی ہے وہ خدا تعالیٰ کی ہی پیدا کردہ ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ تو اس پر احسان کرتا ہے مگر وہ اس احسان کی قدر کرنے کی بجائے یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ میں بڑا لائق تھا۔ میں بڑا قابل تھا میں نے یہ جدوجہد کی اور یہ ترقی حاصل کر لی۔ حالانکہ نہ صرف ہر کام میں

کامیابی حاصل کرنے کے سامان اور ذرائع خدا تعالیٰ مہیا کرتا ہے بلکہ ہر کام کا نتیجہ بھی خدا تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے۔ آخر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک شخص سارا سال لوہارے کا کام سیکھتا ہے لیکن وہ سیکھ نہیں سکتا۔ پھر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک کاریگر ہوتا ہے لیکن اسے کوئی کام نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ روپیہ مل جائے تو کوئی ڈاکو اس کا سارا روپیہ چھین لے۔ پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کما کر اپنے گھر روپیہ لے آئے۔ لیکن گھر میں آتے ہی اس کے پیٹ میں درد اٹھے اور وہ جانبر ہی نہ ہوسکے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ایسی جلدی بیماری پیدا ہوجائے کہ وہ کپڑا نہ پہن سکے۔ پس جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی محنت سے بھی روزی کمائے تب بھی اسے جو کچھ ملتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ اور اس کا فرض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جتنا بڑا بنائے اتنا ہی وہ جھکتا چلا جائے۔ دیکھو جس پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کو دولت کا مل جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے سر پر بوجھل گٹھڑی رکھی ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں اس کے اندر زیادہ فروتنی اور زیادہ انکسار پایا جانا چاہیے نہ یہ کہ وہ متکبر ہوجائے اور دوسروں کو ذلیل سمجھنے لگے۔ بہر حال جو شخص دولت و ثروت اور عزت کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھے گا وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جھکے گا اور جو اس کو اپنا ذاتی کمال قرار دے گا وہ تکبر میں مبتلا ہوگا اور آخر خدا تعالیٰ سے دور چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تکبر کو شدید طور پر ناپسند کیا ہے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی ترقیات کے لئے کوشش نہ کرو۔ تم اپنی ترقیات کے لئے جتنی بھی کوشش کرو۔ جائز ہے مگر اس کے بعد تمہیں جتنی بھی ترقی ملے اتنا ہی اپنے آپ کو متواضع بناؤ۔ ورنہ اگر تم متکبر ہوگئے تو خدا تعالیٰ تم سے خوش نہیں ہوگا بلکہ ناراض ہوگا اور وہ ترقی تمہارے لئے رحمت کا موجب نہیں بلکہ ابتلاء کا موجب ہوگی اور تم آئندہ کے لئے انوار سماوی سے محروم ہوجاؤ گے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا۔ یارسول اللہ! مجھے سخت مالی تنگی ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کشائش رزق کے سامان پیدا فرمائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور آخر آپ کی دعا کی برکت سے وہ اس قدر امیر ہوگیا کہ ساری وادی اس کے جانوروں سے بھر جاتی تھی شہروں میں رہنے والے شائد اس امر کو نہ سمجھ سکیں کہ ایک شخص کے پاس اتنے جانور کہاں سے آسکتے ہیں۔ مگر گاؤں کے رہنے والے جانتے ہیں کہ ایک ایک آدمی کے پاس کس قدر جانور ہوتے ہیں۔ میں ایک دفعہ سلسلہ کی زمینوں کے معائنہ کے لئے سندھ گیا۔ تو ایک جگہ میں نے تین چار سو جانور دیکھے۔ میں نے ان جانوروں کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا یہ اس گاؤں کے جانور ہیں؟ اس پر وہاں کا مینجر ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ تو صرف ایک آدمی کے جانور ہیں۔ لیکن شہریوں کے لئے ایک گائے یا ایک بھینس کا رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ تو اس کے پاس اس قدر جانور ہو گئے

کہ ان سے وادی بھر جاتی ۔ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آدمی اس کے پاس بھجوایا اور کہا کہ اس سے زکوٰۃ لاؤ۔جب اس نے زکوٰۃ مانگی تو کہنے لگا کہ کیا مصیبت ہے جانوروں کو کھلانے کے لئے ہمارے پاس رقم نہیں ہوتی اوران کو ہروقت چندوں کی سوجھتی رہتی ہے۔انہیں ہمارے بوجھوں کا کوئی فکر ہی نہیں ۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی ۔تو آپؐ نے فرمایا۔اسے چھوڑ دو۔ہم اس سے زکوٰۃ نہیں لیں گے ۔بعد میں اسے کسی نے کہا کہ کمبخت تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کروا کروا کے امیر بنا تھا اوراب تو نے زکوٰۃ دینے سے ہی انکار کردیا۔ اس پر اسے ندامت پیدا ہوئی اور وہ زکوٰۃ لے کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تم سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی ۔اس پر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا۔ دوسرے سال پھر وہ زکوٰۃ کا مال لے کر آیا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا۔غرض اسی طرح ہر سال وہ زکوٰۃ کا مال لاتا اوررسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ردّ فرمادیتے یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس مالِ زکوٰۃ لایا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص کا مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا میں بھی اس کا مال قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ چونکہ اس کے دل میں نیکی تھی اس لئے وہ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ لاتا مگر اس کی زکوٰۃ قبول نہ کی جاتی ۔اسی طرح بعض لوگ امتحان دے رہے ہوتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ دعا کریں ہم امتحان میں کامیاب ہوجائیں ۔اورکسی اعلیٰ عہدہ پر لگ جائیں ۔جب امتحان میں کامیاب ہوجاتے ہیں اورعہدہ مل جاتا ہے تو پھر لگتے ہیں احمدیوں سے بھاگنے ۔کبھی کہتے ہیں کہ احمدیوں کی سوسائٹی ادنیٰ ہوتی ہے۔کبھی کہتے ہیں احمدی مالدار نہیں ہوتے ۔کبھی کہتے ہیں احمدیوں کے گھر صاف نہیں ہوتے ۔وہ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ پہلے ہم سے دعائیں کروایا کرتے تھے اور پھر وہ ہمیں سے بھاگتے ہیں ۔یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ایسے آدمیوں کے دلوں میں ایمان نہیں ہوتا۔اگر ایمان ہوتا تو وہ دین کی خدمت کرتے ۔دینداروں کی خدمت کرتے ۔جماعت کی خدمت کرتے اور تکبر میں مبتلا نہ ہوتے ۔

میں نے دیکھا ہے غریبوں میں تواضع اورانکسار زیادہ پایا جاتا ہے ۔اسی لئے انبیاء کی جماعتوں میں عموماً غریب ہی شامل ہوتے ہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا انہیں غریب رکھنا چاہتا ہے ۔بلکہ خدا ان غریبوں کو اس لئے دین کی خدمت کا موقعہ دیتا ہے کہ ان میں حرص نہیں ہوتی ۔اورشکر کا مادہ ان میں زیادہ ہوتا ہے ۔بے شک وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو امراء ہیں اور مخلص ہیں ۔اوروہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن پر دباؤ ڈالا جائے تو مان جاتے ہیں ۔لیکن وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو چندوں سے کھسکتے رہتے ہیں ۔اور پھر جہاں بیٹھیں گے کہیں گے کہ بڑی

مصیبت ہے ہروقت چندہ ہی چندہ مانگا جاتا ہے۔ وہ غریب آدمی جو پچیس روپے کما کر چندہ دے رہا ہوتا ہے وہ حیران ہوتا ہے کہ یہ اڑھائی ہزار روپیہ لے کر بھی کیوں چندہ نہیں دے سکتا۔ ان نقائص اور خرابیوں سے بچنے کا واحد ذریعہ یہی ہوتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرے اور اس کے احسانوں کو یاد رکھے۔ لیکن جب وہ کہتا ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنی کوشش اور علم کی وجہ سے ملا ہے۔ یا جب وہ کہتا ہے کہ ہم تو پہلے ہی مر رہے ہیں۔ ہم دین کے لئے روپیہ کہاں سے دیں۔ یا کہتا ہے بڑی مصیبت آگئی ہر وقت چندے ہی چندے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ تو اس وقت وہ خدائی برکات سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدائی برکات سے وہ اسی وقت حصہ لے سکتا ہے جب اسے ایک پیسہ بھی ملتا ہے تو وہ اسے خدائی انعام سمجھتا ہے۔ یا پندرہ کی بجائے اسے بیس روپے ملتے ہیں تو وہ ان پانچ روپوؤں کی زیادتی کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا ہے۔ پھر اسے سو روپیہ ملتا ہے تو وہ سو کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ ہزار روپیہ ملتا ہے تو وہ ہزار کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ پندرہ سو روپیہ ملتا ہے تو وہ ان پندرہ سو کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کے واہمہ اور گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ اگر مجھ سے دین کی خدمت کے لئے کسی چندے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ ایک مصیبت ہے جو مجھ پر آ گئی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اسی کا ہے میرا اپنا کچھ نہیں۔ جب تمہارے پاس کوئی شخص امانت رکھتا ہے اور پھر وہ تم سے مانگنے آ جاتا ہے۔ تو کیا تم اس امانت کی واپسی کو مصیبت سمجھتے ہو؟ اسی طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے جو روپیہ تمہیں ملتا ہے اگر تم اس کے متعلق اپنے دلوں میں یہ یقین اور ایمان پیدا کرو کہ وہ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے تمہیں دیا ہے تو تم خدا کے لئے اس روپیہ کو خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہ کرو۔ کیونکہ تم سمجھو کہ یہ میری چیز نہیں تھی بلکہ اسی کی تھی۔ جیسے انسان بعض دفعہ سفر پر جاتا ہے تو وہ اپنی بھینس ہمسایہ کو دے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ دس دن اس کا دودھ پئیں۔ سفر سے واپس آ کر میں لے لوں گا۔ اب کوئی کمینہ اور ذلیل انسان ہی ہوگا جو اس کے مانگنے پر اپنے دل میں کہے کہ یہ مر کیوں نہ گیا۔ بھینس میرے قبضہ میں ہی رہتی۔ ورنہ جو شریف انسان ہوگا۔ وہ کہے گا کہ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ آپ کی بھینس سے میں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر دنیا میں تو امانت رکھنے والے اپنی ساری امانت واپس لے لیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی امانت میں سے ہمیشہ ایک حصہ مانگتا ہے سارا نہیں مانگتا۔ پس وہ تو امانت دار ہی نئی قسم کا ہے۔ اس کے مانگنے پر جو شخص ناراض ہوتا ہے وہ بڑا ہی ذلیل اور رذیل قسم کا انسان ہے۔ اس نے رات دن خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا۔ پھر کسی موقعہ پر اگر اس نے ایک آدھ چیز مانگ لی تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ حقیقتاً یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی ناقدری اور ناشکری سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے خدا تعالیٰ

نے بار بار کہا ہے کہ میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اور میرے احسانات کو یاد رکھو۔ جب انسان ہر چیز کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا اور اس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے تو اسے سارا دین مل جاتا ہے۔

قارون کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَوَ لَمۡ یَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَہۡلَکَ مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مَنۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُ قُوَّۃً وَّ اَکۡثَرُ جَمۡعًا کیا یہ جواب دیتے ہوئے اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی ایسی بستیوں کو اجاڑا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں اور اس کے جتھہ سے ان کے پاس زیادہ جتھہ تھا۔

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ اس کی دولت ذاتی نہیں تھی۔ کیونکہ اگر اس کی ذاتی دولت ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا کہ ہم اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے مالدار لوگوں کو تباہ کر چکے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں قارون کے مقابلہ میں پہلی ہلاک شدہ قوموں کی دولت اور ان کی طاقت کو پیش کیا ہے۔ پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قارون کے قبضہ میں بھی قومی دولت تھی یعنی وہ حکومت مصر کا ایک بڑا افسر تھا۔ اس کی ذاتی دولت و ثروت کا اس جگہ ذکر نہیں کیا گیا۔

وَ لَا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذُنُوۡبِہِمُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ میں بتایا کہ مجرم اپنے اعمال سے آپ پہچانا جاتا ہے اس کے متعلق کسی جستجو اور پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا آتی ہے وہ طبعی ہوتی ہے اور طبعی سزا آپ ہی بتا دیتی ہے کہ مجرم اس کا مستحق تھا۔ مثلاً اگر کوئی شخص آنکھوں سے کام نہ لینے کی وجہ سے نابینا ہو جائے یا ہاتھ پاؤں سے کام نہ لینے کی وجہ سے چلنے پھرنے کی طاقت سے محروم ہو جائے یا دماغ سے کام نہ لینے کی وجہ سے سوچنے اور سمجھنے کی قوت سے محروم ہو جائے یا نیک تعلیموں کا انکار کرنے کی وجہ سے ہدایت سے محروم ہو جائے تو ہر شخص سمجھ جائے گا کہ اس کی سزا اس کے اعمال کے عین مطابق ہے۔ اور وہ اس سزا پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِہٖ فِیۡ زِیۡنَتِہٖ ؕ قَالَ الَّذِیۡنَ یُرِیۡدُوۡنَ

(ایک دن ایسا ہوا کہ) وہ اپنی زینت (یعنی اپنے باڈی گارڈ) کے ساتھ نکلا۔ اس پر وہ لوگ جو کہ دنیا

الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا یٰلَیۡتَ لَنَا مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ قَارُوۡنُ ۙ اِنَّہٗ

کی زندگی کا سامان چاہتے تھے بول اٹھے۔ اے کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا۔ اس کو تو (دنیا

لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۸۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ

کا ایک) بہت بڑا حصہ ملا ہے۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ بولے۔ تمہارا ستیاناس! اللہ کی طرف سے ملنے

ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج وَلَا يُلَقّٰهَآ

والی جزاء مومن اور ایمان کے مناسب حال عمل کرنے والے کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ اور یہ (جزاء)

اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ قف فَمَا

صرف صبر کرنے والوں کا گروہ ہی پاتا ہے۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے قبیلہ کو مکروہات میں مبتلا کر دیا۔ اور کوئی

كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ق وَمَا كَانَ

جماعت ایسی نہ نکلی جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتی اور کسی تدبیر سے بھی وہ (اپنے دشمن سے) بچ نہ سکا۔ اور وہ لوگ جو

مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ

کل تک اس کے مقام پر ہونے کی تمنا کرتے تھے کہنے لگ گئے تجھ پر ہلاکت ہو اللہ (تعالیٰ) ہی یقیناً

بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ

اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔

يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ج لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا

اگر ہم پر اللہ (تعالیٰ) نے احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی مصیبتوں کا شکار کر دیتا۔ تجھ پر ہلاکت ہو

لَخَسَفَ بِنَا ط وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع

(بات یہی ہے کہ) کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

حل لغات۔ وَيْكَ وَیْ تعجب کا کلمہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں وَیْ لِزَیْدٍ یعنی زید پر تعجب کرو نیز وَیْ کَلِمۃٌ

بِهَا عَنِ الْوَيْلِ کبھی اس لفظ سے ہلاکت مراد لی جاتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں وَيْكَ اِسْتَمِعْ قَوْلِيْ۔ تُو ہلاک ہو۔ میری بات سن۔ کبھی کبھی وَيْ کے ساتھ كَاَنْ یا كَاَنَّ بھی داخل کر دیتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ خَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ کے یہ معنے ہیں کہ ایک دن وہ بڑی شان و شوکت سے اپنے تمام اہلکاروں اور باڈی گارڈز وغیرہ کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے سے گذرا۔ اور اس نے اپنے شاہانہ اقتدار کی نمائش کی اور انہیں دکھایا کہ میری کتنی بڑی عزت ہے اور کس طرح یہ سب لوگ میری رضاء اور خوشنودی کے حصول کے لئے میرے آگے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں اور مجھے سلام کرتے اور میرے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کا اپنی قوم کے سامنے اس شاہانہ کرّ و فر سے گذرنا درحقیقت اپنی قوم کی تذلیل کے لئے تھا۔ اور وہ انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ کامیابی کا اصل راز فرعون کی اطاعت میں ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بحیثیت قوم فرعون بنی اسرائیل کا دشمن تھا اور وہ ان کی طاقت کو کچلنا چاہتا تھا۔ مگر ان کی طاقت کو کچلنے کے لئے اس نے جو ذرائع اختیار کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے بنی اسرائیل میں سے ہی قارون کو سرکاری افسر بنا دیا تا کہ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرے کہ میں بنی اسرائیل کے قابل افراد کی قدر کرتا ہوں اور دوسری طرف جب وہ اپنے ہی ہم قوم افراد پر ظلم کرے تو وہ ظلم فرعون کی طرف منسوب ہونے کی بجائے قارون کی طرف منسوب ہو جائے اور لوگ یہ کہیں کہ اس میں فرعون کا کیا قصور ہے یہ ظلم تو قارون نے کیا ہے۔ انگریز نے بھی اپنے زمانہء اقتدار میں ایسا ہی کیا تھا۔ اور اس نے بھی ہندوستان پر حکومت کرنے کے زمانہ میں بعض ماتحت افسر خود ہندوستانیوں میں سے مقرر کئے ہوئے تھے اور وہ انگریز کی خوشنودی کے لئے حاکم قوم کے افراد سے بھی زیادہ ظلم کرتے تھے۔ قارون بھی ایسے ہی ظالم افسروں میں سے تھا۔ جس کے پیش نظر ہمیشہ بنی اسرائیل کی تذلیل رہتی تھی۔ چنانچہ اسی پروگرام کے ماتحت اس نے ایک دن اپنا شاہانہ جلوس نکالا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ سب جمع ہوں اور اس نظارہ کو دیکھیں اور اپنی ذلّت اور بیچارگی پر آنسو بہائیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۔ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ چونکہ ہر قوم میں بعض کمزور افراد بھی ہوتے ہیں جو دین اور تقویٰ اور خدا ترسی کی بجائے دنیوی شان و شوکت اور ظاہری مال و دولت کو زیادہ اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے بنی اسرائیل میں سے کمزور افراد نے قارون کے اس شاہانہ کرّ و فر کو دیکھ کر اس پر رشک کیا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کاش ہم بھی قارون کی طرح ہوتے۔ یہ تو بڑا خوش نصیب ہے جس نے اتنا بڑا اقتدار حاصل کر لیا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۔ جب ان باتوں کا چرچا ہوا اور قوم کے بعض کمزور افراد نے قارون کی تعریف کرنی شروع کر دی بلکہ اس بات پر آہیں بھرنی شروع کر دیں کہ انہیں بھی یہ مقام کیوں حاصل نہیں ہوا تو حقیقت حال کا علم رکھنے والوں یعنی علماء اور ربّانی لوگوں نے انہیں سمجھایا۔ کہ تم اس چندروزہ زندگی پر کیوں مرتے ہو یہ تو آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گی ۔ دائمی زندگی تو وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے اور اس زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے والوں اور اس ایمان کے مطابق عمل کرنے والوں کو جو جزائے نیک ملے گی اس کے مقابلہ میں اس چندروزہ زندگی کا مال و متاع کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ اگر سو سال بھی تم نے عیش سے گذار لئے لیکن اگلی زندگی میں جو غیر محدود ہے تمہارے لئے کوئی سکھ کا سامان نہ ہوا تو تمہیں یہ آرام کیا فائدہ دے گا؟ تم دائمی سکھ اور آرام حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس دنیا سے اپنا دل مت لگاؤ۔

وَ لَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۔ میں بتایا کہ جس طرح اگلے جہان کی جزائے نیک ایک غیر معمولی انعام ہے اسی طرح اس انعام کا مستحق بننا بھی ایک بڑی قربانی چاہتا ہے اور یہ مقام ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صبر سے کام لیا کرتے ہیں ۔ صبر کے معنے صرف جزع فزع سے بچنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ برے خیالات کا اثر قبول کرنے سے رکنے ۔ ان کا مقابلہ کرنے اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ پس انہوں نے دین کو دنیا پر مقدم کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ مقام تمہیں اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تم ان بداثرات کا مقابلہ کرو۔ جو قارون اور اس جیسے دوسرے افراد کی دنیوی شان وشوکت کو دیکھ کر تمہارے دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اور پھر قارون کی طرح ظلم پر کمربستہ ہونے کی بجائے ہمیشہ بدیوں سے بچتے رہو اور نیکیوں پر پورے ثبات اور استقلال کے ساتھ قائم رہو۔ اگر تم ایسا کرو گے ۔ تو تمہاری روحانی آنکھیں کھل جائیں گی ۔ اور تمہیں نظر آنے لگ جائے گا کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر اور ذلیل چیز ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ میں بتایا کہ آخر قارون کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور خدائی عذاب اس پر نازل ہو گیا۔ بنی اسرائیل پر اس کے تمام مظالم اس طاقت اور عزت کی وجہ سے تھے جو فرعون کی خوشنودی کی وجہ سے اسے حاصل تھی ۔ مگر جب خدا تعالیٰ نے اسے تباہ کرنا چاہا تو ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ قارون بھی اور اس کا تمام خاندان بھی ذلیل کر دیا گیا۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ زمین پھٹی اور قارون اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ اس میں غرق ہو گیا (گنتی باب ۱۶ آیت ۳۱، ۳۲) ۔ گویا اس کی تباہی ایک زلزلہ کی وجہ سے ہوئی ۔ اور خَسَفَ کے لفظی معنے زمین میں دھنسنے کے ہی ہیں ۔ لیکن خَسَفَ فُلَانًا کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اسے ذلیل کر دیا ۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جسے وہ ناپسند

کرتا تھا۔اس جگہ خَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ سے یہی مراد ہے کہ ہم نے اس کو اور اس کے سارے خاندان کو دنیا بھر میں ذلیل کر دیا۔

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسا ذلیل ہوا کہ ملک بھر میں کوئی اس کا نام نہ لیتا تھا۔اور کوئی گروہ اس کی مدد کرنے کے لئے نہ نکلا۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ۔اور نہ وہ خود اپنی حالت بدل سکا۔ اِنْتَصَرَ کے معنے ہوتے ہیں اِمْتَنَعَ مِنْ عَدُوِّهٖ (اقرب) اپنے دشمن سے بچ گیا۔پس اس کے معنے یہ ہیں کہ نہ وہ بیرونی تدبیر سے اپنی اس ذلت کو مٹا سکا اور نہ وہ اپنے علم سے کام لے کر جس پر اسے بڑا ناز تھا اپنے آپ کو اس تباہی سے بچا سکا۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ ۚ لَوْ لَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔جب قارون خدائی عذاب کی گرفت میں آ گیا تو وہ لوگ جو کل تک اس پر رشک کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کاش ہمیں بھی قارون جیسا مقام میسر آتا۔ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں ۔اور کہنے لگے کہ تعجب کی بات ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وافر رزق عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اسے تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ ہم پر احسان نہ کرتا اور ہماری اس کوتاہی کو معاف نہ کرتا کہ ہم نے قارون کو ایک بڑا آدمی سمجھ کر یہ خواہش کرنی شروع کر دی تھی کہ کاش ہم بھی ایک دوسرے قارون بن جائیں تو آج ہم کو بھی وہ بے نام ونشان کر دیتا اور وہی عذاب جو اس پر مسلطّ کیا گیا اس میں ہم بھی شریک ہوتے ۔اس سے ظاہر ہے کہ مجرموں کی تائید کرنا یا ان کی پیٹھ ٹھونکنا یا ان کے ظالمانہ افعال کی حمایت کرنا یا مجرموں کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے والوں کی مخالفت کرنا بھی انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔اور اگر وہ توبہ اور استغفار سے کام نہ لیں اور اپنے رویہ کو ترک نہ کریں تو خطرہ ہوتا ہے کہ وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آ جائیں۔

وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ میں بتایا کہ انبیاء کے مخالفین کو دنیا میں عارضی کامیابیاں تو حاصل ہو سکتی ہیں مگر فلاح جو اپنے مقاصد میں بامراد ہونے کا نام ہے انہیں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔اور وہ نبیوں کے مقابلہ میں ضرور تباہ ہوتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي

یہ (جو) اخروی زندگی (ہے) ہم اسے انہی کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں جو ملک میں

الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۴﴾

ناجائز غلبہ اور فساد نہیں چاہتے ۔اور انجام متقیوں کا ہی (اچھا) ہوتا ہے۔

تفسیر ۔اس میں بتایا کہ اخروی زندگی کے انعامات ہم نے انہی لوگوں کے لئے مخصوص کئے ہوئے ہیں جو نہیں چاہتے کہ لوگوں کو ذلیل کر کے آپ بڑے بن جائیں اور نہ فساد اور فتنہ انگیزی کی روح اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ اور گو ابتداء میں یہی سمجھتی ہے کہ امن پسندی سے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ۔کامیابی اور عزت حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ دوسروں کو گرایا جائے اور ملک میں شورش پیدا کی جائے ۔لیکن بڑائی کے آخر وہی مستحق ہوتے ہیں جو متقی ہوں اور انجام ہمیشہ امن پسند اور نیک لوگوں کا ہی اچھا ہوتا ہے ۔اور وہی کامیاب ہوتے ہیں ۔فتنہ وفساد پھیلانے والے خواہ کچھ عارضی کامیابی حاصل بھی کر لیں پھر بھی ان کا انجام حسرتناک ہوتا ہے اور وہ اپنے اعمال کی اس دنیا میں بھی سزا پاتے ہیں اور آخرت میں بھی ذلیل اور رسوا ہوں گے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ

جو شخص پسندیدہ عمل کرے اسے اس سے بہتر بدلہ ملے گا اور جو کوئی

بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا

برا عمل کرے گا تو برے اعمال کرنے والوں کو ان کے اپنے عمل کے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

برابر جزاء دی جائے گی۔

تفسیر ۔نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنا قانون بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ جو شخص کوئی نیک کام بجالائے اسے اپنے کام سے بہت زیادہ بدلہ ملتا ہے اور جو شخص کوئی برا کام کرے ۔اسے

صرف اپنے عمل کے مطابق بدلہ ملتا ہے

یوں تو دنیا میں جو بھی نیک کام کیا جائے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ طاقتوں سے ہی کیا جاتا ہے اور اس نقطۂ نگاہ سے اگر عملِ نیک کی کوئی بھی جزا نہ دی جاتی تو کوئی قابلِ اعتراض امر نہ تھا کیونکہ جن سامانوں سے کام لے کر نیک کام کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر ہاتھ سے کوئی شخص نیکی کا کام کرتا ہے تو ہاتھ اس کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہاتھ کے اندر جو کام کرنے کی طاقت پائی جاتی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی ہی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے اس کی اپنی نہیں۔ پھر اگر ہاتھ سے اس نے کسی پیاسے کو پانی پلایا ہے تو پانی بھی خدا تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔ گلاس جس دھات سے بنایا جاتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور پھر وہ دماغ جس کے اندر نیکی کا یہ جذبہ پیدا ہوا وہ بھی خدا تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ پس جب شروع سے لے کر آخر تک ہر چیز خدا تعالیٰ ہی کی ہے اور اس کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر عملِ نیک کیا جاتا ہے تو اگر وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے تو بوجہ اس کے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور اس کی مملوکہ اشیاء کا بھی مالک ہے انسان اپنے اعمال کے بدلہ میں کسی انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(شرح دیوان غالب صفحہ ۸۳)

یعنی اگر جان بھی انسان خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دے تو اس کا یہ فعل کوئی قربانی نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ جان خدا تعالیٰ نے ہی دی تھی۔ اگر کسی کی چیز انسان نے اس کو واپس کر دی اور وہ بھی سالہا سال کے استعمال کے بعد تو اس صورت میں بھی وہ خدا تعالیٰ کا ہی ممنون احسان ہوتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کوئی کام کیا ہے لیکن باوجود اس کے کہ تمام نیک اعمال خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے عمل میں لائے جاتے ہیں اور اگر ان اعمال کا کوئی بھی بدلہ نہ ملے تب بھی درست ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت کا اس رنگ میں اظہار نہیں کیا کہ وہ انسان کے اعمال کو بدلہ سے محروم کر دے بلکہ اس رنگ میں کیا ہے کہ وہ انسانی اعمال کا ان کے مناسب معاوضہ سے زیادہ بدلہ دے۔ اور باوجود اس کے کہ سب اعمال حسنہ اسی کی دی ہوئی توفیق سے انسان بجا لاتا ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ ایسا ہی قرار دیتا ہے کہ گویا انسان نے وہ نیک عمل اپنی طاقت اور اپنے سامانوں سے کئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اس کے عمل کا پورا بدلہ دیتا بلکہ اپنے پاس سے زائد نعمتیں بھی عطا فرماتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو

اول تو اس کی توبہ پر اسے معاف کر دیتا ہے اور اگر کوئی شخص توبہ نہ کرے تو پھر وہ گناہ کی سزا تو دیتا ہے لیکن اسی قدر جتنا کہ گناہ ہو۔ گویا نیک لوگوں کے ساتھ تو وہ احسان کا معاملہ کرتا ہے۔ اور گنہگاروں کے ساتھ انصاف کا سلوک روا رکھتا ہے اور ان کی بدیوں کے برابر ہی ان کو سزا دیتا ہے اس سے بڑھ کر کسی صورت میں سزا نہیں دی جاتی۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلۡ

وہ خدا جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اس مقام کی طرف لوٹا کر لائے گا

رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی وَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ

جس کی طرف لوگ لوٹ لوٹ کر آتے ہیں۔ تُو کہہ دے میرا رب اس کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پر قائم ہوتا ہے

مُّبِیۡنٍ ﴿۸۶﴾

اور (اس کو بھی) جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے۔

تفسیر۔ اب اللہ تعالیٰ اس بات کے ثبوت میں کہ انبیاء کا مقابلہ کرنے والے خواہ کتنی بڑی طاقت رکھتے ہوں تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اور انجام کار مومن ہی کامیاب اور مظفر و منصور ہوتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک اہم ترین واقعہ کو بطور پیشگوئی بیان کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ۔ یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا اور اس کی اطاعت فرض کی ہے وہ اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ تُو بہر حال اس مقام کی طرف پھر واپس لوٹایا جائے گا جس کی طرف لوگ بار بار اور بار بار آتے ہیں۔ بار بار لوگ کس طرف آتے تھے؟ اسی مقام کی طرف جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ ہم نے اسے مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ بنایا ہے (سورۃ بقرۃ آیت ۱۲۶) اگر یہاں مَعَادٍ کی جگہ مَثَابَۃ کا لفظ رکھا جاتا تو اِخفاء نہ رہتا۔ اس لئے مثابۃ کا ہم معنے لفظ مَعَادٍ رکھ دیا تا کہ پیشگوئی بھی ہو جائے اور اخفاء بھی رہے۔ فرماتا ہے ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ کہ ہم تجھے پھر اس مقام یعنی مکہ مکرمہ کی طرف واپس لائیں گے جس کی طرف لوگ بہ نیتِ حج اور حصول ثواب کے لئے بار بار آتے ہیں۔ اور یہ سیدھی بات ہے کہ واپس اسی کو لاتے ہیں جو گیا ہو۔ اور جو گیا ہی نہ ہو اس کے واپس آنے کا سوال ہی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ پس اس آیت میں دو عظیم الشان پیشگوئیاں کی گئی

تھیں۔ایک یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کرنی پڑے گی اور دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد آپ پھر ایک فاتح کی صورت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے۔

یہ آیت قرونِ اولیٰ میں اتنی دوہرائی جاتی تھی اور اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ بعض بیوقوفوں کو اس سے بڑے بڑے دھوکے بھی لگ گئے۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا جو اس مومنٹ کا بانی تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔جس نے اسلام میں ایک بہت بڑا فتنہ برپا کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائیاں کیں۔وہ اسی آیت کو پیش کر کے کہا کرتا تھا کہ اسلام تناسخ کا قائل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ میں مَعَادٍ سے مراد دنیا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء کی تمثیلیں دنیا میں آتی رہتی ہیں۔اگر انبیاء کی تمثیلیں نہ آئیں تو دوسروں کی تمثیلوں سے کیا فائدہ؟ دنیا میں اگر یہ ایک سچی حقیقت ہے جو انگریزی زبان میں بیان کی جاتی ہے کہ

History repeats Itself.

''تاریخ اپنے آپ کو بار بار دوہراتی ہے''۔تو یقیناً انبیاء بھی بار بار تمثیلی طور پر دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔اور درحقیقت اگر کوئی چیز دوبارہ واپس لانے کے قابل ہوتی ہے تو اچھی چیز ہی ہوتی ہے لیکن اس آیت میں کسی تناسخ کا ذکر نہیں اور نہ معادٍ سے مراد دنیا ہے۔ بلکہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ میں درحقیقت یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کریں گے اور پھر اس شہر میں واپس آئیں گے جس کو عبادت کا مرکز بنایا گیا ہے۔اور جس کی طرف بار بار دنیا حج اور عمرہ کے لئے آتی ہے۔گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ ایک دن کفار تجھے اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔مگر وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا اور اس کی اطاعت فرض کی ہے تجھ سے قسم کھا کر وعدہ کرتا ہے کہ جب دشمن تجھے تیرے وطن سے نکال دے گا تو ہم پھر تجھے تیرے وطن میں لے آئیں گے۔غور کرو اور سوچو کہ اس آیت میں آپ کی مکہ سے ہجرت کی خبر کس لطیف پیرایہ میں دی گئی ہے۔بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ایک دن تجھے ہجرت کرنی پڑے گی اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حساس دل کو صدمہ پہنچتا اس نے پہلے ہی آپؐ کو واپس آنے کی خوشخبری دیدی۔اور چونکہ واپس وہی آسکتا ہے جو گیا ہو اس لئے ضمنی طور پر اس میں یہ بھی بتا دیا کہ ایک دفعہ آپ کو مکہ سے ہجرت کرنی پڑے گی۔اور موسیٰؑ کے ساتھ آپ کی مماثلت ظاہر ہو جائے گی۔

سورۂ قصص کے مکی ہونے کے متعلق مسلمان علماء تو متفق ہی ہیں لیکن عیسائی مصنفین بھی اسے مکی تسلیم کرتے

ہیں ۔(کمنٹری آن دی قرآن مصنفہ وہیری جلد ۳ ص ۲۵۱) اور اس طرح وہ اپنے ہاتھوں اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں ۔ کیونکہ اگر یہ سورۃ مکی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پتہ لگ گیا تھا کہ میں مکہ سے ہجرت کروں گا اور اس کے بعد میں ایک فاتح کی حیثیت سے دوبارہ اس شہر میں داخل ہوں گا۔ اگر باوجود اس کے کہ آپ کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی علم نہیں تھا آپ یہ پیشگوئی فرماتے ہیں اور پھر وہ پوری بھی ہوجاتی ہے ۔تو یہ آپ کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے ۔پس عیسائی مستشرق اس سورۃ کو مکی کہہ کر خود پھنس گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت کر گئے ۔اگر وہ لکھ دیتے کہ یہ سورۃ مدنی ہے تو کہا جاسکتا تھا کہ مدینہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طاقت حاصل ہوگئی تھی اس لئے اس قسم کی پیشگوئی کرنا آپ کے لئے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔لیکن انہوں نے اس سورۃ کو مکی قرار دیا اور اس طرح اپنی تحقیق سے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کا اظہار کر دیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورۃ میں بعض آیات مدنی بھی ہیں ۔لیکن عیسائی مصنفین اسے خالص مکی سورۃ قرار دیتے ہیں ۔اور اس طرح وہ اپنے ہاتھ سے اسلام کی صداقت کا ثبوت مہیا کرتے ہیں ۔بعض عیسائی مصنّف لکھا کرتے ہیں کہ ہمیں سورتوں کے سٹائل سے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس سورۃ کی فلاں آیت مدنی ہے اور فلاں مکی ۔حالانکہ اگر یہ بات درست ہے کہ انہیں قرآن کریم کے سٹائل سے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کی فلاں آیت مکی ہے اور فلاں مدنی تو یہ قرآن کریم کا کتنا بڑا کمال ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کو جس میں ہجرت کی پیشگوئی تھی اس سٹائل میں اتارا جس کی وجہ سے عیسائیوں نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی وجہ سے انہیں اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ مکی زندگی میں ہجرت اور فتح مکہ کے متعلق جو پیشگوئی قرآن کریم نے کی تھی وہ سچی نکلی ۔ورنہ اگر یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوتی تو اسے اس بات کا کیسے علم ہوسکتا تھا کہ آج سے اتنے سالوں کے بعد وہیری، نولڈ کے اور دوسرے مستشرقین نے کسی سورۃ کے سٹائل کی وجہ سے اسے مکی یا مدنی کہنا ہے ۔اس لئے اس کا سٹائل ایسا رکھو کہ اس سورۃ کے پڑھتے ہی ہر شخص یہ معلوم کرلے کہ یہ مکی ہے ۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے نازل کرنے والی ہستی کو ان اعتراضات کا علم تھا جو بیسویں صدی کے عیسائی مصنفین نے کرنے تھے ۔لیکن ان عیسائیوں کو خود بیسویں صدی میں بھی یہ علم نہیں کہ ہم نے ان آیتوں کی کیا تفسیر کرنی ہے ۔ وہ ایک آیت پر اعتراض کرتے ہیں ۔لیکن اس آیت کی جب ہم تفسیر کرتے ہیں تو ان کا اعتراض ردّ ہوجاتا ہے ۔اور اس طرح قرآن کریم کی فضیلت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا پر ظاہر ہوجاتی ہے ۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ کلام کسی

انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ عالم الغیب خدا کا اتارا ہوا ہے۔اور اس کثرت سے اس میں علم غیب بھرا ہوا ہے کہ ہر آیت سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکل آتا ہے۔گویا جیسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اینٹ اینٹ کے نیچے فلاں چیز موجود ہے اسی طرح تم کوئی آیت اٹھاؤ اس کے نیچے ایک معجزہ نکل آتا ہے اور اس طرح قرآن کریم سارے کا سارا معجزوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اس آیت میں ہی خبر نہیں دی گئی بلکہ بعض اور بھی مکی آیات میں یہ خبر واضح طور پر دے دی گئی تھی۔چنانچہ سورۃ بلد جو مکی سورۃ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ(البلد:۲،۳) یعنی میں اس بات کے ثبوت میں کہ کفار اپنے دعووں میں جھوٹے ہیں مکہ شہر کو پیش کرتا ہوں اور اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اے محمد رسول اللہ تُو ایک دن پھر اس شہر میں کامیاب طور پر واپس آنے والا ہے۔پھر آپ کی ہجرت اور مکہ مکرمہ میں کامیاب واپسی کی اس آیت میں بھی خبر دی گئی تھی کہ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (بنی اسرائیل:۹) یعنی اے میرے رب! مجھے مکہ میں داخل ہونے کا بھی بابرکت موقعہ دیجیو اور مجھے مکہ سے نکلنے کا بھی بابرکت موقعہ دیجیو۔یعنی میرا مکہ میں واپس آنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو۔اور میرا مکہ سے نکلنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو۔اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو اور اپنے پاس سے مجھے غلبہ عطا فرمائیو۔وہ غلبہ جو مجھے کامیاب کر دے۔اور میرے دشمنوں کو مغلوب کر دے۔بعض لوگ اس آیت پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے داخل ہونے کا پہلے کیوں ذکر کیا ہے حالانکہ آپ نکلے پہلے اور داخل بعد میں ہوئے۔کہنا یہ چاہیے تھا کہ رَبِّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ مگر کہا یہ گیا ہے رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ یعنی اے رب مجھے اچھے طور سے داخل کیجیو اور مجھے اچھے طور سے نکالیو۔صدق کا لفظ جب عربی زبان میں کسی چیز کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایسی چیز جو ہمیشہ یادگار رہے۔پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ یہ دعا سکھاتا ہے کہ اے میرے رب تو میرا داخلہ ایسا کیجیو جو دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے اور مجھے نکالیو بھی ایسی شان سے کہ قیامت تک یادگار رہے۔یہ سوال کہ اَدْخِلْنِيْ پہلے کیوں رکھا گیا ہے اور اَخْرِجْنِيْ کو بعد میں کیوں رکھا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے نبیوں کو ڈرایا نہیں کرتا۔بلکہ امید اور یقین کا پہلو ہمیشہ ان کے سامنے روشن رکھتا ہے۔اگر پہلے ہی یہ الہام ہوتا کہ رَبِّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل گھبرا جاتا کہ یہ کیا ہونے والا ہے

اور دل میں خیال پیدا ہوتا کہ نہ معلوم یہ نکلنا عارضی ہے یا مستقل۔ اس لئے بجائے نکلنے کا پہلے ذکر کرنے کے اللہ تعالیٰ نے داخل ہونے کا پہلے ذکر کر دیا تا کہ آپ کا دل مطمئن رہے اور آپ سمجھیں کہ یہ نکلنا محض عارضی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہم پھر مکہ میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ دیکھ لو رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ کی دعا کس شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ آپؐ نکلے تو کس شان کے ساتھ نکلے اور آئے تو کس شان کے ساتھ آئے۔ گھر سے نکلے تو اس وقت کفار نے آپ کے گھر کے اردگرد پہرہ لگایا ہوا تھا۔ مگر آپ ان کی آنکھوں کے سامنے نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے آپؐ کو دیکھا بھی مگر خیال کیا کہ یہ کوئی اَور شخص ہوگا۔ اس طرح آپ کفار کی صفوں میں سے نکل گئے اور ان کا ذہن اس طرف مائل ہی نہیں ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں بلکہ انہوں نے سمجھا کہ یہ کوئی اَور شخص ہے۔ پھر وہ ساری رات دروازہ کی دراڑوں میں سے جھانک جھانک کر آپ کو دیکھتے رہے۔ اور چونکہ حضرت علیؓ آپ کے بستر پر سوئے ہوئے تھے انہیں کوئی شبہ نہ پڑا بلکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐ ہی سوئے ہوئے ہیں اتنے میں صبح ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علیؓ اندر سے نکل آئے ہیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑا نشان تھا جو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا۔ پھر آپ غارِ ثور میں جا کر چھپ رہے جو مکہ سے تین چار میل پرے ایک غار ہے۔ میں بھی وہاں گیا ہوں لیکن میرے دل میں کچھ ایسی کمزوری ہے کہ میں پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتا۔ ارادہ تو تھا کہ جاؤں اور غارِ ثور دیکھوں مگر سو دو سو گز تک جا کر رہ گیا۔ اس پر میں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیج دیا۔ اس نے جو کیفیت بتائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی گز کی جگہ ہے اور اس کا خوب کھلا اور چوڑا مونہہ ہے۔ گویا کئی گز چوڑا اور کئی گز لمبا ایک کمرہ ہے۔ آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ گئے اور اس غار میں جا کر بیٹھ رہے۔ جب صبح ہوئی اور مکہ والوں نے دیکھا کہ آپ کہیں چلے گئے ہیں تو انہوں نے مشورہ کیا کہ آپ کا پیچھا کیا جائے۔ ادھر انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص آپؐ کو پکڑ کر لائے گا اسے سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے کھوجی کو اپنے ساتھ لیا اور آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کھوجی پاؤں کے نشانات کو دیکھتے دیکھتے ان سب کو غارِ ثور کے مونہہ پر لے کر پہنچ گیا۔ اور اس نے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو یہاں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اب باوجود اس کے کہ مکہ والوں کو کھوجیوں پر بڑا اعتبار ہوا کرتا تھا۔ ان کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھیں اور غارِ ثور کو اندر سے دیکھ لیں۔ حالانکہ وہ کئی گز لمبی اور کئی گز چوڑی جگہ تھی اور اس کا منہ بہت کھلا تھا۔ یہ کیسا زبردست نشان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا۔ وہ اس کی بات کو سن کر ہنسنے لگ گئے اور کہنے لگے یہ محض بکواس ہے ہم تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ وہ اس وقت اتنے قریب پہنچ

چکے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرائے کہ ایسا نہ ہو یہ ہمیں دیکھ لیں اور انہوں نے آہستگی سے اس خطرہ کا اظہار بھی کر دیا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ اگر یہ ہمارے سر پر بھی کھڑے ہیں تو کیا ہوا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے بھلا یہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنی جان کا فکر نہیں کیونکہ میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ اگر میں مارا بھی جاؤں تو صرف ایک فرد مارا جائے گا۔ لیکن آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو سارا جہان مر جائے گا۔ غرض کفار چند منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر واپس مکہ میں آ گئے۔ تیسرے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غار میں سے نکلے اور مدینہ تشریف لے گئے (السیرۃ النبویۃ بخاری کتاب المناقب باب مناقب المھاجرین)۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں سے نکلنا کس شان کے ساتھ ہوا۔ یہ اسی دعا کی برکت تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکھائی گئی تھی اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ مجھے مکہ میں سے نکالیو تو اس شان کے ساتھ کہ میرا نکلنا قیامت تک یادگار رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔ کیا کوئی شخص اس واقعہ کو بھلا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو مارنے کے لئے آتے ہیں جو گھر کے اردگرد بیٹھے ہوتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی صفوں میں سے گذر جاتے ہیں اور انہیں پتہ تک نہیں لگتا۔ پھر کھوجی ساتھ جاتا ہے وہ نشان بتاتا ہے اور بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو یہیں کہیں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ مگر وہ اپنے کھوجی پر اعتبار رکھنے کے باوجود اس کی بات کو تسلیم نہیں کرتے آپ کی ادھر ادھر تلاش نہیں کرتے بلکہ ہنستے ہوئے واپس آ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارے کھوجی کی عقل ماری گئی ہے۔ پھر اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ والی دعا بھی کس شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ مکہ والوں کی کتنی بڑی طاقت تھی ان کو کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ساری طاقت کو توڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل کیا اور اس شان کے ساتھ داخل کیا کہ بڑے بڑے دشمن آپ کی غلامی میں شامل ہو گئے ہندہ جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ کٹوایا اور مثلہ کیا تھا اور جو اسلام کی شدید ترین دشمن تھی اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مگر جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی تو وہ بھی چھپ کر ان عورتوں کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرنے کے لئے آ گئی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لیتے ہوئے عورتوں سے کہا کہ کہو ہم شرک نہیں کریں گی تو ہندہ سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے کہا یا رسول اللہ کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ ہم مالدار تھے اور آپ غریب تھے۔ ہمارا جتھہ تھا۔ اور آپ اکیلے تھے اگر بتوں کی کوئی بھی حیثیت ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ آپ ہمارے مقابلہ میں جیت جاتے۔ جب آپ ہمارے مال اور ہماری طاقت اور ہماری شوکت اور ہمارے جتھہ اور ہمارے اثر

اور ہمارے اقتدار کے باوجود جیت گئے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے بتوں میں کوئی طاقت نہیں۔ یہ وہ عظیم الشان نشان تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فتح مکہ کے وقت ظاہر ہوا۔ اور جس کی لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ میں خبر دی گئی تھی۔

پھر جب ہم کتب سابقہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان میں بھی یہ پیشگوئی نظر آتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک دن اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اور پھر دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آپ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ آپ کی ہجرت کی خبر یسعیاہ باب ۲۱ میں پائی جاتی ہے جہاں لکھا ہے:۔

''عرب کی بابت الہامی کلام ۔عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے۔ ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے۔ اور خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔''

(یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

اس پیشگوئی میں دوانیوں کے قافلوں اور تیما کی سرزمین کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم روٹی اور پانی لے کر ان لوگوں کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھو جو مخالفین کے جور وستم اور ان کی ننگی تلواروں اور کھچی ہوئی کمانوں کا ایک لمبے عرصے تک نشانہ بنے رہے۔ اور جو اب بھاگ کر تمہارے ملک میں پناہ لینے کے لئے آرہے ہیں۔

دوان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک پوتے کا نام ہے جو آپ کی تیسری بیوی قطورہ کے بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے یُقسان کی اولاد میں سے تھا۔ (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱ و ۲)

تیما حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نویں بیٹے کا نام تھا۔ (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۶) اور قیدار حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے بیٹے کا نام ہے۔ پیدائش باب ۲۵ آیت ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی قطورا دونوں ارض مشرق یعنی عرب میں آباد ہوئے۔ چنانچہ دوان کی اولاد پہلے یمن میں آباد ہوئی۔ مگر پھر اس کے قبائل عرب میں چاروں طرف پھیل گئے۔ اوس اور خزرج بھی اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح تیما کی اولاد مدینہ

کے نواح میں آباد ہوئی۔ لیکن قیدار کی اولاد مکہ کے نواح میں بسی۔ قریش مکہ اسی کی نسل سے تھے (البداية و النهاية ذكر اخبار العرب و تاریخ ابن خلدون جزء ثاني الخبر عن بني عدنان و انسابهم)۔ حضرت یسعیاہ نے ددان اور تیما کی نسلوں کو جو نواح مدینہ میں آباد تھیں بتایا کہ ایک زمانہ میں قریش کے مظالم اور ان کی شب و روز کی جنگ کے نتیجہ میں آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑے گی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھو۔ اور اپنی آنکھوں کو فرش راہ کرو۔ اور روٹی اور پانی لے کر ان کے ملنے کو نکلو۔ یعنی اپنے گھروں کے دروازے ان کے لئے کھول دو۔ اور ان کی خدمت کو اپنے لئے برکت اور رحمت کا باعث سمجھو۔ چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکلے اور ایسی حالت میں نکلے جب کہ ننگی تلواروں کے ساتھ دشمن نے آپ کے مکان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ آپ کا خاتمہ کر دے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسی قدرت نمائی فرمائی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے سے نکل آئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

پھر اس پیشگوئی میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ہجرت کے ٹھیک ایک سال بعد آپؐ کے اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان ایک جنگ ہوگی جس میں دشمن شکست کھائے گا۔ قریش کا تمام رعب و دبدبہ خاک میں مل جائے گا۔ چنانچہ عین ایک سال کے بعد جنگ بدر ہوئی جس میں اسلام کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور قریش مکہ اپنے کمانڈر اور جرنیلوں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر ہی بھاگ کھڑے ہوئے (بخاری كتاب المغازی باب دعا النبی علی کفار قریش)۔

پھر یہ تو ہجرت کی خبر تھی۔ فتح مکہ کی خبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں دی کہ

> ’’خداوند سینا سے آیا۔ شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔‘‘

(استثناء باب ۳۳ آیت ا و ۲)

اس آیت میں فاران سے ظاہر ہونے والے جس موعود کی پیشگوئی کی گئی تھی وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہؓ کے لشکر کے ساتھ مکہ میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ہوگی آتشی شریعت سے مراد دلوں کو صاف کرنے والی شریعت بھی ہو سکتی ہے اور اس موقعہ کے مناسب اس کے معنے تلوار کے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب مکہ والے قرآن کی حکومت

کو جو رحمت کا پیغام تھا قبول نہیں کریں گے بلکہ اسے مٹانے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک آتشی شریعت یعنی تلوار دیگا اور آخر مکہ کے لوگ تلوار کے آگے اپنا سر جھکا دیں گے۔

یہ پیشگوئی جو بائیبل میں پائی جاتی ہے اس کی طرف یہود کے اہل علم طبقہ کی نگاہ رسول کریم صلی اللہ عیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی اٹھ چکی تھی۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرا گئے اور آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا۔ وہ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو صحفِ انبیاء سے خوب واقف تھا اور کہا کہ ان کے پاس اپنی کیفیت کا ذکر کریں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں باتیں بتائیں کہ کس طرح ان پر وحی نازل ہوئی ہے تو ورقہ بن نوفل نے کہا۔ کاش میں اس وقت جوان ہوتا اِذْ یُخْرِجُكَ قَوْمُكَ۔ جب تیری قوم تجھے مکہ سے نکال دے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحف سابقہ کی یہ پیشگوئیاں ان کے ذہن میں تھیں کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی پیدا ہوگا جسے اس کی قوم کے لوگ اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سنی تو آپؐ سخت حیران ہوئے کیونکہ اس وقت تک ابھی آپ نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور سارا عرب آپ کو راستباز اور امین سمجھتا اور آپ کو عزت کے مقام پر بٹھاتا تھا۔ اسی حیرت کے عالم میں آپؐ نے ورقہ بن نوفل سے کہا۔ اَوَ مُخْرِجِیَّ ھُمْ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ انہوں نے کہا۔ ہاں! ضرور نکال دے گی (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف بدء الوحی)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشگوئی کی طرف پہلے ہی واقف لوگوں کے ذہن منتقل ہو چکے تھے کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی آئے گا جو موسیٰؑ کا مثیل ہوگا۔ اس کی قوم کے لوگ اسے اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ پھر وہ کسی اَور مقام میں پناہ لے گا اور وہاں سے طاقت حاصل کر کے مکہ فتح کرے گا۔ چنانچہ جب اس پیشگوئی کے ظہور کا وقت آیا تو ابھی آپ مکہ میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن کی اطاعت فرض کی ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ خدا تجھے پھر اس شہر کی طرف واپس لائے گا جس کی طرف لوگ بار بار لوٹ کر آتے ہیں۔ یعنی اب تیری ہجرت کا زمانہ قریب آچکا ہے اور تجھے مکہ سے نکال کر دشمن خوش ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا مگر تیرا خدا ہجرت سے بھی پہلے خوشخبری دیتا ہے کہ وہ پھر تجھے اس مقام میں واپس لائے گا اور دشمنوں کی جھوٹی خوشیوں کو پامال کر دے گا۔

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْھُدٰی وَمَنْ ھُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ جو ہدایت لاتا ہے اس کو بھی اور جو گمراہی میں پڑا ہوا ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پھر یہ کس

طرح ہوسکتا ہے کہ ہدایت لانے والا ناکام رہے اور گمراہ لوگ کامیاب ہوجائیں۔آخری فیصلہ بہرحال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو ہدایت لے کر آیا ہے وہ کامیاب ہو اور اس کے دشمن ہلاک ہوں۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً

اور تُو (کوئی) امید نہیں رکھتا تھا کہ تجھ پر ایک مکمل کتاب نازل کی جائے گی۔مگر تیرے رب کی طرف

مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ

سے رحمت کے طور پر ایسا ہوا۔پس تُو کافروں کا مددگار کبھی نہ بنیو۔اور تجھے کوئی شخص اس کے بعد کہ اللہ (تعالیٰ) کی

عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا

آیتیں تجھ پر اتاری گئیں ان سے روکنے والا نہ بنے۔اور تُو اپنے رب کی طرف (لوگوں کو)

تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۸﴾ج

بلا اور مشرکوں میں شامل نہ ہو۔

تفسیر۔فرمایا۔اے محمدؐ رسول اللہ تیرے واہمہ میں بھی یہ بات کب آسکتی تھی کہ تجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کامل کتاب نازل ہوگی یہ صرف تیرے رب کی رحمت کا ہی تقاضا تھا کہ موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق تجھ پر وہ کتاب نازل کی جاتی جو دنیا کے تمام دکھوں کا درماں ہوتی اور جو قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کے لئے اپنے اندر ہدایت اور راہنمائی کا سامان رکھتی۔پس اب جبکہ ایسی کامل کتاب ہم نے دنیا میں نازل کردی ہے۔اے محمدؐ رسول اللہ کی پیروی کا دم بھرنے والے تُو کبھی کافروں کا مددگار نہ بن۔

اس جگہ الکِتٰب کا ترجمہ ہم نے ’’کامل کتاب‘‘ اس لئے کیا ہے کہ عربی زبان میں جس چیز پر الف لام داخل ہو۔اس کے ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز اپنی ذات میں کامل ہے۔جیسے الحمد للہ کے ایک معنے یہ ہیں کہ حمد اپنے سارے کمال کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔پس یہاں الکتاب کے معنے ہیں جو تمام روحانی ضرورتوں کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں بظاہر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے مگر قرآن کریم کا یہ طریق

ہے کہ وہ کئی مقامات پر مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتا ہے مگر مراد آپ کی امت کے افراد ہوتے ہیں۔اس جگہ بھی فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ میں امت محمدؐیہ کے افراد سے خطاب کیا گیا ہے۔ورنہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔(الانعام:۱۶۳، ۱۶۴)

یعنی تو ان لوگوں سے کہہ دے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔جو تمام جہانوں کا رب ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔اور مجھے اسی امر کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

پس اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادتیں بھی اور آپؐ کی قربانیاں بھی بلکہ آپؐ کی زندگی بھی اور آپ کی موت بھی سب خدا کے لئے تھی۔اور آپ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کے مصداق تھے۔اور نہ نبوت سے پہلے آپ نے کبھی شرک کیا اور نہ نبوت کے بعد۔تو یہ تصور بھی کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپ کسی وقت کفار کی مدد کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔

پس فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ کے مخاطب امت محمدیہؐ کے افراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اب جبکہ میں نے ایک کامل کتاب نازل فرما کر تمام دنیا کے لئے خیر اور برکت کا سامان مہیا کر دیا ہے اور قیامت تک اب کسی اور شریعت کی ضرورت نہیں رہی تو تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ تم اس کتاب کے علوم سے غفلت اختیار کرو۔اور اس پر عمل کرنے میں تساہل سے کام لو۔کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم دنیا میں گمراہی پھیلانے کا موجب بن جاؤ گے اور اپنے عمل سے کفار کے مددگار ہو جاؤ گے۔کیونکہ مومن اور کافر دو مختلف راستوں پر جا رہے ہیں۔مومن اس کتاب کو اپنے ہاتھ میں لے کر نکلے گا اور کافر اس کتاب کو مٹانے کی کوشش کرے گا لیکن اگر کسی وقت اس کتاب پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے والا ہی اس کتاب کو پس پشت پھینک دے گا تو وہ کفار کا مددگار ہو جائے گا۔پس اے مسلمانو! تم ہمیشہ اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور کبھی کفار کے ان بد ارادوں میں جو وہ اپنے دلوں میں خدا اور اس کے رسول کے نام کو مٹانے کے لئے رکھتے ہیں مددگار مت بنو بلکہ ہمیشہ اس کی تعلیم کو پھیلاتے چلے جاؤ۔

وَ لَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ ۔ دوسری نصیحت اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ قرآن کریم گو ایک کامل کتاب ہے جس کے بعد کوئی شریعت نہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ نزولِ قرآن کے بعد آیاتِ الٰہیہ کا بھی

نزول نہیں ہوگا۔آیاتِ الٰہیہ کا ہر زمانہ میں مختلف شکلوں میں نزول ہوتا چلا جائے گا۔کبھی مجددین کی شکل میں ۔کبھی ماموریں کی شکل میں اور کبھی معجزات ونشانات اور آسمانی تائیدات کی شکل میں اس لئے جب بھی تم پر خدا تعالیٰ کی آیات نازل ہوں یعنی تمہارے زمانہ میں تمہاری ترقی اور بہتری کے لئے خدا تعالیٰ مختلف نشانات کے آئینہ میں اپنی شکل دکھائے توان پر ایمان لانے کے سلسلہ میں کوئی روک تمہارے راستہ میں حائل نہیں ہونی چاہیے ۔جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آخری زمانہ میں مسیح موعود آئے اور تمہارے کانوں میں اس کی آواز پہنچے تو تم فوراً اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑو۔خواہ تمہیں گھٹنوں کے بل چل کر ہی اس کے پاس کیوں نہ جانا پڑے۔

وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اور پھر ایمان لانے کے بعد تمہارا کام یہ ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو بھی اس نعمت میں شریک کرو۔اورانہیں خدا تعالیٰ کے مامور پر ایمان لانے کی تحریک کرو۔اور تبلیغ کے سلسلہ کو وسیع کرو۔

وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور مشرکوں میں شامل نہ ہو۔اس جگہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں بلکہ آپؐ کی امت سے خطاب کیا گیا ہے۔ورنہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہ نبوت سے پہلے کبھی شرک کیا تھا اور نہ نبوت کے بعد آپؐ نے کبھی شرک کیا۔پس اس آیت کی مخاطب آپ کی جماعت ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آیات الٰہیہ کا انکار اور تبلیغ میں کوتاہی بھی اپنے اندر شرک کا ہی ایک رنگ رکھتی ہے۔ کیونکہ آیات الٰہیہ کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو ڈرتا ہے کہ اگر میں نے اپنے ایمان کا اظہار کیا تو لوگ میری مخالفت کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔اسی طرح تبلیغ سے بھی وہی شخص بھاگتا ہے جو لوگوں کی مخالفت اور ان کی ایذا رسانی سے گھبراتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اپنے اندر شرک کا ایک رنگ رکھتی ہیں ۔پس اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی کہ تم مشرکوں میں سے مت بنو۔دلیری سے آیاتِ الٰہیہ پر ایمان لاؤ۔اور پھر دلیری سے ان کی دنیا میں اشاعت کرو۔ اور اپنی نگاہیں ہمیشہ آسمان کی طرف بلند رکھو۔زمینی لوگوں سے مت ڈرو کہ یہ بھی ایک مخفی شرک ہے۔

وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۟ کُلُّ شَیۡءٍ

اور (اے مخاطب) اللہ (تعالیٰ) کے سوا کسی معبود کو مت پکار۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر ایک چیز ہلاک ہونے

ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ؕ لَہُ الۡحُکۡمُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۹﴾

والی ہے سوائے اس کے جس کی طرف اس (یعنی خدا تعالیٰ) کی توجہ ہو۔ حکم اسی کے اختیار میں ہے اور (تم سب) اسی کی طرف لوٹ کر لے جائے جاؤ گے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک اور اہم نصیحت کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ۔ اے مسلمانو! تم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو اپنا معبود سمجھ کر مت پکارو کیونکہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو اشاعت اسلام کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اسلام کے ساتھ سب سے زیادہ ٹکراؤ اور سب سے لمبی ٹکر عیسائیت نے لینی تھی اس لئے قرآن کریم میں عیسائیت کے غلط عقائد کی تردید پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کو بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہیں سب سے بڑا مقابلہ عیسائیت کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ جو تین خداؤں کی قائل ہے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم عیسائیت کے مقابلہ میں مضبوطی سے ڈٹے رہو۔ اور کبھی خدائے واحد کی توحید کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اپنی ذات میں احد یعنی اکیلا ہے۔ اور غیر منقسم ہے۔ اس لئے نہ وہ کسی بیٹے کا محتاج ہے اور نہ روح القدس کا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح اول رضی اللہ عنہ بیمار تھے اور ہم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے آنکھ کھولی اور فرمایا۔ مجھے ابھی لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنے سمجھائے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ صرف اللہ کی ذات ہی مفرد ہے باقی سب چیزیں مرکب ہیں۔ پس روح اور مادہ کے ازلی ہونے کی بحث بالکل لغو ہے۔ روح اور مادہ ہرگز مفرد نہیں بلکہ یہ بھی مرکب ہیں۔ اور ان پر خدا تعالیٰ کا ہرگز قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فنا سے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پاک ہے۔ کیونکہ مفرد پر فنا نہیں آتی۔ فنا ہمیشہ مرکب پر آتی ہے۔ کیونکہ فنا کے معنے ہیں مرکب اجزاء کا الگ الگ ہو جانا۔ اور مفرد کے اجزاء ہی نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کے کسی وقت الگ الگ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ یہی دلیل اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کی ہے اور فرمایا ہے کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ۔ دنیا کی ہر چیز بلکہ ہر مزعومہ معبود بھی ہلاک ہونے والا ہے اور یہ

ہلاکت ثابت کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ کوئی اور وجود اسے قائم رکھ رہا ہے۔

اس آیت میں ضمنی طور پر وحدتِ وجود والوں کا بھی ردّ کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ دنیا میں خدا کے سوا اَور کچھ نہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ خدا تعالیٰ کا ہی جلوہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر وہ چیز جو پیدا ہوتی ہے، وہ ہلاک ہوتی ہے اگر یہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے تو دنیا کی کوئی چیز تغیر پذیر نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر اس کا تغیر پذیر ہونا بتاتا ہے کہ یہ چیزیں خدا کا حصہ نہیں ورنہ اگر کسی چیز کے ایک حصہ میں تغیر ہوسکتا ہے۔ تو پھر کُل میں بھی تغیر تسلیم کرنا پڑے گا۔

اِلَّا وَجْهَهٗ میں بتایا کہ صرف وہی بچیں گے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی۔ یہ استثناء اللہ تعالیٰ نے اس لئے کیا کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ سے یہ شبہ پڑ سکتا تھا کہ شائد جنت بھی ایک دن فنا ہوجائے گی۔ یا وہ روحانی علوم جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ دنیا میں نازل کئے ہیں وہ بھی تباہ ہوجائیں گے یا اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بھی ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اِلَّا وَجْهَهٗ کے الفاظ بڑھا دیئے۔ اور بتا دیا کہ کچھ چیزیں اس ہلاکت سے محفوظ بھی رہیں گی۔ مگر وہ وہی ہوں گی جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کے لئے موت لازمی ہے اور انسانوں میں سے بھی کوئی اس موت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ہاں وہ لوگ جو وَجْهُ اللّٰہ میں محو ہوکر ایک نئی زندگی حاصل کر لیتے ہیں وہ جسمانی موت سے تو نہیں بچ سکتے لیکن ان کی روحیں ہمیشہ کے لئے زندہ رکھی جائیں گی۔ کیونکہ ان ارواح کا خدا تعالیٰ کی ذات سے اتصال ہوجاتا ہے۔ اور دنیا میں ہی خدا نما وجود بن جاتے ہیں۔ جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ بندہ میرے قرب میں اتنا بڑھتا ہے کہ آخر مَیں اس کے ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کے پاؤں ہوجاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اور اس کی زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔ جو اس پر حملہ کرتا ہے وہ اس پر نہیں بلکہ خدا پر حملہ کرتا ہے۔ اور جو اس کو عزت دیتا ہے۔ وہ اس کو نہیں بلکہ خدا کو عزت دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ؎

سر سے میرے پاؤں تک وہ یار مجھ میں ہے نہاں
اے میرے بدخواہ کرنا ہوش کر کے مجھ پر وار

(براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۳۳)

یعنی تم مجھے دیکھتے ہو تو یہ خیال کرتے ہو کہ یہ مرزا غلام احمدؑ ہے۔ اگر ہم نے اس پر حملہ کر لیا تو کیا ہوا حالانکہ اگر

تم حملہ کرتے ہو تو تمہارا حملہ مرزا غلام احمدؑ پر نہیں بلکہ خدا پر ہوتا ہے کیونکہ خدا نے میرے وجود کو اپنا لیا ہے۔

پرانے زمانہ میں طریق تھا کہ بادشاہ ایک بکرا لے کر اس کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ کہ جو اس پر حملہ کرے گا وہ ہم پر حملہ کرنے والا سمجھا جائے گا۔ وہ تمام ملک میں آزاد پھرتا تھا اور کوئی اس کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اور اگر کسی علاقہ میں وہ مارا جاتا تو بادشاہ اس پر چڑھائی کر دیتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض بندے اس کے اتنے پیارے اور محبوب ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان پر حملہ اپنی ذات پر حملہ سمجھتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت صالح علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی اونٹنی کے متعلق لوگوں میں اعلان کر دیا کہ دیکھنا اس کو نہ چھیڑنا۔ ورنہ تم اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کا مطلب درحقیقت یہی تھا کہ جس طرح حضرت صالحؑ خدا کے ہو گئے تھے اسی طرح خدا صالحؑ کا ہو گیا تھا جس طرح حضرت صالحؑ کے بغیر خدا ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اونٹنی کے بغیر صالحؑ بھی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ پس جو اونٹنی کو مارتا تھا وہ اس لئے نہیں مارتا تھا کہ وہ ایک اونٹنی ہے بلکہ اس لئے مارتا تھا کہ صالحؑ تبلیغ نہ کرے۔ اور جو صالحؑ کو مارتا تھا وہ اس لئے نہیں مارتا تھا کہ صالحؑ اور افراد کی طرح ایک فرد ہے بلکہ اس لئے مارتا تھا کہ صالحؑ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا چہرہ دنیا پر ظاہر نہ ہو۔ اس لئے جن لوگوں نے اونٹنی پر حملہ کیا۔ انہوں نے اونٹنی پر نہیں بلکہ صالحؑ پر حملہ کیا اور خدا نے انہیں اپنے غضب کا نشانہ بنا دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم نے اونٹنی کو مار کر صالحؑ کو مارا۔ اور صالحؑ کو مار کر مجھے مارا۔ پس ایسے وجود چونکہ خدا تعالیٰ کے وجود میں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اِلَّا وَجْهَهٗ فرما کر ان کا استثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اور انہیں دائمی حیات کا وارث قرار دے دیا گیا ہے۔

پھر كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ جس چیز میں اللہ تعالیٰ کا وجھہ نظر آتا رہے۔ یعنی وہ اپنی غرضِ پیدائش کو پورا کرتی رہے وہ محفوظ رہتی ہے۔ ورنہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ وجودِ باری کو ظاہر کرنے والا ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ کسی میں رحمت کا اور کسی میں غضب کا اور کسی میں ربوبیت کا اور کسی میں حفاظت کا اور کسی میں قضا و انصاف کا۔ اگر کہو کہ کیا گندی چیزوں میں بھی خدا کا چہرہ نظر آتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چہرہ سے مراد ظہورِ صفات ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کوئی حقیقی چہرہ ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ گندی اور پاک دونوں چیزوں سے خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ صرف ظہور مختلف قسم کا ہے۔ ہاں انسان ایک وقت میں صرف ایک ہی صفت کو نمایاں طور پر ظاہر کر سکتا ہے یا چند صفات ظاہر کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں غضب اور رحم اور باقی سب صفات ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ پس یہ

کوئی اعتراض نہیں کہ ایک ہی وقت میں اس کا چہرہ مختلف آثار کیونکر ظاہر کر رہا ہے۔

پھر فرماتا ہے لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہو بادشاہت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔اور پھر تم سب نے مر کر پیش بھی اسی کے حضور ہونا ہے۔اور جب یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز نے فنا ہونا ہے۔صرف وہی چیز باقی رہے گی جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی اور تمام بادشاہت بھی اسی کے قبضہ میں ہے تو پھر مشرکوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ؟ جب فنا ہونا ہے تو پھر اس ذات کے ساتھ انسان کیوں تعلق پیدا نہ کرے جس کی توجہ سے انسان کو دائمی اور ابدی زندگی مل سکتی ہے اور مرنے کے بعد انسان ہمیشہ کا سکھ پا سکتا ہے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ عنکبوت۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ سَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ستر (۷۰) آیتیں ہیں اور سات (۷) رکوع ہیں۔

وقت تنزیل حضرت ابن عباسؓ۔ ابن زبیرؓ۔ حسن۔ عکرمہ۔ عطاء اور جابر بن زید کے نزدیک یہ تمام سورۃ مکی ہے۔ یحیٰ بن سلام کے نزدیک اس کی صرف بارہ ابتدائی آیات مدنی ہیں۔ باقی ساری سورۃ ان کے نزدیک بھی مکی ہے۔ لیکن قتادہ اسے مدنی قرار دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کے نزدیک یہ سورۃ مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی تھی۔ یوروپین مستشرقین میں سے نولڈکے اور وہیری دونوں اسے مکی قرار دیتے ہیں۔ البتہ وہ اسکی ابتدائی دس آیات اور آیت ۴۵ کو مدنی قرار دیتے ہیں۔

تعلق اور ترتیب سورۃ قصص کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی اے محمد رسول اللہ کے ساتھیو! ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم رہو۔ اور دنیا میں اس کی اشاعت کرتے رہو۔ اور اس بات سے نہ ڈرو کہ مشرکوں کا ملک ہے وہ تم کو تکالیف پہنچائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز نے فنا ہونا ہے۔ صرف وہی چیز باقی رہے گی جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی۔ اس لئے مشرکوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ۔ تمہیں اپنا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے رکھنا چاہیے اور اسی کی رضاء اور خوشنودی کی جستجو کرنی چاہیے۔ اب سورۂ عنکبوت کو بھی اسی مضمون کے تسلسل میں جاری رکھا گیا ہے اور فرماتا ہے کہ بے شک تم چاروں طرف سے مشرکوں میں گھرے ہوئے ہو اور تمہاری مثال اس وقت ایسی ہے جیسے بتیس دانتوں میں زبان ہوتی ہے۔ مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایمان کی شان بھی اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب دشمنوں کی مخالفت اپنے انتہا کو پہنچ چکی ہو۔ اگر تم یہ سمجھو کہ تمہیں پھولوں کی سیج پر چلتے ہوئے کامیابی حاصل ہو جائے گی تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ تم نے بے شک اپنی زبانوں سے اپنے ایمانوں کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارا عمل بھی اس ایمان کی شہادت دے اور تم اپنے خون کے نقوش سے اس ہدایت کے اقرار کا ایک عملی ثبوت قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے مہیا کرو اور یہ مت سمجھو کہ اس قربانی کا صرف تم سے ہی مطالبہ کیا گیا ہے بلکہ پہلے لوگوں سے بھی ایسا ہی مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف منہ کے اقرار سے کسی قوم کو انعامات کا حقدار قرار نہیں دیتا بلکہ وہ انہیں آزمائشوں

اور امتحانات کی بھٹی میں ڈالتا ہے اور انہیں صبر آزما مصائب کے ایک ہولناک دور میں سے گذارتا ہے تا کہ ان کے ایمانوں کا صدق یا کذب بھی لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور لوگوں کو یہ بھی پتہ لگ جائے کہ کس پایہ کا ایمان اللہ تعالیٰ کے حضور مقبول ہوا کرتا ہے۔

خلاصہ مضامین فرماتا ہے۔کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ دینے سے ان کو اللہ تعالیٰ چھوڑ دے گا۔اوران کے ایمان کا امتحان لے کر ان کی حقیقت کو دنیا پر ظاہر نہیں کرے گا۔(آیت ۳)

مومنوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان سے پہلے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے امتحان میں ڈالا۔پس اس زمانہ کے مومنوں کو بھی اللہ تعالیٰ ممتاز کر کے چھوڑے گا۔اور دنیا پر ظاہر کر دے گا کہ وہ صادق ہیں یا جھوٹے۔(آیت ۴)

پھر فرماتا ہے کہ کیا وہ لوگ جو بدیاں کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو سزا نہیں دیں گے۔یا وہ کسی نہ کسی طرح ہماری سزا سے بچ جائیں گے۔ان کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ہماری سزا سے بچنے کا طریق یہی ہے کہ انسان توبہ کرے اور ہماری طرف رجوع کرے۔(آیت ۵)

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت آخر ضرور آئے گا۔ہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کرنا انسان کے اپنے فائدے کے لئے ہوتا ہے خدا کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔جو نیکی کرے گا وہ اپنے فائدہ کے لئے کرے گا۔اور جو بدی کرے گا اس کا نقصان اسے خود پہنچے گا۔اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔(آیت ۶، ۷)

ہاں بدی اور نیکی کی جزاء میں ایک فرق ہے۔ہم چونکہ رحیم وکریم ہیں۔اگر کوئی نیکی کرے تو ہم اس کی نیکیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیتے ہیں۔اور اگر لوگوں سے کوئی غلطیاں ہو جائیں تو ہم ان پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔(آیت ۸)

پھر فرماتا ہے۔ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ہاں اگر وہ توحید کے خلاف کوئی بات کریں تو نہ مانے کیونکہ آخر معاملہ خدا سے پڑنا ہے ماں باپ سے نہیں پڑنا۔اس لئے جو بات خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اس کو خدا تعالیٰ پر چھوڑے۔اس میں ماں باپ کی بات نہ مانے۔(آیت ۹)

پھر بتایا کہ مومنوں کو مرنے کے بعد اعلیٰ مقامات ملیں گے اور ان کو ہم نیک لوگوں کی جماعت میں داخل کریں گے۔(آیت ۱۰)

پھر اس سورۃ کی پہلی آیت کے تسلسل میں بتایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے ان کو تکلیف دی جاتی ہے تو وہ انسانوں کی تکلیفوں کو اتنا ہی بڑا سمجھتے ہیں جتنا خدا کے عذاب کو۔وہ خدا کی رحمت کے دروازہ تک پہنچ کر پھر لوٹ جاتے ہیں۔مومن کو ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمت اور استقلال کے ساتھ سچ پر قائم

رہنا چاہیے۔

پھر فرماتا ہے بزدل لوگ بزدلی کی وجہ سے منافق بھی بن گئے ہیں۔ اگر مومنوں کو خدا کی مدد آجائے تو کہتے ہیں ہم بھی تمہارے ساتھ تھے لیکن وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایمان کا انعام تو خدا نے دینا ہے محمدؐ رسول اللہ نے نہیں دینا۔ اور خدا تو دل کی باتوں کو جانتا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ تو نہیں جانتے۔ پس آرام اور ترقی کے راستے کھلے دیکھ کر اپنے متعلق مومنوں کے ساتھ ہونے کا دعویٰ کرنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ضرور آزمائش میں ڈالے گا۔ یہاں تک کہ دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ مومن کون سے ہیں اور منافق کون سے۔ اور اللہ تعالیٰ کا علمِ قدیم علم واقعہ سے بدل جائے گا۔ تاکہ اس علم کے مطابق اللہ تعالیٰ جو سزا یا جزاء دے اس پر کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ رہے (آیت ۱۱و۱۲)

پھر فرماتا ہے کہ کفر انسان کے دل پر ایسا زنگ لگا دیتا ہے کہ خلافِ عقل باتیں کافر کے منہ سے نکلتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کافر کہنے لگ جاتے ہیں کہ اگر تم ہمارے پیچھے چلو تو ہم تمہارے گناہ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ وہ اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس قسم کی دھوکا بازی کے بدلہ میں اَور بھی بوجھ ان پر ڈالا جائے گا کیونکہ انہوں نے یہ بات کہہ کر اَور بھی گناہ کیا ہے۔ (آیت ۱۳و۱۴)

اس کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر شروع کیا ہے۔ جن کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ آئے تھے اور جن کے سلسلہ میں آگے حضرت موسیٰؑ آئے۔ فرماتا ہے انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک دنیا میں تبلیغ کی لیکن لوگوں نے نہ مانا۔ آخر خدا تعالیٰ کو انہیں ایک طوفان کے ذریعہ سے تباہ کرنا پڑا۔ لیکن نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو خدا تعالیٰ نے بچا لیا اور آنے والوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔ (آیت ۱۵و۱۶)

پھر ابراہیمؑ کا ذکر فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ نوحؑ کے واقعہ سے ابراہیمؑ کے زمانہ کے لوگوں نے فائدہ نہ اٹھایا۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی لوگوں نے شرک کرنا شروع کر دیا۔ اور ابراہیمؑ نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور خدا تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تمہیں کچھ بھی علم ہو تو اس نصیحت پر عمل کرنا تمہارے لئے بہت بہتر ہوگا۔ تم اتنا تو سوچو کہ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو اور خدا تعالیٰ پر ان کے بارہ میں افتراء باندھتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ تم تو اپنی زندگی کے لئے رزق کے محتاج ہو اور تمہارے معبود رزق دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ رزق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے اور زمین سے غلّہ اگاتا ہے۔ پس جو رزق دیتا ہے اسی کی طرف توجہ کرو۔ اور اس کی عبادت کرو کیونکہ آخر تم نے اسی کے پاس جانا ہے۔

اگر تم اس بات کو نہیں مانو گے تو یاد رکھو کہ پہلی قومیں بھی شرک کرتی آئی ہیں اور تمہیں پتہ ہے کہ ان کے شرک

کا کیا نتیجہ نکلا۔ میں تو رسول کی حیثیت میں صرف بات پہنچانے کا ذمہ وار ہوں ۔ جبراً کسی کو ایمان دینا میرا کام نہیں ۔ (آیت ۱۷ تا ۱۹)

پھر فرماتا ہے لوگ اتنا غور نہیں کرتے کہ خدائی نظام بھی ایک عرصہ کے بعد لوگوں کے بدلنے کی وجہ سے بدل جاتا ہے ۔ پھر لوگ کس طرح سمجھتے ہیں کہ ان کے زبردستی ٹھونسے ہوئے نظام ہمیشہ قائم رہیں گے ۔ اور جس نظام یا عقیدہ نے ایک دن بدل ہی جانا ہے اس کو زبردستی ٹھونسنے کی کیا وجہ ہے؟ (آیت ۲۰ و ۲۱)

پھر فرماتا ہے ۔ عذاب الٰہی بھی انہی لوگوں پر آتا ہے جو خدا تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق عذاب کے مستحق ہوتے ہیں ۔ اور رحم بھی انہی پر نازل ہوتا ہے جو خدائی تقدیر کے ماتحت رحم کے مستحق ہوتے ہیں ۔ (آیت ۲۲)

پھر فرماتا ہے کہ خدائی تقدیر کا مقابلہ انسان نہیں کر سکتا ۔ اگر خدا کسی قوم کو اونچا کرنا چاہتا ہے تو وہ ضرور اونچی ہو کر رہے گی ۔ اور اگر کسی کو نیچا کرنا چاہے تو وہ ضرور نیچی ہو کر رہے گی ۔ (آیت ۲۳)

پھر بتایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نشانات اور اس کی لقاء کے منکر ہوتے ہیں ان کے اس انکار کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں ۔ اور آخر یہی مایوسی انہیں بڑے بڑے گناہوں پر دلیر کر دیتی ہے ۔ چنانچہ دیکھ لو جب ابراہیمؑ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی نصیحت کی ۔ تو ان لوگوں نے جو خدا تعالیٰ کی لقاء سے مایوس ہونے کی وجہ سے گناہوں پر دلیر ہو چکے تھے ایک دوسرے سے کہا کہ اسے قتل کر دو ۔ یا آگ میں ڈال کر جلا ڈالو ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو معجزانہ رنگ میں آگ سے نجات دے دی ۔ (آیت ۲۴ و ۲۵)

اس کے بعد بتایا کہ بت پرستی کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں بلکہ صرف اس لئے بتوں کی پرستش کی جاتی ہے کہ تمام بت پرستوں کا ایک نقطۂ مرکزی قائم ہو جائے اور ان کا ایک جتھہ بن جائے ۔ مگر یہ تمام دوستیاں اور تعلقات صرف دنیا کی زندگی تک محدود ہیں آخرت میں یہ لوگ ایک دوسرے پر لعنت ڈالیں گے اور ان کے مزعومہ معبودوں میں سے کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا ۔ (آیت ۲۶)

پھر بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو لوگ ایمان لائے ان میں سے ایک حضرت لوطؑ بھی تھے ۔ مگر چونکہ ان کی قوم ان کی شدید دشمن تھی اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کر دیا کہ مَیں اب اس ملک سے ہجرت کرنے والا ہوں ۔ اور چونکہ انہوں نے خدا کے لئے اپنے وطن کو چھوڑا اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے منہ موڑا ۔ اس لئے خدا نے اس اخلاص کو دیکھ کر انہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کئے ۔ یعنی بیٹا بھی ایسا لائق بخشا جو خدا تعالیٰ کا نبی بنا اور پھر پوتا بھی ایسا دیا جو نبوت کے مقام پر فائز ہوا ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کو دیکھ کر یہ

فیصلہ کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہی ہوں اور اس طرح خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں بڑا اجر دیا۔ اور آخرت میں بھی وہ بڑے درجات حاصل کرے گا۔ (آیت ۲۷ و ۲۸)

پھر لوطؑ کا ذکر کیا جو ایک ایسی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جو خلاف وضعِ فطرت افعال کی عادی تھی اور ڈاکے ڈالتی تھی اور پبلک مقامات میں بھی فواحش کے ارتکاب سے احتراز نہیں کرتی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے سمجھانے پر ان کی قوم نے یہی کہا کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ حضرت لوطؑ نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ خدایا مجھے اس مفسد قوم کے مقابلہ میں اپنی مدد سے سرفراز فرما۔ (آیت ۲۹ تا ۳۱)

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور قومِ لوطؑ کی تباہی کا فیصلہ کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر اس علاقے کے بعض برگزیدہ بندوں کو دی اور وہ لوگ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس انہیں حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ولادت کی خوشخبری دینے آئے اور پھر بتایا کہ اللہ تعالیٰ حضرت لوطؑ کی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سنکر گھبرا گئے اور فرمانے لگے کہ اس بستی میں تو لوطؑ بھی رہتا ہے جو خدا تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ لوطؑ اور اس کے تمام لواحقین اس عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ صرف اس کی بیوی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بھی عذاب کا شکار ہوگی۔ (آیت ۳۲ و ۳۳)

پھر خدا تعالیٰ کے یہ برگزیدہ بندے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ چونکہ انہیں قوم نے بڑی سختی سے غیر قوموں کے افراد سے تعلق رکھنے اور انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے اور ان کی مہمان نوازی کرنے سے منع کیا ہوا تھا اس لئے جب یہ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو حضرت لوطؑ نے پیش آمدہ مخالفت کا تصور کرتے ہوئے تکلیف محسوس کی۔ انہوں نے کہا کہ اب کسی خوف کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس قوم کی تباہی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ چنانچہ عذاب آیا اور وہ لوگ تباہ ہو گئے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک عبرت کا نشان قائم کر گئے۔ (آیت ۳۴ و ۳۵)

اس کے بعد ہم نے مدین کی طرف شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ مگر اس قوم نے بھی قومِ لوطؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام کا انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دل ہلا دینے والے عذاب نے ان کو پکڑ لیا۔ اسی طرح عاد اور ثمود بھی ہلاک کئے گئے۔ اور قارون اور فرعون اور ہامان بھی موسیٰؑ کی مخالفت کی وجہ سے تباہ ہوئے مگر ان میں سے ہر قوم صرف اپنی ہی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہے۔ خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ (آیت ۳۶ تا ۴۱)

پھر بتایا کہ مشرک لوگ جو معبودان باطلہ کو اپنی جائے پناہ سمجھتے ہیں ان کی یہ پناہ گاہیں مکڑی کے گھر سے بھی زیادہ کمزور ہوتی ہیں۔ اور وقت آنے پر ان کا تمام تار پود بکھر جاتا ہے۔ کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھتے۔ (آیت ۴۲)

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ مشرکین اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کن کن لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔ اور انہیں اپنی مدد پر آمادہ کر رہے ہیں۔ مگر ان کی یہ تدبیریں انہیں کامیاب نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ خدا بڑا غالب اور حکیم ہے۔ (آیت ۴۳)

اور ہم نے ان واقعات اور امثال کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں مگر خدا تعالیٰ کی خشیت رکھنے والوں کے سوا اور کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ (آیت ۴۴)

ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے اور سوچتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم الشان مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اس میں مومنوں کے لئے ایک بڑا بھاری نشان ہے یعنی وہ جانتے ہیں کہ جس طرح جسمانی عالم میں یہ زمین و آسمان ضروری ہیں اسی طرح روحانی عالم میں بھی عقل کے ساتھ الہام کا وجود ضروری ہے۔ (آیت ۴۵)

فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ! لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ یہ ہے کہ تُو قرآن کریم لوگوں کو سنا اور نماز با جماعت کو دنیا میں قائم کر۔ اس سے ہر قسم کی بری اور ناپسندیدہ باتوں کا استیصال ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس ذریعہ سے لوگوں کو ذکر الٰہی کا موقعہ ملتا رہے گا۔ جو اپنی ذات میں تمام مقاصد میں سے بڑا مقصد ہے۔ اور اگر اہل کتاب سے کبھی بحث کی نوبت آ جائے تو اس وقت قرآنی دلائل کو مدنظر رکھا کرو۔ اٹکل پچّو باتیں نہ کیا کرو۔ ہاں جو ان میں سے شریر اور ظالم طبع لوگ ہوں۔ انہیں تم الزامی جواب بھی دے سکتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس طرف بھی توجہ دلاتے رہو کہ آپس میں جھگڑنے کا کیا فائدہ؟ تم بھی موحد ہو اور ہم بھی موحد ہیں۔ آؤ ہم دونوں فریق مل کر خدائے واحد کی توحید دنیا میں پھیلائیں اور شرک کو مٹانے کی کوشش کریں۔ (آیت ۴۶، ۴۷)

پھر بتایا کہ جس طرح موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح اب تجھ پر قرآن کریم نازل کیا گیا ہے۔ اور مسلمان اس کی صداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ یہودیوں میں سے بھی سعادت مند لوگ اس پر ایمان لا رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ ناشکری پر مصر ہیں وہ قرآن کریم کے بیان کردہ مسائل کا انکار کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں تورات اور انجیل کے قصے دوہرائے گئے ہیں۔ حالانکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب کی تلاوت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کتابوں کو نقل بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہ کس

طرح کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پہلوں کی کہانیاں بیان کر دی ہیں۔ یہ کہانیاں نہیں بلکہ آیاتِ بیّنات ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن کو قرآنی علم دیا گیا ہے ان کے سینوں سے اس کے معارف کے دریا بہہ رہے ہیں۔ مگر ظالم لوگ پھر بھی انکار کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر آسمانی نشانات کیوں نازل نہیں ہوئے؟ فرماتا ہے۔ تمہارا منشاء تو نشان سے عذاب مانگنا ہی ہے اور خدا تعالیٰ ایک دن یہ عذاب بھی لے آئے گا مگر کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ تجھ پر ایک کامل کتاب نازل کر دی گئی ہے جو دنیا کے تمام مفاسد کا علاج اور اقوامِ عالم کے لئے رحمت کا پیغام ہے۔ اور مومنوں کے لئے نصیحت کا بڑا بھاری سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ (آیت ۴۸ تا ۵۲)

فرماتا ہے اگر اس دلیل سے بھی ان کا اطمینان نہ ہو تو تُو انہیں کہہ دے کہ اب میں اس جھگڑے کا فیصلہ اپنے خدا پر ہی چھوڑتا ہوں۔ وہ زمین و آسمان کے تمام رازوں کو جانتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سچا ہار جائے اور جھوٹا کامیاب ہو جائے۔ ہلاکت اور بربادی انہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو جھوٹ پر ایمان لاتے اور خدا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ (آیت ۵۳)

فرماتا ہے۔ یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ ان کی تباہی کے متعلق جو تجھے خبریں دی گئی ہیں وہ فوراً پوری ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ غضب میں دھیما ہے۔ وہ ان لوگوں کو کچھ ڈھیل دینا چاہتا ہے۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیوی عذاب جب بھی آیا اچانک آئے گا اور ایک عذاب ایسا بھی آئے گا جو تمام منکرین اسلام کا احاطہ کر لے گا۔ اس وقت یہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور نیچے سے بھی۔ نہ ان کے لیڈران کے کچھ کام آئیں گے اور نہ عوام اپنے لیڈروں کے کام آئیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ اب اپنے عملوں کا مزہ چکھو۔ (آیت ۵۴ تا ۵۶)

پھر فرمایا کہ اے مومنو! اگر کفار تمہیں دکھ پہنچاتے ہیں تو تم غیر ممالک میں نکل جاؤ۔ اور میری عبادت کو دنیا میں قائم کرو۔ اور مت ڈرو کہ اگر باہر نکلے تو تم موت کا شکار ہو جاؤ گے۔ موت سے تو کوئی متنفس بھی نہیں بچ سکتا۔ لیکن اگر تم خدا کے لئے مرو گے تو چونکہ تم نے ہمارے پاس ہی آنا ہے ہم تمہیں بہترین انعامات دیں گے اور بلند و بالا مکانات عطا کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ (آیت ۵۷ تا ۵۹)

پھر بتایا کہ اس راہ میں صبر اور توکّل سے کام لینا ضروری ہے۔ اس بات سے کبھی نہ گھبراؤ کہ اگر تم نے خدا کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں تو تم کھاؤ گے کہاں سے؟ تم جانوروں کو دیکھو کیا وہ اپنا رزق اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ پھر کس طرح خدا ان کو رات دن کھلاتا اور ان کی ضروریات کو پوری کرتا ہے پس اگر تم خدا کے ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں بھی رزق دے گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ دعاؤں کو سننے والا اور اپنے بندوں کے حالات کو خوب جاننے

والا ہے۔(آیت ۶۰و۶۱)

اس کے بعد بتایا کہ جب تم لوگ توحید کی اشاعت کے لئے نکلو۔ اور مشرک قوموں سے تمہارا مقابلہ ہو تو تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو بغیر مزدوری کے کس نے بنی نوع انسان کی خدمت پر لگا رکھا ہے۔ کیا تمہارے مزعومہ معبودوں میں سے کسی معبود کا یہ کارنامہ ہے؟ وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اب دیکھو کہ وہ اس اقرار کے باوجود کس طرف کو بہکے جا رہے ہیں۔

پھر رزق کی فراوانی اور تنگی بھی ایک قانون کیساتھ وابستہ ہے جس میں کسی غیر معبود کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے کشائش عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور یہ رزق کی کمی بیشی بڑی حکمتوں پر مبنی ہے اور اس کے پیچھے ایک علیم ہستی کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔(آیت ۶۲و۶۳)

پھر فرمایا۔ اگر ان مشرک لوگوں سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا اور کس نے ایک مردہ زمین کو پھر زندہ کر دیا ہے۔ کیا یہ طاقت تمہارے کسی معبود میں بھی تھی۔ تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کیا ہے۔ تو کہہ دے کہ پھر اس سے ثابت ہوا کہ اللہ ہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے اور جب ہر تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے تو یہ جھوٹے معبود کہاں سے آ گئے۔ جن کا تم ذکر کر رہے ہو۔(آیت ۶۴)

پھر بتایا کہ علمی رنگ میں تو ان پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود جو انہیں اپنے غلط عقائد پر اصرار ہے تو صرف اس لئے کہ خدا کو مان کر دنیا چھوڑنی پڑتی ہے اور دنیا چھوڑنے کے لئے ان کا دل نہیں چاہتا۔ حالانکہ یہ دنیوی زندگی لہو اور لعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اصل زندگی وہی ہے جو اگلے جہان میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے۔ تو انہیں اپنے تمام دیوتا بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی عقیدت کو مخصوص کرتے ہوئے وہ اسے پورے درد اور سوز کے ساتھ پکارتے ہیں۔ لیکن جب کشتی بھنور میں سے نکل جاتی ہے تو پھر شرک کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور ہمارے انعامات کا انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا جبکہ وہ اپنے اعمال کی جزا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے توحید کا انکار کر کے کتنی بڑی غلطی کی۔(آیت ۶۵ تا ۶۷)

پھر فرمایا۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے مکہ مکرمہ کو کیسی پرامن بستی بنایا ہے۔ اس کے اردگرد کے علاقہ میں قتل و خونریزی اور فساد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر مکہ کے رہنے والوں پر کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا۔ پھر کیوں

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے احسان کو دیکھنے کے بعد بھی باطل کی طرف جھکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا انکار کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں انہیں عطا کی گئی ہے۔

انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں بڑے ظالم دو ہی شخص ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا پر افتراء کرے اور دوسرا وہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسول کی تکذیب کرے اور یہ دونوں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ لوگ جو ہمارے قرب کی اپنے دلوں میں سچی خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لئے متواتر جدوجہد اور قربانی اور ایثار سے کام لیتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب کی غیر متناہی راہوں کی طرف بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کنارِ عاطفت میں آجاتے ہیں یہی سلوک اب بھی ہوگا۔ اور محسنوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوگی۔ اور کفار ناکامی و نامرادی کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ (آیت ۶۸ تا ۷۰)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

الٓمّٓ ۚ ② اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا

میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ کیا اس زمانہ کے لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کا یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان

وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ③ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ

لے آئے ہیں (کافی ہوگا) اور وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ جو (لوگ) ان سے پہلے

فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ④

گزر چکے ہیں ان کو ہم نے آزمایا تھا (اور اب بھی وہ ایسا ہی کرے گا) سو اللہ (تعالیٰ) ظاہر کر دے گا ان کو بھی جنہوں نے سچ بولا اور ان کو بھی جنہوں نے جھوٹ بولا۔

تفسیر ۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ الٓمّٓ تین حروف مقطعات سے مرکب ہے۔ الفٓ اَنَا کا قائم مقام ہے لٓ اللہ کا اور مٓ اَعۡلَمُ کا۔ اور ان حروف کے معنے یہ ہیں کہ میں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے حروفِ مقطعات درحقیقت سورۃ کے آنے والے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس جگہ بھی فرمایا گیا ہے کہ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف ان کے منہ کے ان دعووں کی وجہ سے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ اب بظاہر یہ آیت الٓمّٓ کے مضمون کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ الٓمّٓ کے معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اور یہ آیت بتاتی ہے کہ جب تک آزمائش میں ڈال کر مومنوں کے ایمان کی حقیقت نہ کھولی جائے۔ صرف مونہہ سے یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کافی نہیں ہوتا۔ گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو آزمائشوں میں ڈال کر ان کے ایمان کے متعلق صحیح علم حاصل کرے۔ لیکن درحقیقت اگر غور کیا جائے۔ تو ان دونوں معنوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں کیونکہ گو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے لیکن نہ کافر اس بات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ کمزور مومن کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ چونکہ وراء الوراء ہے اور اس کا علم بھی وراء الوراء ہے۔ جب تک

ظاہری آثار ظاہر نہ ہوں۔ لوگوں کو اس بات پر یقین نہیں آتا اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ گو ہم تو جانتے ہیں لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی بھی تسلی ہو اور ان کو بھی معلوم ہو کہ کون مومن ہے اور کون غیر مومن۔ اس لئے اگر کوئی شخص منہ سے ایمان کا دعویٰ کرے تو ہم اس پر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ بار بار ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ گروہِ مومنین جس کو خدا تعالیٰ نے چنا تھا واقعہ میں مومن ہے۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ پھر مثال دیتا ہے کہ یہ طریق ہم نے آج ہی اختیار نہیں کیا بلکہ پہلے زمانہ کے لوگوں کو بھی مختلف قسم کی آزمائشوں میں ڈالا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کے مخفی یقین اور ایمان کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

اس جگہ عِلْم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کے ظاہری معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعہ جان لے گا کہ کون مومن ہے اور کون منافق۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو ازلی ہے اور وہ ہمیشہ سے ہر واقعہ کو جانتا ہے خواہ وہ آدمؑ کے وقت ہوا ہو یا قیامت کے دن ہونے والا ہو۔ پھر ایسا کیوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعہ سے جان لے گا کہ کون مومن ہے اور کون منافق۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ علم الٰہی دو قسم کا ہے۔ ایک کسی چیز کے واقعہ ہونے سے پہلے کا اور ایک واقعہ ہونے کے بعد کا۔ جو وقوعہ سے پہلے کا علم ہے وہ بھی سچا ہے۔ لیکن مجرم کو اس کی بناء پر سزا دی جائے یا اچھا کام کرنے والے کو انعام دیا جائے تو اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کو شک رہتا ہے کہ میری سزا یا انعام ٹھیک تھا یا غلط۔ لیکن وقوعہ کے بعد کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور اس کو سزا یا جزاء کے حق ہونے کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں جو لَيَعْلَمَنَّ فرمایا ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ ہم اپنے علم قدیم کو علمِ واقعہ سے بدل دیں گے۔ یعنی مومنوں کو ایسے حالات میں سے گذرنے دیں گے کہ ان پر بھی اور ان کے ساتھیوں پر بھی یہ بات کھل جائے گی کہ وہ سچے مومن تھے۔ اور کفار کو بھی اس اعتراض کا موقعہ نہیں ملے گا کہ ان کو یونہی انعام مل گیا ہے یہ اس کے مستحق نہ تھے۔ پس درحقیقت لَيَعْلَمَنَّ کے معنے ظاہر کر دینے کے ہیں۔ یعنی صادق مومنوں کا جب صدق ظاہر ہو جائے گا اور باوجود ابتلاؤں کے وہ ثابت قدم رہیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے علمِ ازلی کو علم واقعہ سے بدل دے گا۔ کیونکہ علمِ ازلی تو خدا کو ہے مگر بندے تو نہیں جانتے کہ ایسا ہوگا۔ بندے اس وقت جانتے ہیں جب کوئی بات وقوع میں آجائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ زید فلاں مہینہ میں فلاں دن مرے گا لیکن بندوں کو تو معلوم نہیں اور نہ

خدا تعالیٰ کے مخفی علم کی وجہ سے ان کو اس علم پر تسلی ہو سکتی ہے۔ہاں جب خدا تعالیٰ کا ازلی علم واقعہ میں بھی ظاہر ہوجائے اور مقررہ مہینہ کے مقررہ دن وہ شخص مرجائے تو پھر دنیا کے لوگوں کو یقین ہوجاتا ہے کہ واقعہ میں وہ مرگیا ہے اسی کی طرف لَيَعْلَمَنَّ کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہمیشہ سے جانتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون نہیں مگر بندے نہیں جانتے اور جب تک اللہ تعالیٰ کا ازلی علم وقوعہ سے نہ بدل جائے وہ شک میں رہتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ طرح طرح کے فتنوں میں ڈال کر جب کہ مومن اپنے ایمان پر قائم رہتے ہیں دنیا کو یہ یقین دلا دیتا ہے کہ یہ سچے مومن ہیں۔اور اگر ابتلاء کے موقعہ پر کوئی پھسل جائے تو خدا تعالیٰ کا ازلی علم جو اس کے جھوٹے ہونے کے متعلق تھا علم وقوعہ میں بدل کر دوسرے انسانوں کو بھی یقین دلا دیتا ہے کہ وہ کمزور ایمان والا تھا اور اس طرح خدا تعالیٰ کے سلوک پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ امر بیان فرمایا ہے کہ دعویٰ ایمان اور ابتلاء وآزمائش لازم وملزوم ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ مومنوں کو صرف ان کے دعویٰ ایمان کی وجہ سے ہی کامل مومن سمجھ لیا جائے اور انہیں آزمائشوں اور ابتلاؤں کی بھٹی میں نہ ڈالا جائے۔اس طرح نہ پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو جن لوگوں نے کسی زمانہ میں بھی سچا دین قبول کیا ان کے لئے فوراً ہی آرام اور سکھ کا راستہ نہیں کھولا گیا۔ بلکہ پہلے پہل تو یہی ہوا کہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ بھی انہیں دینا پڑا۔اگر کچے گھروں والے تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ ان کے محل بن جاتے وہ گھر بھی انہیں چھوڑنے پڑے۔اگر قوموں میں معزز تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ بادشاہ اور حکمران بن جاتے انہیں پہلی عزتیں بھی چھوڑنی پڑیں۔اگر مالدار تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ ان کا مال دگنا، چوگنا، بیس گنا اور ہزار گنا ہوجاتا انہیں اپنا پہلا مال بھی ترک کرنا پڑا۔اگر لوگوں سے تعلقات تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ ان کے تعلقات وسیع ہوجاتے وہ بھی کٹ گئے۔غرض جو راحت، آرام، عزت، دولت، طاقت اور رسوخ انہیں پہلے حاصل تھا۔وہ بھی جاتا رہا۔اور بجائے فوراً سکھ ملنے کے بظاہر انہیں دکھ ملا۔ یہاں تک کہ خدا کے لئے انہیں اپنے وطنوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے۔مگر انہیں لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے فلسطین جانا پڑا۔حضرت نوح علیہ السلام آئے تو انہیں بھی اپنا مقام چھوڑنا پڑا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو انہیں بھی اپنے گھر بار سے جدا ہونا پڑا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کو صلیب پر لٹکایا گیا اس کے بعد ہمارے نزدیک تو وہ صلیبی موت سے بچ کر کشمیر کی طرف چلے گئے۔اور غیر احمدیوں کے نزدیک آسمان پر چلے گئے۔ پھر ان کی جماعت

پر مظالم ہوئے۔تو وہ جزیرہ سائپرس میں چلے گئے پھر مظالم ہوئے تو وہ روما چلے گئے۔پھر بھاگے تو مصر میں آئے۔ مصر میں مظالم ہوئے تو پھر روما بھاگ گئے ۔پھر روما میں مظالم ہوئے تو صقلیہ میں آ گئے ۔اس طرح متواتر تین سو سال تک اس جماعت کو اپنے مرکز بدلنے پڑے۔اسی طرح بنی اسرائیل پر بخت نصر کے حملہ کے موقعہ پر اتنی عظیم الشان تباہی آئی کہ ان کے تمام مقدس مقامات گرا دیئے گئے ۔شہر مٹا دیئے گئے ۔اور ساری قوم کو پکڑ کر غلام بنا دیا گیا۔یہ کتنا بڑا ابتلاء ہے کہ کوئی شخص بھی آزاد اور حریت والا نہ رہا۔قوم غلام بن گئی ۔معبد گرا دیا گیا۔متبرک مقامات مٹا دیئے گئے ۔شہروں کو آگ لگا دی گئی ۔اور تمام فلسطین اور شام کے حصے ویرانہ بن کر رہ گئے ۔مگر اس کے باوجود ان کی کوشش اور جدوجہد برابر جاری رہی ۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر آتا ہے (دیکھو سورۂ بقرہ آیت ۲۶۰)۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک نبی ایک مردہ بستی کے پاس سے گذرا اور اس نے کہا کہ خدایا یہ مردہ بستی دوبارہ کس طرح زندہ ہوگی؟ اللہ تعالی نے انہیں کشف میں سو سال کا نظارہ دکھایا اور بتایا کہ سو سال کے بعد میں پھر اسے زندہ کر دوں گا۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شبہ دور کرنے کے لئے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں واقعہ میں سو سال سوتا رہا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے کہا دیکھ لو تمہارا گدھا بھی زندہ ہے اور کھانا بھی سلامت ہے۔اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ ایک کشفی نظارہ ہے۔جو تمہیں دکھایا گیا ہے۔چنانچہ جس طرح رؤیا میں بتایا گیا تھا عین سو سال کے بعد فارس اور رمید کا بادشاہ جس کا نام سائرس تھا بابل پر حملہ آور ہوا اور چونکہ اندر کے قلعوں تک پہنچنا اس کے لئے مشکل تھا۔اس نے پیغام رسانی کی اور یہود کو اپنے ساتھ ملانا چاہا۔اس وقت کے انبیاء نے یہود کو اس بادشاہ کے ساتھ ملنے کی اجازت دے دی ۔اس کا بھی قرآن کریم میں ذکر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں بعض انبیاء کے حکم کے ماتحت یہودیوں نے خفیہ سوسائٹیاں بنائیں۔جن میں صرف مرد شامل کئے جاتے تھے عورتیں شامل نہیں کی جاتی تھیں (دیکھو سورۂ بقرہ آیت ۱۰۳)۔یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جس میں انبیاء نے یہ فیصلہ دیا کہ یہود بادشاہ کے ساتھ مل جائیں۔چنانچہ انہوں نے خفیہ کوششیں کیں ۔نتیجہ یہ ہوا کہ جب فارس اور میدکا بادشاہ حملہ آور ہوا تو اندر سے یہود نے بغاوت کر دی اور ان کی مدد سے بادشاہ کو فتح حاصل ہوئی ۔اور اس نے اعلان کر دیا کہ یہود کو اپنے شہروں میں بسنے اور پھر دوبارہ اپنے معابد اور مقدس مقامات وغیرہ بنانے کی اجازت ہے۔بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ اس پر جس قدر روپیہ خرچ ہو وہ سرکاری خزانہ میں سے دیا جائے (ہسٹوریز ہسٹری آف داورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)۔یہ وہی واقعہ ہے جو آیت مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ کے دوسرے حصہ میں بیان ہوا ہے۔پہلے حصہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہودی لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی مخفی کارروائیاں کرتے ہیں ۔اور ان

کا خیال ہے کہ جیسے میدا اور فارس کے بادشاہ کے ساتھ مل کر انہوں نے نینوہ کی حکومت کو تباہ کر دیا تھا اسی طرح اب بھی وہ کسریٰ کے ساتھ مل کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تباہ کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تم نے دو دفعہ خفیہ سوسائٹیاں بنائی ہیں ایک دفعہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ حجی اور زکریاہ کے زمانہ میں۔ پہلی دفعہ جب تم نے خفیہ سوسائٹی بنائی تو خدا کا نبی تمہارے مقابلہ میں تھا اور تم اس کے مخالف تھے۔ اور دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کے انبیاء ہاروت اور ماروت تمہارے ساتھ تھے۔ یہ درحقیقت ان انبیاء کے صفاتی نام ہیں جو بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ میں ان کو واپس لانے پر مقرر ہوئے تھے۔ ھاروت ھرت سے نکلا ہے جس کے معنے پھاڑنے کے ہیں۔ اور ماروت مَرَتَ سے نکلا ہے جس کے معنے توڑ دینے کے ہی (تاج العروس) گویا ان کا کام حکومت کو پھاڑنا اور طاغوتی طاقتوں کو توڑنا تھا۔ ان دو مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم ایک نبی کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تو تم ہارے اور جب انبیاء تمہارے ساتھ رہے اس وقت تم اپنے مخفی منصوبوں میں کامیاب ہوئے۔ اب تمہیں غور کرنا چاہیے کہ تمہارے مقابلہ میں مدعٔی نبوت ہے یا تمہارے ساتھ مدعٔی نبوت ہے۔ اگر تو وہ تمہارے مقابلہ میں ہے تو تمہاری کوششیں ایسی ہی ہیں جیسی تم نے سلیمانؑ کے وقت میں کیں اور اگر یہ مدعٔی نبوت تمہارے ساتھ ہے تو پھر بے شک تمہاری مثال ایسی ہو سکتی ہے جیسے خورس کے حملہ کے وقت ہاروت اور ماروت کے زمانہ میں کوششیں کی گئیں۔ اور چونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کا نبی تمہارے مقابلہ میں ہے اس لئے تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ تمہارے ساتھ وہ واقعہ گذرے گا جو سلیمان کے وقت ہوا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں یہود بالکل تباہ ہو گئے۔ غرض اس وقت بنی اسرائیل پر ایسی تباہی آئی تھی کہ انبیاء تک بھی حیران تھے کہ اب یہ قوم دوبارہ کس طرح زندہ ہو گی۔ چنانچہ حزقیل نبی نے یہی کہا تھا کہ خدایا تو اس کو کس طرح زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ سو سال کے بعد یہ قوم پھر زندہ ہو جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی جماعتوں پر یہ اوقات ہمیشہ آئے اور درحقیقت یہی اوقات اس کے دعوئ ایمان کے صدق اور کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو بھی سالہا سال تک ایسی تکالیف میں سے گذرنا پڑا جو انتہائی درد انگیز تھیں۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہؓ کی ایک جماعت ایک جگہ بھیجی مگر ان لوگوں نے جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے دھوکہ دے کر ان پر حملہ کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اب اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے تم نیچے اتر آؤ۔ (وہ اس وقت ایک پہاڑی ٹیلے پر چڑھے ہوئے تھے) ان کے لیڈر نے کہا۔ میں ان کی باتوں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ جھوٹے اور دھوکہ باز ہیں۔ ان کی قسموں کا کوئی

اعتبار نہیں۔ چنانچہ وہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ مگر باقیوں نے سمجھا کہ جب یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کہیں گے تو ہمیں ان پر اعتبار کرتے ہوئے نیچے اتر آنا چاہیے۔ جب وہ نیچے اترے تو انہوں نے رسیاں باندھ کر انہیں گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اس پر ان لوگوں نے پھر مقابلہ کیا مگر وہ کیا کر سکتے تھے باقیوں کو تو انہوں نے مار دیا لیکن دو کو پکڑ کر مکہ لے گئے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں انہیں بیچ دیا جن کے بعض آدمی مسلمانوں سے مارے گئے تھے ان میں سے ایک کو قتل کرنے سے پہلے مکہ کے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری جگہ پر یہاں ہوتے اور تم اپنے بیوی بچوں میں مدینہ میں آرام سے بیٹھے ہوئے ہوتے۔ اس نے جواب دیا خدا کی قسم تم تو یہ کہتے ہو کہ میں مدینہ میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں میری جگہ ہوتے۔ مَیں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آرام سے بیٹھے ہوں اور آپ کے پاؤں میں کانٹا تک چبھے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک قبیلہ کا رئیس آیا۔ اور اس نے کہا میری قوم اسلام لانے کے لئے تیار ہے۔ آپ میرے ساتھ کچھ آدمی بھجوا دیں۔ وہ تو اپنی اس بات میں سچا تھا اور بعد میں ایمان بھی لے آیا مگر اس کی قوم نے غداری کی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اعتبار کرتے ہوئے ستّر حفاظ کا قافلہ اس کی قوم کی طرف روانہ کر دیا۔ جب وہ اس قبیلہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس رئیس کے بھتیجے کے پاس ایک آدمی کے ذریعہ پیغام بھجوا دیا کہ ہم لوگ آ گئے ہیں۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا کیا کام ہوگا۔ اس نے ان کے سردار کو بلوایا۔ اور جب وہ ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس رئیس نے ایک شخص کو اشارہ کیا جس نے پیچھے سے اس صحابیؓ کی گردن میں نیزہ مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جب اسے نیزہ لگا۔ تو تاریخ میں لکھا ہے کہ اس نے نعرہ لگایا اور کہا فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ۔ کعبہ کے رب کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ اکٹھے ہو کر تمام صحابہؓ پر ٹوٹ پڑے۔ انہی لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ کا وہ غلام بھی تھا جو ہجرت کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ جب ہزاروں آدمیوں کے ہجوم نے ان ستر صحابہؓ پر حملہ کر دیا تو یہ لازمی بات تھی کہ انہوں نے مارا جانا تھا۔ چنانچہ وہ سارے کے سارے وہیں قتل ہو گئے۔ اور ان میں سے کسی نے بھی ہتھیار نہ ڈالا۔ یکے بعد دیگرے جب وہ لوگ مرتے یا کسی کو خنجر لگتا یا تلوار سے کسی کا سر کٹتا تو یہی الفاظ ان کی زبان پر ہوتے کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ خدائے کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ مَیں اسلام سے واقف نہیں تھا۔ میں باہر سے آیا تھا۔ اور قبیلہ والوں کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہو گیا تھا میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ مرتے وقت بجائے یہ کہنے کے کہ ہائے

اماں یا ہائے ابا یہ کہتے ہیں کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ ۔کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا تو مجھے حیرت آئی کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔کیا موت میں کامیابی ہوا کرتی ہے؟ آخر میں نے ایک شخص سے اس بارہ میں پوچھا۔اس نے کہا تم مسلمانوں کو نہیں جانتے یہ ایسے ہی پاگل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں مارا جاتا ہے وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔چونکہ اس کے دل میں نیکی تھی وہ کہتا ہے میں نے جب یہ بات سنی تو سمجھا کہ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔چنانچہ آہستہ آہستہ میں نے اسلام کی تحقیق کی۔اور میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا۔غرض یکے بعد دیگرے ان لوگوں نے موت کو قبول کیا اور موت میں ہی اپنی ساری کامیابی سمجھی۔یہی چیز تھی جس کی وجہ سے وہ قلیل ترین عرصہ میں ساری دنیا پر غالب آ گئے اور ایسی شان سے غالب آئے کہ اس کی مثال پہلی کسی قوم میں نہیں ملتی۔پھر دیکھ لو مصائب کا یہ سلسلہ جلدی ختم نہیں ہو گیا بلکہ ایک لمبے عرصہ تک جاری رہا۔خلافت قائم ہوئی تو حضرت عمرؓ شہید ہوئے۔حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔حضرت علیؓ شہید ہوئے اور کربلا کے میدان میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قریباً سارا خاندان ہی شہید ہو گیا۔بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ابتلاء صرف ابتدائی زمانہ میں آتے ہیں ترقی کے زمانہ میں ابتلاؤں کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔مگر یہ درست نہیں انبیاء کی جماعتوں کی ترقی اور ابتلاء یہ دو توام بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ابتدائی سے ابتدائی زمانہ میں بھی ابتلاء آتے ہیں۔اور ترقی کے انتہائی زمانہ میں بھی ابتلاء آتے ہیں۔اس طرح ابتداء سے انتہاء تک ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔جب نبی ایک منفرد وجود ہوتا ہے اور اس پر صرف ایک یا دو آدمی ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔اس وقت بھی ابتلاء آتے ہیں اور انتہائی عروج کے وقت جب سلسلہ کو ترقی پر ترقی حاصل ہو رہی ہوتی ہے اس وقت بھی ابتلاء آتے ہیں۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دن بھی مصائب و مشکلات میں سے گذرنا پڑا اور آپؐ کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو مختلف قسم کے ابتلاء پیش آئے اور اس کے بعد جب ترقیات کا زمانہ آیا اس وقت بھی ان ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔یہ نہیں ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کسی دن اس خیال کے ساتھ سوئے ہوں کہ اب تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے۔اور وہ تمام مسائل جو مسلمانوں کی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے حل ہو چکے ہیں۔نہ حضرت ابو بکرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔نہ حضرت عمرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔نہ حضرت عثمانؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔اور نہ ہماری جماعت کو کبھی ایسا خیال کرنا چاہیے۔یہ چیزیں الٰہی سلسلوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔اور کبھی کوئی روحانی جماعت ان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ان قربانیوں کی نوعیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ

الصّٰبِرِیْنَ۔ یعنی ہم ضرور تم کو کسی قدر خوف اور بھوک اور اموال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ذریعہ آزمائیں گے اور اے ہمارے رسول تُو ان لوگوں کو جو ان ابتلاؤں کے اوقات میں اپنے راستہ سے ہٹیں نہیں اور مضبوطی سے دین کی راہ میں قربانیاں کرتے چلے جائیں ہماری طرف سے بشارت اور خوشخبری دے دے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔ غرض جب تک کوئی قوم مرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ زندہ نہیں ہوسکتی کیونکہ زندگی موت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک دانہ مٹی میں نہیں ملتا شگوفہ نہیں نکلتا۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا جب تک رحم کی تاریکیوں میں سے نہیں گذرتا۔ اسی طرح کوئی قوم بھی ترقی نہیں کرسکتی جب تک وہ ایک موت اختیار نہ کرے۔

ہماری جماعت میں سے بھی بعض لوگ اس سلسلہ میں داخل ہونے کی وجہ سے کابل میں شہید کئے گئے اور بعض کو اپنے وطن چھوڑنے پڑے لیکن انہوں نے صداقت کو نہ چھپایا اور ایسا تو شائد ہی کوئی انسان ہو جس کو کسی قسم کا بھی دکھ نہ دیا گیا ہو۔ اگر اَور کچھ نہیں تو فتوٰئے کفر کے ذریعہ ہی اسے ڈرانے کی ضرور کوشش کی گئی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ بندوں کو پہلے اپنے ابتلاؤں کے دریاؤں میں سے گذارتا ہے تب انہیں اپنے قرب سے مشرف کرتا ہے۔ یہ بزدلوں اور منافقوں کا کام ہوتا ہے کہ وہ مصائب کے آنے پر گھبرا جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے ابتداء میں ہی منافق کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے اور جب آرام اور راحت کا وقت آتا ہے تو چل پڑتا ہے۔ مومن وہ ہوتا ہے جو مصائب کے وقت اَور بھی مضبوط ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر جب مسلمانوں سے کہا گیا کہ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور وہ تمہیں مارنے کی فکر میں ہیں۔ تو انہوں نے کہا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ۔ (الاحزاب: ۲۳) یعنی یہ تو وہی لشکر ہیں جن کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ ان لشکروں سے ہمارے ایمان متزلزل کیوں ہوں گے۔ وہ تو اَور بھی بڑھیں گے اور ترقی کریں گے۔ پس ایسے امور سے مومنوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے مدارج کو بلند کرنے کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جس نے ایک دن مرنا نہیں۔ مگر ایک موت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ طبعی موت ہوتی ہے۔ اور دوسری موت کے متعلق فرماتا ہے کہ ایسے مرنے والے ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں۔ بلکہ فرماتا ہے۔ تم ان کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو رزق مل رہا ہے۔ یعنی ان کی روحانی ترقیات کے سامان متواتر ہوتے چلے جائیں گے۔ دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ وہ مومنوں کو مٹا دے اور انہیں غمگین بنا دے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ انہیں مارا جاتا ہے تو یہ اَور بھی زیادہ دلیر ہوجاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں خدا نے ہماری ترقی کے کیسے سامان پیدا کئے ہیں۔ تو اس کا حوصلہ پست

ہوجاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سیالکوٹ تشریف لے گئے تو مولویوں نے یہ فتویٰ دیدیا کہ جو شخص مرزا صاحب کے پاس جائے گا یا ان کی تقریروں میں شامل ہوگا۔اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ یہ کافر اور دجال ہیں ان سے بولنا، ان کی باتیں سننا اور ان کی کتابیں پڑھنا بالکل حرام ہے۔ بلکہ ان کو مارنا اور قتل کرنا ثواب کا موجب ہے مگر آپ کی موجودگی میں انہیں فساد کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ چاروں طرف سے احمدی جمع تھے۔انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ ان کے جانے کے بعد فساد کیا جائے۔ میں بھی اس وقت آپ کے ساتھ تھا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں سے روانہ ہوئے اور گاڑی میں سوار ہوئے تو دور تک آدمی کھڑے تھے جنہوں نے پتھر مارنے شروع کر دیئے۔مگر چلتی گاڑی پر پتھر کس طرح لگ سکتے تھے۔شاذو نادر ہی ہماری گاڑی کو کوئی پتھر لگتا۔ وہ مارتے ہم کو تھے اور لگتا ان کے کسی اپنے آدمی کو تھا۔ پس ان کا یہ منصوبہ تو پورا نہ ہوسکا۔باقی احمدی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وجہ سے وہاں جمع تھے ان میں سے کچھ تو اردگرد کے دیہات کے رہنے والے تھے جو آپ کی واپسی کے بعد ادھر ادھر پھیل گئے اور جو تھوڑے سے مقامی احمدی رہ گئے یا باہر کی جماعتوں کے مہمان تھے ان پر مخالفین نے اسٹیشن پر ہی حملے شروع کر دیئے۔ان لوگوں میں سے جن پر حملہ ہوا ایک مولوی برہان الدین صاحبؓ بھی تھے۔مخالفوں نے ان کا تعاقب کیا۔ پتھر مارے اور برا بھلا کہا۔اور آخر ایک دکان میں انہیں گرالیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گوبر لاؤ ہم اس کے مونہہ میں ڈالیں۔ چنانچہ وہ گوبر لائے اور انہوں نے مولوی برہان الدین صاحبؓ کا منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔جب وہ انہیں مار رہے تھے اور گوبر ان کے مونہہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے تو بجائے اس کے کہ مولوی صاحب انہیں گالیاں دیتے یا شور مچاتے۔جنہوں نے وہ نظارہ دیکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ وہ بڑے اطمینان اور خوشی سے یہ کہتے جاتے تھے کہ سبحان اللہ! یہ دن کسے نصیب ہوتا ہے۔ یہ دن تو اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے آنے پر ہی نصیب ہوتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس نے مجھے یہ دن دکھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں ہی جو لوگ حملہ کر رہے تھے ان کے نفس نے انہیں ملامت کی اور وہ شرمندگی اور ذلت سے آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔تو بات یہ ہے کہ جب دشمن دیکھتا ہے کہ یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں تو کہتا ہے آؤ ہم انہیں ڈرائیں۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ شیطان اپنے اولیاء کو ڈراتا ہے۔پس جب کوئی شخص ڈرتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شیطانی آدمی ہے لیکن اگر وہ ڈرتا نہیں بلکہ ان حملوں اور تکالیف کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا ہے اور کہتا ہے خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ عزت کا مقام عطا فرمایا ہے اور اس نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ میں اس کی خاطر مار کھا رہا ہوں تو دشمن مرعوب ہوجاتا ہے اور آخر اس کے دل میں ندامت پیدا ہوجاتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے متواتر بتایا کہ جماعت احمدیہ کو بھی ویسی ہی قربانیاں کرنی پڑیں گی جیسی پہلے انبیاء کی جماعتوں کو کرنی پڑیں۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں نظام الدین کے گھر میں داخل ہوا ہوں۔ نظام الدین کے معنے ہیں ''دین کا نظام'' اور اس رؤیا کا مطلب یہ ہے کہ آخر احمدیہ جماعت ایک دن نظام دین بن جائے گی۔ اور دنیا کے اور تمام نظاموں پر غالب آجائے گی۔ مگر یہ غلبہ کس طرح ہوگا۔ اس کے متعلق رؤیا میں آپ فرماتے ہیں ہم اس گھر میں کچھ حسنی طریق پر داخل ہوں گے اور کچھ حسینی طریق پر داخل ہوں گے۔ (تذکرہ صفحہ ۵۷۷ ایڈیشن ۲۰۲۲ء) یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے جو کامیابی حاصل کی وہ صلح سے کی اور حضرت حسینؓ نے جو کامیابی حاصل کی وہ شہادت سے حاصل کی۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بتایا گیا کہ نظام الدین کے مقام پر جماعت پہنچے گی تو سہی مگر کچھ صلح محبت اور پیار سے اور کچھ شہادتوں اور قربانیوں کے ذریعہ۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ بغیر صلح اور محبت اور پیار کے یہ سلسلہ ترقی کرے گا تو وہ بھی غلطی کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ بغیر قربانیوں اور شہادتوں کے یہ سلسلہ ترقی کرے گا تو وہ بھی غلطی کرتا ہے۔ ہمیں کبھی صلح اور آشتی کی طرف جانا پڑے گا اور کبھی حسینی طریق اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے دشمن کے سامنے مرجانا ہے مگر اس کی بات نہیں ماننی۔ یہ دونوں طریق ہمارے لئے مقدر ہیں۔ نہ خالی مسیحیت والا سلوک ہمارے لئے مقدر ہے نہ خالی مہدویت والا سلوک ہمارے لئے مقدر ہے۔ ایک درمیانی راستہ ہے جس پر ہمیں چلنا پڑے گا۔ ایک غلبہ ہوگا صلح اور محبت اور پیار کے ساتھ اور ایک غلبہ ہوگا قربانیوں کے ساتھ۔ اس کے بعد جماعت نظام الدین کے گھر میں داخل ہوگی اور اسے کامیابی حاصل ہوگی۔

یہی پیغام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب ''انوار الاسلام'' میں بھی دیا ہے۔ آپؑ تحریر فرماتے ہیں:۔

''مجھے اس کی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ مجھے دنیا و آخرت میں اس سے زیادہ کوئی چیز بھی پیاری نہیں کہ اس کے دین کی عظمت ظاہر ہو۔ اس کا جلال چمکے اور اس کا بول بالا ہو۔ کسی ابتلاء سے اس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں اگر چہ ایک ابتلاء نہیں کروڑ ابتلاء ہو ابتلاؤں کے میدان میں اور دکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے ؎

من نہ آنستم کہ روزِ جنگ بینی پُشتِ من
آں منم کاندر میانِ خاک وخوں بینی سرے

پس اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہو جائے۔ مجھے کیا معلوم کہ ابھی کون کون سے ہولناک جنگل اور پُرخار بادیہ درپیش ہیں جن کو مَیں نے طے کرنا ہے پس جن لوگوں کے نازک پیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ جو میرے ہیں وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے نہ مصیبتوں سے نہ لوگوں کے سبّ وشتم سے۔ نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے اور جو میرے نہیں وہ عبث دوستی کا دم مارتے ہیں کیونکہ وہ عنقریب الگ کئے جائیں گے اور ان کا پچھلا حال ان کے پہلے حال سے بدتر ہوگا۔'' (انوار الاسلام ص ۲۲)

غرض قومی ترقی کا ایک ہی گُر ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دینا۔ اور اس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ابتلاء کیوں آتے ہیں؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اول تو ابتلاء عموماً اس لئے آتے ہیں کہ انسان کا ایمان مضبوط ہو۔ لیکن اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس لئے کہ خود انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے ایمان کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک عورت کی لڑکی سخت بیمار تھی۔ وہ روزانہ دعا کیا کرتی تھی کہ اس کی بیماری مجھے لگ جائے اور میں مرجاؤں۔ ایک رات اس کی گائے کا منہ ایک تنگ برتن میں پھنس گیا۔ اور وہ اسے برتن سے نکال نہ سکی۔ اور گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اس عورت کی آنکھ کھل گئی اور ایک عجیب قسم کی شکل اپنے سامنے دیکھ کر اس نے سمجھا کہ ملک الموت میری جان نکالنے کے لئے آ گیا ہے۔ اس عورت کا نام میستی تھا وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگی ؎

ملک الموت من نہ میستی ام
من یکے پیر زالِ محنتی ام

یعنی اے ملک الموت میں میستی نہیں ہوں۔ مَیں تو ایک غریب محنت کش بڑھیا ہوں اور اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا میستی وہ لیٹی ہوئی ہے اس کی جان نکال لے۔ اب دیکھو وہ عورت خیال کرتی تھی کہ اسے اپنی لڑکی سے بے انتہا محبت ہے لیکن جب اس نے سمجھا کہ جان نکالنے والا فرشتہ آ گیا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اسے اتنی محبت نہ تھی کہ وہ اس کے بدلہ میں جان دے دیتی۔ یہ ہے تو ایک حکایت لیکن یہ بات کثرت سے پائی جاتی ہے کہ انسان بسا اوقات اپنے خیالات کا بھی اچھی طرح اندازہ نہیں لگا سکتا اور جب اس پر ابتلاء آتے ہیں تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کسی چیز سے محبت یا نفرت کا دعویٰ کہاں تک صادق تھا۔

اسی طرح ابتلاء میں اس لئے بھی ڈالا جاتا ہے تا لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ فلاں کا ایمان کیسا ہے ورنہ یوں دوسروں کو کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں کا ایمان پختہ ہے یا نہیں۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی انسان جتنا بڑا ہو اس پر اتنے ہی بڑے ابتلاء آتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ابتلاء نبیوں کو آتے ہیں جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا کہ

کربلا یست سیر ہر آنم
صد حسینؓ است در گریبانم

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہتک کی ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جگہ اپنے ابتلاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ تو ایک بار مارے گئے لیکن دشمن مجھے ہر وقت مارنے کے درپے رہتے اور ایذائیں دیتے ہیں۔ اور میں ہر وقت کربلا کا نظارہ دیکھتا رہتا ہوں۔ سولی پر ایک دفعہ چڑھ کر مرنا اتنی بڑی بات نہیں جتنی کہ ہر وقت ابتلاؤں میں پڑے رہنا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یسوع مسیح چونکہ سولی پر چڑھ کر مر گئے اس لئے ان کو خدا کا بیٹا مان لو۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر جو لوگ ہر وقت سولی پر چڑھائے جاتے ہیں ان کو کیا ماننا چاہیے۔ سب انبیاء کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اور جب انہیں متواتر تکالیف دی جاتی ہیں تو لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کا کیسا پختہ ایمان ہے۔ کہتے ہیں اَلْاِسْتَقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ اور سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دشمن بھی خوبی کو مان لے اور اس کا انکار نہ کر سکے۔ پس اخلاق اور روحانیت کی پختگی کے لئے ابتلاؤں کا آنا اور ان کے آنے پر صبر و رضاء کا مقام اختیار کرنا ایمان کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ

کیا جو لوگ بدیاں کرتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری سزا سے بچ جائیں گے؟

مَا یَحْکُمُوْنَ ۝۵

ان کا فیصلہ بہت برا ہے۔

تفسیر۔ فرمایا۔ وہ لوگ جو ناروا افعال میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ

کسی طرح سے ہماری سزا سے بچ جائیں گے ان کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ دنیا میں کوئی شخص دھوکا سے خدا تعالیٰ کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ دوسرے لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا تو الگ رہا انسان خود اپنی ذات کے متعلق بھی صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ ہوتا بد ہے لیکن سمجھتا اپنے آپ کو نیک ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائے گا۔ حالانکہ اس کا یہ فیصلہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور وہ عذاب میں پکڑا جاتا ہے اور اس دن اسے پتہ لگتا ہے کہ میں اپنے آپ کو غلط طور پر مومن سمجھتا رہا ہوں۔ یہ مقام خاص خاص مومنوں کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ایمان کی پختگی کے واقف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ (الاحزاب: ۲۴) یعنی صحابہؓ میں سے بعض تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دعوٰئے ایمان کو ثابت کر دیا ہے۔ اور بعض اس موقعہ کے منتظر ہیں جب وہ اپنے دعوائے ایمان کو ثابت کر دیں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت مالک بن انسؓ ایک انصاری صحابی جو غلطی کی وجہ سے جنگِ بدر میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ جب انہوں نے بدری صحابہؓ سے بدر کی جنگ کے کارنامے سنے تو جوش سے اٹھ کر ٹہلنے لگ گئے اور کہنے لگے یہ کیا بات ہے جب مجھے موقعہ ملا تو میں بتاؤں گا کہ مومن کیسی قربانیاں کرتا ہے۔ چنانچہ اُحد کی لڑائی میں وہ شامل ہوئے اور جب پیچھے کی طرف سے یک دم حملہ کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور وہ میدان جنگ سے ہٹ کر کچھ فاصلہ تک آ گئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے اور کفار کے پتھراؤ کی وجہ سے زخمی ہو کر دوسرے زخمیوں کے جسموں پر گر گئے اور اتنے میں کچھ اور لوگ زخمی ہو کر آپؐ پر گر گئے اور چند منٹ کے بعد لوگوں نے آپ کو غائب دیکھ کر سمجھ لیا کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں تو بعض لوگوں نے دوڑ کر مدینہ میں جو اُحد کے قریب ہی تھا یہ مشہور کر دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ خبر ان لوگوں پر بھی جو میدان جنگ سے صرف تھوڑے فاصلہ پر پیچھے تھے بجلی کی طرح گری۔ ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔ کہ مالک بن انسؓ جنہوں نے جنگ سے پہلے کھانا نہیں کھایا تھا۔ دو تین کھجوریں کھاتے ہوئے ان کے پاس سے گذرے۔ اور چونکہ وہ اس وقت میدان جنگ سے آئے تھے جبکہ مسلمان فاتح ہو چکے تھے اور کفار شکست کھا چکے تھے اور حضرت عمرؓ اس وقت میدان جنگ سے آئے تھے جبکہ پیچھے کی طرف سے دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر گر گئے تھے اور بعض صحابہؓ نے سمجھ لیا تھا کہ آپ شہید ہو گئے ہیں اس لئے آپ رو رہے تھے اور مالکؓ خوش تھے کہ ہم کو فتح نصیب ہو چکی ہے۔ پس ان

کا رونا مالکؓ کو عجیب معلوم ہوا اور وہ حیرت سے حضرت عمرؓ کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے۔ عمرؓ! یہ خوشی کا موقعہ ہے یا رونے کا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی ہے ہمیں تو خوشی منانی چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا مالکؓ! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بعد میں جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ دشمن نے پہاڑی کے پیچھے سے آ کر دوبارہ حملہ کر دیا اور اچانک حملہ کی تاب نہ لا کر اسلامی لشکر بکھر گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس وقت مالکؓ کے ہاتھ میں آخری کھجور تھی۔ انہوں نے کھجور اٹھا کر زمین پر پھینک دی اور کہا میرے اور میرے محبوب کے درمیان سوائے اس کھجور کے اَور کیا حائل ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کو دیکھا اور کہا جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ سچ ہے تو پھر بھی رونے کا موقعہ نہیں ہمیں بھی ادھر جانے کی تیاری کرنی چاہیے جدھر ہمارا محبوب گیا ہے۔ یہ کہہ کر تلوار میان سے نکال لی اور دشمن کے جم غفیر پر جا پڑے اکیلا آدمی سینکڑوں آدمیوں کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان کا جسم زمین پر بکھر گیا۔ اور جب خدا تعالیٰ نے پھر مسلمانوں کو غلبہ دیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مالک بن انسؓ کو تلاش کرو۔ وہ کہاں ہیں تو لوگوں نے آ کر خبر دی کہ ان کا تو کہیں پتہ نہیں لگتا آپؐ نے پھر ان کی تلاش کا حکم دیا۔ اتنے میں ان کی بہن مدینہ سے یہ وحشتناک خبر سن کر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں دوڑتی ہوئی میدان جنگ میں پہنچی اور آخر ایک جگہ پر اس نے ایک لاش کے ٹکڑے دیکھے۔ جن ٹکڑوں میں سے ایک انگلی کے ذریعہ اس نے پہچان لیا کہ یہ میرے بھائی مالکؓ کی نعش ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی۔ مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت کہ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ انہی کے متعلق تھی۔ میں وجوہِ تنزیل کا اتنا قائل نہیں لیکن مالک بن انسؓ کا واقعہ تاریخوں اور حدیثوں میں اتنے تکرار سے آیا ہے اور قرآنی الفاظ اتنے واضح ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ اور کہیں ہو یا نہ ہو اس جگہ وجہِ تنزیل صحیح ہے۔ پس جس طرح بعض کفار آخر تک سمجھتے چلے جاتے ہیں کہ ہم عذاب سے بچ رہیں گے اور ہمارے کام اچھے ہیں لیکن جب سزا آتی ہے تو پھر انہیں پتہ لگتا ہے کہ ان کے اعمال برے ہیں۔ اسی طرح بعض مومن سمجھتے ہیں کہ ہم سچے ہیں اور واقعات ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کا خیال ٹھیک ہے جیسا کہ میں نے اوپر ایک واقعہ بیان کیا ہے چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ

جوشخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ (تعالیٰ) کا مقرر کردہ وقت ضرور آنے

السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۶

والا ہے۔ اور وہ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔

تفسیر ۔فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے وہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدۂ ملاقات بالکل سچا ہے اور پورا ہو کر رہے گا اور خدا تعالیٰ بہت دعائیں سننے والا اور جاننے والا ہے۔

چونکہ اوپر کی آیات میں ان ابتلاؤں کا ذکر ہے جو انبیاء کی جماعتوں پر آتے ہیں اس لئے یہاں لِقائے الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کی نصرت کا نزول ہے اور مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دشمنوں کی شرارتوں کو دیکھ کر تمہارے دلوں میں مایوسی نہیں آنی چاہیے۔ اور تمہیں کبھی یہ تصور بھی نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اکیلا چھوڑ دے گا اور دشمن تمہیں تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ابتلاؤں کے ذریعہ صرف تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے ورنہ وہ تمہارے ساتھ ہے اور اس کے فرشتے تمہاری تائید میں کام کر رہے ہیں۔ پس دشمن خواہ تمہیں کس قدر ستائے اور تم پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کرے تمہیں اس بات پر کامل یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم سے ترقی کے وعدے کئے ہوئے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے اور وہ تمہاری مدد کے لئے دوڑتا چلا آئے گا۔ اگر تم ابتلاؤں میں ثابت قدمی دکھاؤ گے اور خدا تعالیٰ پر کبھی بدظنی نہیں کرو گے بلکہ امید رکھو گے کہ خدا تعالیٰ آسمان سے اترے گا اور تمہارے دشمنوں کی گردنیں مروڑ دے گا تو تمہارا خدا تم سے ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اور وہ تمہارے لئے ایسی غیرت دکھائے گا جس کی مثال اَور کہیں نظر نہیں آئے گی۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی کہ ان کا ایک زندہ خدا پر ایمان نہ رہا۔ اور معجزات اور خوارق کے متعلق انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ یہ صرف پہلے زمانہ کے لوگوں کے لئے دکھائے جاتے تھے اب خدا نعوذ باللہ ان نشانات کے دکھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا کوئی ولولہ نہ رہا اور وہ مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اسلام اس نظریہ کو غلط قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے محبوب کی ملاقات یعنی اس کی نصرت اور تائید پر کامل یقین رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کے لئے آسمان

سے اتر آتا ہے اور وہ اسی طرح ان کی تائید کرتا ہے جس طرح پہلے انبیاء کی جماعتوں کی اس نے تائید کی۔ مگر ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ ابتلاؤں کا بھی ایک دور ہوتا ہے اور کامیابیوں اور فتوحات کا بھی ایک دور ہوتا ہے اور مومن کامل وہی ہوتا ہے جو مصائب اور آفات میں اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ رکھتا ہے۔ جب اس کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ کا اسے مژدہ سنایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی کی طرف آیت کے آخری حصہ میں یہ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی دعاؤں کو سننے والا اور ان کے حالات کو جاننے والا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ان کی دعاؤں کو قبول نہ کرے اور دشمن کے ظالمانہ رویہ کو روکتے ہوئے اسے سزا نہ دے۔

ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ روس کا بادشاہ پیٹر ایک دفعہ کسی ضروری امر پر غور کرنے کے لئے اپنے بالا خانہ پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے حکم دے دیا کہ کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ پرانے زمانہ میں دروازے نہیں ہوتے تھے۔ صرف پردے لٹکائے جاتے تھے۔ اور عربی کتابوں سے پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں کے مکانوں میں بھی دروازے نہیں ہوتے تھے۔ اسی لئے حکم تھا کہ جب آؤ تو اجازت لے کر آؤ۔ بہرحال اس نے ڈیوڑھی پر ٹالسٹائے کو جو اس کا چپڑاسی تھا۔ بٹھا دیا اور اسے کہہ دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں ایک ضروری امر کے متعلق غور کر رہا ہوں۔ اتفاقاً کوئی شہزادہ آ گیا۔ اس نے بادشاہ کے پاس کسی کام کے لئے جانا چاہا۔ روس کے شاہی قانون کے مطابق شہزادہ کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔ شہزادوں کو یہ اجازت تھی کہ وہ بادشاہ کے پاس جب چاہیں چلے جائیں۔ انہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ بھی روسی قانون تھا کہ کوئی غیر فوجی آدمی کسی فوجی کو نہیں مار سکتا۔ کسی بڑے افسر کو چھوٹا افسر نہیں مار سکتا۔ اور کسی شہزادہ کو کوئی غیر شہزادہ نہیں مار سکتا۔ یا کسی نواب کو کوئی غیر نواب نہیں مار سکتا۔ پس چونکہ قانون اجازت دیتا تھا کہ شہزادے بغیر کسی روک کے بادشاہ کے پاس چلے جایا کریں۔ اس لئے شہزادے نے اندر داخل ہونا چاہا مگر جونہی وہ اندر داخل ہونے لگا۔ ٹالسٹائے نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور شہزادہ صاحب بادشاہ کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے مگر تمہیں پتہ ہے میں شہزادہ ہوں۔ اور شہزادوں کے متعلق یہ قانون ہے کہ وہ بغیر کسی روک کے بادشاہ کے پاس جا سکتے ہیں۔ اس نے کہا پتہ ہے۔ اس پر شہزادے کو غصہ آیا اور اس نے اسے دو چار کوڑے لگائے اور کہا باوجود اس قانون کے معلوم ہونے کے تم یہ جرأت کرتے ہو کہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ اس نے مار کھالی اور شہزادے نے بھی دو چار ہنٹر مارنے کے بعد سمجھ لیا کہ اسے اب سبق آ گیا ہوگا۔ چنانچہ وہ پھر اندر داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر ٹالسٹائے نے پھر اسے روک لیا اور کہا حضور بادشاہ

نے اندر جانے سے منع فرمایا ہے۔اس پر اس نے پہلے سے بھی زیادہ اسے مارا۔اور خیال کیا کہ اب اسے سمجھ آ گئی ہوگی۔مگر جب اس نے پھر محل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔تو ٹالسٹائے نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور کہا حضور بادشاہ کا حکم ہے کہ کوئی شخص اندر نہ آئے اس پر شہزادے نے پھر اسے تیسری بار مارا۔شہزادہ کے بار بار مارنے اور پھر غصہ سے اس کی آواز کے بلند ہونے کی وجہ سے جب شور پیدا ہوا تو قدرتی طور پر بادشاہ بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔اور وہ تمام نظارہ اوپر بیٹھ کر دیکھتا رہا۔جب شہزادہ اسے تیسری دفعہ مار چکا تو بادشاہ نے غصہ والی آواز بنا کر کہا۔ٹالسٹائے! ادھر آؤ۔ٹالسٹائے دوڑ کر اندر گیا۔ساتھ ہی شہزادہ بھی جوش کی حالت میں داخل ہو گیا۔اور اس نے چاہا کہ وہ بادشاہ سے شکایت کرے۔جب ٹالسٹائے پہنچا تو بادشاہ نے کہا۔ٹالسٹائے یہ کیسا شور تھا؟ اس نے کہا حضور شہزادہ صاحب تشریف لائے تھے اور اندر آنا چاہتے تھے مگر مجھے چونکہ حضور کا حکم تھا کہ کسی کو اندر نہیں آنے دینا اس لئے میں نے عرض کر دیا کہ آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔اور جب یہ زبردستی اندر داخل ہونے لگے تو میں نے ان کو روکا۔بادشاہ نے کہا۔پھر۔اس نے کہا۔پھر انہوں نے مجھے مارا۔بادشاہ نے شہزادہ سے پوچھا۔کیا یہ ٹھیک ہے۔اس نے کہا۔ٹھیک ہے۔لیکن روس کا قانون یہ اجازت نہیں دیتا کہ شہزادہ کو اندر داخل ہونے سے روکا جائے۔بادشاہ نے کہا یہ درست ہے کہ روس کا قانون یہ اجازت نہیں دیتا کہ شہزادہ کو اندر آنے سے روکا جائے لیکن کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بادشاہ پر اپنے ملک کی کئی قسم کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔جن کے لئے بسا اوقات اسے غور اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور غور و فکر کے لئے علیحدگی ضروری ہوتی ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ حکومت کی ذمہ داریاں تو ادا ہوں یا نہ ہوں لیکن قانون کے محض الفاظ پورے ہوتے چلے جائیں۔میرے سامنے اس وقت ایک بہت بڑی مہم تھی جو حکومت سے تعلق رکھتی تھی اور میں چاہتا تھا کہ مجھے کچھ وقت ملے تو مَیں اس کے متعلق سکیم سوچوں اور غور کروں کہ کس طرح اپنے ملک کو خطرہ سے بچایا جا سکتا ہے۔کیا ان حالات میں میرا یہ حق نہ تھا کہ مَیں حکم دے دیتا کہ کوئی شخص اندر نہ آئے اور میری توجہ کو کسی اور طرف نہ پھیرے۔ٹالسٹائے نے عقلمندی اور ادب سے کام لیا اور اس نے میرے حکم کی فرمانبرداری کی۔مگر تم نے میرا بیٹا ہوتے ہوئے میرے حکم کی نافرمانی کی۔اور تم نے جو اس کو مارا تو اس کے کسی جرم کی وجہ سے نہیں مارا بلکہ اس لئے مارا کہ اس نے میری فرمانبرداری کیوں کی۔اس کے بعد بادشاہ نے ٹالسٹائے کے ہاتھ میں کوڑا دے کر کہا ٹالسٹائے اٹھو اور اس کوڑے سے شہزادے کو مارو۔شہزادے نے کہا۔روس کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر فوجی کسی فوجی آدمی کو مارے۔میں فوجی ہوں اور یہ غیر فوجی ہے اس لئے یہ مجھے مار نہیں سکتا۔بادشاہ نے کہا۔ٹالسٹائے میں تم کو فوجی عہدہ دیتا ہوں تم اسے مارو۔گویا بادشاہ نے بتایا کہ

اگر روس کا قانون یہ ہے کہ کوئی غیر فوجی کسی فوجی کو نہیں مار سکتا تو فوجی عہدے دینا بھی تو میرے اختیار میں ہے۔ میں ٹالسٹائے کو فوجی عہدہ دے دیتا ہوں۔ اس پر پھر شہزادے نے کہا۔ میں فوج میں کرنیل یا جرنیل ہوں۔ مجھے میرے برابر کا آدمی ہی مار سکتا ہے چھوٹا نہیں۔ بادشاہ نے کہا ٹالسٹائے میں تم کو بھی وہی عہدہ دیتا ہوں۔ اس پر شہزادہ نے کہا روس کا قانون یہ ہے کہ کسی نواب کو کوئی غیر نواب سزا دینے پر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے کہا۔ نواب بنانا بھی میرے اختیار میں ہے اے نواب ٹالسٹائے میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم اس شہزادہ کو مارو۔ اور اس طرح بادشاہ نے شہزادہ کے ہر عذر کو توڑا اور آخر ٹالسٹائے سے اس کو پٹوایا۔ کیونکہ ٹالسٹائے نے بادشاہ کی خاطر مار کھائی تھی۔ اسی طرح جو شخص اس لئے پیٹا جائے گا کہ وہ خدا کی بات پر ایمان لایا۔ یا خدا کی آواز پر اس نے لبیک کہا۔ دنیا کا چھوٹا ہو یا بڑا جو اس کو مارے گا اور سزا دے گا خدا اسے نہیں چھوڑے گا جب تک اسے سزا نہ دے لے خدا تعالیٰ کے کوڑے کے مقابلہ میں کسی انسان کا کوڑا نہیں چل سکتا۔ لوگ اپنی کثرت پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ لوگ اپنے جتھے پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ لوگ اپنی حکومتوں پر گھمنڈ کرتے ہیں مگر ہمارے خدا کی حکومت دنیا کی حکومتوں سے بہت بڑی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نبیوں نے کہا کہ وہ کونے کا پتھر ہوگا۔ جس پر وہ گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا اور جو کوئی اس پر گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو جائے گا۔ یعنی خواہ وہ کسی پر حملہ آور ہو یا کوئی اس پر حملہ آور ہو دونوں صورتوں میں وہ سزا پائے بغیر نہیں رہے گا۔ اسی طرح آپ کے متبع بھی ظلی رنگ میں کونے کے پتھر ہیں۔ پس جو لوگ خدا پر توکل رکھتے ہیں خدا ان کے دشمنوں کو سزا دیئے بغیر نہیں رہتا۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ

اور جو شخص خدا (تعالیٰ) کے لئے کوشش کرتا ہے درحقیقت وہ اپنی جان ہی کے لئے کرتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) تمام

عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷

جہانوں سے بے نیاز ہے (اور ان کی عبادت کا محتاج نہیں)۔

تفسیر۔ اس آیت میں مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہاری تمام نیک کوششیں تمہارے اپنے لئے فائدہ بخش ہیں۔ خدا تعالیٰ کو ان سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی عبادت یا ان کی قربانیوں سے بے نیاز ہے۔

پس قربانیاں کرتے وقت تم کبھی یہ خیال نہ کرو کہ تم خدا اور اس کے رسول پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ خدا تعالیٰ قربانیوں کا محتاج نہیں بلکہ تم اس کے فضل کے محتاج ہو اور اگر تمہیں کسی نیکی کی توفیق ملتی ہے تو تم خدا پر یا اس کے سلسلہ پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنی جان پر احسان کرتے ہو۔ جو لوگ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے وہ بعض دفعہ نیکیاں کرتے کرتے جنت کے دروازہ تک پہنچ جاتے ہیں اور ان کا غرور ان کے راستہ میں دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ دوزخ میں جا گرتے ہیں۔ پس نیکیوں کے بعد کبر یا خود پسندی کے جذبات کی بجائے ہمیشہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ایمان کی توفیق دی۔ اور مصائب و آفات میں ثباتِ قدم عطا فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور ایمان کے مطابق انہوں نے عمل کئے ہم ان کی بدیوں کو

سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا

ان سے دور کر دیں گے اور جو کام وہ کرتے تھے اس کے مطابق جو بہترین جزاء ان کو مل سکتی ہو گی

يَعْمَلُوْنَ ۝۸

وہ ہم ان کو دیں گے۔

حلّ لُغَات۔ لَنُكَفِّرَنَّ لَنُكَفِّرَنَّ كَفَّرَ سے جمع متکلم مؤکد بہ نونِ ثقیلہ کا صیغہ ہے اور كَفَّرَ اللّٰهُ لَهُ الذَّنْبَ کے معنے ہیں مَحَاهُ یعنی گناہ کے اثر اور اس کے نشان کو مٹا دیا (اقرب)۔ اسی طرح كَفَّرَ کے معنے بدلہ دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (المائدۃ: ۹۰) جب تم قسم کھا کر اسے توڑ دو تو اس کا بدلہ وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے وَالتَّكْفِيْرُ سَتْرُهٗ وَتَغْطِيَتُهٗ يَصِيْرَ حَتّٰى بِمَنْزِلَةِ مَالَمْ يَعْمَلْ۔ اور تکفیر (جو كَفَّرَ کا مصدر ہے جس سے کفارہ بنا ہے) کے معنے کسی عمل کو اس حد تک چھپا دینے اور ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں کہ گویا اس کا وجود ہی نہ تھا اور اس کے کرنے والے نے وہ عمل کیا ہی نہ تھا۔ وَيَصِحُّ اَنْ يَّكُوْنَ اَصْلُهٗ اِزَالَةَ الْكُفْرِ وَالْكُفْرَانِ نَحْوَ التَّمْرِيْضِ فِيْ كَوْنِهٖ اِزَالَةً لِّلْمَرَضِ وَتَقْذِيَةِ الْعَيْنِ فِيْ اِزَالَةِ الْقَذٰى عَنْهُ (مفردات) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کی بنیاد بابِ تفعیل کے اس خاصہ پر ہو کہ وہ اصل مادہ

کے معنوں کو دور کرنے پر دلالت کرتا ہے اور کَفَّرَ کے معنے ہوں کفر یا کفران نعمت کو دور کرنا۔ جیسے عربی زبان میں تَمْرِیْض کے معنے مرض پیدا کرنے کے نہیں بلکہ مرض کے دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح تَقْذِیَۃُ الْعَیْن کے معنے آنکھ میں قَذٰی یعنی تنکا ڈالنے کے نہیں ہوتے بلکہ آنکھ سے تنکا دور کرنے کے ہوتے ہیں۔

اوپر کے لغات کے حوالوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کفارہ کے معنے مٹا دینے کے بھی ہیں جس میں تین باتیں شامل ہیں (۱) گناہ کی خواہش اور عادت کو مٹا دینا۔ (۲) گناہ کی سزا اور نتیجہ کو مٹا دینا۔ (۳) گناہ کی شہرت اور بدنامی کو مٹا دینا اسی طرح کفارہ کے معنے بدلہ دینے یا گناہ کو دور کرینے کے بھی ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں جزائے نیک کے بارہ میں اسلام کا یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص سچی توبہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ صرف گناہ کو ہی معاف نہیں کرتا بلکہ گناہ کی یاد بھی مٹا دیتا ہے۔ یعنی جو لوگ گناہ سے واقف ہوتے ہیں۔ مثلاً خود گناہ گار کا اپنا وجود ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور دوسروں کے ذہن سے اس گناہ کی یاد کو مٹا دیتا ہے اور بدی کے نقش کو یا تو دھندلا کر دیتا ہے یا اسے بالکل محو کر دیتا ہے تا نفس میں شرمندگی نہ رہے اور نیکی کا جذبہ غالب آجائے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو سچا ایمان لائے ہیں اور اپنے ایمان کے مطابق انہوں نے عمل کئے ہیں ہم ان کے گناہوں کو مٹا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے بہترین اعمال کے مطابق ان سے سلوک کریں گے۔ اس جگہ مٹا دینے سے مراد ان کا فراموش کر دینا ہی ہے کیونکہ جب عمل صالح کرنے والے اور کامل ایمان والوں کا ذکر ہو۔ تو مٹا دینے کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ گناہ کی عادت چھٹ جائے گی۔ کیونکہ ایسا شخص عمل نیک تو پہلے ہی کرنے لگ گیا ہے۔ پس اس جگہ مٹانے سے مراد ان کا فراموش کر دینا ہی ہے تا کہ ان کی عزت پر کوئی حرف باقی نہ رہے۔

لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی اعمال کی جزا دیتے وقت اس کی کمزوریوں پر انعام کی بنیاد نہیں رکھے گا بلکہ اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ حالت پر اس کی بنیاد رکھے گا۔ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بدلہ دیتے وقت انسان کی کمزوریوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ عام طور پر اس سے کس قسم کے اعمال کا ظہور رہا ہے۔ جسے قاعدۂ اوسط کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام جزاء اس اوسط کے قاعدہ پر مبنی ہے۔ حتیٰ کہ حکومتیں پنشن دیتے وقت بھی قاعدۂ اوسط سے کام لیتی ہیں اور یہ دیکھتی ہیں کہ تین سال کی تنخواہ کا اوسط کیا ہے پھر اس اوسط کے مطابق پنشن دیتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص پنشن کے وقت سے تین سال پہلے تین سو روپیہ تنخواہ لیتا تھا۔ دو سال پہلے چار سو روپیہ اور آخری سال میں پانچسو تو وہ اسے دوسو پنشن دے گی جو چار سو کا نصف بنتا ہے نہ کہ اڑھائی سو جو

اس کی آخری تنخواہ کا نصف ہوتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔اس کے انعام سے دوسروں کا حق نہیں مارا جاتا اور وہ جو کچھ دیتا ہے اپنی ملکیت سے دیتا ہے۔اس نے جزاءِ نیک کے بارہ میں دنیا کے اس قاعدہ کے خلاف یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو شخص مرتے ہوئے نیک ہو اور ایمان پر جان دے اس کا درجہ وہ نہیں سمجھا جائے گا جو موت کے وقت اسے حاصل تھا بلکہ اس کا وہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سمجھا جائے گا جو اس کی زندگی میں کسی وقت اسے حاصل ہوا ہو۔مثلاً فرض کرو نیکی کے دس درجے ہیں۔اور ایک شخص مرتے ہوئے ساتویں درجہ پر تھا لیکن دو چار سال پہلے اسے آٹھواں یا نواں درجہ حاصل تھا پھر کسی جسمانی یا دماغی کمزوری کی وجہ سے اس کی نیکی کا درجہ گر گیا۔اور دین کی خدمت کا اسے اس قدر موقعہ نہ ملا جو اس سے پہلے ملا کرتا تھا تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ موت کے وقت کے درجہ پر فائز نہ کرے گا بلکہ اسے اس درجہ میں رکھے گا جو اسے پہلے حاصل تھا اور جو سب سے اعلیٰ تھا۔غرض انسان کو جزاء دیتے وقت اس امر کا خیال رکھا جائے گا کہ اپنی زندگی میں کس اعلیٰ سے اعلیٰ مقام کو یہ پہنچ چکا ہے۔اور بعد کے تغیرات کو نظر انداز کر کے اس اعلیٰ درجہ کے مطابق اس سے سلوک کیا جائے گا۔

اس بارہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات ہیں جن میں سے ایک یہ آیت بھی ہے۔ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ جو اچھے سے اچھا عمل ہو گا اس کا بدلہ مل جائے گا اور دوسرے چھوڑ دیئے جائیں گے کیونکہ اس سے تو بندوں کا فائدہ نہیں نقصان ہے کیونکہ چھوٹے اعمال بڑے عملوں سے مل کر بدلہ کو بڑھا دیتے ہیں کم نہیں کرتے۔اور خالی بڑا عمل چھوٹے عملوں سے علیحدہ رہ کر بڑا نہیں چھوٹا ہوتا ہے۔کیونکہ ان سے الگ ہو کر اس کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔دس کا عدد چھ اور سات سے بڑا ہے لیکن ۱۰+۶+۷ سے بڑا نہیں۔جمع کی صورت میں دس کو اگر چھ اور سات سے الگ کر دیا جائے تو یہ چھوٹا ہو جائے گا۔پس اللہ تعالیٰ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارے ادنیٰ اعمال کو ہم بغیر بدلہ کے چھوڑ دیں گے اور صرف بڑے عمل کا بدلہ دیں گے۔لازماً ماننا پڑتا ہے کہ اس جگہ عام جزا کا ذکر نہیں بلکہ خاص قسم کی جزا کا ذکر ہے۔عام جزا میں تو بے شک چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی ضائع نہیں کیا جائے گا۔جیسا کہ فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔لیکن اس جگہ جس قسم کی جزا کا ذکر ہے اس میں صرف بڑے عمل کو الگ کر لینے سے انسان کا فائدہ زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ شامل کر دینے سے بڑے عمل کی طاقت بھی کم ہو جاتی ہے۔جیسے ایک مصور ہزاروں تصویریں بناتا ہے لیکن اس کی سب تصویریں یکساں نہیں ہوتیں۔اس کی بہت سی تصویروں میں سے کوئی بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور کوئی درمیانی اور کوئی ادنیٰ۔اعلیٰ تصویر جو اس کے کام کا منتہاء کہلاتی ہے اور جسے انگریزی محاورہ میں ''ماسٹر پیس'' کہتے ہیں اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ انسان کی آخری

تصویر ہی ہو۔کبھی وہ ابتدائی زمانہ کی تصویر ہوتی ہے کبھی درمیانی زمانہ کی اور کبھی آخری زمانہ کی۔اب اگر اس مصور کو ایک نئی زندگی دی جائے اور اس کی لیاقت کی اوسط نکال کر یا اس کی آخری عمر کی حالت کے مطابق اسے اس کی نئی زندگی میں ذہانتِ مصوری بخشی جائے تو یقیناً اس کا نقطہء مسابقت ادنیٰ ہوگا۔لیکن اگر اس کے ذہن کو اس سطح پر رکھ دیا جائے جو اسے اپنی چوٹی کی تصویر بناتے وقت میسر تھا تو اس کا نقطۂ مسابقت یقیناً بہت اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ گویا ذہن کی عام قابلیت اگر اعلیٰ سے اعلیٰ کام کے مطابق رکھی جائے تو وہ یقیناً اعلیٰ ہوگی۔بہ نسبت تمام کام کی اوسط نکال کر اس کے مطابق رکھنے کے۔کیونکہ انسانی زندگی میں قبض اور بسط کے دور آتے رہتے ہیں اور ان دونوں کی اوسط گو قبض کی گھڑیوں سے اعلیٰ ہوتی ہے لیکن بسط کی اعلیٰ گھڑیوں سے بہت ادنیٰ ہوتی ہے۔اسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دوسری زندگی میں ہم جو قوتِ عمل انسان کو بخشیں گے وہ اس کی پہلی زندگی کی ترقیات کی اوسط کے مطابق نہ ہوگی بلکہ اس کی پہلی زندگی کی ان گھڑیوں کے مطابق ہوگی جن میں انسان نے اپنا انتہائی کمال ظاہر کیا ہوگا خواہ وہ کمال زندگی کے کسی دور میں ظاہر ہوا ہو اور اس طرح ہم اسے ایک ایسا اعلیٰ نقطۂ مسابقت بخشیں گے جس پر کھڑے ہو کر وہ اعلیٰ مقامات کو بہت سرعت سے حاصل کر سکے گا۔اور ان معنوں کے رو سے اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کے مطابق جزاء کا ملنا ایک انعام ہے اور انعام بھی وہ جس کا خیال کر کے بھی دل خوشی سے اچھل پڑتا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور (کہا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ سے اس

لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ

بات میں بحث کریں کہ تُو کسی کو میرا شریک قرار دے حالانکہ اس کا تجھے کوئی علم نہیں تو تُو ان دونوں کی فرمانبرداری نہ

مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹

کر کیونکہ تم سب نے میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور میں تمہارے عمل (کی نیکی بدی) سے تم کو واقف کروں گا۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق بڑی تاکید کی ہے کہ ان سے نیک سلوک کیا جائے۔ ہاں اگر وہ تم سے اس بات کے لئے جھگڑیں کہ تم کسی کو میرا شریک قرار دے دو۔جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تو پھر ان کی بات نہ مانو۔یعنی مومن کو جب اس کے ماں باپ سے اچھا معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو پھر کس طرح ہوسکتا ہے کہ مومن خدا تعالیٰ سے جو ماں باپ سے بھی زیادہ محسن ہے اچھا معاملہ نہ کرے ۔اور جب ماں باپ خدا تعالیٰ کے خلاف کوئی بات کہیں تو ان کی بات کو ردّ نہ کرے۔ بہر حال اس استثناء کے سوا ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے نوجوان ایسے دکھائی دیتے ہیں جو اپنے ماں باپ کا مناسب احترام نہیں کرتے اور نہ ان کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں بلکہ اولاد میں سے کسی کو اگر کوئی اچھا عہدہ مل جائے تو وہ اپنے غریب والدین سے ملنے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سنایا کرتے تھے کہ کسی ہندو نے بڑی تکلیف برداشت کر کے اپنے لڑکے کو بی۔اے یا ایم۔اے کرایا اور اس ڈگری کو حاصل کرنے کے بعد وہ ڈپٹی ہوگیا۔آجکل ڈپٹی ہونا کوئی بڑا اعزاز نہیں سمجھا جاتا۔لیکن پہلے وقتوں میں ڈپٹی ہونا بھی بڑی بات تھی۔اس کے باپ کو خیال آیا کہ میرا لڑکا ڈپٹی ہوگیا ہے۔میں بھی اس سے مل آؤں۔ چنانچہ جس وقت وہ ہندو اپنے بیٹے کو ملنے کے لئے مجلس میں پہنچا تو اس وقت اس کے پاس وکیل اور بیرسٹر وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔یہ بھی اپنی غلیظ دھوتی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا۔باتیں ہوتی رہیں کسی شخص کو اس غلیظ آدمی کا بیٹھنا برا محسوس ہوا اور اس نے پوچھا کہ ہماری مجلس میں یہ کون آبیٹھا ہے۔ ڈپٹی صاحب اس کی یہ بات سن کر کچھ جھینپ سے گئے اور شرمندگی سے بچنے کے لئے کہنے لگے یہ ہمارے ٹہلیا ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کی یہ بات سن کر غصے کے ساتھ جل گیا۔وہ اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔اور کہنے لگا۔جناب میں ان کا ٹہلیا نہیں ان کی ماں کا ٹہلیا ہوں۔ساتھ والوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ ڈپٹی صاحب کے والد ہیں تو انہوں نے اس کو بہت لعن طعن کی اور کہا کہ اگر آپ ہمیں بتاتے تو ہم ان کی مناسب تعظیم وتکریم کرتے۔اور ادب کے ساتھ ان کو بٹھاتے۔ بہر حال اس قسم کے نظارے روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں کہ لوگ رشتہ داروں کے ساتھ ملنے سے جی چراتے ہیں تا کہ ان کی اعلیٰ پوزیشن میں کوئی کمی واقع نہ ہوجائے۔گویا ماں باپ کا نام روشن کرنا تو الگ رہا ان کے

نام کو بٹہ لگانے والے بن جاتے ہیں۔اور سوائے ان لوگوں کے جو اس نقطہ نگاہ سے والدین کی عزت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ والدین کی عزت کرو۔دنیاداروں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو والدین کی پورے طور پر عزت کرتے ہیں۔اور زمینداروں اور تعلیم یافتہ طبقہ دونوں میں یہی حالات نظر آتے ہیں۔اسی طرح بعض نوجوان اپنی ماؤں کی خبر گیری ترک کر دیتے ہیں اور جب پوچھا جاتا ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اماں جی کی طبیعت تیز ہے اور میری بیوی سے ان کی بنتی نہیں۔حالانکہ بیوی کو ماں سے کیا نسبت۔بیوی نے اس کے فائدے کے لئے کیا کیا ہوتا ہے۔وہ نوجوانی کی حالت میں اس کی خدمت کرتی ہے لیکن ماں جس نے اپنی چھاتیوں سے دودھ پلایا ہوتا ہے اور جس نے اپنا خون دودھ کی شکل میں تبدیل کر کے اس کی پرورش کی ہوتی ہے اور محنت ومشقت کر کے پڑھایا ہوتا ہے اس سے اس لئے اعراض کر لیا جاتا ہے کہ بیوی سے اس کی بنتی نہیں۔پس اس خطرناک نقص کو دور کرو۔اور اپنے والدین کی خدمت بجالاؤ۔ورنہ تم اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔جو تمہارے ماں باپ کے قدموں کے نیچے رکھی گئی ہے۔

آخر میں فرمایا اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ۔آخر تم نے خدا تعالیٰ کی طرف ہی لوٹنا ہے اور تمام اعمال کا نتیجہ اسی نے ظاہر کرنا ہے اس لئے تمہارا کام یہی ہے کہ جب شرک کا سوال آئے تو اپنے ماں باپ کی اطاعت کرنے سے انکار کر دو۔مگر اس استثناء کے علاوہ تمام دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔اور ان کی کامل فرمانبرداری کرو۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک لڑکی کے پاس جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کی بہن تھیں ان کی والدہ آئیں۔انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری ماں آئی ہے اور چاہتی ہے کہ میں اس سے کچھ سلوک کروں مگر وہ کافرہ ہے۔کیا میں اس سے حسن سلوک کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا۔ہاں بیشک کرو۔یہ دنیوی معاملہ ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دفعہ ایک جبّہ دیا جو ریشمی تھا۔انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک دفعہ آپؐ کو ایک ریشمی جبّہ پیش کیا تھا۔مگر آپؐ نے اس کو پسند نہ فرمایا۔اب آپ مجھے خود ریشمی جبّہ دے رہے ہیں۔کیا میں اس کو پہن لوں۔آپؐ نے فرمایا۔میں نے پہننے کے لئے نہیں دیا کسی کو تحفۃً دے دو یا بیچ ڈالو۔اس پر انہوں نے اپنے بھائی کو جو مکہ میں رہتا تھا اور کافر تھا دے دیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اختلاف کی وجہ سے تعلقات منقطع نہیں ہو جاتے بلکہ مومن کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کا احترام کرے اور ہمیشہ ان سے حسن سلوک کرتا رہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ابتلاؤں کے ذکر میں ماں باپ سے حسن سلوک کی تاکید اس لئے کی گئی ہے کہ نبیوں کے آنے پر بسا اوقات نوجوان طبقہ تو پرانے خیالات سے آزاد ہونے کی وجہ سے صداقت کو قبول کر لیتا ہے لیکن ان کے والدین اپنے پرانے عقائد پر ہی قائم رہتے ہیں اور چونکہ مذہبی عقائد کا اختلاف ماں باپ اور ان کی اولاد میں ایک وسیع خلیج حائل کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض دفعہ والدین ایسی سختی پر اتر آتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنے گھروں سے نکال دیتے یا انہیں اپنی جائیدادوں سے بے دخل کر دیتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو توجہ دلاتا ہے کہ بیشک تمہارا صداقت قبول کرنا ایک بڑی بھاری نیکی ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ تم ان سختیوں کی وجہ سے اپنے ماں باپ سے حسن سلوک ترک کر دو۔ تمہارا کام یہی ہے کہ تم ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اور دنیوی معاملات میں ان سے محبت کے ساتھ پیش آؤ۔ ہاں اگر وہ تمہیں کبھی خدا اور اس کے رسول سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں تو تم فوراً کہہ دو کہ اس معاملہ میں ہم آپ کی اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اس کے مطابق انہوں نے عمل بھی کیا ہے ہم ان کو اچھے بندوں میں

الصّٰلِحِيْنَ ⑩

داخل کریں گے۔

تفسیر ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں اور پھر اس ایمان کے مطابق انہوں نے اعمال صالحہ بھی کئے ہیں ہم انہیں یقیناً صالحین میں داخل کریں گے یعنی ان صادق اور راستباز لوگوں میں شامل کریں گے جن کے متعلق زبور (زبور باب ۳۷ آیت ۲۹) میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ انہیں فسلطین کی بادشاہت دی جائے گی۔ گویا وہ وعدہ جو بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا اب مسلمانوں کے ایمان اور عمل صالح کرنے کی وجہ سے ان کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ جب تک مسلمان صالح رہے فلسطین مسلمانوں کے پاس رہا۔ اور جب ان میں بگاڑ پیدا ہو گیا فلسطین بھی ان سے چھن گیا۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے ظاہر ہے یہ فلسطین کا چھننا عارضی ہے ایک دن اللہ تعالیٰ ان کو پھر اس ملک میں لائے گا اور ان کی موجودہ پسپائی فتح سے بدل جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ امریکن قوم بڑی ہوشیار ہے مگر اس موقعہ پر اس نے سخت غلطی کی ہے اور ایک

ایسی قوم کی حمایت کے لئے کھڑی ہوگئی ہے جس کو بائیبل بھی ملزم قرار دیتی ہے اور قرآن کریم بھی ملزم قرار دیتا ہے۔ یہودی اگر فلسطین میں مستقل طور پر رہنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ صالحین میں شامل ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ کو ان سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اگر وہ صالح بن جائیں تو وہ اس ملک میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صالح کی تشریح میں فرماتا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں وہ صالح اور شہید اور صدیق وغیرہ کا مقام پائیں گے۔ پس صالح بننے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیروی ضروری ہے۔ اگر یہود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو اس ملک میں قائم رکھے گا اور وہ اسی طرح مسلمانوں کے بھائی ہوں گے جس طرح اسحاقؑ اسماعیلؑ کا بھائی تھا۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمت کر کے خدا تعالیٰ کے قانون کو اپنی تائید میں نہ بنالیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ

اور لوگوں میں سے (بعض ایسے بھی ہوتے ہیں) جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لے آئے ہیں پھر جب

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ

اللہ (تعالیٰ) کی وجہ سے ان کو تکلیف دی جاتی ہے وہ لوگوں کے عذاب کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے ہیں اور

رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا

اگر تیرے رب کی طرف سے مدد آتی ہے تو وہ کہتے ہیں (درحقیقت) ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ کیا دنیا جہان کے

فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو اللہ (تعالیٰ) اچھی طرح نہیں جانتا؟ اور اللہ (تعالیٰ) ضرور ظاہر کر دے گا

لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۲﴾

ان کو بھی جو ایمان لائے اور ان کو بھی جو منافق ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا کہ جو لوگ صرف منہ کے ایمانوں پر بھروسہ کرتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی

ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لوگوں کے عذاب دینے کو وہ اللہ کے عذاب دینے کے برابر سمجھ لیتے ہیں۔ اور جب کبھی تیرے رب کی طرف سے نصرت آجائے تو پھر اپنی اصل حالت کو چھپانے کے لئے مسلمانوں کے پاس آ آ کر کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ حالانکہ وہ صرف منہ سے ساتھ تھے دل سے ساتھ نہیں تھے۔ مومنوں کو اس قسم کے بزدلانہ رویہ سے بچنا چاہیے اور صداقت پر پوری مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے۔

آج سب سے بڑی مصیبت سچ کی اشاعت میں یہی ہے کہ لوگ قوم اور ملک کی رسوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یورپ میں سے لاکھوں آدمی ایسے ہیں۔ جن کے دلوں پر اسلام کی سچائی نے اثر کر لیا ہے مگر وہ ملک کی اور قوم کی رسوم کا مقابلہ کرنے اور اپنے ہمسائیوں کے تمسخر سے گھبراتے ہیں۔ اگر وہ دلیر ہو جائیں تو نہ صرف ان کو سچائی قبول کرنے کا موقعہ ملے بلکہ ان کو دیکھ کر ہزاروں اور آدمی آگے آجائیں اور سچائی دنوں میں اتنی پھیل جائے جو پچھلی صدیوں میں نہیں پھیلی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ کی تمام خرابیوں کے باوجود اس میں اتنی خوبی موجود ہے کہ علوم کے خزانے باہر آگئے ہیں اور ہر علم کے متعلق اتنی کتابیں موجود ہیں کہ انسان آسانی سے ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات پہلے لوگوں کو میسر نہ تھی۔ پس مبارک ہے وہ جو اس سامان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور سچے مذہب کے قائم کرنے میں اپنی نیک مثال سے مدد دیتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل اس پر نازل ہوں گے۔ اور آنے والی نسلیں ان کو دعائیں دیں گی۔ ہم انتظار کر رہے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں سے کون کون سے لوگ اس مقام کو حاصل کرتے ہیں۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتلاء اور عذاب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے مگر لوگ اپنی نادانی سے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو وہ اپنی تباہی کا موجب سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ابتلاء اور عذاب میں فرق یہ ہوتا ہے کہ (۱) عذاب کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوتی ہے مگر ابتلاء کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا۔ تکلیفیں تو دونوں طرح ہی آتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی دیکھ لو۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپ دشمن کے نرغے میں اکیلے پھنس گئے۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا مگر ابوجہل ایک ہی دفعہ فوجوں سمیت پکڑا گیا اور ہلاک ہو گیا۔

(۲) عذاب کے نتیجہ میں نقصان کی زیادتی ہوتی ہے اور ابتلاء میں نفع کی زیادتی ہوتی ہے۔ ابتلاء کی مثال تو ایسی ہوتی ہے جیسے ربڑ کے گیند کو جتنے زور سے پھینکا جائے وہ اتنا ہی اچھلتا ہے۔ مگر عذاب میں گر کر انسان اوپر نہیں اٹھ سکتا۔

(۳) عذاب جس انسان پر نازل کیا جاتا ہے اس کے دل میں مایوسی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مگر جس پر ابتلاء نازل ہوتا ہے اس کے دل میں اطمینان اور تسلی ہوتی ہے۔ جب عذاب نازل ہوتا ہے تو مغضوب کہتا ہے۔ ہائے میں ہلاک ہو گیا۔ یا اگر وہ اس سے گھبراتا نہیں تو اس کے دل میں کبر اور خود پسندی کے جذبات جوش مارنے لگتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون ہلاک کر سکتا ہے؟ لیکن جب ابتلاء آتا ہے تو انسان کہتا ہے کوئی پرواہ نہیں میں کمزور اور بے کس ہوں لیکن میرا بچانے والا طاقت ور ہے اور وہ خدا تعالیٰ پر یقین میں اور بھی ترقی کر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ پر اس کی حسن ظنی بہت بڑھ جاتی ہے۔

(۴) عذاب کے دور کرنے کی انسان جب کوشش کرتا ہے تو ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مگر جس پر ابتلاء آتا ہے اس کا فہم رسا ہو جاتا ہے اور وہ بات کو خوب سمجھنے لگ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔ کفار آپ کا کھوج لگاتے لگاتے غار ثور تک پہنچ گئے اور وہاں جا کر کھوجی نے کہہ دیا کہ یا تو وہ آسمان پر چلا گیا ہے اور یا یہیں ہے۔ ان میں کھوجی کی بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان اس وقت سخت خطرہ میں تھی۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بھی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ بلکہ آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی تسلی دینی شروع کر دی اور فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ سوئے ہوئے تھے کہ ایک کافر نے آپؐ کی تلوار اٹھالی اور آپ کو قتل کرنا چاہا۔ لیکن آپ ذرا بھی نہ گھبرائے۔ اور اس کے اس سوال پر کہ اب آپؐ کو کون بچا سکتا ہے آپؐ نے نہایت تسلی سے جواب دیا کہ ''اللہ''۔ اس غیر معمولی حالت اطمینان کو دیکھ کر اس کافر پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔

(۵) پانچواں فرق یہ ہے کہ ابتلاء میں انسان کو احساسِ بلاء نہیں ہوتا۔ جب ابتلاء آتا ہے تو انسان ان تکالیف کو حقیر سمجھتا ہے اور ان میں لذت محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ میں ادنیٰ چیز کو اعلیٰ پر قربان کر رہا ہوں۔ مثلاً اس کا مال جاتا ہے تو کہتا ہے خدا کے لئے ہی گیا ہے اس لئے کیا پرواہ ہے۔ یا اگر اس کا بیٹا مر جاتا ہے تو کہتا ہے خدا نے ہی دیا تھا اگر اس نے واپس لے لیا ہے تو کیا غم ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی واقعہ ہے۔ مبارک احمد سے آپ کو بڑی محبت تھی اور اس کی بیماری میں آپ نے بڑی تیمارداری کی۔ اس سے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ تک کو بھی یہ خیال تھا کہ اگر مبارک احمد فوت ہو گیا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بڑا صدمہ ہو گا۔ آخری وقت حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ اس کی نبض دیکھ رہے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو انہوں نے کہا مُشک لائیں اور چونکہ اس کی نبض بند ہو رہی تھی۔ آپ پر اس خیال کا کہ اس کی وفات سے حضرت مسیح موعود علیہ

السلام کو بہت صدمہ ہوگا اس قدر اثر ہوا کہ آپ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئے۔ مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ مبارک احمد فوت ہو گیا ہے۔ تو اسی وقت نہایت صبر کے ساتھ دوستوں کو خط لکھنے لگ گئے کہ مبارک احمد فوت ہو گیا ہے۔ مگر اس امر پر گھبرانا نہیں چاہیے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مشیئت تھی جس پر ہمیں صبر کرنا چاہیے اور پھر باہر آ کر مسکرا مسکرا کر تقریر کرنے لگ گئے کہ مبارک احمد کے متعلق خدا تعالیٰ کا جو الہام تھا وہ پورا ہو گیا۔ چنانچہ آپ کا ایک شعر بھی ہے کہ ؎

بلانے والا ہے سب سے پیارا اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

غرض ابتلاء میں دکھ کا اثر قلب پر ہمت شکن نہیں ہوتا کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان کر رہا ہوں۔ بعض اوقات سخت عذاب میں بھی احساسِ تکلیف مٹ جاتا ہے۔ مگر یہ اختلال حواس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ایک عورت دکھائی اور اس سے پوچھا تمہارے فلاں رشتہ دار کا کیا حال ہے؟ اس نے ہنس کر بتایا کہ وہ تو مر گیا ہے۔ اسی طرح ایک دو اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھا اور وہ ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔ اب وہ معرفت کے لحاظ سے اس طرح نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کو بیماری تھی اور اس میں غم محسوس کرنے کی حس ہی باقی نہیں رہی تھی۔

(۶) چھٹا فرق یہ ہے کہ عذاب میں روحانیت کم ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عذاب میں خدا تعالیٰ سے دوری ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں خدا تعالیٰ کی طرف اور زیادہ توجہ ہو جاتی ہے۔

ابتلاء اور عذاب میں یہ چھ موٹے موٹے فرق ہیں جن کو یاد رکھنا چاہیے۔

اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ میں بتایا کہ وہ بزدل لوگ جو مشکلات کے دور میں مومنوں کا ساتھ نہیں دیتے لیکن جب مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور فتوحات کا دور آ جاتا ہے تو مومنوں کو آ آ کر کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں ہمیں بھی انعامات میں شریک کیا جائے۔ کیا انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ایمان کا انعام تو خدا نے دینا ہے مسلمانوں نے نہیں دینا اگر انہیں دنیوی مال و دولت یا حکومتی عہدوں میں سے کوئی عہدہ مل بھی گیا تو کیا ہوا اصل انعام تو اللہ تعالیٰ نے دینا ہے اور وہ تمہاری اس دھوکا بازی کو خوب جانتا ہے اس لئے یہ چالاکیاں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں بھی ابھی کئی جھٹکے ایسے لگیں گے جن سے تمہاری اس منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ چنانچہ فرمایا وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ متواتر ایسے ابتلاء پیدا کرتا چلا جائے گا جن سے دنیا پر بھی ظاہر ہو جائے گا کہ کون سچا مومن تھا اور کون منافق۔ اور خود ان

منافقوں پر بھی اپنے دعوٰئے ایمان کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا

اور کافر مومنوں سے کہتے ہیں تم ہمارے پیچھے چلو۔ ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہ

وَ لۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِحٰمِلِیۡنَ مِنۡ خَطٰیٰہُمۡ مِّنۡ

(بالکل) نہیں اٹھا سکتے۔ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے

شَیۡءٍ ؕ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَیَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَہُمۡ وَ اَثۡقَالًا

سوا اور لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے (جن کو وہ دھوکا دیتے ہیں) اور قیامت کے دن ان سے ان کے

مَّعَ اَثۡقَالِہِمۡ ۫ وَ لَیُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَمَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ ع

اس افتراء کے بارہ میں سوال کیا جائے گا۔

تفسیر۔ فرمایا۔ ایسے موقعہ پر مسلمانوں سے مایوس ہو کر کافر کہہ دیا کرتے ہیں کہ تم ہمارے رستہ پر چلو ہم تمہارے بوجھ اٹھالیں گے۔ حالانکہ وہ اپنے مخاطبین کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ہاں ان کی اس بے ہودہ گوئی کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس کے علاوہ مزید سزا بھی حاصل کریں گے اور قیامت کے دن ان سے پوچھا جائے گا کہ تم اتنا جھوٹ کیوں بولتے رہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ کفر انسان کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند کہلانے والے آدمی بھی ایسی باتیں کہنے لگ جاتے ہیں جو ایک بچہ کے نزدیک بھی قابل ہنسی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس طبعی طریق کو دیکھو جو قرآن کریم نے اوپر کی آیات میں بیان فرمایا ہے کہ گناہوں سے بچنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ انسان توبہ کرے لقاءِ الٰہی کے حصول کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد سے کام لے اور دوسری طرف اس غیر طبعی طریق کو دیکھو جس کا دعویٰ کفار کیا کرتے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی باتیں نہایت سچی اور صحیح ہیں اور اس کے مخالفوں کی باتیں نہایت بودی اور کچی ہیں۔ کفار کا یہ دعویٰ کہ اگر مومن ان کی بات مان کر کافر ہو جائیں تو وہ ان کا بوجھ اٹھالیں گے بالکل خلاف عقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ

مومن کافر کا نہ کافر مومن کا۔ بوجھ تو اللہ تعالیٰ معاف کر کے اٹھاتا ہے اور اسی کے حقیقی ذریعہ کا نام توبہ ہے۔

غرض اسلام جو ایک فطرتی مذہب ہے وہ گنہگار کے لئے توبہ کا دروازہ کھولتا ہے اور اسے لقاءِ الٰہی کی امید دلاتا ہے مگر غیر مذاہب اس فطری طریق کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں۔ مثلاً عیسائیت لوگوں کو یہ ترغیب دیتی ہے کہ اگر وہ یسوع مسیح پر ایمان لے آئیں تو محض اس ایمان کی برکت سے ہی ان کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔

عیسائیت اس بارے میں یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ شیطان نے آدمؑ اور اس کی بیوی حوا کو ورغلایا اور گنہگار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر شخص جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ گناہ کا ورثہ لے کر آتا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ عادل ہے اور اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ ہر گنہگار کو سزا دے اس لئے آدمؑ و حوا کے گناہ کی وجہ سے دنیا کا ہر شخص سزا کا مستحق ہے۔ مگر دوسری طرف خدا تعالیٰ کا رحم تقاضا کرتا ہے کہ وہ گنہگاروں کو معاف کر دے سو اس مشکل کے حل کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ بے گناہ ہو کر صلیب پر لٹکایا جائے اور سچا ہو کر جھوٹا قرار پائے۔ چنانچہ وہ مسیح کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوا اور یہود نے اسے بلا کسی گناہ کے صلیب پر لٹکا دیا اور وہ تمام ایمان لانے والوں کے گناہ اٹھا کر ان کی نجات کا موجب ہوا۔ یہ نظریہ جو عیسائیت پیش کرتی ہے۔ اس قدر خلافِ عقل ہے کہ اس پر جتنا بھی غور کیا جائے اتنا ہی انسان حیران ہو جاتا ہے اور اسے تعجب آتا ہے کہ یہ گناہوں کی معافی کی کونسی صورت ہے۔ اگر گناہ گار کے گناہ کو معاف کرنا عدل کے خلاف ہے تو بے گناہ کو سزا دینا بھی تو عدل کے خلاف ہے۔ پھر یہ کس طرح ہوا کہ خدا کے بیٹے نے دوسروں کے گناہ اپنے سر پر لے لئے اور خدا نے اس بے گناہ کو پکڑ کر سزا دے دی؟ پھر عقلاً بھی یہ بالکل غلط بات ہے کہ باپ جو کچھ کرے بیٹے کو اس کا ضرور ورثہ ملتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جاہل ماں باپ کے لڑکے ہمیشہ جاہل رہتے اور عالموں کے عالم۔ مسلول ماں باپ کے بچے ہمیشہ مسلول نہیں ہوتے نہ کوڑھیوں کے بچے ہمیشہ کوڑھی ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ورثہ ہے اور بعض میں نہیں۔ اور جہاں ورثہ ہے وہاں بھی خدا تعالیٰ نے ورثہ سے بچنے کے سامان پیدا کئے ہیں۔ اگر ورثہ سے بچنے کے سامان نہ ہوتے تو تبلیغ اور تعلیم کا مقصد کیا رہ جاتا۔ کافروں کے بچوں کا ایمان لے آنا بتاتا ہے کہ ایمان کے معاملہ میں خدا تعالیٰ نے ورثہ کا قانون جاری نہیں کیا اگر اس میں بھی ورثہ کا قانون جاری ہوتا تو مسیح کی آمد ہی بے کار ہو جاتی۔ اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو نیک طاقتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ پھر بعض انسان ان حالتوں کو ترقی دیتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض ان کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں اور نامراد ہو جاتے ہیں۔ قانونِ شریعت بے شک سب کا سب قابل عمل ہے لیکن نجات کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے جو فضل کو جذب کرتا ہے۔ عمل اس کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور نہایت ضروری ہے۔ لیکن پھر بھی وہ تکمیل

کا ذریعہ ہے اور ذریعہ کی کمی سے چیز کا فقدان نہیں ہوتا۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے۔لیکن پانی سے وہ بڑھتا ہے۔ ایمان بیج ہے اور عمل پانی جو اسے اوپر اٹھاتا ہے۔خالی پانی سے درخت نہیں اگ سکتا لیکن بیج ناقص ہو اور پانی میں کسی قدر کمی ہو جائے تب بھی کسی قدر درخت اگ آتا ہے۔کسان ہمیشہ پانی دینے میں غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن اس سے کھیت مارے نہیں جاتے جب تک بہت زیادہ غلطی نہ ہو جائے۔انسانی عمل ایمان کو تازہ کرتا ہے۔اور اس کی کمی اس میں نقص پیدا کرتی ہے۔لیکن اس کی ایسی کمی جو شرارت اور بغاوت کا رنگ نہ رکھتی ہو اور حد سے بڑھنے والی نہ ہو ایمان کی کھیتی کو تباہ نہیں کر سکتی اور اگر شرارت اور بغاوت بھی ہو تو خدا کا عدل توبہ کے راستہ میں روک نہیں۔عدل اس کو نہیں کہتے کہ ضرور سزا دی جائے بلکہ اس کو کہتے ہیں کہ بے گناہ کو سزا نہ دی جائے۔پس گنہگار کو رحم کر کے بخشنا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے مخالف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔اگر عدل کے معنے یہ ہوں کہ ہر عمل کی عمل کے برابر جزا ملے تو بخشش اور نجات کے معنے کیا ہوئے؟ کیونکہ عدل کے معنے برابر کے ہیں اور اگر یہ صحیح ہو تو کسی شخص کو اس کی عمر کے برابر ایام کے لئے ہی نجات دی جا سکتی ہے اور وہ بھی اس کے اعمال کے وزن کے برابر۔مگر اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔پھر نہ معلوم خدا تعالیٰ کی رحمت کو اس مسئلہ سے کیوں محدود کیا جاتا ہے۔اسلام بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ مالک ہے اور مالک کے لئے انعام اور بخشش میں کوئی حد بندی نہیں۔وہ بے شک وزن کرتا ہے لیکن اس کا وزن اس لئے ہوتا ہے کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ ملے۔نہ اس لئے کہ اس کے حق سے زیادہ نہ ملے۔مسیح بے شک بے گناہ انسان اور خدا کا رسول تھا۔لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دوسروں کا بوجھ اٹھا لے گا۔قیامت کے دن ہر شخص کو اپنی صلیب خود ہی اٹھانی ہو گی۔اور جو خود اپنی صلیب نہ اٹھا سکے گا وہ نجات بھی نہ پا سکے گا۔سوائے اس کے کہ خدا کے فضل کے ماتحت اس کی بخشش ہو اور خدا تعالیٰ خود کسی کا بوجھ اٹھا لے۔

حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں یہی نظریہ پیش کیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

”جو کوئی اپنی صلیب اٹھا کر میرے پیچھے نہیں آتا میرے لائق نہیں ہے۔“ (متی باب ۱۰ آیت ۳۸)

حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ عیسائیوں کا یہ کہنا کہ مسیح نے گناہگاروں کا بوجھ اٹھا لیا ہے بالکل غلط ہے۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا اور اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑے گی۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ پس وہ ان میں نو سو پچاس سال تک رہا۔ سو اس کی قوم

اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۵﴾

کے لوگوں کو طوفان نے آلیا اور وہ ظالم تھے۔

تفسیر۔ اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ پہلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کو کسی فتنہ میں نہیں ڈالا جائے گا اور یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ذکر کرنے کے بعد نوحؑ کا ذکر کیوں کیا گیا۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ نوحؑ کی قوم کا اس لئے ذکر شروع کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فتنہ میں ڈالنے کا طریق قدیم سے چلا آتا ہے۔ اور نوحؑ شرعی نبیوں میں سے سب سے پہلے نبی ہیں یا کم سے کم حضرت آدمؑ کے بعد دوسرے۔ پس اس وقت سے لے کر اگر بعد کے چند نبیوں کا ذکر ہو جائے تو مومنوں کو آزمائش میں ڈالنے کا جو ذکر تھا اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پس نوحؑ کے ذکر سے مومنوں کے ابتلاؤں کی کڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس آیت میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ لَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال رہے اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس رہنے کے معنے روحانی رہنے کے ہیں۔ یعنی نوحؑ کی تعلیم اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک رہی پھر مٹ گئی۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَاۤ

پس ہم نے اس کو اور اس کی کشتی میں بیٹھنے والے ساتھیوں کو نجات دی اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان کے

اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

لوگوں کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

تفسیر۔ اس جگہ ان ابتلاؤں کا ذکر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی جماعت کو پیش آئے۔ اور بتایا گیا

ہے کہ نوحؑ اور اس کے ماننے والوں کو لوگوں نے بڑی تکلیف دی۔ یہاں تک کہ ان سب کو ایک کشتی کے ذریعہ اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ اور وہ کشتی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے خدا تعالیٰ کا ایک نشان قرار پائی۔ چنانچہ آج تک اس کشتی پر بحث ہو رہی ہے۔ اور محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگ کبھی اس کشتی کے آثار آرمینیا میں دیکھتے ہیں۔ اور کبھی روس میں۔ حالانکہ بالکل ممکن ہے کہ چونکہ ہر رسول کو دوسرے رسول کا قائمقام قرار دیا جاتا ہے۔ بہت سے نبیوں کے مخالفین پر نوحؑ کے زمانہ کے سے عذاب آئے ہوں اور کئی نبیوں کو کشتی کے ذریعہ سے بچنا پڑا ہو۔ جیسا کہ حضرت یونسؑ کا مشہور واقعہ ہے۔ پس ممکن ہے ایک کشتی نہ ہو بلکہ بہت سی کشتیاں ہوں جو اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کا نشان بنی ہوں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی مصر چھوڑنا پڑا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے مختلف ملک اور مختلف قومیں تھیں جن پر نوحؑ کے زمانہ کے سے عذاب آئے۔ مگر بعد کے لوگوں نے غلطی سے سب کو ایک سمجھ لیا۔

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ

اور (ہم نے) ابراہیم (کو بھی رسول بنا کر بھیجا تھا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور اس کا تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے۔

تفسیر۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت نوح علیہ السلام کی امت میں سے ہی تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کا ان الفاظ میں اظہار فرماتا ہے کہ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (الصّٰفّٰت: ۸۴) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین میں سے تھے۔ پس اس مناسبت کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک ممتد ہوا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی عمر سے یہ مراد نہیں کہ ان کو ساڑھے نو سو سال کی جسمانی زندگی ملی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ساڑھے نو سو سال تک جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ تک ممتد ہوتے تھے حضرت نوحؑ کی تعلیم اور تلقین لوگوں کے لئے مشعل راہ بنی رہی اور اس طرح وہ روحانی رنگ میں

ساڑھے نو سو سال تک زندہ رہے۔

اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ؕ

تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا (دوسری ہستیوں کی) عبادت کرتے ہو۔ اور مذہب کے بارے میں

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ

جھوٹی باتیں بناتے ہو۔ وہ (ہستیاں) جن کی تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرتے ہو تمہیں رزق

رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ

نہیں دے سکتیں۔ پس اللہ (تعالیٰ) سے اپنا رزق مانگو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ اور اس کا شکر ادا کرو۔

اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۸﴾

تم کو اسی کی طرف لوٹا کر لے جایا جائے گا۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اس زمانہ کے لوگوں میں بھی شرک پایا جاتا تھا۔ جس کو مٹانے کے لئے آپ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شرک پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ وہ دور صفات الٰہیہ کے احساس کا ابتدائی دور تھا اس لئے شرک بھی صرف بسیط شکل میں تھا۔ یعنی بعض لوگ اپنے بزرگوں کے مجسمے پوجنے لگ گئے تھے یا بعض نے کوئی اور سادہ قسم کا شرک اختیار کر لیا تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں شرک ایک فلسفیانہ مضمون بن گیا تھا۔ اور اب عقلوں پر فلسفہ کا غلبہ شروع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی توحید کی باریک راہیں بھی نکل آئی تھیں جن پر عمل کرنا صرف توحید کے موٹے موٹے مسائل پر عمل کرنے سے بہت مشکل تھا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بت پرستی دنیا میں آج بھی موجود ہے مگر آج جب بت پرستوں کو کہا جاتا ہے کہ تم کیوں بت پرستی کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں ہم تو کوئی بت پرستی نہیں کرتے ہم تو صرف اپنی توجہ کے اجتماع کے لئے ایک بت سامنے رکھ لیتے ہیں۔ گویا شرک تو وہی ہے جو پہلے تھا مگر اب شرک کو ایک نیا رنگ دے دیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں شرک کو ایک نیا رنگ دے دیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو صرف یہی نصیحت نہیں فرمائی کہ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا کہ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور خدا تعالیٰ پر ان کے بارہ میں افتراء کرتے ہو۔ بلکہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ وَ اشۡکُرُوۡا لَہٗ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ۔ یعنی وہ ہستیاں جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہو تمہیں رزق نہیں دے سکتیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے اپنا رزق مانگو۔ اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ تم کو اسی کی طرف لوٹا کر لے جایا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پانچ امور کی طرف توجہ دلائی تھی۔

اول اس امر کی طرف کہ معبودانِ باطلہ جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کے متعلق تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ تمہاری حاجت روائی کرتے یا مشکلات میں تمہارے کام آتے ہیں۔ ان میں نہ تو کسی کو ایک ذرّہ بھر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ وہ کسی کو ایک ذرّہ بھر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

دوم۔ ہر قسم کا رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے تم اسی سے مانگو جو تمام خیر و برکت کا منبع ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں تمام نعمتوں کے ذخائر ہیں۔

سوم۔ عبادت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی بجالاؤ۔ کسی اَور کو قابل پرستش نہ سمجھو۔

چہارم۔ ان نعمتوں پر جو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہیں عطا کی گئی ہیں اس کا شکر بجالاؤ۔ اور ان کی قدر و قیمت کا احساس اپنے اندر پیدا کرو۔

پنجم۔ تم مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے والے ہو اس لئے ایسے اعمال بجالاؤ جو تمہیں خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا مستحق بنا سکیں۔

یہ امور بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں صرف بتوں کی پرستش سے نہیں روکا بلکہ اس فلسفہ کا بھی ردّ کیا ہے جو اس بت پرستی کے پیچھے اس زمانہ میں کام کر رہا تھا۔ اور انہیں بتایا ہے کہ پتھر کے بے جان بتوں نے تمہیں کیا دینا ہے۔ تم اگر کچھ لینا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگو جو اپنے اندر تمام طاقتیں رکھتا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو صرف یہ نصیحت ہی نہیں کی کہ فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ بلکہ آپ نے اپنا عملی نمونہ ان کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ جب آپ کو خدا تعالیٰ نے کہا کہ جا اور اپنے بچے اسمٰعیلؑ اور اس کی ماں ہاجرہؑ کو ایک وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑ آ تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہاں ان کے کھانے پینے اور رہنے کا کیا انتظام ہوگا۔ بلکہ وہ گئے اور ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ کر چلے آئے۔ کیونکہ انہیں

یقین تھا کہ جو خدا انہیں گھر پر رزق دیتا رہا ہے وہ انہیں اس جنگل میں بھی رزق عطا فرمائے گا۔

پھر فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں سامان عطا کئے ہوئے ہیں ان سے کام لو پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح تمہاری تمام ضرورتیں پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان کچھ دولتیں کماتا ہے اور کچھ دولتیں انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔جو دولتیں انسان دنیا میں کماتا ہے وہ کسی انسان کے پاس زیادہ ہوتی ہیں کسی کے پاس کم ہوتی ہیں اور کسی کے پاس ہوتی ہی نہیں۔مثلاً زمین بھی دولت ہے لیکن دنیا کے سب لوگ زمیندار نہیں۔کسی کے پاس زمین بہت زیادہ ہے کسی کے پاس بہت کم زمین ہے اور کسی کے پاس زمین ہے ہی نہیں۔تجارتیں ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔کوئی پھیری کر کے گذارہ کرتا ہے اور کوئی بڑے بڑے کارخانوں کا مالک ہے۔ بینکنگ کا بھی یہی حال ہے۔مالی لحاظ سے کسی کے پاس پانچ سات روپے ہوتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو مالدار سمجھتا ہے اور کسی کے پاس کروڑوں روپے ہوتے ہیں اور پھر بھی وہ اور مال حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے امریکہ میں بعض لوگوں کی سالانہ آمد کروڑوں ڈالر ہے ان کو بھی مالدار کہتے ہیں ۔اور غرباء کے علاقہ میں اگر کسی کے پاس سو دو سو روپیہ آجاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ شخص بہت مالدار ہے۔غرض وہ دولت جو انسان کماتا ہے اور جو ظاہر میں نظر آتی ہے سب کو یکساں طور پر نہیں ملی۔کیونکہ اس کے لئے محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔اور اسی وجہ سے انسانوں میں بہت بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔یہ تفاوت کبھی قانون کے طور پر ہوتا ہے جیسے جو شخص زیادہ محنت کرتا ہے زیادہ کما لیتا ہے۔ اور کبھی استثناء کے طور پر ہوتا ہے۔جیسے ماں باپ مالدار ہوں تو ان کا بیٹا بغیر کسی محنت کے مالدار بن جاتا ہے۔لیکن ایک دوسری قسم کی دولت بھی انسان کو ملتی ہے جو حقیقتاً بہت زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔مگر افسوس ہے کہ انسان اس کی قدر نہیں کرتے۔حالانکہ وہی دولت اصل دولت ہے۔اور پھر وہ ایسی دولت ہے جو تمام انسانوں کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی ہے اور وہ دولت ہے حافظہ کی۔فکر کی ۔ذہانت کی۔عقل کی۔تدبّر کی ۔یہ دولت ہر ایک انسان کو ملی ہے سوائے پاگل اور فاتر العقل کے اور یہ چیز بطور استثناء کے ہے ورنہ جو انسان بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خزانہ دے کر بھیجا جاتا ہے۔اسے پیدائش کے ساتھ ہی حافظہ اور ذہانت اور فکر اور تدبّر کی قوتیں عطا کی جاتی ہیں۔اگر بعد میں وہ ان کی ناقدری کرتا ہے تو یہ قوتیں کلّی طور پر یا جزوی طور پر ضائع ہو جاتی ہیں۔مثلاً اگر وہ آنکھوں کو استعمال نہیں کرتا تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ پاؤں سے نہیں چلتا تو پاؤں شل ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ سے کام نہیں لیتا تو ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔اسی طرح اگر وہ جسم کے دوسرے اعضاء کو استعمال نہیں کرتا

تو اس کی جسمانی طاقتیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ اور جو شخص ان کی قدر کرتا ہے اس کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص محنت کرتا ہے اور اپنے اسباق کو یاد کرتا ہے تو اس کا حافظہ تیز ہوجاتا ہے۔ اور جو محنت نہیں کرتا اور اپنے اسباق کو یاد نہیں کرتا اس کا حافظہ کمزور ہوجاتا ہے۔ پھر جو لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی استنباط کی قوت بڑھ جاتی ہے اور جو لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ان کی استنباط کی قوت جاتی رہتی ہے۔ جو لوگ اپنے اردگرد کے ماحول پر غور کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں ان کی قوت فکر بڑھ جاتی ہے اور جنہیں اپنے ماحول پر غور کرنے کی عادت نہیں ہوتی ان کی قوت فکر جاتی رہتی ہے پھر جو لوگ اپنے مختلف جذبات کو اپنی اپنی حد کے اندر قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی عقل ترقی کرتی ہے اور جو ایسا نہیں کرتے۔ ان کی عقل ماری جاتی ہے۔ جو لوگ خداداد سامانوں کو صحیح طور پر اور مناسب موقعہ پر استعمال کرنے کی سکیم بنا لیتے ہیں ان کی قوتِ مدبّرہ ترقی کرتی ہے اور جو اس قسم کی سکیم نہیں بناتے ان کی قوت مدبرہ جاتی رہتی ہے۔ لیکن پیدائش کے وقت یہ سب قوتیں ہر انسان کو ملتی اور قریباً برابر ملتی ہیں۔ بعد میں ناقدری کی وجہ سے یہ قوتیں کم ہوجائیں تو یہ اَور بات ہے۔ یا ماں باپ نے جس قسم کا معاملہ کیا ہو اس کے مطابق یہ قوتیں کم یا زیادہ ہوجاتی ہیں۔ مثلاً ایام طفولیت میں اگر ماں باپ نے بچہ کی صحیح نگرانی نہیں کی۔ یا ماں نے حمل کے دوران میں پوری احتیاط نہیں کی تو اس سے بچہ کی قوتوں پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن اس امر کو مستثنٰی کرتے ہوئے اگر انسانوں کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو کروڑوں کروڑ لوگ ایسے نکلیں گے جو ان خداداد قوتوں سے مالا مال ہوں گے۔ لیکن ظاہری لحاظ سے یہ صورت نہیں۔ اگر تمام انسانوں کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جائے تو ظاہری مالدار اس دنیا میں دس پندرہ لاکھ سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس وقت دنیا کی آبادی اڑھائی ارب ہے اگر ظاہری دولت رکھنے والے پندرہ لاکھ ہوں اور دنیا کی آبادی پندرہ کروڑ ہوتی تو ان کی نسبت کروڑ میں سے ایک لاکھ ہوتی۔ لیکن دنیا کی آبادی اڑھائی ارب ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قریباً سترہ سو (۱۷۰۰) میں سے ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ظاہری دولت ہے۔ لیکن حافظہ ذہانت تدبّر اور فکر کی دولت ۱۷۰۰ میں سے ۱۶۸۰ کے پاس ہوگی صرف بیس اشخاص ایسے نکلیں گے جن کی یہ طاقتیں ماؤف ہوں گی۔ باقی سب لوگوں کے پاس یہ دولت موجود ہوگی۔ ہاں عدمِ استعمال کی وجہ سے ان پر زنگ لگ جائے تو اَور بات ہے۔ جیسے اگر کوئی چاقو بارش میں پھینک دیا جائے تو اس پر زنگ لگ جائے گا۔ لیکن اگر اسے پانی میں سے اٹھا کر صاف کیا جائے تو وہ ویسا ہی صاف نکل آئے گا جیسے پہلے تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بےقدری اسی دولت کی کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کو عطا کی گئی ہے اگر کسی شخص سے دریافت کیا جائے کہ تمہارے پاس کیا کیا مال ہے تو وہ کہے گا۔ میرے پاس اتنی زمین

ہے۔مکان ہے۔بھینس ہے۔گھوڑا ہے لیکن وہ دولت جو سب سے بڑی ہے یعنی ہوا ہے۔پانی ہے۔جو اسے نہ ملے تو مرجائے اس کا ذکر تک نہیں کرے گا۔بھینس اور گھوڑ اضائع ہوجائے تو انسان نہیں مرے گا۔کپڑوں کا ایک حصہ ضائع ہوجائے تو وہ موسم کی برداشت کرلے گا۔لیکن اگر ہوا نہ ملے تو چند منٹ میں ہی مرجائے اگر پانی نہ ملے تو وہ ایک دن یا اس سے کچھ زائد عرصہ میں مرجائے گا۔غرض انسان سب سے بڑی دولت کو گنے گا ہی نہیں حالانکہ اگر یہ دولت اسے نہ ملے تو اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔وہ کبھی آنکھوں کانوں ناک اور زبان کا نام نہیں لے گا۔حالانکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اگر وہ کہتا ہے کہ میرے پاس گُڑ ہے تو وہ گڑ کس کام کا جب زبان نہ ہوگی ۔اگر زبان گڑ کو نہ چکھتی تو انسان کے نزدیک گڑ اور پھیکا برابر ہوتا یا مثلاً وہ کہتا ہے میری بیوی اور بچے خوبصورت ہیں لیکن اس کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ اگر اس کی آنکھیں ہی نہ ہوں تو اسے وہ خوبصورت کیسے معلوم ہوں۔غرض دولت کے جو حقیقی خزانے ہیں انسان ان کی قدر نہیں کرتا اور جو دولتیں نسبتی ہیں اور بالواسطہ ملتی ہیں ان کے پیچھے ہر وقت پڑا رہتا ہے۔مثلاً کپڑا ہے۔اگر کپڑا میرے جسم کو نرم اور ملائم معلوم ہوتا ہے تو اس کی قیمت ہے لیکن اگر میرا جسم کپڑے کی ملائمت محسوس نہیں کرتا تو اس کی کوئی قیمت نہیں ۔ پھر اگر اس کی کوئی قیمت ہے تو اس لئے کہ میرے ملنے والے دوستوں کو اچھا لگے۔ اور انہیں لذت محسوس ہو۔اگر میرے دوست کی آنکھیں ہی نہ ہوں اور میری حس موجود نہ ہو تو چاہے وہ کپڑا لاکھ روپے گز کا ہو یا چند آنے کا مجھے اس کا کیا فائدہ۔پھر زبان اور معدہ ہیں ۔یہ دونوں مل کر کھانے کی قیمت بناتے ہیں اگر کوئی دودھ پئے ۔مکھن کھائے ۔لسی پیئے یا پلاؤ اور زردہ کھائے ۔لیکن اس کی زبان نہ ہو تو یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ۔ غرض ہمارے سب کپڑوں اور کھانوں کی قدر ان نعمتوں کی وجہ سے ہے جو خدا تعالیٰ نے عطا کی ہیں ۔اگر تم اپنی آنکھیں نکال دو۔یا جسمانی حس ماردو تو خوبصورت اور ردّی کپڑوں میں تمہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا ۔ چاہے کپڑا لاکھ روپے گز ہو یا چار آنہ گز۔تمہارے لئے دونوں برابر ہوں گے۔پس اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں وہ بہت زیادہ قیمتی ہیں مگر افسوس ہے کہ لوگ ان سے کام نہیں لیتے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اسی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم اپنی طاقتوں کو کیوں ضائع کرتے ہو۔ تم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ان معنوں کے لحاظ سے یہاں عِنْدَ اللّٰہِ کے الفاظ کا استعمال ویسا ہی ہے جیسے سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ بدکاری کا الزام لگانے کے بعد چار عینی گواہ نہ لائیں فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (النور:۱۴) وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جھوٹے ہیں۔اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی

فرمایا کہ تم سارا دن بتوں کے آگے کیوں پڑے رہتے ہو۔ تمہیں خدا تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں تم ان سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ مضحکہ انگیز روش جو تم نے اختیار کر رکھی ہے اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَ مَا عَلَى

اور اگر تم میری بات کو جھوٹا قرار دو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلی قوموں نے بھی (اپنے رسولوں کو) جھٹلایا تھا۔

الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۹﴾

اور رسول کا کام تو کھول کھول کر پہنچانا ہوتا ہے (زبردستی منوانا نہیں ہوتا)۔

تفسیر ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان اَور بھی بہت سے نبی گذرے ہیں اور ان سب نبیوں کی امتوں کو اپنے اپنے زمانہ کے کفار سے تکلیفیں پہنچیں۔ مگر انہوں نے ہر قسم کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور آخر خدا تعالیٰ نے انہیں کامیاب کر دیا۔

وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تلوار کی بجائے تبلیغ سے کام لینا ہی ایک دیرینہ اصول ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی اصول کو اختیار کیا تھا۔ اور ان کے زمانہ کے لوگوں کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی ارشاد ہوا تھا کہ ہمارے اس رسول کا کام صرف بات پہنچا دینا ہے تلوار سے منوانا نہیں اور یہی سارے قرآن کا خلاصہ ہے کہ دلیل کے ساتھ بات منوانا مذہبی لوگوں کا کام ہوتا ہے جبر سے منوانا مذہبی لوگوں کا کام نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک دنیا اس مسئلہ کو نہیں سمجھی بلکہ خود مسلمانوں میں بھی قتلِ مرتد کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی کا عقیدہ جھوٹ ہو یا سچ عقیدہ رکھنے والا اسے بہرحال ویسا ہی سچا سمجھتا ہے جیسے ایک مسلمان اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ عیسائیت جھوٹی سہی مگر سوال تو یہ ہے کہ دنیا کا اکثر عیسائی عیسائیت کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اسے سچا سمجھتا ہے۔ ہندو مذہب جھوٹا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ دنیا کا اکثر ہندو اپنے مذہب کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اسے سچا سمجھتا ہے۔ یہودی مذہب یقیناً اس وقت سچا نہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہودیوں کا اکثر حصہ یہودیت کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اسے سچا سمجھتا ہے۔ پس اگر اس بات پر کسی کو قتل کرنا جائز ہے کہ میں سمجھتا ہوں میرا مذہب سچا ہے دوسرے کا نہیں تو پھر ایک عیسائی کو یہ کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جس مسلمان کو چاہے قتل

کر دے۔ایک ہندو کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً دوسروں کو ہندو بنالے یا انہیں مار ڈالے۔چین میں کنفیوشس مذہب کے پیروؤں کو یہ کیوں حق نہیں کہ وہ زبردستی لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کرلیں۔فلپائن میں جہاں اب بھی پندرہ بیس ہزار مسلمان ہے عیسائیوں کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنالیں۔امریکہ کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً ان مسلمانوں کو جو اس کے ملک میں رہتے ہیں عیسائی بنالے۔روس کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً سب کو عیسائی بنالے یا جبراً سب کو کمیونسٹ بنالے۔اگر مسلمان دوسروں کو جبراً اپنے عقیدہ پر لا سکتے ہیں تو ویسا ہی حق عقلاً دوسروں کو بھی حاصل ہے۔لیکن کیا اس حق کو جاری کر کے دنیا میں کبھی امن قائم رہ سکتا ہے۔کیا اس حق کو جاری کر کے تم اپنے بیٹے کو بھی کہہ سکتے ہو کہ یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا بیوی کو بھی کہہ سکتے ہو کہ یہ مسئلہ ٹھیک ہے کہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیں۔مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ عیسائیوں کو زبردستی مسلمان بنالیں۔ایران والوں کا حق ہے کہ وہ سب حنفیوں کو زبردستی شعیہ بنالیں اور حنفیوں کا حق ہے کہ وہ سب کو زبردستی سنی بنالیں۔غرض یہ ایسی عقل کے خلاف بات ہے کہ کوئی انسان اس کو ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کرسکتا۔

گذشتہ انبیاء کی قوموں نے جب بھی خدائی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا تو خدا تعالیٰ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ اَنُلۡزِمُکُمُوۡهَا وَ اَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ (ھود:۲۹) یعنی اگر تم خود ہدایت لینا پسند نہیں کرتے تو ہم جبراً تمہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔لیکن افسوس کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں اس اصل کا انکار کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔اگر دنیا اس مسئلہ کو سمجھ جائے تو یقیناً ظلم اور تعدّی مذہبی اور سیاسی امور میں بند ہوجائے۔نہ لوگ اپنے عقیدے لوگوں پر جبراً ٹھونسیں اور نہ اپنے سیاسی نظام دوسرے ملکوں میں جبراً جاری کرنے کی کوشش کریں۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰهُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ ؕ اِنَّ

کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ (تعالیٰ) پیدائش عالم کو کس طرح پہلی دفعہ شروع کرتا ہے پھر اس کو بار بار

ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۰﴾ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا

لوٹاتا جاتا ہے۔یہ کام اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔تُو کہہ ملک میں چاروں طرف پھرو۔پھر دیکھو کہ

کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ

اللہ (تعالیٰ) نے مخلوق کی پیدائش کس طرح شروع کی تھی پھر مرنے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرتا چلا گیا۔

اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۱﴾

اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

تفسیر ۔ ان آیات میں وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ کی دلیل پیش کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پچھلے نبیوں کے ذریعہ سے ایک روحانی جماعت قائم کرتا رہا ہے۔ پھر جب ان نبیوں کا روحانی اثر جاتا رہا اور پھر وہ کسی نئے نبی کے ذریعہ سے روحانی جماعتوں کو قائم کرتا رہا۔ تو یہ بات اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ چنانچہ تم زمین میں پھرو اور دیکھو کہ کیا نبی کے بعد نبی نہیں آتا رہا اور جماعت کے بعد جماعت نہیں قائم ہوتی رہی۔ بعینہٖ اسی رنگ میں اب اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پھر ایک جماعت قائم کرے گا اور وہ اس بات پر قادر ہے۔ تمہاری مخالفانہ کوششیں اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ میں مزاحم نہیں ہو سکتیں۔

یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں آخرت کا ذکر کیا گیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ اس جگہ آخرت کا نہیں بلکہ اسی دنیا کا ذکر ہے اور چونکہ اس دنیا میں مردے زندہ نہیں ہوتے اس لئے پیدائش اول سے مراد قوموں کو تمکنت بخشنا اور پیدائش ثانی سے مراد غالب قوموں کے زوال کے بعد پھر دوبارہ ان میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اُخروی زندگی ہے ہی نہیں بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ اس آیت میں اس دنیا میں قوموں کے اتار چڑھاؤ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کے الفاظ سے اور ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ دنیا پر غور کرو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی دفعہ پیدائش کا کام شروع کیا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینی شروع کی۔

فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ میں اللہ تعالیٰ نے علمِ بدءِ عالم کا بھی ذکر کر دیا ہے جسے اصطلاحاً ایتھنالوجی کہتے ہیں۔ یعنی اس بات کا پتہ لگانا کہ پیدائشِ عالم کس طرح ہوئی ہے۔ فرماتا ہے تم زمین میں پھر کر دیکھو پھر تمہیں پتہ لگے گا کہ پیدائش عالم کس طرح ہوئی تھی یعنی اگر تم نے تاریخ عالم کا صحیح پتہ لگانا ہو۔ تو یہ پتہ تمہیں کسی ایک ملک سے نہیں لگ سکتا بلکہ مختلف ملکوں کے دیکھنے سے اس کا پتہ لگے گا۔ کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف تہذیبیں عروج پر رہی ہیں۔ اگر تم اقوام عالم کی صحیح تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہو تو تم ساری دنیا میں پھرو کیونکہ کسی صدی میں ہندوستان میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں ایران میں تہذیب پھیلی۔ کسی صدی میں روم میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں عرب میں پھیلی۔ اسی طرح کسی صدی میں شام میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں مصر میں پھیلی۔ غرض ایتھنالوجی کے علم کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کرو اور ان میں مختلف اقوام کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان

سے تاریخ عالم کا پتہ لگاؤ پھر تم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکو گے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹا کر لایا جائے گا۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔وہ جس پر چاہتا ہے عذاب نازل کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اندھا دھند عذاب نازل کرتا ہے اور اندھا دھند رحم کرتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں صاف لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں پر رحم کرتا ہے جو ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائیوں سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں اور نماز باجماعت قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (التوبۃ:۷۱) یعنی مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ضرور ان پر رحم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔عَذَابِیْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (الاعراف:۱۵۷) یعنی میں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں۔ اور میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے۔ پس میں ضرور اس کو ان لوگوں کے لئے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اندھا دھند رحم نہیں کرتا بلکہ جو لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے اس کے رحم کے مستحق ہوتے ہیں صرف انہی پر رحم کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے عذاب کے بارہ میں بھی یہ اصول بیان فرمادیا ہے کہ وہ کسی کو اندھا دھند عذاب نہیں دے گا بلکہ صرف ایسے ہی لوگ عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے جنہوں نے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کی ہوگی۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (النساء:۱۷۴) یعنی

وہ لوگ جو مومن ہوں گے اورانہوں نے نیک اور مناسب حال اعمال کئے ہوں گے۔ وہ انہیں ان کے اعمال کے پورے پورے بدلے دے گا اور اپنے فضل سے انہیں زائد انعامات سے بھی سرفراز فرمائے گا۔لیکن جن لوگوں نے خدائی ہدایات سن کر برا منایا ہوگا اور تکبر سے کام لیا ہوگا وہ انہیں دردناک عذاب دے گا۔اسی طرح سورۃ غاشیہ میں فرماتا ہے۔لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ۔ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (الغاشیۃ: ۲۳ تا ۲۵) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تُو ان لوگوں پر داروغہ کے طور پر مقرر نہیں۔ہاں جس نے پیٹھ پھیر لی اور کفر کا مرتکب ہوا اللہ تعالیٰ اس کے کفر کے نتیجہ میں اسے بہت بڑا عذاب دے گا۔اسی طرح فرماتا ہے۔فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۔(ھود: ۱۰۷ تا ۱۰۹) یعنی جو بدبخت ثابت ہوں گے وہ آگ میں داخل ہوں گے۔اس میں کسی وقت تو ان کے درد سے لمبے لمبے سانس نکل رہے ہوں گے۔اور کسی وقت ہچکی کی حالت کے مشابہ سانس نکل رہے ہوں گے۔وہ اس میں اس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہیں۔سوائے اس عرصہ کے جو تیرا رب چاہے۔تیرا رب جو چاہتا ہے اسے کر کے رہتا ہے۔اور جو خوش نصیب ثابت ہوں گے۔وہ جنت میں ہوں گے۔وہ اس میں اس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس وقت کے جو تیرا رب چاہے۔یہ ایسی عطاء ہے جو کبھی کاٹی نہیں جائے گی۔سورۂ فرقان میں بھی فرماتا ہے۔وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا۔ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا۔(الفرقان: ۲۸، ۲۹) اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا۔اے کاش! میں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔وائے بدبختی! میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔غرض قرآن کریم نے صرف یہی نہیں بتایا کہ وہ کن لوگوں پر رحم کرے گا بلکہ اس نے یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ کن لوگوں کو عذاب دے گا۔ایسی صورت میں کسی پر اندھا دھند رحم کرنے یا کسی کو اندھا دھند سزا دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

پھر اگر وہ اندھا دھند سزا دے تو یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔چنانچہ فرماتا ہے۔وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۔(الانبیاء: ۴۸) یعنی ہم قیامت کے دن ایسے تول کے سامان پیدا کریں گے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔اور اگر ایک رائی کے دانہ کے

برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۔ (الاعراف: ۹،۱۰) یعنی اس دن تمام اعمال کا وزن کرنا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ جس کے وزن بھاری ہوئے وہ لوگ بامراد لوگوں میں شامل ہوں گے اور جن کے وزن ہلکے ہوئے تو سمجھ لو کہ ایسے لوگ اپنی جانوں کے معاملہ میں خسارہ پانے والے ہیں۔ یہ اس لئے ہوا کہ وہ ہماری آیتوں کے معاملہ میں ظلم سے کام لیتے تھے۔ پھر فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء: ۴۱) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس: ۴۵) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یقیناً ایسی ہے کہ وہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔ ہاں لوگ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے ہیں۔

پھر یہ سوال اس لئے بھی باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ اصول بیان فرما دیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوگا کے عمل کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۔ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (النجم: ۴۰ تا ۴۲) کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور انسان ایک دن اپنی کوشش کا نتیجہ ضرور دیکھ لے گا اور اس کو اپنے اعمال کی پوری پوری جزاء مل جائے گی۔ پھر فرماتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔ (الزلزال: ۸،۹) یعنی جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۔ (الشمس: ۱۰،۱۱) یعنی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا سمجھو کہ وہ اپنے مقصود کو پا گیا۔ اور جس نے اسے مٹی میں گاڑ دیا سمجھ لو کہ وہ نامراد ہو گیا۔

ان اصول کی موجودگی میں کسی کو اندھا دھند عذاب دینے یا کسی پر اندھا دھند رحم کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ پس جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے بخشتا ہے کے یہ معنے نہیں کہ وہ اندھا دھند ایسا کرتا ہے بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ثابت ہے جو لوگ اپنے اندر خدا تعالیٰ کی محبت کی قابلیت پیدا کرتے ہیں ان پر وہ رحم کرتا ہے اور جو لوگ اپنے نفسوں میں گند پیدا کرتے ہیں ان پر عذاب نازل کرتا ہے۔

پس اس آیت میں جو مَنْ يَّشَآءُ فرمایا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کا عذاب یا رحم بغیر کسی اصول کے نازل ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ حالات کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ پس ''چاہتا ہے'' سے یہ مراد ہے کہ حالات کے مطابق چاہتا ہے نہ کہ اندھا دھند۔ باقی رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے مشیئت کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔

اور کیوں یہ نہیں کہا کہ جو نیک ہوگا اسے بخشے گا اور بد کو سزا دے گا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مشیئت اور مقتضائے انصاف ایک ہی شے ہے۔ انسان پر چونکہ سچائیاں حاکم ہوتی ہیں۔ اس کے اعمال کا اندازہ اس کے نفس پر نہیں بلکہ سچائیوں پر کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ سچائیوں کا منبع ہے اور وہ اسی میں سے نکل رہی ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سچائیوں کے مطابق عمل کرے گا بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشیئت پر عمل کرے گا۔ کیونکہ اس کی مشیئت ہی سچائیوں کا منبع ہے۔ وہ حسن کی کان ہے۔ ہر سچائی اس کی مشیئت کا ایک بیرونی پرتو ہے۔ اس کے حسن کی جھلک ہے۔ اس کے ارادہ کی ایک تصویر ہے۔ پس اس کی مشیئت کو سچائی کا تابع کہنا ایسا ہی بے ہودہ ہے جس طرح ایک بیٹے کو اپنے باپ کا باپ قرار دینا۔ یہ نکتہ ایسا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس قسم کی تمام آیات حل ہو جاتی ہیں۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا

اور تم نہ زمین میں نہ آسمان میں خدا (تعالیٰ) کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکو گے اور خدا (تعالیٰ)

لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۳﴾ ع ۲/۹/۱۴

کے سوا نہ کوئی تمہارا دوست ہے نہ مددگار۔

تفسیر ۔ اس میں بتایا کہ اے کفار! خواہ تم زمینی تدبیریں کرو یا آسمانی۔ یعنی خواہ اسلام کے خلاف تم دنیوی تدابیر عمل میں لاؤ یا دعاؤں سے آسمانی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ دونوں صورتوں میں تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کو نہیں روک سکتے۔ کیونکہ زمینی سامان بھی اس کی مدد کے لئے تیار رہیں گے اور آسمانی مدد بھی اس کے لئے تیار رہے گی۔ ہاں الٹا تم تباہ ہو گے اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہیں کوئی دوست اور مددگار نہیں ملے گا۔

اس آیت میں زمینی اور آسمانی دونوں تدبیروں کو بروئے کار لانے کا اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر مومنوں کو بھی اشاعت اسلام کے لئے انہی دونوں تدبیروں کے استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ (الانعام: ۳۶) ۔ یعنی اے ہمارے رسول یا اے قرآن کے پڑھنے والے! اگر مخالفین کا اعراض کرنا تمہیں بری بات

معلوم ہوتی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ ان کی مخالفت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب ان کی اصلاح مشکل ہے تو اے انسان تُو کبھی اس وہم میں مبتلا نہ ہونا۔ یعنی دشمن کے انکار اور اس کی مخالفت کو کبھی ایسا نہ سمجھنا کہ اس کی اصلاح ناممکن ہوگئی ہے بلکہ اگر تمہیں طاقت ہو کہ تم زمین میں کوئی سرنگ لگاؤ یا تمہیں طاقت ہو کہ تم آسمان کے لئے کوئی سیڑھی تیار کرو اور ان کے لئے کوئی نشان لے آؤ تو ایسا کرو۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیزیں یہاں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی نہیں جو ممکن نہ ہوں۔ دنیا میں بھی انسان جب جنگوں میں کسی قلعہ کو فتح کرنا چاہتا ہے تو دو ذرائع ہی اختیار کرتا ہے۔ یعنی کبھی تو سرنگ لگا کر قلعہ کو اڑا دیتا اور اس کو فتح کر لیتا ہے اور کبھی سیڑھیوں سے اس کے اوپر چڑھتا اور اندر اتر جاتا ہے۔ گویا دنیا میں یا تو قلعوں کی دیواریں اڑائی جاتی ہیں یا دیواریں مغلوب کر لی جاتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں ناممکن نہیں۔ پس یہاں وہ ذرائع بتائے گئے ہیں جن کو دنیا ہمیشہ استعمال کرتی چلی آئی ہے اور یہی دو ذرائع فتوحات حاصل کرنے کے ہیں۔ یعنی یا تو سرنگ لگا کر یا دوسرے ذرائع سے دیواریں توڑ دی جاتی ہیں یا سیڑھیوں پر چڑھ کر قلعوں کو فتح کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روحانی طور پر بھی یہی دو ذرائع خدا تعالیٰ نے تمہاری کامیابی کے لئے مقرر کئے ہیں۔ یعنی جب تم سمجھو کہ دشمن کی مخالفت بہت بڑھ گئی ہے تو ایک طرف جس قدر دنیوی سامان ہیں سب ان کی ہدایت کے لئے استعمال کرو۔ اور دوسری طرف آسمان سے سیڑھی لگاؤ اور اس کے اوپر چڑھنا شروع کر دو۔ یہ سیڑھی کون سی ہو سکتی ہے معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سیڑھی دعا کی سیڑھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جس طرح دنیا کے قلعے فتح ہوتے ہیں اسی طرح تم روحانی قلعے فتح کرو۔ وہ دیواروں کو یا اڑا دیتے ہیں یا ان کو پھاند کر اندر داخل ہو جاتے ہیں اور یہی دو ذریعے ایسے ہیں جن پر عمل کر کے روحانی جنگ میں بھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی ایک طرف ان کو سمجھانے کے لئے پوری کوشش اور جدوجہد سے کام لیا جائے اور دوسری طرف ان کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص میں ذرہ بھر بھی سنجیدگی ہوگی اس کے کفر کی عمارت گرنی شروع ہو جائے گی۔

پھر فرماتا ہے وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ اے مومن تو مایوس نہ ہو۔ اگر خدا چاہے تو ان کافروں کو بھی ہدایت دے دے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ پس تو اس نکتہ کو بھولیو نہیں۔ کیونکہ جب انہیں ہدایت دینا خدا تعالیٰ کی طاقت میں ہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ مایوسی ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان کو اپنی تدابیر میں رخنے ہی رخنے نظر آتے ہوں۔ لیکن جب وہ یہ سمجھ لے کہ ایک کیا خدا تعالیٰ ساروں کو ہدایت دے سکتا ہے تو اس وقت وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ پس فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ اس نکتہ

سے غافل نہ رہو کہ تمہارے خدا میں بہت بڑی طاقت ہے۔اور وہ ایک کیا ساری دنیا کو ہدایت دے سکتا ہے۔

غرض چونکہ مومنوں کو کامیابی کا یہ طریق بتایا گیا تھا کہ جب دشمن کی مخالفت اپنی انتہاء کو پہنچ جائے تو تم بھی اپنی تدابیر کو انتہا تک پہنچا دو اور ان تدابیر کے دو حصے کرو۔ایک حصہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سرنگ لگاؤ اور تبلیغ کو اپنے کمال تک پہنچا دو۔اور دوسرا طریق یہ ہے کہ آسمان کی طرف سیڑھی لگاؤ۔یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور کثرت سے دعائیں کرو اور اس سے مدد مانگو۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کفار کو توجہ دلائی ہے کہ مومنوں کی ان کوششوں کے مقابلہ میں اگر تم بھی یہی طریق اختیار کرلو تو یاد رکھو تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔تم خواہ تمام دنیوی ذرائع اختیار کرلو اور خواہ دعاؤں اور گریہ زاری سے کام لو۔دونوں صورتوں میں تمہارے لئے ناکامی ہی مقدر ہے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اور ان کی قوم جیتیں گے اور ان کا دشمن جو جبر سے کام لیتا ہے وہ ہارے گا۔اور اس فیصلہ کو اب دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآىِٕهٖٓ اُولٰٓىِٕكَ يَىِٕسُوْا مِنْ

وہ لوگ جو اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں کا اور اس سے ملاقات ہونے کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو

رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾

میری رحمت سے مایوس ہو گئے اور وہی ہیں جن کو دردناک عذاب ملے گا۔

تفسیر۔فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نشانوں کے منکر ہوتے ہیں اور اس کی ملاقات کی امید نہیں رکھتے درحقیقت اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ میری رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں ضرور عذاب ملے گا اس لئے ہمیں موت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ موت نبی اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنی چاہیے تا کہ مرنے کے بعد کی باتیں نہ ہم ان سے سنیں اور نہ گھبراہٹ پیدا ہو۔چنانچہ وہ نبیوں اور ان کی جماعتوں پر حملہ شروع کر دیتے ہیں اور انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔اور چونکہ انہوں نے نبیوں اور ان کی جماعتوں پر دردناک مظالم کئے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ

پس اس کی (یعنی ابراہیمؑ کی) قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اس کو قتل کر دو۔ یا اس کو

فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ

جلا دو۔ (چنانچہ انہوں نے اس کو آگ میں ڈال دیا) مگر اللہ (تعالیٰ) نے اس کو آگ سے بچا لیا۔ اس میں یقیناً

یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۵﴾

مومن قوم کے لئے بڑے نشان ہیں۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب ابراہیمؑ سے اس زمانہ کے لوگوں نے یہ باتیں سنیں کہ بتوں کی پرستش ترک کر دو اور خدائے واحد کی عبادت کرو۔ تو انہوں نے ایک دوسرے کو آپ کے خلاف اکسانا شروع کر دیا اور کہا کہ آؤ اور اس کو قتل کر دو یا اس کو آگ میں ڈال کر جلا دو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آگ سے بچا لیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طریق کا ذکر کرتے ہوئے جس سے کام لے کر آپ کو بچا لیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ (الانبیاء: ۵) یعنی ہم نے اس وقت آگ سے کہا۔ کہ اے جسمانی آگ تیرے اندر ایک روحانی آگ داخل ہو رہی ہے۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ اس آگ کے مقابلہ میں سرد ہو جا۔ ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت کی آگ بھڑک رہی ہے اور میرے عشق کی آگ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح سورج کے مقابل پر شمعیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح میری محبت کی آگ کے مقابلہ میں تیری آگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پس ابراہیمؑ کے لئے تو سرد ہو جا۔ جس طرح انگارہ کے مقابلہ میں کسی اور گرم چیز کی گرمی کم محسوس ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ ایسی شدید ہے کہ دوسری تمام آگیں اس کے مقابلہ میں سرد پڑ جاتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ایک دفعہ الہام ہوا کہ

''آگ سے ہمیں مت ڈرا کہ آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔''

اس کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ہمارے دل میں عشق الٰہی کی آگ شعلہ زن ہے۔ اس آگ کے مقابلہ میں ظاہری آگ کی کیا حیثیت ہے۔ ایک گرم توا انسان کے ہاتھ کو تو جلا دیتا ہے مگر انگارے کو نہیں جلا سکتا۔ اسی طرح آگ اس شخص کو نہیں جلا سکتی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ بھڑک رہی ہو۔ چنانچہ اسی وقت بادل آیا اور برسا اور

وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی ۔اور یہ معجزہ دیکھ کر اس کی قوم کے بعض لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا ہو گیا اور اس کے لئے سلامتی کے سامان پیدا ہو گئے ۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ابتداء میں اس آیت کے یہ معنے کیا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے ان کی مخالفت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۰۳ء میں جب ایک شخص عبدالغفور نے جو اسلام سے مرتد ہو کر آریہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنا نام دھرم پال رکھ لیا تھا ''ترک اسلام'' نامی کتاب لکھی ۔تو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب لکھا۔ جو ''نورالدین'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب روزانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کو سنائی جاتی تھی ۔ جب دھرم پال کا یہ اعتراض آیا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ ٹھنڈی ہوئی تھی تو دوسروں کے لئے کیوں نہیں ہوتی ۔اور اس پر حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سنایا گیا کہ اس جگہ ''نار'' سے ظاہری آگ مراد نہیں بلکہ مخالفت کی آگ مراد ہے تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اس تاویل کی کیا ضرورت ہے ۔ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے ابراہیم کہا ہے اگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کس طرح ٹھنڈی ہوئی تو وہ مجھے آگ میں ڈال کر دیکھ لیں کہ آیا میں اس آگ میں سے سلامتی کے ساتھ نکل آتا ہوں یا نہیں ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی وجہ سے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ''نورالدین'' میں یہی جواب لکھا اور تحریر فرمایا کہ

''تم ہمارے امام کو آگ میں ڈال کر دیکھ لو۔ یقیناً خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اسے اس آگ سے اسی طرح محفوظ رکھے گا جس طرح اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو محفوظ رکھا تھا۔''

(نورالدین صفحہ ۴۶)

اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس جرح کی وجہ سے ہی میں نے جہاں کہیں قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر کی ہے میں نے یہ نہیں لکھا کہ خدا تعالیٰ نے مخالفت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا بلکہ یہی لکھا ہے کہ مخالفوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا لیکن وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور چونکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اسباب سے ہی کام لیا کرتا ہے ۔اس لئے ممکن ہے اس وقت بادل آ گیا ہو۔اور بارش ہوگئی ہو جس کی وجہ سے آگ بجھ گئی ہو۔ بہر حال ہمارا ایمان یہی ہے کہ دشمنوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے واقعہ میں آگ جلائی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے کہ جن کی وجہ سے ان کی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور آپ آگ سے محفوظ رہے۔

یہ مضمون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں اور ڈائریوں میں بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک دوست کا خط حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی آیا وہ فی الواقعہ آتشِ ہیزم تھی یا فتنہ وفساد کی آگ تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

''فتنہ وفساد کی آگ تو ہر نبی کے مقابل میں ہوتی ہے اور وہی ہمیشہ کوئی ایسا رنگ اختیار کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک معجزہ نما طاقت اپنے نبی کی تائید میں اس کے بالمقابل دکھاتا ہے۔ ظاہری آتش کا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرو کر دینا خدا تعالیٰ کے آگے کوئی مشکل امر نہیں اور ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان واقعات کی اب بہت تحقیقات کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہزاروں سالوں کی بات ہے۔ ہم خود اس زمانہ میں ایسے واقعات دیکھ رہے ہیں اور اپنے اوپر تجربہ کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ میں سیالکوٹ میں تھا تو ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ جس کمرہ کے اندر میں بیٹھا ہوا تھا اس میں بجلی آئی۔ سارا کمرہ دھوئیں کی طرح بھر گیا اور گندھک کی سی بُو آتی تھی۔ لیکن ہمیں کچھ ضرر نہ پہنچا۔ اسی وقت وہ بجلی ایک مندر میں گری جو کہ تیجا سنگھ کا مندر تھا اور اس میں ہندوؤں کی رسم کے مطابق طواف کے واسطے پیچ در پیچ اردگرد دیوار بنی ہوئی تھی اور وہ اندر بیٹھا ہوا تھا۔ بجلی ان تمام چکروں میں سے ہو کر اندر جا کر اس پر گری اور وہ جل کر کوئلہ کی طرح سیاہ ہوگیا دیکھو وہی بجلی کی آگ تھی جس نے اس کو جلا دیا۔ مگر ہم کو کچھ ضرر نہ دے سکی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہماری حفاظت کی۔ ایسا ہی سیالکوٹ کا ایک اَور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کو میں ایک مکان کی دوسری منزل پر سویا ہوا تھا اور اسی کمرہ میں میرے ساتھ پندرہ سولہ اور آدمی بھی تھے۔ رات کے وقت شہتیر میں ٹک ٹک کی آواز آئی۔ میں نے آدمیوں کو جگایا کہ شہتیر خوفناک معلوم ہوتا ہے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کوئی چوہا ہوگا۔ کچھ خوف کی بات نہیں اور یہ کہہ کر پھر سو گئے تھوڑی دیر کے بعد پھر ویسی ہی آواز سنی۔ تب میں نے ان کو دوبارہ جگایا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پھر تیسری بار شہتیر سے آواز آئی۔ تب میں نے ان کو سختی سے اٹھایا۔ اور سب کو مکان سے باہر نکالا اور جب سب نکل گئے تو خود بھی وہاں سے نکلا ابھی میں دوسرے زینہ پر تھا کہ وہ چھت نیچے گری اور دوسری چھت کو بھی ساتھ لے کر نیچے جا پڑی اور چارپائیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں اور ہم سب بچ گئے۔

یہ خدا تعالیٰ کی معجزہ نما حفاظت ہے جب تک کہ ہم وہاں سے نکل نہ آئے شہتیر گرنے سے محفوظ رہا۔ ایسا ہی ایک دفعہ ایک بچھو میرے بستر کے اندر لحاف کے ساتھ مرا ہوا پایا گیا اور دوسری دفعہ ایک بچھو لحاف کے اندر چلتا ہوا پکڑا گیا۔ مگر ہر دو بار اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے ضرر سے محفوظ رکھا۔ ایک دفعہ میرے دامن کو آگ لگ گئی تھی مجھے خبر بھی نہ ہوئی ایک اَور شخص نے دیکھا اور بتلایا اور اس آگ کو بجھا دیا۔ خدا تعالیٰ کے پاس کسی کے بچانے کی ایک راہ نہیں بلکہ بہت راہیں ہیں۔ آگ کی گرمی اور سوزش کے واسطے بھی کئی ایک اسباب ہیں اور بعض اسباب مخفی در مخفی ہیں جن کی لوگوں کو خبر نہیں اور خدا تعالیٰ نے وہ اسباب اب تک دنیا پر ظاہر نہیں کئے۔ جن سے اس کی سوزش کی تاثیر جاتی رہے۔ پس اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر آگ ٹھنڈی ہوگئی۔'' (الحکم ۱۰؍جون ۱۹۰۷ء)

اسی طرح ''براہین احمدیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''برہمو سماج والوں کی یہی بھاری غلطی ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں اور ربوبیتوں کو اپنے تنگ اور منقبض تجارب کے دائرہ میں گھسیڑنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جو امور ایک قانون مشخص مقرر کے نیچے آجائیں ان کا مفہوم محدود ہونے کو لازم پڑا ہوا ہے اور جو حکمتیں اور قدرتیں ذات غیر محدود میں پائی جاتی ہیں ان کا غیر محدود ہونا واجب ہے۔ کیا کوئی دانا کہہ سکتا ہے کہ اس ذات قادرِ مطلق کو اس اس طور پر بنانا یاد ہے اور اس سے زیادہ نہیں۔ کیا اس کی غیر متناہی قدرتیں انسانی قیاس کے پیمانہ سے وزن کی جاسکتی ہیں؟ یا اس کی قادرانہ اور غیر متناہی حکمتیں تصرف فی العالم سے کسی وقت عاجز ہوسکتی ہیں۔ بلاشبہ اس کا پُرزور ہاتھ ذرہ ذرہ پر قابض ہے۔ اور کسی مخلوق کا قیام اور بقا اپنی مستحکم پیدائش کے موجب سے نہیں بلکہ اسی کے سہارے اور آسرے سے ہے۔ اور اس کی ربانی طاقتوں کے آگے بے شمار میدان قدرتوں کے پڑے ہیں۔ نہ اندرونی طور پر کسی جگہ انتہا ہے اور نہ بیرونی طور پر کوئی کنارہ ہے۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل آگ کی تیزی فرو کرنے کے لئے خارج میں کوئی ایسے اسباب پیدا کرے جن سے اس آگ کی تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس آگ کی خاصیت احراق دور کرنے کے لئے اسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب پیدا کردے جن سے خاصیتِ احراق دور ہوجائے کیونکہ اس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ اور جب ہم اس کی حکمتوں اور قدرتوں کو غیر متناہی مان چکے تو ہم پر یہ

بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کو بھی مان لیں کہ اس کی تمام حکمتوں اور قدرتوں پر ہم کو علم حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے۔ سو ہم اس کی ناپیدا کنار حکمتوں اور قدرتوں کے لئے کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ اور جس چیز کی حدود ہمیں معلوم ہی نہیں اس کی پیمائش کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ ہم بنی آدم کی دنیا کا نہایت ہی تنگ اور چھوٹا سا دائرہ ہیں اور پھر اس دائرہ کا بھی پورا پورا ہمیں علم حاصل نہیں۔ پس اس صورت میں ہماری نہایت ہی کم ظرفی اور سفاہت ہے کہ ہم اس اقل قلیل پیمانہ سے خدا تعالیٰ کی غیر محدود حکمتوں اور قدرتوں کو ناپنے لگیں۔'' (براہین احمدیہ حصہ اول، روحانی خزائن جلد ۱ حاشیہ نمبر ۱۱ صفحہ ۴۸۲ تا ۴۸۸)

پھر یہی مضمون ''برکات الدعا'' میں بھی آپ نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

''اس جگہ ایک اور سرّ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ اولیاء سے جو خوارق کبھی اس قسم کے ظہور میں آتے ہیں کہ پانی ان کو ڈبو نہیں سکتا اور آگ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اس میں بھی دراصل یہی بھید ہے کہ حکیم مطلق جس کے بے انتہا اسرار پر انسان حاوی نہیں ہوسکتا اپنے دوستوں اور مقربوں کی توجہ کے وقت کبھی یہ کرشمۂ قدرت دکھلاتا ہے کہ وہ توجہ عالم میں تصرف کرتی ہے اور جن ایسے مخفی اسباب کے جمع ہونے سے مثلاً آگ کی حرارت اپنے اثر سے رک سکتی ہے خواہ وہ اسباب اجرام علوی کی تاثیریں ہوں یا خود مثلاً آگ کی کوئی مخفی خاصیت یا اپنے بدن کی ہی کوئی مخفی خاصیت یا ان تمام خاصیتوں کا مجموعہ ہو وہ اسباب اس توجہ اور اس دعا سے حرکت میں آتے ہیں تب ایک امر خارق عادت ظاہر ہوتا ہے مگر اس سے حقائقِ اشیاء کا اعتبار نہیں اٹھتا اور نہ علوم ضائع ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ تو علوم الٰہیہ میں سے خود ایک علم ہے اور یہ اپنے مقام پر ہے اور مثلاً آگ کا محرق بالخاصیت ہونا اپنے مقام پر بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ روحانی مواد ہیں جو آگ پر غالب آ کر اپنا اثر دکھاتے ہیں اور اپنے وقت اور محل سے خاص ہیں۔ اس دقیقہ کو دنیا کی عقل نہیں سمجھ سکتی کہ انسانِ کامل خدا تعالیٰ کی روح کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جب کبھی انسان کامل پر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اس جلوہ کا عین وقت ہوتا ہے تو اس وقت ہر ایک چیز اس سے ایسی ڈرتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ سے۔ اس وقت اس کو درندہ کے آگے ڈال دو۔ آگ میں ڈال دو وہ اس سے کچھ بھی نقصان نہیں اٹھائے گا۔ کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کی روح اس پر ہوتی ہے اور ہر یک چیز کا عہد ہے کہ اس سے ڈرے یہ معرفت کا ایک آخری بھید ہے جو بغیر صحبتِ کاملین سمجھ میں نہیں آسکتا۔ چونکہ یہ نہایت دقیق اور پھر نہایت درجہ نادر الوقوع

ہے اس لئے ہر ایک فہم اس فلاسفی سے آگاہ نہیں۔مگر یاد رکھو کہ ہر یک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سنتی ہے ۔ہر یک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرف ہے اور ہر یک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں ۔اس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر یک ذرہ کی جڑھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر یک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اس کی قدرتیں ہیں۔جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اس گروہ میں داخل ہے جو مَاقَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ کے مصداق ہیں۔اور چونکہ انسان کامل مظہرِ اتم تمام عالم کا ہوتا ہے اس لئے تمام عالم اس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے۔وہ روحانی عالم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالم اس کی تاریں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی سرّ ہے۔‘‘

(برکات الدعا، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۹ تا ۳۱ حاشیہ)

وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ

اس (یعنی ابراہیمؑ) نے کہا۔تم نے اللہ (تعالیٰ) کے سوا بتوں سے تعلق قائم کر چھوڑا ہے (اور تمہارا یہ فعل) صرف

بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ

ورلی زندگی میں دوسرے مشرکوں سے محبت بڑھانے کے لئے (ہے) پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض

بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّ مَاْوٰىكُمُ

کا انکار کریں گے اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت ڈالیں گے اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور جن کو تم مددگار سمجھتے ہو

النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۟ۙ ﴿۲۶﴾

ان میں سے کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔

تفسیر۔اس میں بتایا کہ باوجود اس کے کہ ابراہیمؑ کو اس کی قوم نے آگ میں ڈال دیا تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے معجزانہ رنگ میں نجات دی پھر بھی ابراہیمؑ توحید کا ایسا عاشق تھا کہ آگ سے نجات پاتے ہی اس نے اپنی قوم کو پھر سمجھانا شروع کر دیا اور کہا کہ تم نے تو بتوں کو اس لئے خدا بنا لیا ہے تا کہ اس دنیا میں وہ تمہارے درمیان محبت پیدا کرنے کا موجب ہوں۔یعنی ایک مرکزی نقطہ بن جائے۔اور تم سب ایک بت کے پجاری اپنے

آپ کو بھائی بھائی کہنے لگ جاؤ لیکن یہ بت اس دنیا تک ہی ہیں۔ اگلے جہان میں یہ تم کو کوئی فائدہ نہیں دیں گے بلکہ اگلے جہان میں پجاری بتوں کے تعلق سے اور بت پجاریوں کے تعلق سے انکار کرنے لگیں گے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت ڈالیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کافر آگ میں داخل کئے جائیں گے اور کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شرک کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں بلکہ صرف قوم کے لوگوں کو خوش کرنے اور ان کی تعریف حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن سچا دین ہمیشہ دلیل پر قائم ہوتا ہے اور سچے دین کے پیرو لوگوں کو خوش کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو مقدم رکھتے ہیں۔ گویا مشرک تو دنیا کو دین پر مقدم کرتا ہے لیکن مومن دین کو دنیا پر مقدم کرتا ہے۔ مشرک لوگوں سے ڈرتا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن مومن صرف خدا سے ڈرتا اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ وَّ یَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا میں بتایا کہ کفر کی دوستی ایسی ناپائیدار ہوتی ہے کہ دنیا میں بھی وہ لوگ جن کو خوش کرنے کے لئے خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کی جاتی ہے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اگلے جہان میں بھی یہ دوستیاں انسان کے کسی کام نہیں آسکتیں۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

اس (نصیحت) کے بعد لوط اس پر ایمان لے آئے اور (ابراہیمؑ نے) کہا۔ میں تو اپنے رب کی طرف ہجرت

الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ

کر کے جانے والا ہوں وہ یقیناً غالب (اور) بڑی حکمت والا ہے۔ اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب بخشے

جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی

اور اس کی ذرّیت کے ساتھ نبوت اور کتاب مخصوص کر دی اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی اس کا اجر بخشا اور

الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۸﴾

آخرت میں بھی وہ نیک بندوں میں شامل کیا جائے گا۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ نکل آنے کا معجزہ دیکھ کر جو لوگ آپ کی طرف

راغب ہوئے تھے ان میں سے ایک حضرت لوطؑ بھی تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی حاران کے بیٹے تھے۔(پیدائش باب ۱۲ آیت ۵) چنانچہ فرماتا ہے کہ اس نظارہ کو دیکھنے کے بعد لوطؑ ابراہیمؑ پر ایمان لے آیا اور پھر ابراہیمؑ نے لوگوں میں اپنی ہجرت کا اعلان کر دیا۔اور کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی خاطر اب اپنا وطن بھی چھوڑ رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرا خدا جو غالب ہے اور جس کے تمام کام حکمتوں پر مبنی ہیں مجھے بھی غلبہ عطا فرمائے گا اور میری اس ہجرت کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ بلکہ اس کے اعلیٰ نتائج عطا فرمائے گا۔

پھر فرماتا ہے۔جب ابراہیمؑ نے خدا کے لئے اپنے وطن اور عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا تو وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ۔ ہم نے اس کے اخلاص کو دیکھ کر اسے اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا عطا کیا۔اور اس کی ذریّت میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔

تاریخ سے ثابت ہے اور بائیبل بھی اس امر پر گواہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے غیر قوموں میں بھی نبی آتے رہے ہیں پس جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ کے صرف یہ معنے ہیں کہ ابراہیمؑ کی ذریت میں سے نبی آتے رہے اور ان کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ یہ معنے نہیں کہ دوسری قوموں میں نبی نہیں آئے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ(الفاطر:۱۵) یعنی دنیا کی کوئی قوم نہیں جس میں ہماری طرف سے کوئی نبی مبعوث نہ ہوا ہو۔اسی طرح فرماتا ہے وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ(الرعد:۷) دنیا کی ہر قوم کی طرف ہادی اور راہنما آتے رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو کسی زمانہ سے مخصوص نہیں کرتا۔پس اس آیت کے یہ معنے نہیں کئے جا سکتے کہ نبوت اور کتاب کو ان معنوں میں آپ کی ذریّت سے مخصوص کر دیا گیا کہ کسی غیر قوم میں نبی نہیں آئے گا۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیمؑ کے اخلاص کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اَلنَّبِيّ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کی خبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی اور جن کو ایک آتشی شریعت دی جانے والی تھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہوں۔اور چونکہ ان کے بعد کوئی نبوت تامہ مستقلہ نہیں آئے گی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظلّی اور بروزی نبوت آئے گی اس لئے قیامت تک آپ کے ذریعہ سے اب نبوت ابراہیم کے خاندان کے ساتھ چسپاں ہوگئی۔ مادی لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک مہرِ تاباں یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی لئے بغیر بارگاہ الٰہی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ آخرت میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑے درجات حاصل ہوں گے اور وہ منعم علیہ گروہ میں شامل کئے جائیں گے مگر اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ آخری زمانہ

میں بھی ابراہیمؑ کو لوگ بہت نیک قرار دیں گے۔ چنانچہ اس آخری زمانہ میں بھی جو امتیں قائم ہیں وہ ساری کی ساری حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتی ہیں۔یعنی مسلمان بھی۔ یہودی بھی۔عیسائی بھی۔

اسی طرح اس کے تیسرے معنے یہ ہیں کہ ساعتِ آخرت میں جو بروزِ ابراہیمؑ ظاہر ہوگا وہ بھی خدا کے نزدیک اپنے کام کا اہل ہوگا۔اوراس پر اعتراض کرنے والے غلطی کریں گے۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ٘ مَا

اور لوطؑ کو بھی (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بدی کرتے ہو جس کا

سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۹﴾ اَئِنَّكُمْ

ارتکاب دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔کیا تم (عورتوں کو چھوڑ کر) مردوں کے پاس آتے ہو۔

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِیْ

اور ڈاکے مارتے ہو۔اور اپنی مجالس میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہو۔اس پر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا

نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ

کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر تُو سچے لوگوں میں سے ہے۔تو اللہ (تعالیٰ) کا عذاب

قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۰﴾

ہم پر نازل کردے۔اس پر لوطؑ نے کہا۔اے میرے رب!

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۳۱﴾ ع

مفسد قوم کے خلاف میری مدد کر۔

تفسیر۔فرماتا ہے۔ہم نے لوطؑ کو بھی رسول بنا کر بھیجا اوراس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک خاص بدی میں مبتلا ہو جو تم سے پہلے کسی اَور قوم میں نہیں پائی گئی۔کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے

ڈالتے ہو۔اور اپنی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کرتے ہو اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔

تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آجکل یورپ اور امریکہ میں بے حیائی پائی جاتی ہے اور پبلک میں عورتوں کو چمٹانا اور انہیں پیار کرنا یا پارکوں میں زنا کاری کرنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔اسی طرح اس زمانہ میں بھی تمدن بہت بڑھ گیا تھا۔اور وہ مجالس میں ایک دوسرے کے سامنے اس قسم کی فواحش کا دلیری سے ارتکاب کرلیا کرتے تھے اور کوئی شخص برا نہیں مناتا تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اس نصیحت کے باوجود اپنی حرکات سے باز نہ آئی بلکہ اس نے لوطؑ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشان لاؤ اور ہم پر عذاب نازل کرو۔آخر لوطؑ نے تنگ آکر اپنے رب سے دعا کی کہ خدایا مجھے مفسد قوم کے خلاف مدد دے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰیۙ قَالُوْٓا اِنَّا

اور جب ہمارے رسول ابراہیمؑ کے پاس بشارت لائے۔تو انہوں نے کہا۔ہم اس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔

مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا

کیونکہ اس کے باشندے ظالم ہیں۔(ابراہیم نے جواب میں) کہا کہ اس (بستی) میں تو لوطؑ بھی رہتا ہے۔

ظٰلِمِيْنَۚۖ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًاؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ

انہوں نے کہا ہم اس (بستی) میں رہنے والوں کو خوب جانتے ہیں۔ہم اس (یعنی لوطؑ) کو اور اس کے گھر والوں کو

فِيْهَاۗ ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

سوائے اس کی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہوجائے گی نجات دیں گے۔

تفسیر۔فرمایا جب ہمارے پیغامبر (یعنی علاقہ کے بعض ملہم جن کو خدا تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے اور ان کا رہبر بننے کے لئے بھجوایا تھا) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لائے۔تو انہوں نے کہا کہ ہم اس بستی یعنی لوطؑ کی بستی کو ہلاک کرنے کے لئے بھجوائے گئے ہیں۔

رُسُلُنَا سے مفسرین نے فرشتے مراد لئے ہیں لیکن میرے نزدیک اس جگہ رسولوں سے اس علاقہ کے بعض

اولیاء مراد ہیں جو خدا تعالیٰ سے وحی پا کر پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور پھر حضرت لوط علیہ السلام کو عذاب کی خبر دینے کے لئے چلے گئے۔ ان رُسُل کے انسان ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب یہ لوگ آئے تو آپ فوراً اپنے گھر تشریف لے گئے اور ان کے کھانے کے لئے ایک بچھڑا ذبح کر دیا (سورۃ ہود آیت ۷۰) اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھتے کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ ان کے لئے کھانے کا کیوں انتظام فرماتے۔ پھر جب انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال گذرا کہ مہمان نوازی میں کوئی سقم نہ رہ گیا ہو جس کی وجہ سے یہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو انہوں نے کہا کہ لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ۔ یعنی آپ تسلی رکھیں۔ آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم اس وقت ایک عذاب کی خبر دینے کے لئے جا رہے ہیں اس لئے کھانا کھانے سے معذور ہیں۔ ان کا یہ جواب بھی بتاتا ہے کہ وہ فرشتے نہیں تھے ورنہ وہ یہ جواب دے سکتے تھے کہ ہم تو فرشتے ہیں اور ہم نے کبھی کھانا کھایا ہی نہیں اس لئے آپ کا کھانا بھی ہم نہیں کھا سکتے۔

پھر وہ لوگ جب حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ خدا کے فرشتے آ گئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (الحجر: ۶۳) یعنی آپ لوگ تو اس علاقہ میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ گویا ان کا ذہن بھی فرشتوں کی طرف نہیں گیا بلکہ انہوں نے بھی ان کو انسان ہی سمجھا۔ پھر ان رُسُل کے انسان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۶) یعنی تُو انہیں کہہ کہ اگر زمین پر فرشتے بس رہے ہوتے جو زمین پر اطمینان سے چلتے پھرتے تو اس صورت میں ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو ہی رسول بنا کر اتارتے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے رسول ہو کر صرف نیک لوگوں کے لئے آتے ہیں۔ بدکاروں کے لئے نہیں آتے۔ مگر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ان فرشتوں کو سدوم کے تمام لوگوں نے دیکھا۔ اور ان کے آنے پر حضرت لوطؑ کو لوگوں نے برا بھلا کہا۔ پس ان کا ایسے لوگوں کے سامنے جسمانی رنگ میں ظاہر ہونا جن پر عذاب نازل ہونے والا تھا اس آیت کے خلاف ہے۔ پس اس جگہ رسل سے مراد ارد گرد کے علاقہ کے بعض ملہم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اس لئے بھیجا کہ وہ عذاب کے وقت اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ پائیں اور حضرت لوطؑ کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیں۔

بائیبل جو ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے اس نے ان رسل کو کبھی تو انسان قرار دیا ہے اور کبھی

فرشتے۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۸ آیت ۱، ۲ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے۔

’’وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں۔‘‘

اسی طرح پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۶ میں لکھا ہے۔

’’تب وہ مرد وہاں سے اٹھے اور انہوں نے سدوم کا رخ کیا۔‘‘

مگر پیدائش باب ۱۹ آیت ۱ میں لکھا ہے۔

’’وہ دونوں فرشتے شام کو سدوم میں آئے اور لوط سدوم کے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔‘‘

گویا بائیبل کبھی تو انہیں انسان قرار دیتی ہے اور کبھی فرشتے اور کبھی تین مرد قرار دیتی ہے اور کبھی دو فرشتے۔ مگر فرشتہ کہنے کے ساتھ ہی بائیبل یہ بھی کہتی ہے کہ حضرت لوطؑ نے

’’ان کے لئے ضیافت تیار کی اور بے خمیری روٹی پکائی اور انہوں نے کھایا۔‘‘

(پیدائش باب ۱۹ آیت ۳)

حالانکہ اگر وہ فرشتے تھے تو ان کے روٹی کھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ پس یہ رسل فرشتے نہیں تھے بلکہ انسانوں میں سے ہی بعض نیک لوگ تھے جو ان کی طرف بھجوائے گئے تھے۔

یہ سوال کہ وہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کیوں آئے اور کیوں نہ سیدھے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس چلے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے تھے اور اس لحاظ سے وہ ایک تابع نبی کی حیثیت رکھتے تھے جس طرح حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ بھی تابع نبی تھے یا حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے تابع تھے گو ان میں سے امتی نبی کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں نبوت براہِ راست ملا کرتی تھی۔ کسی سابق نبی کے فیض سے نبوت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ پس چونکہ حضرت لوط علیہ السلام نبوت سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے اور آپ کے ساتھ ہی ہجرت کر کے وہ شام میں آئے تھے اس لئے ان کی قوم کی تباہی کی خبر بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہی دی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کی خبر سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خوشخبری بھی پہنچا دی جس کا ذکر وَ لَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی میں کیا گیا ہے۔ یہ بشارت حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی خبر تھی جس کا ذکر سورۃ ہود آیت ۷۲، سورۃ الحجر آیت ۵۴ اور سورۃ الذاریات آیت ۲۹ میں کیا گیا ہے۔ علامہ ابوحیانؒ نے بھی بُشْرٰی سے

حضرت اسحٰق علیہ السلام اور پھر ان کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت کی خبر مراد لی ہے (بحر محیط جلد ۷ ص ۱۵۰) گویا خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک نیک نسل کی پیدائش کی خوشخبری دی اور پھر قومِ لوطؑ کی ہلاکت کی خبر دی تا کہ آپ کا صدمہ کم ہو جائے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر یہ رسول انسان تھے اور الہام کے ذریعہ سے خبر پا کر لوطؑ کو بتانے آئے تھے تو خدا تعالیٰ نے براہ راست حضرت لوطؑ پر کیوں نہ الہام نازل کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ بائیبل سے ظاہر ہے حضرت لوطؑ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اُور سے جو عراق کے علاقہ کا ایک قصبہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی ہجرت کر کے کنعان یعنی فسلطین کی طرف چلے آئے تھے یہاں پہنچ کر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو کر سدوم نامی بستی میں رہنے لگے۔ (پیدائش باب ۱۲ آیت ۴، ۵)

اور طالمود جو یہود کی روایات اور تاریخ کی کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ سدوم اور عمورہ کے لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ سدوم) اسی کی طرف قرآن کریم نے بھی وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ اور جو قوم ہمسائیوں کو اس طرح دکھ دینے کی عادی ہو لازماً وہ اپنے ہمسائیوں سے خائف بھی رہے گی کہ شاید وہ کسی وقت اسے نقصان پہنچا دیں۔ اور سدوم والوں سے ان کے ہمسائیوں کی عملاً لڑائی بھی رہتی تھی۔ بلکہ بائیبل بتاتی ہے کہ ایک دفعہ سدوم اور عمورہ کے بادشاہوں پر اردگرد کے بادشاہوں نے مل کر حملہ کر دیا اور وہ سدوم اور عمورہ کا سب مال اور وہاں کا سب اناج لے کر چلے گئے۔ بلکہ لکھا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کو بھی قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے تین سو اٹھارہ بہادروں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور وہ حضرت لوطؑ کو اور سدوم اور عمورہ کے باقی سب مردوں اور عورتوں کو جنہیں وہ پکڑ کر لے گئے تھے چھڑا کر لے آئے اور مال بھی انہوں نے واپس لے لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مہم سے کامیاب واپس آئے تو سدوم کے بادشاہ نے آپ کا استقبال کیا اور ملک صدق جو سالم کا بادشاہ تھا اس نے بھی آپ کی دعوت کی اور سدوم کے بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ مجھے صرف آدمی دے دیئے جائیں۔ اور مال خود رکھ لیں مگر حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں جوتی کا ایک تسمہ بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا اور سب چیزیں آپ نے انہیں دے دیں۔ (پیدائش باب ۱۴)

پس چونکہ حضرت لوط علیہ السلام اس علاقہ سے پوری طرح واقف نہیں تھے بلکہ اس ملک میں سدوم والوں کے دشمن بھی موجود تھے۔ اگر براہ راست ان پر الہام ہوتا کہ یہاں سے نکل جاؤ تو وہ گھبراتے کہ جاؤں کہاں۔

سو اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لئے یہ تدبیر کی کہ اردگرد کے بعض نیک لوگوں کو الہام کیا کہ لوطؑ کے پاس جاؤ اور ان کو بتادو کہ ان کی قوم پر عذاب آنے والا ہے اور انہیں حفاظت کے ساتھ کسی محفوظ مقام تک پہنچادو۔ کیونکہ وہ اس علاقہ کے واقف نہیں۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے کہ نبی کو تو پتہ نہ لگا ہو کہ میری قوم ہلاک ہونے والی ہے لیکن دوسروں کو علم ہو گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال قلّت تدبّر کا نتیجہ ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کو پہلے سے عذاب کی خبر دے چکے تھے۔ چنانچہ سورۂ حجر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ رسول آپ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (الحجر: ۶۴) ہم آپ کے پاس اس عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں جس کے بارہ میں یہ لوگ شک کر رہے ہیں۔ گویا وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عذاب کی خبر حضرت لوط علیہ السلام پہلے ہی دے چکے تھے۔ مگر چونکہ یہ عذاب اب بالکل قریب آپہنچا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس علاقہ کے چند نیک لوگوں کو اس لئے آپ کے پاس بھیجا کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام پر پہنچادیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ماتحت یہ انتظام نہ فرماتا تو حضرت لوط علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوتی کہ اب جب اس شہر پر عذاب آنے والا ہے تو میں کہاں جاؤں۔ جبکہ باقی علاقہ میں میری واقفیت بھی کوئی نہیں۔ اور پھر اردگرد سب سدوم کے دشمن آباد ہیں۔

اسلام میں بھی اس قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بعض اہم معاملات کی دوسرے مسلمانوں کو خبر دی گئی۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ ایک صحابی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رؤیا کے ذریعہ سے اذان سکھائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی رؤیا پر انحصار کرتے ہوئے مسلمانوں میں اذان کا رواج ڈالا۔ بعد میں قرآنی وحی نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے یہی اذان سکھائی تھی۔ مگر بیس دن تک میں خاموش رہا۔ اس خیال سے کہ ایک اَور شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بیان کر چکا ہے (سنن ابی دائود جزو اول مطبوعہ مصر ص ۸۰، ۸۱ وسنن ابن ماجہ جزو اول ص ۲۴۰، ۲۴۱ مطبوعہ مصر) اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ يَرٰى اَوْ يُرٰى لَهٗ (السنة لابن ابی عاصم الجزء الاول صفحہ ۲۱۴)۔ یعنی مومن کو کبھی تو براہ راست خبر دی جاتی ہے اور کبھی دوسروں کی معرفت اسے خبر پہنچائی جاتی ہے۔ پس حضرت لوط علیہ السلام کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ عذاب کے بالکل قریب آجانے کی خبر پہنچانا کوئی قابل اعتراض امر نہیں۔

اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے یہ مراد نہیں کہ ان کو کوئی خاص طاقت حاصل تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے الہام کے ماتحت ہم اس بستی کی ہلاکت کی خبر دینے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ کیونکہ اس بستی کے لوگ ظالم ہیں۔ اگر بالفرض ان کو فرشتے بھی سمجھ لیا جائے جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں۔ تب بھی فرشتے خود عذاب نہیں دیا کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی خبر دیا کرتے ہیں۔ پس اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے عذاب کی خبر دینا مراد ہے نہ کہ خود عذاب نازل کرنا۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خبر سن کر کہا کہ اس بستی میں تو لوط ؑ بھی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا برگزیدہ ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہم اس بستی میں رہنے والوں کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اس کو اور اس کے اہل کو سوائے اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے نجات دیں گے۔ یعنی انہیں کسی محفوظ مقام میں پہنچا دیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں کو حضرت لوط ؑ کی آئندہ رہائش کے انتظام کے لئے ہی بھیجا گیا تھا۔

وَ لَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ

اور جب ہمارے رسول لوطؑ کے پاس آئے تو ان کی وجہ سے اسے دکھ پہنچا۔ اور نیز ان کی وجہ سے

ذَرْعًا وَّ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ لَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ

اس کا دل تنگ ہو گیا اور (اس کی اس حالت کو دیکھ کر) ان پیغام لانے والوں نے کہا کہ کسی (آئندہ) بات کا خوف

اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۳۴ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ

نہ کر۔ اور نہ کسی گزشتہ واقعہ پر افسوس کر۔ ہم تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو سوائے تیری بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں

عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا

میں شامل ہو جائے گی نجات دینے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اس بستی پر ان کی نافرمانی کی وجہ

يَفْسُقُوْنَ ۳۵ وَ لَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ

سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔ اور ہم نے اس بستی کے (واقعہ کے) ذریعہ سے ایک کھلی عبرت کا

يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

سامان عقل والے لوگوں کے لئے پیچھے چھوڑا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے۔ جب وہ لوگ وہاں سے چل کر ہمارے رسول حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کو دیکھ کر اسے بڑی تکلیف ہوئی اور اس کا دل تنگ ہوگیا کیونکہ اس کی قوم کے لوگوں نے غیر قوموں کے آدمیوں کی مہمان نوازی سے اسے منع کیا ہوا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت لوطؑ کے مخالفین نے ان سے کہا اَوَ لَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ (الحجر:۷۱) کہ اے لوطؑ! کیا ہم نے تجھے غیر معلوم مسافروں کو گھر میں لانے سے نہیں روکا ہوا؟ اس زمانہ میں شہر چھوٹے چھوٹے اور دور دور ہوتے تھے۔ اور غیر معلوم مسافروں کے لانے سے ڈر ہوتا تھا کہ کہیں ڈاکہ نہ پڑے اور چونکہ سدوم کے باشندے خود بھی ڈاکو تھے وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتے تھے اور غیر معروف مسافروں کو شہر میں نہیں آنے دیتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ رات کو وہ شہر کے دروازے کھول دیں اور دشمن غفلت کی حالت میں آکر حملہ کردے۔ حضرت لوطؑ چونکہ مہمان نواز تھے وہ مسافروں کو لے آتے اور سمجھتے کہ اگر وہ باہر رہیں گے تو لوٹے جائیں گے۔ اور یہ لوگ ان کو اس سے منع کیا کرتے تھے۔ اس دفعہ جب پھر حضرت لوطؑ ان لوگوں کو ساتھ لے آئے تو یہ لوگ غصہ سے بھر گئے اور حضرت لوطؑ کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ حضرت لوطؑ کو بہت دکھ پہنچا۔ اور آپ ڈرے کہ کہیں یہ لوگ مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مگر انہوں نے کہا کہ ڈر نہیں اور غم نہ کر۔ یعنی اب تجھے کسی آئندہ خطرہ سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ ان کی تباہی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ مگر چونکہ قوم کی تباہی کی خبر سے حضرت لوط علیہ السلام کا غمگین ہونا ایک طبعی امر تھا۔ اس لئے انہوں نے ساتھ ہی آپ کو تسلی دی کہ لَا تَحۡزَنۡ آپ ان کی تباہی پر غم بھی نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکی کے بیج کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ وہ آپ کو اور آپ کے تمام اہل کو سوائے آپ کی بیوی کے اس عذاب سے محفوظ رکھے گا اور اس طرح ان کے ذریعہ پھر دنیا میں نیکی اور تقویٰ کی کھیتی سرسبز ہونی شروع ہوجائے گی۔

اِنَّا مُنَجُّوۡكَ میں انہوں نے اس نجات کو اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اسی غرض کے لئے بھجوائے گئے تھے کہ لوطؑ اور ان کے اہل کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔

باقی رہا ان رسولوں کا اس تباہی کو اپنی طرف منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤى اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریم

سے کہا کہ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم:۲۰) یعنی میں تیرے رب کا ایک پیغامبر ہوں تا کہ میں تجھے ایک پاک لڑکا دوں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ لڑکا خدا دیا کرتا ہے۔ فرشتہ نہیں دیا کرتا۔ پس جس طرح لِاَهَبَ لَكِ سے مراد صرف لڑکے کی پیدائش کی خبر دینا ہے نہ کہ لڑکا دینا۔ اسی طرح اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اور اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ۔ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ یا اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ ان رسولوں نے عذاب نازل کرنا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی خبر کے ماتحت یہ اطلاع دیتے ہیں کہ لوط ؑ اور اس کے اکثر اہل بیت بچ جائیں گے۔ اور مخالف تباہ ہو جائیں گے۔ ورنہ عذاب تو خدا تعالیٰ نے ہی نازل کیا تھا۔ جیسے سورۂ ہود میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ۔ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ (ھود: ۸۳و۸۴) یعنی جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس بستی کے اوپر والے حصہ کو نیچے والا حصہ بنا دیا۔ اور اس پر سوکھی مٹی کے بنے ہوئے پتھروں کی یکے بعد دیگرے بارش برسائی جو تیرے رب کی تقدیر میں ان کے لئے ہی مقدر اور نامزد کئے گئے تھے۔

اس جگہ بھی وَ لَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ہم نے اس ذریعہ سے عقل رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک بڑی عبرت کا سامان پیچھے چھوڑا۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ عذاب خدا تعالیٰ نے اتارا تھا۔ ان رسولوں نے نہیں اتارا تھا۔ وہ صرف خبر دینے آئے تھے۔ اگر ان رسولوں نے عذاب اتارا ہوتا تو خدا تعالیٰ یہ کیوں کہتا کہ ہم نے اس عذاب کے ذریعہ سے ایک کھلا نشان پیچھے چھوڑ دیا کیونکہ اگر رسولوں نے عذاب اتارا تھا تو نشان انہوں نے چھوڑا نہ کہ خدا تعالیٰ نے۔ پس اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ یا اسی قسم کی بعض دوسری آیات سے یہ مراد نہیں کہ وہ عذاب ان رسولوں نے نازل کیا تھا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اس بستی کے باشندوں پر خدائی عذاب کے نازل ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ ورنہ عذاب تو خدا تعالیٰ نے ہی نازل کرنا تھا۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔(جب وہ آیا) تو اس نے کہا۔اے میری قوم!

ارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۷﴾

اللہ کی عبادت کرو اور اخروی زندگی کے وقت کو یاد رکھو اور ایسے مفسدانہ کام نہ کرو کہ ملک میں تمہارے کاموں کی وجہ

فَکَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ

سے فساد پھیل جائے۔اس پر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا اور ایک ہلا دینے والے عذاب نے ان کو پکڑ لیا۔جس کے نتیجہ

جٰثِمِیْنَ ﴿۳۸﴾

میں وہ اپنے گھروں میں (زمین سے) چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

تفسیر ۔فرمایا۔ہم نے لوطؑ کے بعد مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا تھا اور انہوں نے بھی اپنی قوم کو یہی کہا تھا کہ ایک خدا کی پرستش کرو۔اور یوم آخرت پر ایمان رکھو۔اور دنیا میں فساد مت پیدا کرو۔

وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کی خوگر تھی۔چونکہ مدین قوم کا مرکزی شہر جس کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے عرب۔شام اور مصر کے راستوں پر واقع تھا اور وہاں سے قافلے گذرا کرتے تھے اس لئے یہ لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے۔اس قیاس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ مدین قوم کے قبضہ میں قریب ہی ایک بڑا بھاری جنگل تھا۔جس میں رہنے والوں کا قرآن کریم نے ''اصحاب الایکہ'' نام رکھا ہے۔اور یہ لوگ بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبین میں ہی شامل تھے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنگل میں ڈاکے ڈالنے زیادہ آسان ہوتے ہیں کیونکہ انسان اس میں بڑی آسانی سے چھپ سکتا ہے۔پس یہ لوگ ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کے ارتکاب سے بھی فساد پیدا کر رہے تھے اور بیع و شرا کرتے وقت تول اور ماپ میں بھی کمی بیشی کر کے فساد پیدا کر رہے تھے۔حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں بہت سمجھایا مگر ان کی قوم نے ان نصائح کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہوں نے آپ کو جھٹلا دیا۔آخر ان پر ایک شدید زلزلہ آیا۔جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں دوزانو بیٹھے ہوئے رہ گئے۔حضرت شعیبؑ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے

گذرے ہیں اس لئے ان کے ذکر سے خدا تعالیٰ نے نوحؑ سے لے کر موسیٰؑ تک نبیوں کے آنے اور ان کے ماننے والوں کے امتحان میں پڑنے کا ذکر فرما دیا۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ قف وَ

اور عاد کو بھی اور ثمود کو بھی (ہماری طرف سے ایک ہلا دینے والے عذاب نے پکڑ لیا) اور (اے اہل مکہ) تم پر ان کی

زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ

بستیوں کا حال ظاہر ہے۔ اور شیطان نے ان کو ان کے عمل اچھے کر کے دکھائے۔ اور اس نے (یعنی شیطان نے)

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ﴿۳۹﴾

ان کو (اللہ تعالیٰ) کے راستہ سے روکا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتے تھے۔

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ عاد اور ثمود میں بھی بڑے بڑے بھاری نشانات ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قومیں اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کی معلم اور استاد تھیں اور فنِ تعمیر میں بھی بڑی بھاری دسترس رکھتی تھیں۔ چنانچہ قوم عاد کے نبی حضرت ہودؑ نے انہیں نصیحت فرمائی تھی کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء: ۱۲۹، ۱۳۰) یعنی تم نے یہ کیا طریق اختیار کیا ہوا ہے کہ تم ہر اونچی جگہ پر نشان کھڑے کرتے ہو۔ اور بڑے بڑے محلّات تعمیر کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس طرح تمہارا نام ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا۔ میں نے خود عدن میں بعض پرانی عمارتیں دیکھی ہیں جو عادِ اولیٰ کے آثار میں سے ہیں اور وہاں کے مقامی لوگوں میں یہ روایتیں پائی جاتی ہیں کہ یہ عاد کی عمارتیں ہیں۔

اسی طرح ثمود جو عاد ہی کی ایک شاخ تھے ان کے متعلق بھی قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ میدانوں میں بڑے بڑے قلعے بناتے اور پہاڑوں کو کھود کھود کر رہائشی مکانات تیار کرتے تھے (سورۂ اعراف آیت ۷۵) مگر جب انہوں نے خدا تعالیٰ کے نبیوں کا مقابلہ کیا اور اپنے ناشائستہ افعال کو اچھا قرار دیا۔ تو خدا تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا اور آج سوائے ان کے ٹوٹے پھوٹے آثار کے جو عرب میں دکھائی دیتے ہیں ان کی طاقت اور شوکت کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔

زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ سے ظاہر ہے کہ ان کے اعمال تو شیطانی تھے مگر تواتر اور تسلسل سے برے اعمال بجالانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہیں اپنا روحانی کوڑھ بھی خوبصورت نظر آنے لگ گیا۔ گویا ان کی آنکھیں بھی ماری گئیں اور احساسات بھی کند ہو گئے۔ نہ اپنے اعمال کی شناعت انہیں دکھائی دی اور نہ ان کی مضرتوں کا انہیں احساس رہا۔

كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ سے ظاہر ہے کہ ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ ان کی ان حرکات کا نتیجہ اچھا نہیں مگر طاقت نے ان کو مغرور کر دیا۔ اور آخر اس کا جو نتیجہ نکلا وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چند ٹوٹے پھوٹے قلعے اور مکینوں سے خالی عمارات دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کر رہی ہیں۔

اسی طرح كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ شیطان کے گمراہ کرنے سے انسان معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اس کے لئے حقیقت معلوم کرنے کا راستہ خدا تعالیٰ نے کھلا رکھا ہے جیسے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد: ۹ تا ۱۱) یعنی کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں پیدا کیں اور کیا ہم نے اسے زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور کیا ہم نے اسے ہدایت اور گمراہی کے دونوں راستے نہیں بتا دیئے؟ یعنی جبکہ ہم نے اپنے انبیاء کے ذریعے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمراہی کیا ہے تو اس کے بعد بھی اگر وہ گمراہی کی طرف جاتا ہے تو اس کا اپنا قصور ہے ورنہ خدا تعالیٰ نے اس کو اندرونی اور بیرونی دونوں آنکھیں دی ہوئی ہیں اور اگر آنکھوں سے کوئی چیز نظر نہ آئے تو وہ زبان اور ہونٹوں کو استعمال کر کے علماء سے اپنے شبہات کو دور کرا سکتا ہے لیکن اگر ان تمام ذرائع کی موجودگی میں بھی کوئی شخص ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتا تو وہ اپنی تباہی کا آپ ذمہ وار ہوتا ہے۔

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ ۟ قف وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى

اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ہم نے عذاب میں گرفتار کیا)۔ اور موسیٰؑ ان کے پاس کھلے کھلے نشان لے

بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ۝۴۰

کر آئے تھے۔ پھر بھی (وہ نہ مانے بلکہ) انہوں نے تکبر سے کام لیا اور (ہمارے عذاب سے) بھاگ کر بچ نہ سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ

پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لیا۔ سو ان میں سے کوئی تو ایسا تھا کہ ہم نے اس پر

حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ

پتھروں کا مینہ برسایا۔ اور کوئی ایسا تھا کہ اس کو کسی اور سخت عذاب نے پکڑ لیا۔ اور کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اس کو

مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا

ملک میں ذلیل کر دیا۔ اور کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اسے غرق کر دیا۔ اور اللہ (تعالیٰ) ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا۔

كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۱﴾

بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

تفسیر ۔ قارون اور فرعون اور ہامان عاد کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ ثمود فرعونِ موسیٰؑ کے زمانہ میں مدین کے علاقہ میں بس گئے تھے اور ثمود عاد کی ہی ایک شاخ تھے اس لئے عاد اور ثمود کے ذکر کے ساتھ ہامان اور فرعون کا بھی ذکر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین میں ہی آئے تھے۔ کیونکہ وہاں عرب آباد تھے۔ اسی طرح قارون کا بھی ذکر کر دیا جو موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا۔ فرماتا ہے ان سب کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نشانات لے کر آئے لیکن انہوں نے زمین میں بڑے تکبر سے کام لیا۔ اور موسیٰؑ کا انکار کر دیا۔ مگر جب ہمارا عذاب آیا تو ان کا تمام تکبر دھرے کا دھرا رہ گیا اور وہ ہمارے عذاب سے نہ بچ سکے۔ ان قوموں میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ چنانچہ بعض پر تو ہم نے پتھروں کا مینہ برسایا جیسے قومِ لوطؑ کے متعلق فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ (القمر: ۳۵) یعنی ہم نے ان کے تباہ کرنے کے لئے کنکروں سے بھری ہوئی ہوا چلائی جس نے آلِ لوطؑ کے سوا سب کو تباہ کر دیا۔ اسی طرح سورۃ ہود میں فرماتا ہے۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (آیت ۸۳) ہم نے ان پر سوکھی مٹی کے بنے ہوئے پتھروں کی یکے بعد دیگرے بارش برسائی۔ یعنی شدید زلزلہ سے ان کی زمین باقی زمین سے کٹ کر اوپر اڑ گئی اور پھر گر گئی اور وہ سب کے سب اس کے نیچے دفن ہو گئے۔

پھر فرماتا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ کوئی قوم ایسی تھی جو زلزلہ سے ہلاک ہوئی۔ جیسے قوم ثمود کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ۔ (القمر: ۳۲) یعنی ہم نے ان پر ایک ہی دفعہ عذاب نازل کیا اور وہ ایک باڑ بنانے والے کے درختوں سے گرائے ہوئے پتوں کے چُورے یا

روندے ہوئے بھس کی طرح ہو گئے۔اسی طرح سورۃ ہود میں فرماتا ہے۔ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ (آیت ۶۸) یعنی جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا انہیں صیحہ نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے ہوئے رہ گئے۔یعنی زلزلہ کی وجہ سے ان کے مکانوں کی چھتیں ان کے اوپر آ گریں اور وہ اسی حالت میں مر گئے۔

پھر فرماتا ہے وَمِنْھُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ بعض ایسے تھے کہ ان کو ہم نے ملک میں ذلیل کر دیا جیسے قارون کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ (القصص: ۸۲) ہم نے اسے اور اس کے قبیلہ کو مکروحات میں مبتلا کر دیا اور وہ ذلیل ہو کر رہ گئے۔

وَمِنْھُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا۔اور بعض ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے پانی میں غرق کر دیا۔جیسے نوحؑ کی قوم بھی پانی میں غرق کی گئی اور فرعون بھی سمندر میں غرق ہوا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ میں بتایا کہ ان میں سے کوئی قوم بھی ظلماً ہلاک نہیں ہوئی بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ ان سب قوموں نے اپنی تباہی کے خود سامان پیدا کئے تھے خدا تعالیٰ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا تھا۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ

ان لوگوں کا حال جنہوں نے اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر اور دوست بنا لئے مکڑی کا سا حال ہے۔

الْعَنْكَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ

جس نے (اپنے لئے) ایک گھر تو بنایا لیکن گھروں میں سے سب سے کمزور گھر مکڑی

لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ

کا ہی ہوتا ہے۔کاش! کہ یہ لوگ جانتے۔اللہ (تعالیٰ) ہر اس چیز کو جس کو یہ لوگ

مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ

اس کے سوا پکارتے ہیں جانتا ہے۔اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

الْحَكِيْمُ ﴿۴۳﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا

اور یہ مثالیں ہیں۔ جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں۔لیکن عالموں کے سوا کوئی

يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

ان کو اپنے پلّے نہیں باندھتا۔

تفسیر ۔گذشتہ قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا ذکر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت کے اسباب کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان کی تباہی اس لئے ہوئی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے لئے بعض اور پناہ گاہیں تجویز کر لی تھیں۔ کسی نے کہا ہامان بڑا معزز ہے لاکھوں افراد پر اس کی حکومت ہے اگر میں نے ہامان کو خوش کر لیا تو سمجھو کہ میں کامیاب ہو گیا۔ کسی نے کہا ہمیں قارون سے اپنے تعلقات بڑھانے چاہئیں۔ مال و دولت تو اس کے قبضہ میں ہے۔ اگر ہم نے اسے خوش نہ کیا تو ہم تو بھوکے مر جائیں گے۔ ایک اور شخص کے دل میں خیال آیا کہ قارون اور ہامان بھی بے شک بڑے ہیں لیکن اصل طاقت تو فرعون کی ہے کیوں نہ فرعون کی غلامی اختیار کی جائے اور اس کے اشاروں پر چلنے کی کوشش کی جائے۔ اگر فرعون خوش ہوا تو ہامان اور قارون کی بھی مجال نہیں کہ وہ ہمیں کوئی دکھ پہنچا سکیں۔ یہی حال عاد اور ثمود کے وقت ہوا۔ ہودؑ اور صالحؑ کو لوگ دیکھتے تو سمجھتے کہ ان لوگوں کے پاس تو نہ کوئی طاقت ہے نہ جتھہ۔ نہ مال ہے نہ دولت۔ ہم نے ان کی بات مان لی اور ایک خدا پر ایمان لے آئے تو ہمیں کون سا سُرخاب کا پر لگ جائے گا۔ ہمیں تو عاد کے بادشاہوں کے ساتھ اپنے تعلقات رکھنے چاہئیں تا کہ ہم اپنی دنیوی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ اور آنے والی آفات سے محفوظ رہ سکیں۔ قوم ثمود نے بھی یہی نظریہ اختیار کیا اور اپنی قوم کے صنادید کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ غرض ہر ایک نے خدا کو چھوڑ کر بعض خیالی پناہ گاہیں تجویز کر لیں مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی یہ پناہ گاہیں مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں اور وقت آنے پر ان کا تمام تار پود بکھر جائے گا۔ اور نہ فرعون ان کے کام آئے گا اور نہ ہامان اور قارون انہیں خدائی عذاب سے بچا سکیں گے۔ چنانچہ جب فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہوا تو اس وقت ان کا مجازی خدا کہاں گیا اور اس نے کیوں اپنے لشکر کو غرق ہونے سے نہ بچا لیا؟ بلکہ اس نے کسی اور کو کیا بچانا تھا خود بھی سمندر میں غرق ہو گیا۔ اور اسے اپنی پناہ سمجھنے والے بھی غرق ہو گئے اور دنیا پر ثابت ہو گیا کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ ویسے ہی تباہی کے قریب جا رہے ہوتے ہیں

جس طرح مکڑی اپنے جالے میں بیٹھ کر یہ سمجھتی ہے کہ وہ حوادث زمانہ سے محفوظ رہے گی۔قرآن کریم نے بار بار مسلمانوں کو اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور بار بار کہا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ اے مسلمانو! تم خدا کو اپنی ڈھال بناؤ۔یعنی اسے اپنے بچاؤ کا ذریعہ سمجھو۔بے شک تم اسباب سے بھی کام لو۔کیونکہ اسباب سے کام لینا خود خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں سے کام لینا ہے مگر کبھی یہ خیال نہ کرو کہ وہ اسباب اور ذرائع ہی حقیقی چیز ہیں۔اصل مدد خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور اگر اس کی مدد شامل حال نہ ہو تو کوئی سامان فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔آخر سوچو کہ کیا عاد اور ثمود کے پاس کم سامان تھے۔کیا قارون اور فرعون اور ہامان کم طاقتیں رکھتے تھے۔پھر کیا ان کی یہ طاقتیں انہیں خدائی عذاب سے بچا سکیں۔پس اسباب پر انحصار رکھنا اور انہی کو اپنی نجات کا موجب سمجھنا بڑی نادانی ہے مومن کا اصل مقام وہی ہے جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں بیان کیا گیا ہے۔یعنی عبادت بھی سچے دل سے خدا تعالیٰ کی ہی کی جائے اور مدد بھی اسی سے حاصل کی جائے۔کیونکہ خدا تعالیٰ کی احتیاج عبادت بھی ہے لیکن بندوں کی احتیاج ذلت ہے۔اگر کوئی شخص کامیابی کے اس ایک ہی دروازہ کو اپنے اوپر بند کر لیتا ہے تو اس کی ہلاکت اس کے سر پر منڈلانا شروع کر دیتی ہے۔اور آخر اسے انتہائی حسرت کے ساتھ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

پھر بیت العنکبوت کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جس طرح گھر کہہ دینے سے عنکبوت کا گھر گھر کا کام نہیں دے سکتا۔اسی طرح محض مذہب کا لبادہ اوڑھ لینے اور اس کے نام کا لیبل اپنے اوپر چپکا لینے سے وہ مذہب انسان کی نجات کا موجب نہیں بن سکتا۔نجات کا موجب وہ صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے جب انسان کے اندر وہ روح بھی پیدا ہو جائے جو مذہب پیدا کرنا چاہتا ہے۔اگر یہ روح پیدا نہیں ہوتی تو اس کا محض ایک نام اختیار کر کے تسلی پا جانا اور عملی رنگ میں اللہ تعالیٰ کی بجائے غیر اللہ کی طرف جھکے رہنا ایسی ہی کم عقلی کی بات ہے۔جیسے عنکبوت کا اپنے گھر کو گھر سمجھ لینا۔

حقیقت یہ ہے کہ گو اس دنیا میں ہزاروں مذاہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے شدید اختلاف رکھتا ہے لیکن سینکڑوں اختلافات کے باوجود دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اس امر پر متفق ہیں کہ مذہب کی حقیقی غرض اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا ہے۔اور جب مذہب کی اصل غرض یہی ہے تو ایک دیانتدار انسان کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اعمال کا جائزہ لیتا رہے اور یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کہاں تک ان پھلوں کو حاصل کیا ہے جو سچے مذہب پر چلنے کے نتیجہ میں حاصل ہوا کرتے ہیں۔

حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے

پہچانا جاتا ہے۔مگر اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر درخت کو پھل نہ لگا ہو تو درخت پہچانا نہیں جا سکتا۔معمولی زمیندار بھی چاہے وہ باغبان نہ ہو درختوں کو بغیر پھل کے پہچان لیتے ہیں۔کیونکہ درختوں کی شاخیں اور پتے الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔آم کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔انار کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔شہتوت کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے لیچی کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔مالٹے کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔سیب کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک پنجاب کا رہنے والا آدمی افغانستان یا کشمیر کے درختوں کو نہ پہچان سکے لیکن عام درخت جو اس کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں ان کو وہ پہچان لیتا ہے خواہ ان درختوں کو پھل نہ لگا ہوا ہو۔پس حضرت مسیح ناصریؑ کے اس قول کے یہ معنے نہیں کہ جب تک درخت پر پھل نہ لگے وہ پہچانا نہیں جاتا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ درخت کی اصل قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے پھل لگا ہوا ہو۔چنانچہ دیکھ لو ہر آم کے درخت کو آم لگتے ہیں لیکن بعض آم اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ کھانے کے کام نہیں آتے بلکہ لوگ ان کا آچار ڈال لیتے ہیں اور بعض ایسے ردی ہوتے ہیں کہ آچار کے کام بھی نہیں آتے۔اور بعض آم ایسے ہوتے ہیں جو سودو دوسو روپے سینکڑہ بکتے ہیں۔اب نام تو سب کا آم ہی ہوتا ہے۔لیکن بعض درختوں کا پھل بہت مہنگا بکتا ہے اور باغبان ان کی خاص طور پر حفاظت کرتا ہے اور بعض درختوں کے ردّی پھل کو دیکھ کر باغبان کاٹ ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی جگہ میں کوئی اور پودہ لگاؤں گا۔

اسی طرح مذہب بھی اپنے ساتھ بعض پھل رکھتا ہے۔اگر وہ پھل کسی شخص میں پائے جائیں تو اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچے مذہب کا پیرو ہے۔لیکن اگر وہ پھل نہ پائے جائیں تو محض زبان سے کسی مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا اسے نجات نہیں دے سکتا۔خود حضرت مسیح ناصریؑ کا ایک حواری ایسا تھا جس نے تیس درہم یعنی ساڑھے سات روپے میں حضرت مسیح علیہ السلام کو بیچ دیا۔بیچنے کا لفظ اس لئے بولا جاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو پولیس تلاش کرتی رہتی تھی لیکن آپ ان کے ہاتھ نہیں آتے تھے۔آپ کو پولیس کی آمد کا علم ہو جاتا تھا اور آپ وہاں سے روپوش ہو جاتے تھے۔ایک شخص جو کہ کئی سال تک دھڑلّے سے اپنی تبلیغ کو دنیا تک پہنچاتا رہا اور لوگوں کے سامنے تقریریں کرتا رہا اس کے متعلق ہم یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ پولیس اسے پہچان نہ سکتی تھی۔پولیس آپ کو پہچانتی تو تھی۔لیکن معلوم ہوتا ہے مسیح علیہ السلام ایسے طور پر رہتے تھے کہ لوگوں کو آپ کا علم نہ ہوتا۔جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے اپنے اردگرد ایسے طور پر چادر لپیٹ لی کہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہے تو آپؓ نے فرمایا۔یہ میرا ہادی ہے۔ ھادی کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔یہ بھی کہ یہ میرا آقا ہے اور یہ بھی کہ یہ مجھے راستہ دکھانے

والا ہے۔اس شخص نے سمجھا کہ یہ شخص راستہ دکھانے والا ہے۔اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔یہ سچ کا سچ تھا اور بات کا پتہ بھی نہ لگ سکا۔اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام لباس وغیرہ تبدیل کر لیتے تھے اور جگہ بدل لیتے تھے اور پہچانے نہ جاتے تھے۔آخر پولیس نے یہ تجویز کی کہ مسیحؑ کے حواریوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہوداا سکر یوطی کو تیس درہم دے کر اپنے ساتھ ملایا۔اس نے کہا کہ مجلس میں مَیں جس کے ہاتھ پر بوسہ دوں وہی مسیح ہوگا۔ چنانچہ وہ مجلس میں آیا اور اس نے آتے ہی اے استاد کہہ کر حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ کو چوم لیا۔اس پر پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔اب وہ شخص بھی بظاہر مومن کہلاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں اپنے آپ کو شامل کرتا تھا۔مگر اپنی بدبختی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا موجب بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو پکڑوانے سے پہلے وہ آپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ آپ نے الہام کے ذریعہ خبر پا کر بتایا کہ جو شخص میرے پکڑوانے کا موجب ہوگا اس کا اور میرا ہاتھ اس وقت پیالے میں اکٹھا پڑ رہا ہے۔اس وقت یہوداا سکر یوطی آپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا وہ سمجھ گیا کہ یہ میرے متعلق ہے اور اس نے کہا کہ اے استاد! یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ مسیح علیہ السلام نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے جو پوری ہو کر رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اور اس شخص نے ساڑھے سات روپے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام کو بیچ دیا۔ذلیل سے ذلیل چوروں کے سامنے بھی گورنمنٹ بعض دفعہ پانچ پانچ دس دس ہزار روپے پیش کرتی ہے کہ اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دو۔لیکن وہ نہیں پکڑواتے مگر اس نے ساڑھے سات روپے لے کر اپنے رہبر کو پکڑوا دیا۔تو درحقیقت صرف مذہب کا لبادہ اوڑھ لینا اور مذہب کے نام پر خوش ہو جانا انسان کے کسی کام نہیں آ سکتا۔جس طرح عنکبوت کا گھر بظاہر گھر ہی کہلاتا ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں گھر کی خصوصیات بھی موجود ہیں اسی طرح صرف سچے مذہب میں شامل ہونا انسان کی نجات کا باعث نہیں بن سکتا نجات کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان غیر اللہ سے کامل انقطاع کر کے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اسی سے اپنا تعلق قائم رکھے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ بیت العنکبوت میں اپنا سر چھپاتا ہے۔

درحقیقت اگر سوچا جائے تو مذہب جس پر دنیا کا اکثر حصہ فریفتہ ہے وہ اپنے اندر ایک ہی خصوصیت رکھتا ہے۔ اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان تعلق پیدا کیا جائے۔دنیا میں کئی قسم کی نیکیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ وہ کام کرتے ہیں اور دوسروں سے کرواتے ہیں۔مثلاً ماں باپ سے محبت کرنا۔ ایک دہریہ بھی اپنے ماں باپ سے محبت کرتا ہے۔ایک فلسفی بھی اپنے ماں باپ سے محبت رکھتا ہے۔ایک حریص اور لالچی انسان جو دوسروں کا مال لوٹ کر اپنا گھر بھرنا چاہتا ہے وہ بھی جب ماں باپ کے سامنے آتا ہے تو اس کی

آنکھوں میں محبت کی جھلک آجاتی ہے۔ایک ڈاکو اور قاتل انسان بھی ماں باپ سے محبت کرتا ہے اور بسا اوقات وہ قاتل اور ڈاکو بنتا ہی اس لئے ہے کہ کسی نے اس کے ماں باپ، بہن بھائی یا کسی اور رشتہ دار پر ظلم کیا ہوتا ہے اور وہ اس کا بدلہ لینے کے لئے ڈاکو بن جاتا ہے۔اور مذہب بھی یہی کہتا ہے کہ ماں باپ سے محبت کا سلوک کرو اور ان کا احترام کرو۔پھر مذہب کہتا ہے بیوی سے محبت کرو۔اور اس کا احترام کرو۔مذہب کہتا ہے عورت اپنے خاوند سے محبت کرے اور اس کا احترام کرے۔لیکن اگر مذہب نہ بھی ہوتو بھی لوگ اپنی بیویوں سے محبت کریں گے۔اگر مذہب نہ بھی ہوتو بھی عورتیں اپنے خاوندوں سے محبت کریں گی اور ان کا احترام کریں گی۔پھر مذہب کہتا ہے جھوٹ نہ بولو۔اب اس کے لئے کسی مذہب کی ضرورت نہیں۔جن قوموں میں کوئی مذہب نہیں پایا جاتا مثلاً پرانے حبشی قبائل ہیں جو خدا اور اس کے رسول اور کتاب پر ایمان نہیں رکھتے انہیں دیکھ لو وہ بھی شریف انسان کی یہی تعریف کریں گے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔حالانکہ وہ کسی مذہب کے متبع نہیں۔ان کا رسول اور کتاب پر ایمان نہیں ہوتا۔لیکن شرافت کے ساتھ سچ کا تعلق وہ بھی مانتے ہیں۔پھر چوری کے ساتھ بھی مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔مذہب بے شک یہ کہتا ہے کہ چوری نہ کرو۔لیکن جہاں مذہب نہیں وہاں بھی شرافت یہ کہتی ہے کہ چوری کرنا برا ہے۔پھر لڑائی جھگڑا دنگا فساد۔غیبت اور دوسرے سے بغض اور کینہ رکھنا ہے۔مذہب ان سے منع کرتا ہے۔لیکن اگر مذہب نہ بھی ہوتو بھی ایک شریف انسان ان برائیوں سے اجتناب کرے گا۔پس یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ جہاں مذہب نہیں وہاں بھی پائی جاتی ہیں۔اور جہاں مذہب ہے وہاں بھی یہ سب موجود ہیں۔اگر کوئی چیز ایسی ہے کہ جہاں مذہب ہے وہاں تو وہ موجود ہے لیکن جہاں مذہب نہیں وہاں وہ موجود نہیں۔تو وہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال ہے۔اگر مذہب نہیں تو انسان خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال نہیں رکھتا۔وہ کہے گا مجھے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے یا وہ سرے سے خدا تعالیٰ کا ہی انکار کر دے گا۔لیکن ایک مذہب کا پابند انسان خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔ہر مذہب کا ماننے والا کہے گا کہ مجھے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔لیکن اس امتیازی شان کو کس حد تک اختیار کیا جاتا ہے۔کہنے کو تو ہر مذہب والا یہی کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جن میں تعلق باللہ پیدا کرنے کا احساس اس شدت سے پایا جاتا ہے جس شدت سے وہ پایا جانا چاہیے۔سو میں سے ننانوے نہیں۔ہزار میں سے نو سو ننانوے نہیں بلکہ ایک لاکھ میں سے ننانوے ہزار نو سو ننانوے اور شائد اس سے بھی کم وہ لوگ نکلیں گے جن میں مذہب کا خیال تو ہے لیکن خدا تعالیٰ کی محبت نہیں اور صرف یہی نہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ سے محبت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے کا خیال بھی ان میں

نہیں پایا جاتا۔ایسی صورت میں کون خیال کرسکتا ہے کہ انہوں نے سچے دل سے کسی مذہب کو اختیار کیا ہوا ہے۔تم اگر عرق گاؤزبان کی بوتل پر روح کیوڑہ لکھ دو تو کیا وہ روح کیوڑہ بن جائے گا؟ پانی پر اگر روح گلاب لکھ لیا جائے تو اس سے کیا بنتا ہے جب اندر روح گلاب نہ ہو۔ یہ تو دھوکا ہوگا۔ دھوکہ باز عطار اسی طرح کرتے ہیں۔علاقہ میں وباء شروع ہوتی ہے مثلاً ملیریا شروع ہوتا ہے اور حکیم لکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ مریض کو عرق مکو اور عرق گاؤزبان پلاؤ تو ایک دیانت دار عطار بعض دفعہ کہہ دے گا کہ میرے پاس عرق مکو اور عرق گاؤزبان تیار نہیں۔لیکن بددیانت عطار کہے گا۔میرے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔وہ پانی لے گا بوتل میں بھرے گا اور کہے گا۔یہ عرق مکو ہے یہ عرق کاسنی ہے۔یہ عرق گلاب ہے۔تم جو عرق بھی مانگو گے وہ اس کے پاس موجود ہوگا۔اسی طرح تم کوئی نام رکھ لو۔تم مٹی کا نام سونا رکھ لو تو مٹی سونا نہیں بنے گی۔تم دنیاداری کا نام مذہب رکھ لیتے ہو تو تمہیں مذہب کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ مذہب اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ تعلق باللہ پیدا نہ ہو۔اور اگر تعلق باللہ کے بغیر کوئی شخص کسی مذہب کو اختیار کر کے یہ سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ ہو گیا ہے تو وہ ایسا ہی نادان ہے جیسے مکڑی کے گھر کو گھر سمجھنے والا۔

پھر فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن ہستیوں پر یہ لوگ انحصار رکھتے ہیں۔ان کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے یہ لوگ تو فانی اور کمزور انسانوں کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پتھر کے بے جان بتوں کے آگے اپنے سر جھکا دیتے ہیں اور بعض دفعہ مردوں کی قبروں پر کھڑے ہو کر ان سے دعائیں کرتے اور انہیں اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں۔مگر اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان ہستیوں کی کیا حقیقت ہے۔ بڑے سے بڑا زبردست بادشاہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک مچھر کے پر جتنی حقیقت بھی نہیں رکھتا۔ چلتے چلتے اگر کسی کا ہارٹ فیل ہو جائے تو خواہ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اس کا دوست ہو وہ دنیا کی ساری دولت خرچ کرنے کے باوجود اسے زندہ نہیں کرسکتا۔کسی پر بجلی آگرے یا وہ دریا میں غرق ہو جائے یا آگ میں جل جائے یا ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہو جائے یا ریل اور موٹر کی ٹکر کے نتیجہ میں مرجائے تو کون ہے جو اسے بچا سکے۔ دنیا کے ڈاکٹر امراض کے علاج میں بڑی بھاری مہارت رکھتے ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کی طرف سے موت کا پیغام آجاتا ہے تو بڑے بڑے ڈاکٹر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔اور انسانی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ پھر ایسی بے حقیقت پناہ گاہوں پر انحصار رکھنا اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف اپنی مدد کے لئے ہاتھ پھیلانا کتنی بڑی نادانی ہے۔

پھر وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ انسان کو کامیابی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ ایک غالب ہستی سے تعلق رکھے جیسے کسی نے کہا ہے ؎

’’ یارِ غالب شو کہ تا غالب شوی ‘‘

اور غالب ہستی سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ۔مگر محض غلبہ کے نتیجہ میں چونکہ یہ ڈر بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگ ناانصافی کا شکار نہ ہوجائیں اس لئے خدا تعالیٰ صرف عزیز ہی نہیں بلکہ وہ حکیم بھی ہے یعنی اس کے تمام کام اور تمام حکم حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ۔ان میں کسی ظلم یا حق تلفی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔پس انسان کی سلامتی کی یہی راہ ہے کہ وہ عنکبوت کی سی خیالی پناہ گاہوں کو چھوڑ کر عزیز اور حکیم خدا سے اپنا تعلق پیدا کرے۔

آخر میں وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ کہہ کر بتایا کہ ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان وغیرہ کے واقعات تو بیان کردیئے ہیں ۔مگر ان سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھائیں گے جو اپنے اندر خدا تعالیٰ کی خشیت کا مادہ رکھیں گے باقی لوگ فرعون اور ہامان وغیرہ کے نقش قدم پر انبیاء کا انکار کرتے چلے جائیں گے۔

اس جگہ عالم سے دنیوی علوم کے ماہر مراد نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی خشیت پائی جاتی ہے۔اور جن کے متعلق قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ صراحت فرمادی ہے کہ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (الفاطر : ۲۹) یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں ۔یعنی وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھتے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

اللہ (تعالیٰ) نے آسمانوں اور زمین کو خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔اس میں مومنوں کے لئے

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۵﴾ ع ۱۶/۱۴

ایک بڑا نشان ہے۔

تفسیر ۔اب اللہ تعالیٰ اپنے عزیز اور حکیم ہونے کے ثبوت میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر بڑی بڑی طاقتور قوموں اور حکومتوں کی تباہی دیکھ کر بھی تمہیں خدا تعالیٰ کے عزیز اور حکیم ہونے کا ثبوت نظر نہیں آتا تو تم آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرو۔تمہیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک نہایت پختہ اور اٹل قانون کے ماتحت بنایا ہے ۔یعنی ان میں ایسے قوانین جاری کئے ہیں جن کو کوئی شخص بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ایک دہریہ اپنی زبان سے خدا تعالیٰ کا انکار تو کرسکتا ہے لیکن وہ خدائے عزیز کے قانون کو

بدل کر کانوں سے بولنے اور زبان سے سننے کا کام نہیں لے سکتا۔ اسی طرح اگر وہ چاہے کہ آگ انسانی جسم کو نہ جلائے یا ٹھنڈا پانی اس کے جسم کو ٹھنڈا نہ کرے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یا اگر وہ سورج اور چاند اور ستاروں کے افعال میں کوئی تغیر پیدا کرنا چاہے۔ تو نہیں کر سکتا۔ وہ اگر تیز مرچ استعمال کرے گا تو خدائے عزیز کا قانون اسے پیچش کی صورت میں اس کے اس جرم کی ضرور سزا دے گا اور اگر وہ اسے دور کرنا چاہے گا تو پھر بھی اسے خدا تعالیٰ کے ایک دوسرے قانون کی طرف جانا پڑے گا یعنی ایسی اشیاء استعمال کرنی پڑیں گی جو ان مرچوں کے اثر کو باطل کر دیں۔ بہر حال خدا تعالیٰ کا قانون اس پر غالب ہے اور پھر آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے خدا تعالیٰ کا حکیم ہونا بھی ظاہر ہے کیونکہ دنیا کے تمام علوم کی بنیادیں اشیاء کے غیر متبدل خواص اور قدرت کے اٹل قوانین پر ہیں۔ اگر آگ کبھی جلاتی اور کبھی نہ جلاتی یا پانی کبھی پیاس بجھاتا اور کبھی آگ لگا دیتا تو سائینس کبھی ترقی نہ کر سکتی۔ پس جہاں انبیاء کے مخالفین کی تباہی خدا تعالیٰ کے غالب اور حکیم ہونے کا ثبوت ہے۔ وہاں زمین و آسمان کا اٹل قوانین پر مبنی ہونا بھی بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی سب پر غالب ہے۔

پھر زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اتنے بڑے کارخانہ پر غور کر کے تم سمجھ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ اگر یہ تمام نظام صرف اس لئے ہوتا کہ انسان اس پر چند دن زندگی گذارے اور پھر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے تو یقیناً یہ تمام کام عبث ٹھہرتا۔ پس آسمان اور زمین کی پیدائش خود اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان ایک بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور موت صرف جسم اور روح کے جدا ہو جانے کا نام ہے ورنہ زندگی غیر محدود ہے۔ اور ہر انسان اپنے اعمال کے مطابق آئندہ ترقی یا تنزل کے راستہ پر چلنے والا ہے۔ اسی طرح زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر کر کے دشمنانِ انبیاء کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح زمین آسمانوں کے بغیر اپنی طاقت اور قابلیت کا اظہار نہیں کر سکتی اسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں صرف اپنی عقل اور دماغ سے کام لے کر وہ ترقی کر سکتے ہیں وہ بھی اپنی تباہی کا اپنے ہاتھوں سامان کرتے ہیں کیونکہ زمین اسی صورت میں کام کے قابل ہو سکتی ہے جب اس پر آسمان ہو۔ اسی طرح کوئی عقل انسانی راہنمائی کے لئے کافی نہیں جب تک آسمان سے الہام کا پانی نازل نہ ہو۔ اگر وہ آسمان روحانی سے قطع تعلق کر لیں گے تو ایک مردہ زمین کی طرح ہر قسم کے منافع سے محروم ہو جائیں گے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ کہہ کر بتایا کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں بڑا بھاری نشان تو ہے مگر اس سے

فائدہ صرف مومن اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے حالانکہ انسان اگر سوچے تو ہماری یہ زمین عالم شمسی کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے باغ میں کوئی مالٹا رکھا ہوا ہو۔ مثلاً شالا مار باغ میں کوئی مالٹا یا بیر پڑا ہو تو اس بیر یا مالٹے کی جو حیثیت شالا مار کے مقابلہ میں ہے اس زمین کی عالم شمسی کے سامنے اتنی حیثیت بھی نہیں ۔ پھر عالم شمسی یعنی سورج کے ساتھ جو سیارے وغیرہ ہیں ان کی حیثیت قطب ستارے کے نظام کے مقابلہ میں اتنی بھی نہیں جتنی ایک بیر کی حیثیت باغ کے مقابلہ میں ۔ یا ایک مکھی کی حیثیت شہر کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ پھر قطب ستارے کے ساتھ جو دنیا ہے اس کی حیثیت معلومہ دنیا کے مقابلہ میں اتنی بھی نہیں جتنی ایک مکھی کی شہر کے مقابلہ میں ۔ اگر انسان اس کا اندازہ لگانا شروع کر دے کہ عالم خلق کے مقابلہ میں مکھی کی کیا حیثیت ہے اور پھر سوچے کہ عالم خلق کے مقابلہ میں انسان جو ایک خوردبینی ذرے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کے مقابلہ میں ایک خوردبینی ذرے کے اربویں حصہ تو کیا اس کے اربویں حصہ کی حیثیت رکھتا ہے اس انسان کو پیدا کرنے کا خیال خدا تعالیٰ کو کیوں آیا۔ تو یقیناً اسے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال آ سکتا ہے اور وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی حیثیت کتنی کمزور ہے اور اس کا غرور کتنا احمقانہ ہے ۔ وہ انسان جو کہتا ہے کہ مکا ماروں تو تمہارے دانت نکال دوں۔ فرشتوں کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چیونٹی کے بچے کی طرح ہے جس طرح چیونٹی (اگر اسے زبان مل جائے) کہے کہ میں لات مار کر امریکہ کو اڑا دوں تو تمہیں کتنی ہنسی آئے گی۔ اسی طرح جب انسان کہتا ہے کہ میں مکا مار کر تمہارے دانت نکال دوں گا تو فرشتوں کے نزدیک اس کی حیثیت چیونٹی کے بچے کی سی بلکہ اس سے بھی کم ہوتی ہے ۔ گویا عالم مخلوق کے مقابلہ میں انسان کی کچھ بھی حیثیت نہیں ۔ وہی بادشاہ جن کے اعلانوں سے دنیا میں کھلبلی مچ جاتی ہے ان کے جسم میں ایک باریک خوردبینی کیڑا دق۔ سل یا ہیضہ کا چلا جاتا ہے تو وہ تڑپنے لگ جاتے ہیں اور ایک معمولی ڈاکٹر کے سامنے چلّاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے میرا علاج کریں۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ یا تو وہ اپنے سامنے کسی دوسرے کو سمجھتے ہی کچھ نہیں اور یا وہ دو چار سو روپیہ پانے والے ایک ڈاکٹر کے سامنے تڑپ رہے ہوتے ہیں ۔ وہ ڈاکٹر جس کے دل میں ان کی تندرستی کے دنوں میں اگر انہیں ملنے کی خواہش ہو تو وہ انہیں مل بھی نہ سکے وہ بیماری میں اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ پس انسان کو سوچنا چاہیے کہ آخر اس کی پیدائش کی کیا غرض ہے۔ اس کی پیدائش کی کوئی نہ کوئی غرض تو ہوگی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کوئی چیز بے فائدہ اور عبث پیدا نہیں کی اور جب کوئی چیز بھی بے فائدہ نہیں تو ہر انسان کو اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کے لئے پیدا کیا ہے؟ اور اگر وہ اس بات پر غور نہیں کرتا تو وہ یقیناً اپنی

زندگی کو ضائع کرتا ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ

اس کتاب (یعنی قرآن) میں سے جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے پڑھ (اور لوگوں کو پڑھ کر سنا) اور نماز

الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ

کو (اس کی سب شرائط کے ساتھ) ادا کر۔ یقیناً نماز سب بری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ)

اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

کی یاد یقیناً (اور سب کاموں سے) بڑی ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے چونکہ مومنوں کے لئے آسمان اور زمین کی پیدائش میں ایک بہت بڑا نشان ہے مگر کافر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے اب یہی علاج باقی ہے کہ تو قرآن کریم لوگوں کو سناتا رہ تا کہ اس کی مدد سے لوگ حقیقت کو سمجھیں اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی طرف توجہ پیدا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا تمام دارومدار قرآن کریم پر ہی ہے اور ان کے تنزل کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا ہے۔ نہ وہ خود قرآن کریم پر عمل کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قرآن کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی زندگی کا دارومدار ہی قرآن کریم پر ہے۔ یہ ایک روحانی غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے تیار کی ہے۔ لیکن جس طرح غذا کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً آٹے سے کبھی پراٹھے تیار کئے جاتے ہیں کبھی پھُلکے اور کبھی تنور کی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی غذا بھی کئی شکلوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کہیں یہ غذا نماز کی شکل اختیار کرگئی ہے کہیں روزہ کی شکل اختیار کرگئی ہے کہیں حج کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ کہیں زکوٰۃ کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ گویا کہیں یہ پراٹھا بن گئی ہے کہیں پنجیری بن گئی ہے۔ کہیں گُلگلے بن گئی ہے۔ مگر ہے وہی چیز۔ لیکن ان چیزوں کا صرف بن جانا کافی نہیں جب تک ہم انہیں چبائیں نہیں۔ انہیں نگلیں نہیں۔ جب تک یہ غذا معدہ اور انتڑیوں کے دَور سے نہ نکلے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے میں نے ''ذہنی جگالی'' کی ایک اصطلاح بنائی ہوئی ہے۔ یعنی بغیر ذہنی جگالی کے روحانی غذا ہضم نہیں ہوتی۔ ایک جانور معدہ سے چارہ نکالتا ہے اور پھر اسے چباتا ہے۔ کیونکہ اس

کے معدہ میں اتنا سامان نہیں ہوتا کہ وہ چارہ کو ہضم کرے۔ اور چونکہ معدہ اس غذا کو ہضم نہیں کرتا اس لئے وہ پہلے جلدی جلدی چارہ کھالیتا ہے اور جب کھُرلی پر بیٹھتا ہے تو وہ جگالی کرتا ہے۔ چونکہ ایک جانور چوبیس گھنٹہ تک خوراک جنگل میں نہیں کھا سکتا۔ اس لئے وہ جلدی جلدی خوراک کھاتا جاتا ہے لیکن جب کھرلی پر آتا ہے تو پہلے ایک لقمہ نکالتا ہے اور جگالی کرتا ہے اور اسے خوب چباتا ہے پھر ایک اور لقمہ نکالتا ہے اور اسے چباتا ہے۔ پھر ایک اور لقمہ نکالتا ہے اور اسے چباتا ہے۔ اسی طرح روحانی جگالی کی کیفیت ہوتی ہے۔ جو شخص قرآن کریم پڑھ لیتا ہے یا اس کی تلاوت کر لیتا ہے قرآن کریم اسے ہضم نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک جانور گھاس کھالیتا ہے یا انسان کوئی لقمہ منہ میں ڈال لیتا ہے لیکن اگر تم لقمے نگلتے جاؤ اور انہیں چباؤ نہیں تو تمہاری انتڑیوں میں سوزش پیدا ہوجائے گی۔ دست آنے لگ جائیں گے یا قے آجائے گی اور روٹی باہر نکل آئے گی۔ یہی حال روحانی غذا کا ہے۔ جو لوگ جگالی نہیں کرتے۔ وہ اس غذا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کی مثال اس گدھے سے دی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ جو لوگ ذہنی جگالی نہیں کرتے وہ کتاب تو پڑھ لیتے ہیں لیکن اس پر غور و فکر نہیں کرتے اور اس وجہ سے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن کریم سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ان مراتب میں سے گذارا جائے جس سے اس کے مضامین ہضم ہو جائیں۔ جب تک اسے ان مراتب میں سے گذارا نہیں جائے گا وہ ہضم نہیں ہوگا۔ پس قرآن کریم پڑھنے کے بعد سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور سوچنے کے بعد اس پر عمل کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم ایک زندہ اور فعال قوم نظر آنے لگ جاؤ گے اور دنیا تمہیں دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ لوہے کو دیکھ لو۔ یورپ اس سے انجن بناتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس سے محض ہتھوڑے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ قینچیاں بنا لیتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں عورتیں سیر سیر سونا کانوں میں ڈال لیتی تھیں۔ ان کے کان لٹک جاتے تھے ان میں بڑے بڑے سوراخ ہوجاتے تھے اور وہ سمجھتی تھیں ہم بڑی مالدار ہیں۔ لیکن اسی سونے سے یورپ کے ممالک نے بعض اشیاء تیار کیں۔ اور ان کے ذریعے دوسرے ممالک سے کئی گنا زیادہ مال لے آئے۔ پس کسی چیز کا موجود ہونا کافی نہیں۔ تم اس بات پر فخر نہ کرو کہ تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے۔ اگر تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے تو سوال یہ ہے کہ تم نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا؟ اگر تم قرآن کریم پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہو تو تم سے بڑھ کر خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ اور اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو تم سے بڑھ کر بد قسمت بھی اور کوئی نہیں۔ کیونکہ تمہاری جیبوں میں سونا بھرا ہے مگر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

میرے پاس ایک دفعہ دیو بند کے دو طالب علم آئے۔انہوں نے کہیں سے یہ سن لیا تھا کہ میں نے کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ میرے پاس کچھ اور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں طالب علم بھی آ کر بیٹھ گئے۔ اور ان میں سے ایک جو زیادہ تیز معلوم ہوتا تھا اس نے کہا۔آپ کہاں تک پڑھے ہوئے ہیں۔ مَیں سمجھ گیا کہ وہ گستاخ ہے۔ میں نے کہا میں نے کچھ نہیں پڑھا۔اس نے کہا پھر بھی آپ کس مدرسے میں پڑھے ہیں۔ میں نے کہا۔اگر میں پڑھا ہوتا تو میں پہلے ہی بتا دیتا۔ وہ کہنے لگا۔کیا آپ ہندوستان یا پنجاب کے کسی سکول کے فارغ التحصیل نہیں ہیں؟ میں نے کہا کہ میں نے ایک دفعہ واضح کر دیا ہے کہ جس چیز کو آپ پڑھائی خیال کرتے ہیں۔وہ میں نے کہیں سے بھی حاصل نہیں کی۔جس وقت میں نے یہ کہا تو اس کے دوسرے ساتھی نے جو ذرا ہوشیار معلوم ہوتا تھا اس کے گھٹنے کو چھو کر چپ کرانے کی کوشش کی۔لیکن چونکہ وہ جوش میں تھا چپ نہ ہوا۔اس نے کہا۔اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ بالکل اَن پڑھ ہیں۔میں نے کہا۔آپ کی گفتگو کی بنیاد اس بات پر تھی کہ میں کس مدرسے میں پڑھا ہوا ہوں اور کس نصاب کو میں نے پاس کیا ہے۔سو میں نے کوئی سکول کا نصاب پاس نہیں کیا۔ میں نے اسی کتاب سے تعلیم حاصل کی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی اور آپؐ نے اپنے متبعین کو دی اور وہ قرآن کریم ہے۔ اب آپ فیصلہ کر لیں کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (نعوذ باللہ) ہر قسم کے علوم سے ناواقف تھے یا عالم؟ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ساری دنیا کو آپؐ نے عالم بنا دیا۔بے شک جو درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے وہ بہت بلند ہے۔مگر ہم دونوں ایک ہی کتاب پڑھنے والے ہیں۔چنانچہ میرے اس جواب پر وہ خاموش ہو گیا۔

غرض لوگوں کے نزدیک جب تک کسی نے سُلّم شمس بازغہ۔شروح کافیہ۔شروح شافیہ اور ہدایۃً وغیرہ کتب نہ پڑھی ہوں وہ عالم نہیں کہلا سکتا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ صرف قرآن ہی قرآن تھا۔لیکن لوگ چاہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ سے ہٹ کر بندوں کی طرف مائل ہو جائیں۔اگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں فلاں کتاب پڑھا ہوا ہوں جو مصنفہ خدا تعالیٰ ہے تو یہ بات انہیں تسلی نہیں دیتی۔انہیں یہ بات تسلی دیتی ہے کہ کسی نے وہ کتاب جو مصنفہ بیضاوی ہے پڑھی ہو۔مصنفہ خدا تعالیٰ ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔حالانکہ تمام علوم کا سر چشمہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔

پھر اُتْلُ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کریم کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دلائی بلکہ اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ تم قرآن کریم کی تعلیم دنیا کے تمام غیر مذاہب کے سامنے پیش کرو اور انہیں بھی اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کرو۔گویا تبلیغ میں دوسری چیزوں پر زیادہ زور نہ دو۔بلکہ قرآن کریم کے ذریعہ

سے ہی تبلیغ کیا کرو۔ یہ حکم بھی ایسا ہے جس کی طرف سے مسلمانوں نے اپنی توجہ کو کلیۃً ہٹا رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی تم میں سے ہمیشہ ایک ایسی امت ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے اور انہیں نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔ اور امت کے معنے ایک ایسی جماعت کے ہیں جو اپنے اندر نظم رکھتی ہو اور وہ کسی مرکزی نقطہ کے گرد چکر کھا رہی ہو۔ پس اس آیت میں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو مقصدِ تبلیغ کو لے کر کھڑے ہوں اور ان کا عمر بھر یہی کام ہو کہ وہ ایک نظام کے ماتحت رہیں اور اسلام پھیلائیں۔

اسلام کی گذشتہ تاریخ میں جہاں مسلمانوں سے بعض بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہاں ایک اہم غلطی ان سے یہ بھی ہوئی کہ تبلیغ کو انفرادی فرض سمجھ لیا گیا۔ بیشک مسلمانوں میں مبلّغ رہے بلکہ گذشتہ صدیاں تو الگ رہیں قریب کے زمانہ تک بھی مسلمانوں میں مبلّغ رہے۔ لیکن اجتماعی رنگ میں تبلیغ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ہی قریباً مفقود ہوگئی کیونکہ خلفاء ان جنگوں میں جو عیسائیوں اور زردشتیوں کے خلاف لڑی گئیں اس قدر الجھ گئے کہ اس وقت جہاد اور تبلیغ دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا اور خلفاء کے بعد مسلمانوں پر جمود طاری ہوگیا اور اسلام کی اشاعت بند ہوگئی۔ وہ دنیوی شان وشوکت اور ترقیات کو ہی اپنا منتہائے مقصود سمجھ بیٹھے اور انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ کر دوسرے علوم کو اختیار کر لیا اور تبلیغ کے جوش اور اس کے نتائج سے محروم رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی غالب آگئے جو تبلیغ میں لگے ہوئے تھے اور مسلمان کمزور ہوگئے جو جہاد کے خیال میں پڑے رہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر بھی فرماتا ہے کہ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ یعنی اے مسلمانو! تم اس قرآن کے ذریعہ دشمنوں سے جہاد کرو کہ یہی جہاد کبیر ہے۔ پس بڑا جہاد وہی ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ سے کیا جائے اور تبلیغ اسلام پر زور دیا جائے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں قرآن کریم کو پیش کرکے اسلام کی فضیلت اور اس کی برتری ثابت کی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو توجہ دلائی ہے کہ تم قرآن کریم ہاتھ میں لو اور دنیا میں نکل جاؤ۔ اور خود بھی قرآن پڑھو اور اس پر عمل کرو اور دوسروں کو بھی قرآن سناؤ اور ان سے عمل کرواؤ اور پھر جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے روشناس نہیں ان کو بھی قرآن کریم کے ذریعہ اسلامی انوار اور برکات سے آگاہ کرو اور کوشش کرو کہ دنیا میں ہر جگہ قرآن کی حکومت ہو اسلام کی حکومت ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ہو۔

میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا امتحان تھا کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ وہ اسے ہر جگہ پہنچاتے ہیں یا نہیں پہنچاتے۔ لیکن بدقسمتی سے خود مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کفر ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ کہا کہ ہر جگہ قرآن کریم کا پہنچانا کفر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل ہمیں سمجھ دی کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کفر نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اور اگر قرآن کریم کا ترجمہ نہیں کیا جائے گا تو لوگ کس طرح سمجھیں گے کہ خدا تعالیٰ نے ان سے کیا کہا ہے۔ دنیا میں اس وقت تیرہ سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور تیرہ سو زبانوں میں ہی قرآن کریم کا ترجمہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے نازل ہوا ہے اور دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں جسے قرآن کریم مخاطب نہیں کرتا۔ پس دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں ہونا چاہیے جس کی زبان میں ہم اس کا ترجمہ نہ کر دیں۔ تا کہ کوئی فرد یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! تو نے مجھے فلاں زبان بولنے والے لوگوں میں پیدا کیا تھا اور قرآن کریم تو عربی زبان میں ہے پھر میں قرآن کریم کس سے سیکھتا؟

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے اور سننے اور سنانے اور قرآن کریم کے ذریعہ تمام دنیا کو ہدایت اور راستی کی راہوں کی طرف بلانے کی نصیحت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صرف قرآن کریم سنانا بھی کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ تو خود ان کے لئے نمونہ بنے اور ان کے لئے دعائیں کرتا رہے۔ پس تو نماز باجماعت کو دنیا میں قائم کر اور نماز میں تمام مومنوں اور غیر مومنوں کے لئے دعائیں کیا کر کہ اللہ تعالیٰ ان کی آنکھیں کھولے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ نماز یقیناً بری اور ناپسندیدہ باتوں سے لوگوں کو روکتی ہے۔ ان بری باتوں سے بھی جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان سے بھی جو سوسائٹی پر گراں گذرتی ہیں۔ کیونکہ نماز باجماعت مسلمانوں میں پانچ وقت کی مقرر ہے۔ اگر نماز باجماعت ان میں قائم ہو جائے گی تو ان کا بہت سا وقت خدا تعالیٰ کی عبادت میں لگ جائے گا۔ اور نماز میں خرچ ہونے والا وقت ان کو بے حیائیوں اور بدکاریوں سے بچاتا رہے گا۔ اسی طرح نماز میں جب دعائیں ہوتی رہیں گی۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی تو وہ دعائیں خدا تعالیٰ کا فضل کھینچ کر ان کی اپنی اصلاح کا بھی موجب ہوں گی۔ اور دوسروں کی اصلاح اور ترقی کا موجب بھی بن جائیں گی۔ اسی طرح نماز میں جو قرآن کریم کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تسبیح و تحمید کی کثرت ہوتی ہے اس کا دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ انسان گناہوں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔

غرض اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ کے معاً بعد اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اور اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ کا ذکر فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ بغیر دعاؤں کے پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تلاوت قرآن سے تم دنیا کے خیالات بے شک تبدیل کر سکتے ہو۔ لیکن دنیا میں پاکیزگی بغیر فضلِ الٰہی کے نہیں ہو سکتی اور یہ فضل دعاؤں سے ہی حاصل ہوگا۔ پس نمازیں پڑھو اور دعائیں مانگو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لئے تمہیں کھڑا کیا ہے اس میں تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ انجیل میں حضرت مسیحؑ نے بھی ایک مقام پر فرمایا ہے کہ

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اَور طرح سے نکل نہیں سکتی۔''

(مرقس باب ۹ آیت ۲۹)

مگر انجیل کی ایک تعلیم کے اچھا ہونے کے یہ معنے نہیں کہ عیسائی مذہب اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں تو صرف ایک بات اچھی ہے اور قرآن میں ساری باتیں اچھی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ عبادت کی غرض اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذباتِ شکر کا اظہار کرنا ہوتا ہے کیونکہ انسان فطرتاً اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْھَا۔ انسانی دل کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ اپنے محسن سے محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پس نماز کی ایک بہت بڑی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے رب کے سامنے اس کے احسانوں کا اپنی زبان سے اقرار کرتا رہے۔ مگر اس کے علاوہ عبادت کی ایک اور بھی غرض ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے اور وہ گناہوں اور بدیوں سے پاک کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانی عبادتوں کا محتاج نہیں۔ بلکہ جس قدر احکام اس نے انسان کو دیئے ہیں ان میں اصل غرض اس کے دل کو پاک کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ ناپاک سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ پس تمام عبادات میں یہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ ان سے نفس انسانی بدیوں سے پاک ہو اور ان کے ذریعہ اسے ایسی طاقت مل جائے کہ وہ مختلف قسم کی ہوا و ہوس کو چھوڑنے کے قابل ہو جائے۔ اور ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اس کے تعلقات درست ہو جائیں اور دوسری طرف مخلوق الٰہی سے بھی اس کے معاملات بالکل ٹھیک ہوں۔ چنانچہ اسلام نے مذہب کی تعریف ہی یہی کی ہے کہ وہ بندے کے خدا تعالیٰ سے تعلقات کو مضبوط کرتا ہو اور بندوں کے تعلقات کو قائم کرتا ہو۔ اور اگر کوئی مذہب ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے پورا کرنے سے قاصر ہو تو وہ مذہب نہیں کہلا سکتا کیونکہ اس سے مذہب کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ پس جس قدر عبادات مقرر کی جاتی ہیں ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ بندہ کو خدا تعالیٰ کے نزدیک کر دیا جائے اور ان میں گناہوں سے بچنے کی طاقت پیدا کی جائے اور جو عبادت ان دونوں

باتوں کے حصول کے ذرائع پیدا کرے وہی عبادت مفید سمجھی جاسکتی ہے۔ ورنہ اس میں مشغول ہونا اپنے وقت کو ضائع کرنے والی بات ہوگی۔قرآن کریم نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ نماز بدیوں اور گناہوں سے روکتی ہے۔گویا نماز صرف عبودیت کا اقرار نہیں۔ بلکہ قلب انسانی کو جِلا دینے والی شے بھی ہے اوراس کی مدد سے انسان بدیوں اور بدکرداریوں سے بچتا ہے اوراس کا وجود بنی نوع انسان کے لئے مفید ہوجاتا ہے ۔اب جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ نماز کی اصل غرض اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنااوراس کا شکرادا کرنااورنفس کی اصلاح کرنا ہے توجس طریق عبادت سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوتی ہوں وہ ہی عبادت سچی عبادت سمجھی جائے گی اوراسی عبادت کی طرف ہدایت کرنے والا مذہب سچا مذہب ہوگا۔اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے جوطریق عبادت رکھا ہےاس میں ان اغراض کو پورا کرنے کے لئے جوذرائع استعمال کئے ہیں وہ اَورکسی مذہب نے نہیں کئے ۔ اور ہرایک انسان معمولی غور سے کام لےکربھی سمجھ سکتا ہے کہ وہی ذرائع اس قابل ہیں کہ عبادت کی غرض کو پورا کرسکیں اوروہ ذرائع یہ ہیں۔

اول۔انسانی جسم اورروح کا ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔جس طرح غم کی خبرسن کر جسم ایسامتاثر ہوتا ہے کہ اس پراُداسی کے آثار ظاہر ہوجاتے ہیں ۔اسی طرح جسم کو جب کوئی صدمہ پہنچتا ہےتو روح بھی غمگین ہوجاتی ہے۔اوریہی حال خوشی کا ہے۔پس قلب کوخدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ عبادت کے وقت جسم کوبھی کسی ایسی حالت میں رکھا جائے جس سے تذلّل پیدا ہواوراس کا اثر روح پر پڑکر دل میں بھی رقّت اورنرمی پیدا ہوجائے ۔اورانسان خدا تعالیٰ کی طرف ایک جوش کے ساتھ متوجہ ہوجائے ۔تذلّل کے اظہار کے لئے دنیا میں مختلف صورتوں کواختیار کیا گیا ہے کسی ملک کے لوگ جھک جاتے ہیں ۔کسی ملک میں ہاتھ باندھ کرکھڑا ہونا تذلّل کا نشان قرار دیا گیا ہے۔کسی ملک میں گھٹنوں کے بل گرنے کوکسی میں سجدہ کرنے کو۔اسلام چونکہ خالقِ فطرت کی طرف سے ہےاس نے تمام فطرتوں اور عادتوں کا خیال رکھتے ہوئے نماز میں ان سب نشانات کوجمع کردیا ہے۔اورمختلف المذاق لوگ جس جس حالت میں بھی تذلّل کا اظہار کرتے ہیں نماز ان کے مذاق کے مطابق ہے ۔ اوران مختلف اشکالِ تذلّل کے اثر سے انسانی قلب جوش سے بھر جاتا ہے اوروہ خدا تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے۔درحقیقت وہ ایک قابل دید نظارہ ہوتا ہے جب ایک مسلمان اپنے رب العالمین خدا کے حضور کبھی ہاتھ باندھ سے کھڑا ہوتا ہےکبھی جھک جاتا ہے۔کبھی ہاتھ کھول کر کھڑا ہوجاتا ہےکبھی سجدہ میں گرجاتا ہےکبھی گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے اوراس کا دل اس محبت سے پُر ہوتا ہے جوایک مخلوق کوخالق سے ہوسکتی ہے۔اوروہ زبانِ حال سے اقرار کرتا ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام جس جس طریق میں بھی اپنی عبودیت کا اظہار کرتی ہیں اے خدا میں تیرے

سامنے مجموعی طور پر ان سب طریقوں سے اپنی عبودیت کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ نظارہ نماز ادا کرنے والے کو ہی نہیں بلکہ اس کے دیکھنے والے کے دل کو بھی متاثر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دیتا ہے۔

دوسرا اصل اسلام نے نماز کی غایت کو حاصل کرنے کا یہ تجویز کیا ہے کہ دعا کو نماز کا مغز قرار دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (ترمذی ابواب الدعوات باب فضل الدعاء) دعا نماز کا مغز ہے اور دعا اپنے اندر ایک ایسا مقناطیسی اثر رکھتی ہے کہ ایک طرف تو بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتی ہے اور دوسری طرف اس کے لئے ایسی آسانیاں بہم پہنچا دیتی ہے کہ جن سے وہ گناہوں سے محفوظ رہ سکے۔ جب ہماری استدعاؤں اور التجاؤں کو والدین اور حکام دنیا بھی قبول کرتے ہیں تو کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے اپنے بندوں کی دعاؤں کو ردّ کر دے گا۔ پس نماز کیا ہے؟ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جس سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف دعائیں قبولیت کا درجہ حاصل کر کے انسان کی ہدایت اور نیکیوں میں ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

تیسرا طریق اسلام نے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طاقتوں کا معائنہ کیا جائے۔ کیونکہ جب تک کسی چیز کا کامل علم انسان کو نہ ہو اس سے تعلق مکمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس انسان کو علم کی خوبی معلوم نہیں وہ اس کے حصول کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص زہر کے اثر سے ناواقف ہے وہ زہر سے نہیں ڈر سکتا پس اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے اور بدیوں سے بچنے کے لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ کی کامل معرفت ہو۔ جس کے لئے اسلام نے نماز میں ایسی عبادتوں کا پڑھنا ضروری رکھا ہے جن سے انسان پر اللہ تعالیٰ کا پرجلال اور قابلِ محبت ہونا ظاہر ہوتا ہے اور وہ بے اختیار اس کے حضور گر جاتا ہے۔ اور اس کا دل محبت اور خوف سے بھر جاتا ہے۔ کیونکہ جب اس کے سامنے ایک ہی وقت میں اللہ تعالیٰ کے احسانات پیش کئے جاتے ہیں اور نافرمانی اور قطع تعلق کے نتائج سے آگاہی کی جاتی ہے تو اس پر ایک ایسی انقطاعی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ادنیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ تُو یہ سمجھے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے اور اعلیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ تُو یہ سمجھے کہ تُو اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نماز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں نماز کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ عملی زندگی میں وہ انسان کو فحشاء اور منکر سے روکے۔ گویا اصل مقصود یہ ہوا کہ انسان فحشاء اور منکر سے رُکے۔ اور روحانی لحاظ سے نماز کی غرض یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے سامنے آجائے اور وہ یہ سمجھے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اب یہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تُو

یہ سمجھے کہ تُو خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تجھے یہ مقام حاصل نہیں تو تُو یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہے اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو ہر انسان کو ہر حالت میں دیکھ رہا ہے۔ کیا اسلام کے رُو سے یہ کہنا جائز ہوگا کہ خدا فلاں کو دیکھ رہا ہے اور فلاں کو نہیں دیکھ رہا۔ یا خدا عیسائیوں کو نہیں دیکھ رہا۔ ہندوؤں کو نہیں دیکھ رہا۔ سکھوں کو نہیں دیکھ رہا لیکن مسلمانوں کو دیکھ رہا ہے۔ یا زیدؔ نماز نہ پڑھنے والے کو خدا نہیں دیکھ رہا اور زیدؔ نماز پڑھنے والے کو خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا تبھی خدا اسے دیکھتا تو کئی لوگ جان بوجھ کر نماز چھوڑ دیتے اور سمجھتے کہ نہ ہم نماز پڑھیں گے اور نہ خدا ہمیں دیکھے گا۔ پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ نماز کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ نماز پڑھنے والے کو تو دیکھتا ہے اور جو نماز نہیں پڑھتا اسے نہیں دیکھتا کیونکہ اس صورت میں کمزور لوگ نماز نہ پڑھنے کو اپنے لئے زیادہ برکت کو موجب سمجھتے اور وہ خیال کرتے کہ نہ ہم نماز پڑھیں گے اور نہ ہمیں خدا دیکھے گا۔ پھر اور معنے بھی اس کے لئے جا سکتے ہیں اور وہ یہ کہ فی الواقعہ تو خدا تعالیٰ انسان کو نہیں دیکھ رہا لیکن تم یہ سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ معنے لئے جائیں تو یہ جھوٹ بن جاتا ہے۔ اگر خدا ہمیں نہیں دیکھ رہا اور ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہم اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور ایک جھوٹا تصور اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں معنے نہیں لئے جا سکتے۔ نہ یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم کو عام طور پر نہیں دیکھتا لیکن جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں دیکھتا ہے۔ اور نہ یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم کو حقیقتاً نہیں دیکھ رہا لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ جب یہ دونوں معنے غلط ہیں تو لازماً ہمیں اس کے کوئی اور معنے لینے پڑیں گے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہوں۔ اور وہ معنے یہی ہیں کہ اس جگہ سمجھ لو کے معنے یقین کر لینے کے ہیں۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ تم سمجھ لو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہیں یقینی طور پر اس بات کو محسوس کرنا چاہیے کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اور یقینی علم اور محض خیال اور وہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک آدمی صرف خیال کرتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اور ایک آدمی اس یقین کامل پر قائم ہوتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ بظاہر دونوں یہی سمجھتے ہیں کہ خدا انہیں دیکھ رہا ہے لیکن ایک کا تصور محض وہم پر مبنی ہوتا ہے جو جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور دوسرا یقین کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ ایک کو بڑی آسانی کے ساتھ متزلزل کیا جا سکتا ہے اور دوسرا شخص جو اپنے اندر کامل یقین پیدا کئے ہوئے ہوتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں کہ گو یہ واقعہ تو نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے مگر تم نماز پڑھتے وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ خدا تمہیں دیکھ

رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ نماز کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اس یقین کامل پر قائم ہو جائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ یہاں دیکھنے کے عام معنے تو ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ کافر کو بھی دیکھ رہا ہے اور مومن کو بھی دیکھ رہا ہے عیسائی کو بھی دیکھ رہا ہے اور ہندو کو بھی دیکھ رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے کو بھی دیکھ رہا ہے اور نماز نہ پڑھنے والے کو بھی دیکھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں ایک نماز پڑھنے والا بھی اگر یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس میں اسے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا جس طرح اسے دیکھ رہا ہے اسی طرح ایک کافر اور منافق کو بھی دیکھ رہا ہے۔ خصوصیت اسے تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دیکھنے والے کے بھی اَور معنے لئے جائیں اور وہ معنے حفاظت اور مدد کرنے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت فرماتا ہے کہ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (الطور: ۴۹) یعنی تُو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پس چاہیے کہ جب تُو نماز کے لئے کھڑا ہو تو ہماری تسبیح کیا کر۔ اب آنکھوں کے سامنے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو خدا تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دشمن خدا تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ تُو ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اب ہم تیرا خاص خیال رکھتے ہیں کوئی تجھ کو چھیڑ نہیں سکتا۔ کوئی تجھ پر حملہ نہیں کر سکتا۔ کوئی تجھے ذلیل اور رسوا نہیں کر سکتا۔ جیسے حفاظت کے لئے اگر کسی کی ڈیوٹی مقرر ہو تو وہ حملہ آور کو دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ہمارا تیرے ساتھ ایسا تعلق قائم ہو چکا ہے کہ اب ہم تجھ پر حملہ ہوتے دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتے۔ دنیا میں بھی انسان جب کسی معاملہ میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اور جب دخل دینا چاہتا ہے تو کہتا ہے۔ ''میں دیکھ رہا ہوں۔'' بہرحال جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ نماز کا یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے معنے یہی ہیں کہ اسے یہ یقین کامل حاصل ہونا چاہیے کہ میری نماز اتنی درست ہے کہ اب میرے ساتھ کوئی شخص ایسا سلوک نہیں کر سکتا جسے خدا نظر انداز کر دے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً فرمایا کہ اِنِّیْ مُعِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِعَانَتَكَ وَاِنِّیْ مُهِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ کہ جو شخص تیری مدد کا ارادہ کرے گا میں اس کی مدد کروں گا۔ اور جو شخص تیری اہانت کا ارادہ کرے گا میں اس کی اہانت کروں گا۔ گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی دونوں کا ردّ عمل ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بندے سے نیکی کرنے والے کی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور نہ اپنے بندے کے ساتھ برائی کرنے والے کی برائی کو نظر انداز کرتا ہے۔ اگر کوئی اس سے نیکی کرتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے اور اگر کوئی اس کے

ساتھ بدی کرتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے اور یہ ادنیٰ درجہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر مومن کو حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے اعلیٰ درجہ کی طرف مومنوں کو توجہ دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں اصل مقام یہ ہے کہ تُو نماز پڑھتے وقت یہ سمجھے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ یہاں بھی کَاَنَّکَ تَرَاہُ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اب اس کے بھی یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ تُو فرض کر لے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ یہ جھوٹ بن جاتا ہے۔ اول تو جو چیز ہے ہی نہیں اس کے متعلق کسی نے سمجھنا ہی کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا کمزور دل ہو جو اپنے دل پر بار بار اثر ڈالنے کی کوشش کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں تو اس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے۔ پس کَاَنَّکَ تَرَاہُ کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ تُو یہ فرض کر لے کہ تُو خدا کو دیکھ رہا ہے۔ درحقیقت اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلا مقام حاصل ہو جانے کے بعد مومن ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانات کی حقیقت اس پر واضح ہو جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے سلوک اور اس کے رحم و کرم کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتا ہے۔ پس نماز کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ انسان جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اسے یہ یقین کامل ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ جیسے ہندو کہتے ہیں کہ انسان عبادت کے وقت یہ سوچنا شروع کر دے کہ ایک بت جو اس کے سامنے ہے وہ خدا ہے اسی طرح وہ مسلمان بھی یہ سوچنا شروع کر دے۔ کیونکہ اسلام وہم نہیں سکھاتا۔ اسلام کوئی جھوٹا تصور انسانی ذہن میں پیدا نہیں کرتا۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہیں اس امر کی معرفت حاصل ہو کہ تم سے نیک سلوک کرنے والے سے خدا تعالیٰ نیک سلوک کرتا ہے اور تم سے بُرا سلوک کرنے والے سے خدا تعالیٰ بُرا سلوک کرتا ہے اگر تم کو بھی یہ نظر آ جائے اور تم کو بھی یہ محسوس ہونے لگ جائے کہ جس نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا تھا اس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے نیک سلوک کیا اور جس نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا اس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے بُرا سلوک کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری محبتِ الٰہی کامل ہو جائے گی اور تمہاری نماز اپنی ذات میں مکمل ہو جائے گی۔ غرض اسلام واہمہ کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام ہمیں یقین اور معرفت کے مقام پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی نمازوں کو اس طرح سنوار کر ادا کریں اور انہیں اتنا اچھا اور اعلیٰ درجہ کا بنائیں کہ ایک طرف تو خدا تعالیٰ ہم سے اتنا تعلق رکھے کہ ہمارے ساتھ حسن سلوک کرنے والے سے وہ حسن سلوک کرے اور ہمارے ساتھ بُرا سلوک کرنے والے سے وہ بُرا سلوک کرے اور دوسری طرف ہماری اپنی آنکھیں اتنی روشن ہوں اور ہمارے دل میں اتنا نور بھرا ہو کہ ہم کو خود بھی نظر آ جائے کہ خدا تعالیٰ ہماری تائید میں اپنے نشانات ظاہر کرتا ہے۔ جب یہ مقام کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے روشن نشانات اس کی تائید میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ اس یقین سے لبریز ہو جاتا ہے کہ خدا اسے ضائع نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانات کو دیکھ رہا ہوتا ہے وہ اس کے حسن سلوک اور انعامات کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس یقین پر مضبوطی سے قائم ہوتا ہے کہ دنیا اسے چھوڑ دے مگر خدا اسے نہیں چھوڑے گا۔ نادان اس کو نہیں سمجھ سکتا مگر وہ جس نے خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو وہ ایسی مضبوط چٹان پر قائم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو نماز نہیں پڑھتا اس لئے نہیں کہ وہ نماز کا قائل نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے اگر ہم نماز نہیں پڑھیں گے تو وہ ہمیں بخش دے گا۔ آخر اس نے گناہگاروں کو ہی بخشنا ہے۔ اگر گناہ کرنے والے نہ ہوئے تو وہ بخشے گا کن کو؟ یہ جواب غلط ہے یا صحیح اس کے متعلق بحث نہیں۔ بہرحال یہ ایک جواب ہے جو انہوں نے سوچا ہوا ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو سمجھتا ہے کہ یہ احکام پرانے زمانہ میں محض عربوں کی اصلاح کے لئے دیئے گئے تھے۔ عرب لوگ بالکل وحشی تھے۔ اور وہ گندے اور غلیظ رہتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دے دیا کہ تم اپنے کپڑوں اور بدن کو صاف رکھا کرو۔ اسی طرح ان میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔ وہ بالکل پراگندہ حالت میں تھے۔ اسلام نے ان کو حکم دے دیا کہ وہ پانچ وقت مسجد میں اکٹھے ہو جایا کریں۔ اس طرح گو بظاہر نماز کا حکم دیا گیا مگر دراصل یہ غرض تھی کہ وہ خدا تعالیٰ کے ڈر کے مارے جب مسجد میں آئیں گے اور انہیں قوم اور ملک کے حالات بتائے جائیں گے۔ تو ان میں سیاسی بیداری پیدا ہو جائے گی اور وہ دنیا پر غالب آنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یاد ہے۔ میں بچہ تھا کہ میں نے ایک اخبار میں ایک دفعہ اسی کے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ ایک صاحب جو مسلمانوں کے مبلغ سمجھے جاتے تھے اور جاپان اور امریکہ میں تبلیغ کر کے آئے تھے انہوں نے واپس آنے پر علی گڑھ میں ایک لیکچر دیا جو اخبار میں شائع ہوا۔ اور میں نے بھی پڑھا اس لیکچر میں انہوں نے بیان کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نماز بڑی ضروری چیز ہے اور پانچ وقت مسجد میں با جماعت ادا ہونی چاہیے دراصل ایسا کہنے والے حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ پرانے زمانہ کے لحاظ سے اس کے احکام اور رنگ رکھتے تھے اور اس زمانہ کے لحاظ سے اس کے احکام اور رنگ رکھتے ہیں۔ بیشک احکام وہی رہیں گے مگر حالات کے لحاظ سے ان کی ہیئت بدلتی چلی جائے گی۔ عرب لوگ جاہل تھے وہ ننگے پاؤں رہتے تھے۔ کپڑے ان کے پاس بہت کم ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ان کو سجدہ اور رکوع کا حکم دے دیا گیا۔ مگر اب وہ زمانہ ہے کہ اگر سجدہ کیا جائے یا رکوع کے لئے جھکا جائے تو پتلونوں

کی کریز یں بالکل خراب ہو جائیں۔اس زمانہ میں اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو وہ یقیناً اس حکم میں ترمیم کرتے اور یقیناً وہ یہی کہتے کہ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اگر سر جھکا لیا جائے تو اتنا ہی کافی ہے رکوع اور سجدہ کی کوئی ضرورت نہیں۔اسی طرح روزہ ہے۔یہ روزہ ان لوگوں کے لئے ہے جو بہت کھاتے ہیں۔عرب لوگ وحشی تھے اور وہ اپنے معدوں کا خیال نہیں رکھتے تھے اس لئے اسلام نے انہیں روزوں کا حکم دے دیا۔مگر اب تہذیب کا دور دورہ ہے۔ اب لوگ اپنے معدہ کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔اب اگر صبح و شام صرف ناشتہ کر لیا جائے اور کیک بسکٹ کھا لئے جائیں لیکن دن بھر کچھ نہ کھایا جائے تو روزہ کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔غرض مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان عبادات کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ آؤٹ آف ڈیٹ Out of date ہیں۔موجودہ زمانہ میں ان کی ضرورت نہیں۔اور ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ نماز تو دل کی ہی نماز ہے ظاہری حرکات کی کیا ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ظاہر کی بھی ہے اور دل کی بھی۔اور ان دونوں چیزوں کا مجموعہ انسان کے لئے برکت کا موجب ہوتا ہے۔اگر ہم دل میں خدا خدا کرتے ہیں مگر ظاہر میں نماز نہیں پڑھتے تو ہمارا دل سے خدا خدا کہنا محض دھوکا اور فریب ہوگا۔کیونکہ محبوب کی بات مانا کرتے ہیں۔ردّ نہیں کیا کرتے۔عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم خدا تعالیٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس نے کہا ہے سجدہ کرو۔مگر ہم سجدہ کرنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوتے۔یا ظاہر میں تو نماز پڑھی جائے مگر دل خدا کی طرف متوجہ نہ ہو۔تو یہ بھی کوئی نماز نہیں ہوگی بلکہ محض ایک ورزش کہلائے گی۔جیسے ورزش سے سپاہی کا جسم مضبوط ہوتا ہے۔اسی طرح نماز سے اس کا جسم بھی مضبوط ہوگا۔مگر اس کے دل میں نور ایمان پیدا نہیں ہوگا۔کچھ عرصہ کی بات ہے۔میں سندھ گیا تو ایک ہندو مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔پارٹیشن کے موقعہ پر وہ وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔کیونکہ اس کے مسلمانوں سے تعلقات تھے۔میں نے اس سے کہا کہ تمہارے مسلمانوں سے دیر سے تعلقات چلے آرہے ہیں۔کبھی تم نے ان کے دین پر بھی غور کیا۔وہ کہنے لگا۔سب مذاہب اچھی باتیں کہتے ہیں۔ہمارا مذہب بھی اچھا ہے اور آپ کا مذہب بھی اچھا ہے۔میں نے کہا۔اگر سب میں ایک جیسی اچھی باتیں ہیں تو پھر تم مسلمانوں کے ساتھ مل کیوں نہیں جاتے۔آخر کوئی نہ کوئی فرق ہی ہے جس کی وجہ سے تم ہندو ہو اور ہم مسلمان۔اگر ان دونوں مذاہب میں ایک جیسی باتیں پائی جاتی ہیں تو یا تم مسلمان بن جاتے یا ہم ہندو بن جاتے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی فرق ضرور تسلیم کرنا پڑے گا۔جس کی وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنا علیحدہ وجود قائم رکھنا چاہیے۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ کبھی تم نے نماز اور دیگر عبادات کا اپنے مذہب کی عبادات سے مقابلہ کیا۔اور یہ دیکھا کہ ان

میں سے کون سی عبادت زیادہ بہتر ہے۔اس پر وہ کہنے لگا کہ کعبہ اور دَیر تو دونوں دل میں ہیں۔کسی ظاہری نماز کی کیا ضرورت ہے۔میں نے اس سے پوچھا۔فرمائیے۔آپ شادی شدہ ہیں۔اس نے کہا۔ہاں۔میں نے کہا۔بچے بھی ہیں۔اس نے جواب دیا کہ بچے بھی ہیں۔میں نے کہا۔آپ نے کبھی بیوی بچوں کو پیار بھی کیا ہے۔اس نے کہا۔کیوں نہیں کیا۔میں نے کہا اصل پیار تو دل میں ہوتا ہے پھر آپ ظاہر میں پیار کیوں کرتے ہیں۔اسی لئے کہ آپ سمجھتے ہیں اس پیار کی کوئی ظاہری علامت بھی ہونی چاہیے۔اگر بیوی سے پیار کرنے کے لئے آپ صرف دل کا پیار کافی نہیں سمجھتے۔بچوں سے پیار کرنے کے لئے صرف دل کا پیار کافی نہیں سمجھتے۔بلکہ انہیں بوسہ بھی دیتے ہیں۔تو خدا کے پیار کے معاملہ میں یہ آپ کیوں کہتے ہیں کہ کعبہ اور دَیر تو دونوں دل میں ہیں۔کسی ظاہری عبادت کی ضرورت نہیں۔

بات یہ ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں چیزیں مل کر انسان کو کامل بناتی ہیں۔اگر یہ دونوں چیزیں ملائی نہ جائیں تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا۔اگر اچھی سے اچھی چیز آپ لوگ ایسے برتن میں لیں گے جو غلیظ ہوگا تو وہ چیز بھی غلیظ ہوجائے گی۔اور اگر بغیر برتن کے اس چیز کو لے لیں گے تو وہ گر جائے گی۔گویا برتن کی بھی ضرورت ہے اور پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ برتن اچھا ہو۔اور اس کے اندر کوئی اچھی چیز ہو۔اسی طرح نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ اور دوسری عبادتوں کا حال ہے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ادھر یہ فرمایا ہے کہ قربانی کرو۔مگر ادھر یہ بھی فرمادیا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ قربانی کا گوشت اور خون خدا کو پہنچتا ہے۔خدا کو صرف دل کا اخلاص پہنچتا ہے۔مگر باوجود اس کے کہ قربانی کا گوشت اور خون خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچتا۔خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ قربانی نہ کرو بلکہ کہا ہے کہ قربانی تو کرو مگر یہ سمجھتے ہوئے کرو کہ میں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اپنے محبوب کی بات پوری کرنے کے لئے اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جو خدا تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں قربانی کررہا ہوں۔مثلاً وہ غریب آدمی جو فاقے کرتا ہے یا وہ غریب آدمی جو ہمیشہ دال روٹی کھاتا ہے اس ذریعہ سے اسے بھی گوشت مل جاتا ہے گویا دل بھی صاف ہوتا ہے۔ہمسایوں اور غرباء کے لئے محبت کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا حکم بھی پورا ہوجاتا ہے۔پس مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نماز باجماعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔جو شخص اپنے محبوب کو بھول جاتا ہے اور اس کی یاد اپنے دل میں تازہ نہیں رکھتا۔وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مجھے اپنے محبوب سے محبت ہے۔سچی محبت ہمیشہ اپنے ساتھ بعض ظاہری علامات بھی رکھتی ہے اور محبت کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انسان اٹھتے بیٹھتے اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے اور اس کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھتا ہے۔جب کوئی شخص اپنے

کسی عزیز کو یاد کر لیتا ہے تو اس کی محبت دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اسی لئے کہتے ہیں اَلْمَكْتُوْبُ نِصْفُ الْمُلَاقَاةِ یعنی جب انسان اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھتا ہے تو گویا وہ اس سے نصف ملاقات کر لیتا ہے۔ جب وہ السلام علیکم لکھتا ہے اور پھر وہ اپنے حالات بتاتا ہے اور اس کے حالات دریافت کرتا ہے۔ تو ایک رنگ میں وہ ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ گویا جس طرح ملاقات سے آپس کے تعلقات بڑھتے ہیں۔ اسی طرح خط لکھنے سے بھی آپس کے تعلقات بڑھتے ہیں اور خط لکھنا ملاقات کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ نماز بھی خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے اور چونکہ نماز خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے اس لئے اسلام نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ انسان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد خدا تعالیٰ کا نام لے اور نماز کے لئے کھڑا ہو جائے۔ خواہ جنگ ہو رہی ہو۔ دشمن گولیاں برسا رہا ہو۔ پانی کی طرح خون بہہ رہا ہو۔ پھر بھی اسلام یہ فرض قرار دیتا ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو اگر ممکن ہو مومن اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے۔ (نہایت خطرناک حملہ کی صورت میں وہ نمازیں جو جمع نہیں کی جاسکتیں ان کو بھی جمع کرنے کا حکم ہے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر چار نمازیں جمع کی ہیں) بیشک جنگ کی وجہ سے نماز کی ظاہری شکل بدل جائے گی لیکن یہ جائز نہیں ہوگا کہ نماز میں ناغہ کیا جائے۔ مگر آج کل مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں وہاں ان میں ایک نقص یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ریل میں آرام سے بیٹھے سفر کر رہے ہوں گے مگر نماز نہیں پڑھیں گے اور جب پوچھا جائے کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ تو کہیں گے سفر میں کپڑوں کے پاک ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اس لئے ہم نماز نہیں پڑھتے۔ حالانکہ سفر تو الگ رہا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر سر سے پیر تک کسی شخص کے کپڑے پیشاب میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اس کے پاس اور کپڑے نہ ہوں جن کو بدل سکے اور نماز کا وقت آجائے تو وہ انہی پیشاب آلودہ کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ یا اگر پردہ ہے تو کپڑے اتار کر ننگے جسم کے ساتھ نماز پڑھ لے اور یہ پرواہ نہ کرے کہ اس کے کپڑے پاک نہیں یا جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔ کیونکہ نماز کی اصل غرض یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد خدا تعالیٰ کا نام لیا جائے اور اس طرح اس کی یاد اپنے دل میں تازہ کی جائے۔ جس طرح گرمی کے موسم میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انسان ایک ایک دو دو گھونٹ پانی پیتا رہتا ہے تاکہ اس کا گلہ تر رہے اور اس کے جسم کو تراوت پہنچتی رہے۔ اسی طرح کفر اور بے ایمانی کی گرمی میں انسانی روح کو حلاوت اور تروتازگی پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نماز مقرر کی ہے۔ تاکہ وہ گرمی اس کی روح کو جھلس نہ دے اور اس کی روحانی طاقتوں کو مضمحل نہ کردے۔ خدا تعالیٰ کا نام لینے سے اس کی محبت تازہ ہو جاتی ہے

فرشتے قریب آتے ہیں اور شیطان دور بھاگتا ہے۔ بیشک حکم یہی ہے کہ کپڑے پاک رکھو۔لیکن فرض کرو کسی کے پاس اور کپڑے نہیں تو بھی اس کے لئے یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ نماز نہ پڑھے بلکہ اسے یہی کہا جائے گا کہ خواہ تمہارے کپڑے گندے اور ناپاک ہیں پھر بھی تم انہی گندے اور ناپاک کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ لو۔مثلاً کسی شخص کے پاس صرف ایک ہی تہ بند ہے اور اسے شبہ ہے کہ وہ تہ بند پاک نہیں رہا تو اس کے متعلق شریعت کا یہ حکم نہیں ہوگا کہ وہ نماز نہ پڑھے۔ بلکہ اس کے متعلق حکم یہ ہوگا کہ وہ اسی تہ بند کے ساتھ نماز پڑھ لے ۔کیونکہ کپڑوں کی پاکیزگی سے دل کی پاکیزگی بہرحال مقدم ہے مگر ہمارے ملک میں لوگ کپڑوں کا تو خیال رکھتے ہیں اور اپنے دل کو ناپاک ہونے دیتے ہیں ۔اگر ہم کپڑے کی ناپاکی کا خیال کر کے نماز چھوڑ دیتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم کپڑے کے پاک کرنے کا خیال تو کرتے ہیں لیکن اپنے دل کو پاک کرنے کا خیال نہیں کرتے اور یہ سراسر حماقت ہے۔پس اس وقت جو کپڑا میسر ہو اسی کے ساتھ نماز پڑھ لینا جائز ہوگا۔مگر یہ جائز نہیں ہوگا کہ کپڑے کی ناپاکی کے خیال سے اپنے دل کو ناپاک کر لیا جائے اور نماز کو چھوڑ دیا جائے۔

نماز روحانی جسم کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔جس طرح ایک بیمار جسم محض یہ کہہ کر موت سے بچ نہیں سکتا کہ وہ بیمار ہے اور بیمار ہونے کی وجہ سے وہ روٹی نہیں کھا سکتا اسی طرح ایک روحانی جسم بھی یہ کہہ کر موت سے نہیں بچ سکتا کہ وہ بیمار ہے اور نماز نہیں پڑھ سکتا۔باوجود اس کے کہ ایک شخص بیمار ہے اور کھانا نہیں کھا سکتا۔مثلاً اس کے گلے میں ورم ہو گیا ہے۔یا جبڑا اجڑ گیا ہے۔یا معدہ غذا کو اپنے اندر رکھ نہیں سکتا۔یا غذا کو انتڑیوں کی طرف دھکیل دیتا ہے۔یا منہ کی طرف سے باہر پھینک دیتا ہے۔یا کوئی رسولی پیدا ہوگئی ہے۔یا سرطان ہو گیا ہے۔اور غذا معدہ میں ٹھہرتی نہیں بلکہ قے ہو جاتی ہے۔یا غذا معدہ کے اندر جاتی نہیں یا انتڑیوں میں کوئی بیماری لاحق ہے اس لئے انتڑیوں میں غذا ٹھہرتی نہیں یا پچتی نہیں۔پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مرے گا نہیں اس لئے کہ روٹی کے بغیر انسانی جسم بچ نہیں سکتا۔اسی طرح باوجود اس کے کہ ایک شخص کسی عذر کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا وہ مرے گا۔بعض لوگ عدم فراست کی وجہ سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ چونکہ وجہ جائز ہے اس لئے نتیجہ نہیں نکل سکتا۔حالانکہ ان کا یہ خیال درست نہیں۔وجہ جائز ہو یا ناجائز نتیجہ ضرور نکلے گا۔تم اپنے سر پر اپنی کمائی سے خریدا ہوا تیل لگاؤ یا چوری سے حاصل کیا ہوا تیل لگاؤ سر ضرور چکنا ہوگا۔یہ نہیں کہ اپنی کمائی سے حاصل کردہ تیل سے سر چکنا ہو جاتا ہے اور چوری کے تیل سے سر سوکھا رہ جاتا ہے۔یہ نہیں کہ اپنی کمائی سے حاصل کئے ہوئے کپڑے سے تمہارا جسم ڈھک جائے اور چوری کئے ہوئے کپڑے سے جسم نہ ڈھکے۔کپڑا چاہے چوری کا ہو یا اپنی کمائی سے خریدا ہوا اس سے جسم ڈھک جائے گا۔جیسے اپنی

کمائی سے خریدے ہوئے کپڑے سے جسم ڈھک جاتا ہے اسی طرح چوری سے حاصل کئے ہوئے کپڑے سے بھی جسم ڈھک جاتا ہے۔ نتیجے دونوں کے ایک سے ہوں گے۔ روٹی کا نہ کھانا تو انسان پھر بھی برداشت کرسکتا ہے۔ مثلاً وہ خیال کرسکتا ہے کہ اگر وہ مرجائے گا تو کیا ہوگا اسے اگلے جہان میں تو زندگی مل جائے گی۔ یعنی اسے موت کے بعد اگلے جہان کی زندگی مل جاتی ہے۔ لیکن روحانی موت کا کوئی قائم مقام نہیں۔ جسمانی موت کے متعلق تم کہہ دو گے کہ سارے لوگ مرتے ہیں ہمیں موت آجائے گی تو کیا ہوا۔ اگلے جہان میں ہمیں زندگی مل جائے گی۔ لیکن اگر تمہیں روحانی موت آجائے تو تم کیا کرو گے۔ روحانی موت کا تو کوئی قائم مقام نہیں۔

پس نماز باجماعت کی عادت ڈالو اور اپنے بچوں کو بھی اس کا پابند بناؤ۔ کیونکہ بچوں کے اخلاق اور عادات کی درستی اور اصلاح کے لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ ضروری امر نماز باجماعت ہی ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں اتنے لوگوں سے ملنے اور مختلف حالات کی جانچ پڑتال کا موقع ملا ہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے میری طبیعت کو ایسا حساس بنایا ہے کہ سو سال کی عمر پانے والے بھی اپنی عمر کے تجربوں کے بعد دنیا کی اونچ نیچ اور اچھے برے کو اتنا محسوس نہیں کرسکتے جتنا میں محسوس کرتا ہوں۔ اور میں نے اپنے تجربہ میں نماز باجماعت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نیکی کے لئے ایسی مؤثر نہیں دیکھی۔ سب سے بڑھ کر نیکی کا اثر کرنے والی نماز باجماعت ہی ہے۔ اگر میں اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ کی پوری پوری تشریح نہ کرسکوں تو میں اپنا قصور سمجھوں گا۔ ورنہ میرے نزدیک نماز باجماعت کا پابند خواہ اپنی بدیوں میں ترقی کرتے کرتے ابلیس سے بھی آگے نکل جائے پھر بھی میرے نزدیک اس کی اصلاح کا موقعہ ہاتھ سے نہیں گیا۔ ایک شمّہ بھر اور ایک رائی کے برابر بھی میرے خیال میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز باجماعت کا پابند ہو اور پھر اس کی اصلاح کا کوئی موقعہ نہ رہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بدیوں میں مبتلا کیوں نہ ہو گیا ہو۔ نیکی کے متعلق نماز کے مؤثر ہونے کا مجھے اتنا کامل یقین ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر بھی کہہ سکتا ہوں کہ نماز باجماعت کا پابند خواہ کتنا ہی بداعمال کیوں نہ ہو گیا ہو اس کی ضرور اصلاح ہوسکتی ہے اور وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اور میں شرح صدر سے کہہ سکتا ہوں کہ آخری وقت تک اس کے لئے اصلاح کا موقعہ ہے مگر وہ نماز باجماعت کا پابند اس رنگ میں ہو کہ اس کو اس میں لذت اور سرور حاصل ہو۔

مجھے اپنا واقعہ یاد ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کچھ بیمار تھے اس لئے جمعہ کے لئے مسجد میں نہ جاسکے۔ میں اس وقت بالغ نہیں تھا کہ بلوغت والے احکام مجھ پر جاری ہوں۔ تاہم میں جمعہ کے لئے مسجد کو جارہا تھا کہ ایک دوست مجھے ملے اس وقت کی عمر کے لحاظ سے تو ان کی شکل اس وقت تک یاد نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر

اس واقعہ کا اثر مجھ پر ایسا ہوا کہ اب تک مجھے ان کی صورت یاد ہے۔محمد بخش ان کا نام تھا۔میں نے ان سے پوچھا۔ آپ واپس آ رہے ہیں کیا نماز ہوگئی ہے؟ انہوں نے کہا۔آدمی بہت ہیں مسجد میں جگہ نہیں تھی اس لئے میں واپس آ گیا ہوں۔میں بھی یہ جواب سن کر واپس آ گیا۔اور گھر میں آ کر نماز پڑھ لی۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ دیکھ کر مجھ سے پوچھا مسجد میں نماز پڑھنے کیوں نہیں گئے۔خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں بچپن سے ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادب ان کے نبی ہونے کی حیثیت سے کرتا تھا۔میں نے دیکھا۔آپ کے پوچھنے میں ایک سختی تھی اور آپ کے چہرہ سے غصہ ظاہر ہوتا تھا۔آپ کے اس رنگ میں پوچھنے کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا۔جواب میں میں نے کہا۔میں گیا تو تھا لیکن جگہ نہ ہونے کی وجہ سے واپس آ گیا۔آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔لیکن جس وقت جمعہ پڑھ کر مولوی عبدالکریم صاحب آپ کی طبیعت کا حال پوچھنے کے لئے آئے تو سب سے پہلی بات جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ سے دریافت کی وہ یہ تھی کہ کیا آج لوگ مسجد میں زیادہ تھے۔اس وقت میرے دل میں سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی۔کیونکہ میں خود تو مسجد میں گیا نہیں تھا۔معلوم نہیں بتانے والے کو غلطی لگی یا میری سمجھ میں غلط مفہوم آیا دونوں صورتوں میں الزام مجھ پر آئے گا کہ میں نے جھوٹ بولا۔مولوی عبدالکریم صاحب نے جواب دیا۔ہاں حضور! آج واقعہ میں بہت لوگ تھے۔میں اب بھی نہیں جانتا کہ اصلیت کیا تھی۔خدا نے میری بریت کے لئے یہ سامان کر دیا کہ مولوی صاحب کی زبان سے بھی اس کی تصدیق کرا دی یا فی الواقعہ اس دن غیر معمولی طور پر زیادہ لوگ آئے تھے۔بہر حال یہ ایک واقعہ ہوا جس کا آج تک میرے قلب پر ایک گہرا اثر ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نماز باجماعت کا کتنا خیال رہتا تھا۔بڑا آدمی اگر خود نماز باجماعت نہیں پڑھتا تو وہ منافق ہے۔مگر وہ لوگ جو اپنے بچوں کو نماز باجماعت ادا کرنے کی عادت نہیں ڈالتے وہ ان کے خونی اور قاتل ہیں۔اگر ماں باپ بچوں کو نماز باجماعت کی عادت ڈالیں تو کبھی ان پر ایسا وقت نہیں آ سکتا کہ یہ کہا جا سکے کہ ان کی اصلاح ناممکن ہے اور وہ قابل علاج نہیں رہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آجکل مسلمان مساجد میں جا کر نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور پھر مسجد سے نکل کر کسی قسم کے گناہ سے بھی ان کو پرہیز نہیں ہوتا۔جھوٹ وہ بولتے ہیں رشوت وہ لیتے ہیں۔فریب وہ کرتے ہیں۔خیانت سے ان کو پرہیز نہیں۔تجارتی دھوکوں سے وہ مجتنب نہیں۔غرض ہزاروں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہیں۔مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نماز کو ان شرائط کے ساتھ ادا نہیں کرتے جو اسلام نے مقرر کی ہیں۔اگر وہ ان شرائط کے ساتھ نماز ادا کرتے تو ان کے قلوب پاک ہو جاتے اور گناہوں کی میل دور ہو جاتی اور ہر قسم کے گناہوں اور بدیوں سے وہ محفوظ ہو جاتے

۔کیونکہ نماز کو سنوار کر پڑھنے والا اوران شرائط کو ملحوظ رکھنے والا جو اللہ تعالیٰ نے ادائے نماز کے لئے مقرر فرمائی ہیں اپنے اندر فوراً ایک تبدیلی پاتا ہے اور زیادہ دن نہیں گذرتے کہ اس کے اندر ایک خاص ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اسے بدیوں کی شناخت ہو جاتی ہے اور پوشیدہ در پوشیدہ بدیوں پر اسے اطلاع دی جاتی ہے اور مخفی در مخفی گناہوں کا علم جو دوسروں کو نہیں ہوتا اسے دیا جاتا ہے۔اور ملائکہ اسے ہر موقعہ پر ہوشیار کر دیتے ہیں۔کہ دیکھنا یہ گناہ ہے ہوشیار ہو جانا ۔اوراسے شیطان کے مقابلہ کی مقدرت عطا ہوتی ہے ۔کیونکہ نمازی اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا بلکہ اپنے بندہ کو اس کے اعمال کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیتا ہے۔جب نماز میں کمال تذلل اور خشوع اور خضوع کے ساتھ انسان خدا تعالیٰ کے حضور میں گر جاتا ہے اور وہ تمام تذلل کے طریق جن کو کسی ملک کے باشندوں نے اظہار عبودیت کے لئے تجویز کیا ہے استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اٹھاتا ہے اور جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے خدا تعالیٰ ملائکہ کو فرماتا ہے کہ دیکھو میرے اس بندہ نے میری پاکیزگی کا اقرار کیا ہے تم اسے پاک کر دو۔اوراس نے میری حمد کی ہے تم اس کی حمد کو دنیا میں پھیلاؤ۔اوراس نے میرے حضور میں کمال تذلل اور انکسار کا اظہار کیا ہے تم اس کو عزت و رفعت دو۔

غرض جوں جوں انسان نمازیں پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور حمد اور عظمت کا اقرار کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کے اعمال حسنہ کے ترازو کو بوجھل کرتا جاتا ہے اور انسان کا رفع ہوتا جاتا ہے۔اور چونکہ گناہ نتیجہ ہے مادیت کے تعلق کا۔جب انسان اس عالم سے بلند ہوتا جاتا ہے تو اس کا تعلق مادیت سے کم ہوتا جاتا ہے اور وہ گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔بری اور ناپسندیدہ باتوں سے رکنا بھی ایک بڑا مقصد ہے۔مگر نماز میں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے یہ اس سے بھی بڑا مقصد ہے۔وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے۔اس لئے جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو گے تو وہ بھی تمہیں یاد کرے گا۔تمہیں اپنے قرب اور الہام سے عزت بخشے گا اور تمہاری اور تمہاری قوم کی اصلاح کے سامان پیدا فرمائے گا۔چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دوسرے خطبہ میں جو کلمات پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اس کے کچھ الفاظ یہ بھی ہیں کہ اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ یعنی اللہ کو یاد کرو جس کے نتیجہ میں وہ تمہیں یاد کرے گا۔اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرة:۱۵۳) یعنی چاہیے کہ تم مجھے یاد کرو اس کے نتیجہ میں میں بھی تمہیں یاد کروں گا۔یعنی تمہیں اپنے قرب میں جگہ دوں گا اور تمہاری ہر تکلیف اور مصیبت میں تمہاری مدد کروں گا اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل

کر لے گا وہ بہت سی بدیوں سے بچ جائے گا۔اور خدا تعالیٰ کا معاملہ بھی اس سے محبت اور پیار کا ہو جائے گا۔اسی وجہ سے اسلام نے تمام اجتماعات میں ذکر الٰہی اور عبادت پر بڑا زور دیا ہے۔چنانچہ دیکھ لو ہم حج کے لئے جاتے ہیں۔ تو وہاں بھی ذکر الٰہی ہوتا ہے۔عیدین میں جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکر الٰہی ہوتا ہے۔شادی اور بیاہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکر الٰہی ہوتا ہے۔جنازہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکر الٰہی ہوتا ہے۔گویا ہمارے سب اجتماعوں کو بابرکت بنانے کا نسخہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بیان فرمایا ہے کہ ان میں ذکر الٰہی اور عبادت زیادہ کی جائے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس مجلس میں خدا تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے فرشتے اس میں اتر آتے ہیں۔پس مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اوقات کو اس طرح صرف کرے کہ ذکر الٰہی اس کی زبان پر جاری ہو اور نمازوں میں اسے شغف اور رغبت ہو۔ذکر الٰہی کرنا گویا سوچ آن Switch on کرنا ہے سوچ آن Switch on کر دیا جائے تو روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر سوچ آن Switch on نہ کیا جائے تو پھر اندھیرا ہی رہتا ہے۔اسی طرح اگر ذکر الٰہی نہ کیا جائے تو طبیعت روشن نہیں ہوتی۔پس اپنے اندر ذکر الٰہی کی عادت پیدا کرو تا خدا سے تمہارا تعلق بڑھ جائے۔تمہارے اندر ہمت پیدا ہو جائے تمہاری نظروں میں تاثیر پیدا ہو جائے اور دشمن کے دلوں میں بھی تمہارا رعب بیٹھ جائے۔اور دشمن خود بول اٹھے کہ یہ لوگ واقعی روحانیت کے پتلے ہیں۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا

اور اہل کتاب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ۔سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظلم کرنے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ

والے ہوں (ان کو الزامی جواب دے سکتے ہو) اور ان سے کہو کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں

اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور جو تم پر نازل ہوا ہے اس پر بھی۔اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے۔اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

تفسیر۔چونکہ قرآنی تبلیغ کے بڑے مخاطب یہود اور عیسائی ہی ہو سکتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ کا حکم دینے کے بعد اہل کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا اور فرمایا کہ جب تم قرآن ان کے

سامنے پیش کرو گے تو لازماً تورات اور انجیل کے ساتھ قرآن کا مقابلہ ہو جائے گا اور تمہاری ان سے بحثیں شروع ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں ہم تمہیں یہ ہدایت دیتے ہیں۔ کہ جب کبھی اہل کتاب سے بحث پیش آئے تو ایسی بات پیش کیا کرو جو مضبوط ہو اور خوبصورت نظر آنے والی ہو۔ کیونکہ ان کے پاس خدائی کتاب موجود ہے خواہ وہ محرّف ومبدّل ہی کیوں نہ ہو۔ مگر بہرحال اس میں کچھ نہ کچھ کلام تو خدا کا ہے۔ پس ان کے ساتھ بحث کرتے ہوئے قرآن کریم کو مدنظر رکھا کرو کیونکہ قرآنی دلیلیں بہت زبردست ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بائیبل کی دلیلیں نہیں چل سکتیں۔ اس جگہ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ سے قرآنی دلائل کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر وضاحتہً فرماتا ہے کہ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: ۲۴) یعنی ہم ایک قانون جاری کر رہے ہیں۔ مگر وہ کوئی جبری قانون نہیں وہ محض اپنی بادشاہت منوانے کے لئے نہیں بلکہ بہتر سے بہتر بات جو کہی جا سکتی ہے خواہ دینی رنگ میں یا دنیوی رنگ میں خواہ عقل سے خواہ نقل سے خواہ روایت سے خواہ درایت سے خواہ چھوٹوں کے لئے خواہ بڑوں کے لئے خواہ مردوں کے لئے خواہ عورتوں کے لئے ان تمام بہترین باتوں کو اس قانون میں جمع کر دیا گیا ہے اور اب قیامت تک یہ قانون منسوخ نہیں ہو سکتا۔ دنیوی حکومتیں بعض دفعہ بڑی سوچ بچار کے بعد قانون بناتی ہیں۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی انہیں اپنا قانون اپنے ہاتھوں سے منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ نے بڑا زور لگایا کہ وہ کسی طرح شراب کے استعمال کو روک دے اور اس نے اس پر قانونی پابندیاں بھی لگائیں مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی امریکہ کو شراب نوشی کی پھر اجازت دینی پڑی اور شراب کی ممانعت کا قانون اسے منسوخ کرنا پڑا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم جس قانون کے نفاذ کا اعلان کر رہے ہیں وہ اَحْسَنُ الْحَدِيْث پر مشتمل ہے۔ ہر بہتر سے بہتر بات اس میں موجود ہے اور وہ انتہائی طور پر پاک اور بے لوث قانون ہے۔ جس میں بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ ایسا قانون نہیں جو آج سے سو یا ہزار سال کے بعد منسوخ ہو سکے یا جس میں ردّ و بدل کی کوئی گنجائش نکل سکے۔ پس اس جگہ احسن سے مراد قرآنی دلائل ہی ہیں۔ یعنی اہل کتاب سے بحث کرتے وقت قرآنی دلائل کو مدنظر رکھا کرو۔ اٹکل پچو باتیں نہ کیا کرو۔

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ اس میں بتایا کہ ہماری اصولی ہدایت تو یہی ہے کہ بحث میں کبھی سختی سے کام نہ لو اور صرف دلائل تک اس گفتگو کو محدود رکھو۔ لیکن چونکہ دنیا میں بعض ایسے ظالم لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کے بزرگوں اور ان کے مقدس نبیوں پر بھی گند اچھالنے سے باز نہیں آتے اس لئے کبھی ایسے گندہ دہن دشمنوں سے تمہیں

مقابلہ پیش آ جائے تو تم انہیں الزامی جواب بھی دے سکتے ہو۔

جیسا کہ موجودہ زمانہ میں جب عیسائی پادریوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت گندے اور ناپاک اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور انہوں نے اپنی بدزبانی کے تیروں سے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کر دیا اور آپؐ کو (نعوذ باللہ) دجال اور کذاب کہنا شروع کر دیا اور ''امہات المومنین'' وغیرہ کتب لکھ کر اپنے اس بغض اور کینہ کو انتہا تک پہنچا دیا جو انہیں اسلام اور بانیٔ اسلام سے تھا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اناجیل کی رو سے انہیں الزامی رنگ میں بتایا کہ تم جس مسیح کو خدا قرار دے رہے ہو اس کی اپنی کیا حیثیت تھی اور اس کی پاکیزگی اور اخلاق کے متعلق تمہارے دعوے کہاں تک حق بجانب ہیں۔ آپ کے اس جواب پر عیسائی پادریوں کا شور مچانا تو ایک طبعی امر تھا۔ مگر بدقسمتی سے بعض مسلمانوں نے بھی اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ آپ نے (نعوذ باللہ) حضرت مسیحؑ کی ہتک کی ہے۔ حالانکہ آپ کے یہ جوابات قرآن کریم کی اسی آیت کی روشنی میں تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے گندہ دہن مخالفین کا استثناء کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم ہمیشہ نرمی اور محبت کے ساتھ دلائل پیش کرو۔ لیکن اگر کبھی کسی ایسے مخالف سے بحث پیش آ جائے جو گالیوں اور بدزبانی پر اتر آئے اور اسلام اور اس کے بزرگوں پر حملے شروع کر دے تو تم بھی مناسب رنگ میں اسے الزامی جواب دے کر خاموش کرا سکتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر اسی طریق سے کام لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں صاف طور پر ذکر آتا ہے کہ مخالف یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور قرآن کریم اس کا الزامی رنگ میں یہ جواب دیتا ہے کہ پہلے نبی بھی کھاتے پیتے تھے اور پہلے نبیوں کے بھی بیوی بچے تھے۔ اسی طرح گذشتہ زمانوں میں اسلامی بزرگ بھی اس طریق سے کام لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ایک دفعہ روم کے بادشاہ نے ایک مسلمان بادشاہ کو لکھا کہ آپ اپنا کوئی عالم ہمارے پاس بھجوائیں۔ ہم مذہب کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان بادشاہ نے ایک عالم کو بھجوا دیا۔ عیسائیوں نے پہلے ہی منصوبہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ مسلمان عالم کو آتے ہی ہم شرمندہ کریں گے۔ چنانچہ جب دربار لگ گیا تو ایک پادری اٹھا اور کہنے لگا۔ مولوی صاحب! آپ کے رسولؐ کی بیوی عائشہؓ پر الزام لگایا گیا تھا۔ اور الزام لگانے والے بھی آپ کی قوم ہی میں سے تھے۔ اس لئے یہ اعتراض کچھ مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان عالم جو غالباً امام ابن تیمیہؒ یا ان کے کوئی دوست تھے۔ بڑے ہوشیار تھے۔ کہنے لگے۔ پادری صاحب! دنیا میں دو عورتیں گذری ہیں۔ ایک کا خاوند تھا۔ خبیث لوگوں نے اس پر الزام لگایا۔ مگر ساری عمر اس کے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ لیکن ایک

اَورعورت (یعنی حضرت مریمؑ) تھی ۔جس کا خاوند بھی نہیں تھا۔اس پر دشمنوں نے الزام لگایا۔اوراس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگیا۔اب آپ بتایئے کہ الزام کس عورت پر لگتا ہے۔اس پر پادری سخت شرمندہ اورلا جواب ہوگیااور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے تو سختی شروع کردی۔وہ بات تو ہم نے یونہی کہی تھی۔

خود میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ گذرا ہے۔ایک دفعہ میرے پاس ایک انگریز آیااوراس نے کہا میں آپ سے اسلام کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کوئی الزامی جواب نہ دیں۔میں نے کہا اگرتم اسلام پر حملہ نہیں کروگے تو میں بھی الزامی جواب نہیں دوں گا۔لیکن جب باتیں شروع ہوئیں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا شروع کردیا۔میں نے جواب میں حضرت عیسیٰؑ پر حملہ کردیا اس سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔اور کہنے لگا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔میں نے کہا۔ دیکھو میرا تم سے وعدہ تھا کہ اگرتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہیں کروگے تو میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حملہ نہیں کروں گا۔چنانچہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی ۔لیکن تم نے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا ہے۔اگرتم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے غیرت ہے تو کیا میں ہی اتنا بے غیرت ہوں کہ مجھے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ دیکھ کر غیرت نہ آئے ۔اگرتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک حملہ کروگے تو میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بیس حملے کروں گا ۔چنانچہ وہ اسی وقت اٹھ کھڑا ہوااور کہنے لگا میں عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرسکتا۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عیسائیوں کو الزامی جواب دینا ہرگز قابل اعتراض امر نہیں تھااور نہ آپ کے بعض سخت الفاظ کے مخاطب تمام اقوام کے نیک اور مہذب اور سنجیدہ لوگ تھے ۔بلکہ صرف ایسے ہی لوگ آپ کے مخاطب تھے جنہوں نے شرافت سے کام نہ لیااور اسلام پر گند اچھالنا شروع کردیا چنانچہ آپ اس بارہ میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

''ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم نیک علماء کی ہتک اور مہذب شرفاء کی عیب چینی کریں۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا مسیحی ہوں یا ہندو ہوں بلکہ ہم ان اقوام میں سے جو بیوقوف ہیں ان کے لئے بھی سخت کلامی نہیں کرتے ۔ہم صرف ان کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بیہودہ گوئی میں مشہور ہیں اور بدکلامی کی اشاعت جن کا کام ہے۔لیکن وہ جو ان باتوں سے پاک ہیں اوران کی زبان

گند سے آلودہ نہیں۔ہم ایسے لوگوں کا ذکر ہمیشہ نیکی سے کرتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کو بلند درجہ پر بٹھاتے ہیں اور ان سے اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔‘‘

(لجۃ النور ، روحانی خزائن جلد ۱۶ صفحہ ۶۷)

پھر لکھا ہے :۔

’’ہماری اس کتاب میں اور رسالہ ’’فریادِ درد‘‘ میں وہ نیک چلن پادری اور دوسرے عیسائی مخاطب نہیں ہیں جو اپنی شرافت ذاتی کی وجہ سے فضول گوئی اور بدگوئی سے کنارہ کرتے ہیں اور دل دکھانے والے لفظوں سے ہم کو دکھ نہیں دیتے اور نہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور نہ ان کی کتابیں سخت گوئی اور توہین سے بھری ہوئی ہیں۔ایسے لوگوں کو بلاشبہ ہم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ ہماری کسی تحریر کے مخاطب نہیں صرف وہی لوگ ہمارے مخاطب ہیں خواہ وہ بگفتن مسلمان کہلاتے ہیں یا عیسائی۔جو حد اعتدال سے بڑھ گئے ہیں اور ہماری ذاتیات پر بدگوئی سے حملہ کرتے یا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بزرگ میں توہین اور ہتک آمیز باتیں منہ پر لاتے اور اپنی کتابوں میں شائع کرتے ہیں سو ہماری اس کتاب اور دوسری کتابوں میں کوئی لفظ یا کوئی اشارہ ایسے معزز لوگوں کی طرف نہیں ہے جو بدزبانی اور کمینگی کے طریق کو اختیار نہیں کرتے۔‘‘

(ٹائیٹل پیج ایام الصلح ، روحانی خزائن جلد ۱۴)

یہ تشریح جو اوپر بیان کی گئی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس جگہ اِلَّا کو استثناء متصل قرار دیا جائے گا۔اور یہی نقطہ نگاہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔لیکن علامہ ابوالبقاءؒ نے لکھا ہے کہ اِلَّا کو استثناء منقطع بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس صورت میں اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ کے یہ معنے ہوں گے کہ ایسے ظالموں سے جھگڑو ہی نہیں بلکہ یہ کہہ دو کہ تم بھی خدا کی کتاب کے ماننے والے ہو اور ہم بھی۔اور ہمارا تمہارا خدا ایک ہی ہے۔پھر لڑنے سے کیا فائدہ؟ ہم تم سے بحث ہی نہیں کرنا چاہتے۔گویا اگر وہ بدزبانی کریں تب بھی ان سے سختی کے ساتھ پیش نہ آؤ بلکہ عفو سے کام لو اور ان سے اعراض اختیار کرو۔

پھر فرمایا ہم تمہیں ایک اور نصیحت یہ کرتے ہیں کہ جب اہل کتاب سے تمہیں مقابلہ پیش آئے تو قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔تم انہیں یہ کہا کرو کہ ہم تو اس کلام کو بھی مانتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا اور اس کلام پر بھی اصولی رنگ میں ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوا۔اور تمہارا معبود اور

ہمارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں پس آپس میں جھگڑنے سے کیا فائدہ۔ ہم لوگوں کو مل کر خدائے واحد کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس طریق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران:۶۵) اے اہل کتاب! کم سے کم ایک ایسی بات کی طرف تو آجاؤ۔ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب کا درجہ دیا کریں۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو اس میں اسلام کی حقیقت پسندی کا ایک نہایت ہی زبردست مظاہرہ کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہوا ہے جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۔ (المائدۃ:۸۳) یعنی تُو مومنوں سے عداوت رکھنے میں یقیناً یہودیوں کو اور ان لوگوں کو جو مشرک ہیں سب سے زیادہ سخت پائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں ہر قسم کے نیک سلوک کے باوجود یہود بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے آپ کی ہر قسم کی مخالفتیں کرتے رہے۔ اکثر جنگیں یہود کے اکسانے پر ہی ہوئیں بلکہ کسریٰ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قتل کروانے پر بھی انہوں نے ہی اکسایا تھا گو خدا نے ان کا مونہہ کالا کیا۔ مگر انہوں نے اپنے خبث باطن کا اظہار کر دیا۔ غزوۂ احزاب کی لیڈری بھی یہود ہی کے ہاتھ میں تھی۔ سارا عرب اس سے قبل کبھی اکٹھا نہیں ہوا تھا۔ دراصل مکہ والوں میں ایسی قوت نظام تھی ہی نہیں۔ یہ مدینہ سے جلاوطن شدہ یہودی قبائل کا ہی کارنامہ تھا کہ انہوں نے قریش اور غطفان اور بنو سلیم اور بنو اسد اور بنو سعد اور عرب کے دوسرے زبردست قبائل کو اکٹھا کر کے مدینہ کے سامنے لا ڈالا۔ خدا نے اس وقت بھی ان کا منہ کالا کیا۔ مگر یہود نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل دشمن مکہ والے تھے۔ مگر مکہ والوں نے کبھی دھوکا سے آپ کی جان لینے کی کوشش نہیں کی۔ آپؐ جب طائف گئے اور ملک کے قانون کے مطابق مکہ کے شہری حقوق سے آپ دستبردار ہو گئے مگر پھر آپ کو لوٹ کر مکہ میں آنا پڑا تو اس وقت مکہ کا ایک شدید ترین دشمن آپؐ کی امداد کے لئے آگے آیا۔ اور مکہ میں اس نے اعلان کر دیا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہریت کے حقوق دیتا ہوں۔ وہ اپنے پانچوں بیٹوں سمیت آپ کے ساتھ ساتھ مکہ میں داخل ہوا اور اس نے اپنے

بیٹوں سے کہا۔ کہ محمدؐ ہمارا دشمن ہی سہی پر آج عرب کی شرافت کا تقاضا ہے کہ جب وہ ہماری امداد سے شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو ہم اس کے مطالبہ کو پورا کریں۔ ورنہ ہماری عزت باقی نہیں رہے گی اور اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اگر کوئی دشمن آپ پر حملہ کرنا چاہے تو تم میں سے ہر ایک کو اس سے پہلے مرجانا چاہیے کہ وہ آپ تک پہنچ سکے۔ یہ تھا عرب کا شریف دشمن۔ اس کے مقابلہ میں بد بخت یہودی جس کو قرآن کریم مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہے اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر پر بلایا اور صلح کے دھوکا میں چکی کا پاٹ مکان کی چھت پر سے پھینک کر آپ کو مارنا چاہا۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو اس کے منصوبہ کی خبر دے دی۔ اور آپؐ سلامتی سے وہاں سے نکل آئے۔ اسی طرح یہودی قوم کی ایک عورت نے آپ کی دعوت کی اور زہر ملا ہوا کھانا آپؐ کو کھلایا۔ آپ کو خدا تعالیٰ نے اس موقعہ پر بھی بچالیا۔ مگر یہودی قوم نے اپنا اندرونہ ظاہر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی بدترین دشمن قوم سے کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر اتنے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کریم یہود کو دعوت اتحاد دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے ہمارے رسول یہودیوں کو جو تیرے اتنے دشمن ہیں اور عیسائیوں کو جو تجھے جھوٹا اور کذاب سمجھتے ہیں کہو کہ تم مجھے جھوٹا کہو مگر تم میرے خدا کو تو مانتے ہو۔ آؤ ہم اس خدا کی وحدانیت قائم کرنے کے لئے اکٹھے مشن کھولیں اور توحید کو دنیا میں پھیلائیں۔ لیکن اگر اس دعوت اتحاد کے باوجود وہ پھر بھی اکٹھے نہ ہوں تو تُو انہیں کہہ دے کہ ہم تو خدا کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

زیر تفسیر آیت میں بھی اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر اہل کتاب سے بحث ہو ہی جائے۔ تو قرآنی دلائل کو کام میں لایا کرو۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ ان کو ادھر توجہ دلاتے رہو کہ بے ہودہ باتوں سے کیا فائدہ ہم بھی موحد ہیں اور تم بھی موحد ہو۔ ہم بھی خدا کے کلام پر ایمان لاتے ہیں اور تم بھی خدا کے کلام پر ایمان لاتے ہو۔ بلکہ ہم تم سے بڑھ کر ہیں کہ تم پر نازل ہونے والے کلام پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اپنے او پر نازل ہونے والے کلام پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ پس بحثوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ آؤ ہم مل کر ان لوگوں میں خدائے واحد کی تبلیغ کریں جو خدائے واحد کو نہیں مانتے۔ افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ تیرہ سو سال سے یہ تعلیم قرآن میں موجود ہے۔ آج تک عیسائیوں اور یہودیوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ میں ۵۵ء میں بیماری کے علاج کے لئے یورپ گیا تو ایک کالج کے منتظمین نے مجھے لیکچر کی دعوت دی اور بہت سے گریجوایٹ وغیرہ لیکچر سننے کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کے لئے کہا۔ جس کی مجھے عادت نہ تھی۔ مگر ان کے اصرار پر میں نے ان کی بات مان لی۔ چونکہ طالبعلم مختلف قوموں کے تھے کچھ جرمن سمجھتے تھے کچھ فرانسیسی کچھ سوس کچھ آسٹریلین۔ کچھ یہودی۔ اس

لئے انہوں نے یو۔این۔او کی طرح یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ میری انگریزی تقریر ریڈیو کے ذریعہ مختلف کمروں میں جاتی۔ جہاں مختلف قوموں کے علماء بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ترجمہ کر کے فوراً اس زبان میں اسے ریلے کر دیتے تھے۔ ہر زبان کے جاننے والے نے اپنا آلہ اپنے کانوں کو لگایا ہوا تھا جس کے ذریعہ سے وہ ساتھ ساتھ میری انگریزی کی تقریر کو اپنی زبان میں سنتا جاتا تھا۔ میری تقریر کے بعد بہت سے سوالات ہوئے۔ جن میں سے ایک سوال یہ تھا۔ کہ آپ نے جو اسلام کی باتیں بتائی ہیں۔ یہ تو وہی ہیں جو عیسائیت اور یہودیت پیش کرتی ہے۔ پھر یہ کیا جھگڑا نظر آتا ہے کہ مسلمان عیسائیوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور عیسائی مسلمانوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ یہودی عیسائیوں اور مسلمانوں کو برا سمجھتے ہیں اور عیسائی اور مسلمان یہودیوں کو برا سمجھتے ہیں۔ گویا دنیا نہ موسیٰؑ کے خدا کو مانتی ہے نہ عیسیٰؑ کے خدا کو مانتی ہے۔ اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کو مانتی ہے ایسی صورت میں ان جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے سب مل کر یہ کیوں نہیں طے کر لیتے کہ سب لوگ ایک خدا کو مانیں اس کی سچے دل سے عبادت کریں اور اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے یہ سوال سن کر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آج سے تیرہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے ان جھگڑوں کے تصفیہ کا یہی طریق بتایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا (اٰل عمران: ۶۵) یعنی اے اہل کتاب آؤ میں تمہیں ایک کلمہ پر جمع ہونے کا طریق بتاؤں۔ جو تمہارے نزدیک بھی مسلّمہ ہے اور ہمارے نزدیک بھی مسلّمہ ہے۔ وہ طریق یہ ہے کہ ہم سب ایک خدا کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں۔ تیرہ سو سال ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علاج بتایا تھا اور تمام اہل کتاب کو اس اصل کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ مگر تمہارے باپ دادا نے قرآن کریم کی اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ پس بجائے ہم سے سوال کرنے کے تم اپنے باپ دادا کا شکوہ کرو۔ اور اپنے بزرگوں سے کہو کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی اچھی تعلیم پیش کی تھی تو تم نے اسے قبول کیوں نہ کیا اور اپنا منہ کیوں پھیر لیا۔ بہر حال اس اتحاد کے نہ ہونے کا الزام اگر آتا ہے۔ تو تمہارے باپ دادا پر آتا ہے۔ ورنہ تیرہ سو سال سے قرآن کریم میں یہ بات موجود ہے اب اگر تمہیں کوئی شکوہ ہے تو اپنے باپ دادا سے شکوہ ہونا چاہیے۔ ہم سے نہیں ہونا چاہیے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

اور اسی طرح (پہلی کتابوں کی مصدق بنا کر) ہم نے تجھ پر یہ مکمل کتاب (یعنی قرآن کریم) اتاری ہے۔ پس وہ

الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ

لوگ جن کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے (یعنی اہل کتاب میں سے)

وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

بھی بعض اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ہماری آیتوں کا ضد کے ساتھ انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔

تفسیر۔ فرمایا جس طرح موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح اب ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ گویا اس زمانہ میں تیرا وجود موسیٰؑ کا وہ طور ہے۔ جہاں خدا بول رہا ہے۔ پس وہ خوش قسمت لوگ جن کو ہم نے یہ کتاب عطا فرمائی ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو۔ وہ تو اس کتاب کے ایک ایک حرف کی صداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور اس کی سچائی کے ثبوت میں اپنی جانیں تک قربان کر رہے ہیں بلکہ اہل کتاب میں سے بھی بعض (کیونکہ مِنْ بعضیہ بھی ہوتا ہے) ایسے ہیں جو اس قرآن کو موسیٰؑ کی پیشگوئیوں کا مصدق سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لے آئے ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو یہود کے ایک بہت بڑے عالم تھے۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو جانتے بوجھتے ہوئے محض ضد اور تعصب کی وجہ سے اس کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اول درجہ کے ناشکر گذار ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کتاب نے دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے اور مردہ دنیا میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے نشان کو دیکھنے کے باوجود انہوں نے صداقت کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔ پس یہ لوگ در حقیقت کافرِ نعمت ہیں اور ایسے ہی لوگ ہمارے روشن نشانات کی تکذیب کیا کرتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ

اور اس (یعنی قرآن) کے نازل ہونے سے پہلے تُو کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا۔ نہ لوگوں کو سناتا تھا اور نہ اسے اپنے

بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۹﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ

دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو جھٹلانے والے شبہ میں پڑ جاتے۔ مگر یہ (قرآن) تو کھلی کھلی نشانیاں ہیں ان

فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

لوگوں کے دلوں میں جن کو علم دیا گیا ہے اور ہمارے نشانات کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔

تفسیر۔ اس آیت کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہاں صرف تلاوت کی نفی مقصود نہیں بلکہ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (سورۃ البیّنہ آیت ۳) کی تشریح کی گئی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے یعنی ظاہری علوم سے آپ قطعی طور پر ناواقف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انکار کرنے والے شبہ میں پڑ سکتے تھے کہ شاید دوسری کتابوں سے اس نے علم حاصل کر لیا ہے۔ مگر اب تو ان کے لئے اس قسم کے شبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ تلاوت درحقیقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک کتاب کو دیکھ کر اور دوسرے کسی بات کو دوہرانے سے خواہ وہ دوہرانے والا نابینا یا اَن پڑھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایک اَن پڑھ آدمی جس نے قرآن کریم کا کچھ حصہ زبانی یاد کیا ہوا ہو۔ قرآن کریم پڑھے تو وہ بھی تلاوت کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نابینا شخص قرآن کریم یاد کر لے اور پھر قرآن کریم پڑھے۔ تب بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ چنانچہ امام الصلوٰۃ جو روزانہ نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کو دیکھ کر تلاوت نہیں کرتے۔ بلکہ جو کچھ انہیں یاد ہوتا ہے اسے پڑھ دیتے ہیں۔ پس مِنْ كِتٰبٍ کہہ کر دونوں طرح کی تلاوت کی نفی کر دی گئی ہے اس تلاوت کی بھی جو کتاب کو دیکھ کر کی جاتی ہے اور اس تلاوت کی بھی جو زبانی کی جاتی ہے۔

کتاب کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ خط کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ورنہ عام کتابوں کے لئے قرآن کریم میں کتاب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ کتاب کے لفظ کا استعمال ہمیشہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں کے متعلق ہی کیا جاتا ہے۔ پس مِنْ كِتٰبٍ سے مراد مِنَ الْكُتُبِ السَّمَاوِيَّةِ ہے۔ یعنی کتب سماویہ میں سے آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور یہ ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے

مخالفین کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ تورات اور انجیل کی باتیں دوہرا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ مجھے یہ یہ الہام ہوا ہے۔ بلکہ اب تک عیسائی بھی یہی اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ان کے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ منکرین کہتے ہیں هِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا اسے صبح شام لوگ تورات کی آیتیں سناتے ہیں ۔جنہیں یہ دوہرا دیتا ہے ۔یعنی ہماری کتابوں سے چُرا چُرا کر یہ باتیں بیان کر دیتا ہے ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارا یہ رسول اُمّیوں میں رہتا ہے اور ان سے سارا دن باتیں کرتا رہتا ہے مگر شام تک تو یہ تورات اور انجیل کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ صبح کو اٹھتا ہے تو ان کتابوں کے واقعات دوہرانا شروع کر دیتا ہے اور دہراتا بھی اس شان سے ہے کہ تورات اور انجیل کے تمام غلط واقعات کی تصحیح کرتا چلا جاتا ہے۔اور جن واقعات کو بائیبل نے ترک کر دیا ہے ان کو بیان کر دیتا ہے۔ گویا وہ تورات کی نقل نہیں کرتا بلکہ تورات کی خامیوں کی اصلاح کرتا اور پھر اس گرد وغبار کو بھی دور کرتا ہے جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ کے ہاتھوں انبیاء کے مقدس چہروں پر پڑ گئی تھی۔ پھر بعض مسائل تورات کے ایسے بھی تھے جن کو اس وقت خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے۔مثلاً احادیث میں لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک آدمی کو لے کر آئے جس پر زنا کا الزام تھا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تورات میں زانی کے لئے کیا سزا ہے؟ وہ کہنے لگے ہمارے ہاں تو اس کا کوئی ذکر نہیں۔آپ نے فرمایا۔نکالو تورات۔انہوں نے تورات کھولی۔تو اتفاق کی بات ہے کہ وہی صفحہ نکلا جس میں زانی کے لئے رجم کا حکم تھا۔ایک یہودی نے جلدی سے اس جگہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔لیکن حضرت عبداللہ بن سلام نے دیکھ لیا اور انہوں نے اس سے کہا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ اس نے ہاتھ اٹھایا تو نیچے زانی کے لئے رجم کا حکم موجود تھا۔جب اس قسم کے موٹے موٹے مسائل سے بھی اکثر یہود ناواقف تھے تو ان کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ باریک مسائل کے متعلق علم رکھتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ علوم ان سے حاصل کرتے تھے۔ بلکہ حدیثوں سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تورات پڑھنی شروع کی تو آپؐ سخت ناراض ہوئے (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة) ایسی صورت میں یہ خیال بھی کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ یہودی علماء سے تورات کی باتیں معلوم کیا کرتے تھے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دشمنوں کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ لوگ جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ آپؐ نے تورات اور انجیل پڑھ کر یہ باتیں معلوم کر لی ہیں آپؐ کے

لئے تو تورات اور انجیل پڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آپؐ اُمّی اور اَن پڑھ تھے۔ اور اگر بالفرض آپؐ نے وہ کتابیں پڑھی ہوتیں تو ان کے واقعات کے متعلق ضروری تھا کہ آپؐ دوسروں سے باتیں بھی کرتے۔ آخر جب کوئی شخص علم حاصل کرتا ہے تو وہ ایک دو دن میں ہی اس کے تمام مسائل سے واقف نہیں ہوجاتا بلکہ وہ سال دو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک پڑھنے کے بعد اس کے مسائل کے متعلق واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اور پھر جو علم وہ حاصل کرتا ہے اس کے متعلق دوسرے لوگوں سے گفتگو بھی کرتا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو ہمارے اس رسولؐ نے اس سے پہلے کسی سے اس قسم کی باتیں نہیں کیں پھر اب جو یکدم اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ باتیں اسے کسی ایسی ہستی نے بتائی ہیں جو تمام دنیا کے عالموں سے زیادہ علم رکھنے والی ہے۔ ورنہ ہمارا یہ رسولؐ تو اپنی زبان میں لکھی ہوئی کتاب بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کسی دوسری زبان میں لکھی ہوئی کتاب کس طرح پڑھ سکتا ہے۔

پس یہاں مِنْ كِتٰبٍ سے مراد کتب سماویہ ہیں اور خدا تعالیٰ مخالفین اسلام کو اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ہمارا یہ رسول تم میں ہی رہتا ہے کیا اس کو کبھی کسی نے تورات یا انجیل کے متعلق باتیں کرتے دیکھا۔ اگر نہیں تو پھر کس طرح ایک ہی رات میں اس نے ان کتابوں کو پڑھ لیا۔ اور ایک ہی رات میں غیر زبان سیکھ لی۔ اور ان کتابوں کے سارے مضامین ازبر کر لئے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ بھی تو ایک معجزہ ہے۔ مگر یہ تو ان کتابوں سے بالکل ناواقف تھا۔ اس نے کبھی ان کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی۔ پھر سوچنے والی بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات پڑھنی کس سے تھی۔ مکہ میں صرف ایک ہی شخص ورقہ بن نوفل تھے جو تورات کے بعض حصے عبرانی سے عربی میں نقل کیا کرتے تھے۔ مگر ساری تورات وہ بھی نہیں جانتے تھے۔ دعویٰ کرنے کے بعد جب آپؐ نے دیکھا کہ بعض لوگ تورات پڑھتے ہیں تو آپؐ نے ان کو منع فرما دیا تاکہ ان پر قرآن کریم اور تورات کے مسائل مختلط نہ ہوجائیں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی مسئلہ تورات میں ہو اور وہ اس کے متعلق یہ خیال کرلیں کہ یہ قرآن کریم میں ہے۔ یا کوئی مسئلہ قرآن کریم میں ہو اور وہ اس کے متعلق یہ سمجھیں کہ یہ تورات میں ہے۔ اس لئے آپ نے تورات کے پڑھنے سے منع فرما دیا۔ اسی طرح حدیثوں کے لکھنے سے بھی منع فرما دیا۔ کیونکہ اس وقت قرآن کریم اتر رہا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ دوسری باتیں اس میں مخلوط نہ ہوجائیں۔

وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس کتاب کی تلاوت کی نفی کی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے لکھا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ نفی بھی عام ہے۔ یعنی کتب سماویہ میں سے کوئی کتاب آپ لکھا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ نفی اس لئے بھی ضروری تھی کہ ممکن تھا کوئی شخص یہ خیال کرلیتا کہ ورقہ بن نوفل نے جس قدر تورات کا ترجمہ کیا تھا

شاید اسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کر لیا ہو۔ کیونکہ بعض دفعہ انسان گو مضمون نہیں سمجھتا مگر نقل کرتا جاتا ہے ۔جیسے کاپی نویس بعض دفعہ مضمون نہیں سمجھتے مگر نقل کر لیتے ہیں۔اور جو شخص اس طرح نقل کرے وہ کچھ نہ کچھ حروف سمجھ بھی جاتا ہے۔مثلاً مجھے عبرانی نہیں آتی۔لیکن بعض الفاظ جو عربی سے ملتے جلتے ہیں سمجھ آ جاتے ہیں۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے۔''اِیْلِی اِیْلِی لِمَا سَبَقْتَانِیْ'' یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں مگر عربی کے ساتھ ملتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں یہ مفہوم ہے کہ اِلٰهِیْ اِلٰهِیْ لِمَ تَرَكْتَنِیْ خَلْفًا وَذَهَبْتَ اَمَامًا۔ سَبَقَ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کوئی شخص آگے نکل جائے اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ جائے گویا سَبَقْتَنِیْ کے معنے تَرَكْتَنِیْ کے ہیں۔اب گو میں عبرانی نہیں جانتا لیکن چونکہ میں عربی جانتا ہوں۔اس لئے ایسے الفاظ کو آسانی سے سمجھ سکتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تنزل کے طور پر فرمایا کہ تُو تو ان کتابوں کو نقل بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح تجھے کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ سے ایسا ہی لکھنا مراد ہے جیسے کاتب بے سوچے سمجھے لکھ دیتے ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ میں بتایا کہ اس قرآن میں ایسی تعلیم ہے کہ آسمانی علم والے لوگ فوراً اسے اپنے دلوں میں محسوس کرنے لگتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔صرف ظالم ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔یعنی اگر یہ خدائی کلام نہ ہوتا تو خشیۃ اللہ رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں اس کے ذریعہ سے علم وعرفان کے چشمے کیوں پھوٹ پڑتے۔ یہ بات تو صرف الٰہی تائید سے ہوتی ہے اور تائید الٰہی اسی کلام کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے ہو۔غرض اس آیت میں اس اعتراض کا ردّ کیا گیا ہے جو بالعموم دشمنان اسلام کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات اور انجیل کو پڑھ پڑھ کر یا لوگوں سے سن سن کر یہ باتیں قرآن میں درج کر لی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کریم میں تو ایسے علوم ہیں جو پہلی کتابوں میں ہیں ہی نہیں۔اور جب وہ ان علوم سے خالی ہیں تو نقل کیسے ہو گئی۔مخالفین کا فرض ہے کہ وہ پہلے یہ ثابت کریں کہ ان کی کتابوں میں یہ مضمون موجود تھے۔لیکن جب ان کی کتابیں ان تمام حقائق و معارف سے خالی ہیں جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں تو یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری کتابوں سے یہ باتیں اخذ کی ہیں سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا

اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانات نہیں اترے۔ کہو کہ نشانات تو

الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ اَوَ لَمْ

خدا کے پاس ہیں (جب وہ فائدہ دیکھتا ہے اتارتا ہے) اور میں تو ایک کھلا کھلا ہوشیار کرنے والا ہوں۔

يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ

کیا ان کے لئے (یہ نشان) کافی نہ تھا کہ ہم نے تجھ پر ایک مکمل کتاب (یعنی قرآن) کو نازل کیا جو انہیں پڑھ کر

ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع

سنائی جاتی ہے اس امر میں مومنوں کے لئے تو بڑی رحمت اور نصیحت کے سامان ہیں۔

تفسیر۔ فرمایا۔ ظالم لوگ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اترے۔ اے محمدؐ رسول اللہ! تو ان سے کہہ دے کہ تمہارے نزدیک تو نشان سے مراد نشان عذاب ہی ہوتا ہے اور ایسے نشان بھی خدا کے پاس موجود ہیں۔ مگر میرا کام تو صرف ہوشیار کرنا ہے۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر ایک مکمل کتاب اتاری ہے جو ان کے لئے اپنے اندر رحمت کا بڑا بھاری سامانِ ہدایت رکھتی ہے۔

فرماتا ہے اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ارے اب بھی ان کو کسی اَور جگہ جانے کی ضرورت ہے۔ جبکہ ہم نے انہیں اتنی بڑی چیز دے دی ہے جس کی اَور کہیں مثال ہی نہیں ملتی۔ یعنی ہم نے ایک کامل کتاب اتار دی ہے اور وہ ایسی کتاب ہے کہ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ سمندر کے پاس تو لوگ جاتے ہیں۔ مگر یہ سمندر ایسا ہے کہ آپ تمہارے پاس چل کر آ گیا ہے۔ پھر دنیا میں تو لوگ استادوں کے پاس جاتے اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں بتایا جائے کہ فلاں بات کس طرح ہے۔ مگر یہاں وہ استاد بھیجا گیا ہے کہ جسے خدا کی طرف سے یہ حکم ہے کہ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدۃ: ۶۸) تم خود لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں یہ تمام باتیں پہنچاؤ۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم نے ان میں سے ایک بات بھی نہ پہنچائی تو ہم کہیں گے

کہ تم نے کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ گویا ہمارا استاد اور ہمارا آقا خود ہمارے گھروں پر چل کر آ گیا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَةً۔ اگر تم سوچو تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے اپنے رسولؐ کو جو یہ حکم دیا ہے یہ تم پر ہمارا اتنا عظیم الشان انعام ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی قرآن کریم میں رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ رکھا گیا۔ گویا پنجابی کی وہی مثال یہاں صادق آ رہی ہے کہ ''چوپڑیاں تے دودو'' یعنی روٹیاں گھی سے چُپڑی ہوئی بھی ہوں اور پھر ملیں بھی دودو۔ تو کیا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ ہم تمہیں ایک تو چپڑی ہوئی روٹیاں دے رہے ہیں اور پھر دودو دے رہے ہیں۔ ایک تو ہم نے وہ کتاب دی جو ہر طرح کامل اور مکمل ہے اور جس کی نظیر کسی اور الہامی کتاب میں نہیں مل سکتی اور پھر اپنے رسول کو یہ حکم دے دیا ہے کہ جاؤ اور ہماری کتاب خود لوگوں کے گھر پہنچ کر انہیں سناؤ۔ اور اس کی تعلیموں سے انہیں آگاہ کرو۔

وَذِکْرٰی۔ ایک نعمت تو یہ تھی کہ اتنی عظیم الشان نعمت گھر بیٹھے مل گئی۔ اور دوسری نعمت یہ ہے کہ جو اس کتاب کو مان لیں گے دنیا میں ان کی عزت قائم کر دی جائے گی۔ بعض لوگ اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں نصیحت کی باتیں ہیں۔ یہ معنے بھی درست ہیں مگر اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ جو لوگ اس کتاب پر سچے دل سے ایمان لائیں گے ان کا ذکر نیک دنیا میں جاری رہے گا۔ اور کہا جائے گا کہ فلاں نے یہ خدمت کی اور فلاں نے وہ خدمت کی۔ گویا یہ کتاب نہ صرف ذاتی کمالات کے لحاظ سے ایک شرف اور عظمت رکھتی ہے بلکہ جو لوگ اس پر صدق دل سے ایمان لائیں گے وہ بھی دنیا میں معزز اور مکرّم ہو جائیں گے اور چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے جبکہ ہر زمانہ اپنے ساتھ نئی ضروریات لاتا اور نئے تغیرات پیدا کرتا ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمادیا کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے اس حدیث کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مختلف زمانوں کے تغیرات کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنے کھلتے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے لوگوں کو قرآن کریم کی کئی آیات کے وہ معنے نظر نہ آئے جو بعد میں تغیر آنے والے زمانہ کے لوگوں کو نظر آئے۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کے جو نکات اور معارف نکالے وہ قرآن کریم میں نئی آیات داخل کر کے نہیں نکالے آیات وہی تھیں ہاں آپ پر اس زمانہ کے مطابق ان کا بطن ظاہر ہوا۔ چونکہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ مذہب کے متعلق امن اور صلح کا زمانہ تھا اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم سے امن کے احکام اور صلح کی تعلیم پیش فرمائی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح الفاظ میں

فرمایا ہے کہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۔ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ ۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ۔ یعنی تجھے اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ تُو لوگوں سے جبری طور اپنا مذہب منوائے ۔ نہ ہم نے ان پر جبر کرنے کے لئے بھیجا ہے جو منہ پھیر لیتے ہیں اور کفر اختیار کرتے ہیں ۔ان لوگوں کو سزا دینا خدا کا کام ہے ۔ تیرا کام نہیں۔ کیونکہ خدا دلوں کے حالات کو جانتا ہے تو نہیں جانتا۔

یہ دوسرا بطن تھا جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق آپ پر کھولا گیا۔اور اسلام کی تائید میں تلوار اٹھانے سے منع کیا گیا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ دنیا میں سات بڑے بڑے تغیرات آئیں گے اور ہر تغیر کے زمانہ میں لوگوں کے ذہن بدل جائیں گے ۔اس وقت خدا تعالیٰ قرآن کریم کے ایسے معنے کھول دے گا جو لوگوں کے اس وقت کے ذہنوں اور قلوب کو تسلی دینے والے ہوں گے ۔اس زمانہ میں بیسیوں مسائل ایسے رنگ میں کھلے ہیں کہ پہلے ان کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی جاسکتی تھی ۔مثلاً آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ ہے ۔ پہلے ایسے وقت میں نسخ کا سوال پیدا ہوا کہ اس وقت کے لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ کیونکہ ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل تھا۔ پس باوجود نسخ کے عقیدہ کے یہ بات قرآن کریم کی سچائی کے معلوم کرنے میں روک نہ بن سکتی تھی ۔لیکن جب ایسا زمانہ آیا کہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے دور ہوئے اور دنیا کے ذہنی اور علمی تغیر کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنے نہ کر سکے تو کہنے لگے یہ آیت بھی منسوخ ہے اور وہ آیت بھی منسوخ ہے ۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھڑا کیا اور آپ نے ثابت کیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ان معنوں میں منسوخ نہیں ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اور جن آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا تھا ان کے ایسے معنے بیان فرمائے جنہیں لوگوں کی عقلیں بآسانی قبول کرسکتی ہیں۔ یہ ان آیات کا دوسرا بطن تھا جو خدا تعالیٰ نے آپ پر کھولا۔

تو قرآن کریم کے سات بطن سے مراد سات عظیم الشان ذہنی اور عقلی اور علمی تغیرات ہو سکتے ہیں اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ہر ایسے تغیر میں قرآن کریم قائم رہے گا اور کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہمارے زمانہ کی ضروریات کو قرآن پورا نہیں کرتا۔ باقی الہامی کتابیں تو ایسی ہیں کہ جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب زمانہ بدلا اور دنیا میں تغیر آیا تو ان کتب میں جو کلام تھا اس کے وہ معنے نہ نکلے جو اس زمانہ کے ذہنوں کے مطابق ہوتے ۔اس لئے وہ قابل عمل نہ رہیں مگر قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جوں جوں دنیا میں تغیر آتے جائیں گے اور لوگ قرآن پڑھیں گے اس زمانہ کی ضرورت کو پورا کرنے والا مفہوم اس میں سے نکلتا آئے گا اور لوگ تسلیم کریں گے کہ ہاں قرآن کریم

ہی اس زمانہ کے لئے بھی کافی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس زمانہ کے لئے بھی رسول ہیں۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کے سات بطن ہیں اس سے ضروری نہیں کہ یہی مراد ہو کہ سات ہی بطن ہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ دس، بیس، پچاس، سو، ہزار، دو ہزار بطن ہوں۔ کیونکہ عربی زبان میں سات کا عدد کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کے معنے یہی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے انسانی ترقیات کے لئے ہزاروں بلندیاں پیدا کی ہیں۔ غرض فرمایا کہ قرآن کریم کو ہم نے ایسا بنایا ہے کہ یہ ہر زمانہ کے لئے کافی ہوگا۔ اس میں ہر زمانہ کے خیالات پر بحث موجود ہوگی۔ اگر اس زمانہ کے لوگوں کے خیالات غلط ہوں گے تو ان کی تردید کی جائے گی اور اگر صحیح ہوں گے تو تائید کی جائے گی۔

درحقیقت قرآن کریم میں یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ جب وہ کوئی مضمون لیتا ہے تو اس کے تمام متعلقہ مضامین کو اس کے نیچے تہ بہ تہ جمع کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح زمین کے طبقات ہوتے ہیں۔ اوپر کے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے۔ دوسرے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے۔ تیسرے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے۔ اور جب ہم کسی زمین کو دیکھتے ہیں تو اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ زمین اچھی پیداوار دینے والی ہے۔ یا بری پیداوار دینے والی ہے۔ یہ کنکریلی زمین ہے یا اس میں عمدہ لیسدار مٹی پائی جاتی ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس میں فصل اچھی ہوگی یا خراب ہوگی۔ مکان اچھے تعمیر ہوں گے یا خراب ہوں گے۔ بنیادیں گہری کھودنی پڑیں گی یا تھوڑی۔ عمارت کئی منزلوں کی بن سکے گی یا یہ زمین زیادہ بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی۔ لیکن ایک ماہر فن اس زمین کو کھودے گا تو کہہ دے گا کہ اتنے گز زمین کھودنے کے بعد پتہ لگتا ہے کہ اتنے ہزار سال پہلے اس جگہ پانی ہوتا تھا اور وہ اپنے اندر فلاں قسم کے جانور اور حیوانات رکھتا تھا۔ پھر وہ چند گز اور مٹی کھودے گا اور اس زمین سے جس کو سرسری طور پر دیکھ کر ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس میں فصل زیادہ ہوگی یا کم۔ عمارت کئی منزلوں والی بن سکے گی یا نہیں۔ وہ ماہر فن یہ نتیجہ نکالے گا کہ فلاں فلاں وقت میں اس زمین میں یہ یہ تبدیلیاں اندرونی آگ یا گرمی کی وجہ سے پیدا ہوئیں یا دھاتوں نے پگھل پگھل کر اس کے اندر یہ یہ تغیرات پیدا کر دیئے۔ اسی طرح وہ نیچے چلتا چلا جائے گا اور تاریخ کے مختلف زمانے بیان کرتا چلا جائے گا۔ وہ محض اس زمین کو دیکھ کر دو دو تین تین ہزار تک کے واقعات بیان کر دے گا اور یہ سب چیزیں زمین کے اندر مخفی ہوں گی۔ یہی حال قرآن کریم کا ہے۔ اس کے مطالب بھی الفاظ کی تہوں کے نیچے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر زمین کی سب چیزوں کو باہر نکال کر پھیلا دیا جائے تو انسان کا زمین پر چلنا پھرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ وہ سب چیزیں زمین کے اندر تہ بہ تہ رکھی ہوئی ہیں اس لئے ہم اس کے اوپر چلتے

پھرتے ہیں۔لیکن جب اسے کھودتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مثلاً اس کے اندر چونے کی چٹانیں ہیں۔اگر وہ چونے کی چٹانیں باہر نکال کر سطح پر پھیلا دی جائیں تو کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہاں آبادی ہو سکتی تھی۔یہ جگہ بجائے آدمیوں کے چٹانوں سے بھری ہوئی ہوتی۔اسی طرح وہ سب مطالب جو قرآنی الفاظ کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں اگر باہر نکال لئے جاتے اور ظاہری الفاظ میں انہیں بیان کیا جاتا تو جیسے اس زمین کی اندر کی چیزیں اگر باہر آ جائیں تو وہ چیزیں میں پھیل کر سینکڑوں میل کا علاقہ رک جاتا۔اسی طرح قرآن کریم بھی اتنا پھیل جاتا کہ کوئی انسان اسے پڑھ نہ سکتا۔ اور یہ کتاب نہ رہتی بلکہ ایک عظیم الشان لائبریری ہو جاتی اور اس میں ہزاروں کتب رکھی ہوئی ہوتیں۔ایک نسل انسانی کہہ دیتی کہ ہم نے اس کے پانچسو صفحات پڑھے ہیں۔دوسری کہتی ہم نے اس کے ایک ہزار صفحات پڑھے ہیں۔لیکن اب قرآن کریم ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں ہے اور زمین کی طرح اس کی ایک تہ کے نیچے ایک مضمون ہے۔دوسری تہ کے نیچے دوسرا مضمون ہے۔تیسری تہ کے نیچے تیسرا مضمون ہے اور اس طرح تھوڑے سے الفاظ میں ہزاروں مضامین بیان کر دیئے گئے ہیں۔حفظ کرنے والے اسے آسانی سے حفظ کر سکتے ہیں اور پڑھنے والے اسے جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی اس کے اندر تمام ایسی تعلیمیں پائی جاتی ہیں جو قیامت تک کام آنے والی ہیں۔اور کوئی ایسی تعلیم جو دائمی ہو اس سے باہر نہیں رہی۔اسی شان اور عظمت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا ایک نام قرآن مجید بھی رکھا اور دنیا میں یہ اعلان فرما دیا کہ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان:۲۸) یعنی زمین میں تمہیں جس قدر درخت دکھائی دیتے ہیں اگر ان تمام کو کاٹ کاٹ کر قلمیں بنا لیا جائے اور سمندر سیاہی بنا دیا جائے اور پھر اَور سات سمندروں کا پانی بھی سیاہی بنا دیا جائے اور ان قلموں اور سیاہی سے اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں تو دنیا بھر کے درختوں اور باغات کے درختوں کی قلمیں ٹوٹ جائیں گی اور ساتوں سمندروں کی سیاہی ختم ہو جائے گی مگر قرآنی سمندر پھر بھی بھرا ہوا ہی دکھائی دے گا اور اس کے معارف کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔کیونکہ جس طرح خدا مجید ہے اسی طرح یہ قرآن بھی مجید ہے۔ (البروج) اور بڑی شان اور عظمت کا کلام ہے۔دنیا پر کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا۔جس میں قرآن مجید لوگوں کی راہنمائی کرنے سے قاصر ہو۔وہ ہر زمانہ میں ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا اور مخالفینِ اسلام کی آنکھوں کو اپنی چمک سے خیرہ کر دیتا ہے۔وہ تورات اور ژندواوستا اور وید کی طرح ایک مردہ کتاب نہیں جو ہر زمانہ کی مشکلات کا حل پیش کرنے سے قاصر ہو بلکہ وہ ایک زندہ کتاب ہے جس سے ہر زمانہ میں زندگی کا تازہ سامان لوگوں کو میسر آ سکتا ہے

اور وہ معارف اور حقائق کا ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آ سکتا۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں انہوں نے اس قرآنی حسن سے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ تفسیر بیضاوی اور جلالین وغیرہ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اب اس سے زیادہ کوئی بات بیان کرنا حرام ہے۔ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ یہ کلام ایک مجید خدا کا نازل کردہ ہے جو خود بھی بڑی شان اور بزرگی کا حامل ہے اور جس طرح قانون قدرت کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے اسی طرح کلام الٰہی کے خزانے بھی کبھی ختم نہیں ہوتے۔ دنیا میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب ایجادیں ختم ہو گئی ہوں۔ ریل نکلی تو کہا گیا اب کوئی چیز اس سے زیادہ کیا نکلے گی۔ اس وقت ریل پندرہ میل فی گھنٹہ چلتی تھی۔ پھر تیس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر ۳۵ میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر چالیس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر پچاس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر ساٹھ میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی حتیٰ کہ اب ۷۵ میل فی گھنٹہ تک ریل چل سکتی ہے۔ اس کے بعد موٹر نکل آئی۔ پہلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ریل تو لوہے کی پٹڑی پر دوڑتی ہے مگر موٹر کیسے دوڑے گی۔ پھر ریل کے انجن میں کوئلہ ڈالا جاتا ہے۔ پانی ڈالا جاتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مزید کوئلہ اور پانی ڈالا جاتا ہے اور اس کوئلے اور پانی سے بھاپ بنتی ہے جس سے ریل چلتی ہے لیکن یہ موٹر کیسے چلے گی۔ لیکن موٹریں ایجاد ہوئیں اور لوگوں نے خیال کیا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو گی؟ پھر کاریں آ گئیں۔ تو لوگوں نے خیال کیا یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ پہلے پہل جو کار آئی تھی وہ بڑی اونچی اور بے ڈول سی تھی اس سے بڑی آواز پیدا ہوتی تھی اور جھٹکے لگتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کار نیچی ہونی شروع ہوئی۔ پھر جھٹکے کم لگنے شروع ہوئے۔ پھر سلنڈر بڑھنے شروع ہوئے تو آواز کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ آواز اتنی کم ہو گئی کہ اب کار پاس سے گذرے تو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ صرف سڑک کے ساتھ لگنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہی آتی ہے۔ پھر لوگوں نے خیال کیا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا ایجاد ہو گی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہوائی جہاز نکل آئے۔ پہلے ایسے ہوائی جہاز نکلے جو صرف پچاس ساٹھ میل چل کر پرواز ختم کر دیتے تھے۔ پھر سو ڈیڑھ سو میل تک چلنے والے جہاز نکلے۔ جب پچھلی جنگ عظیم ہوئی تو سو ڈیڑھ سو میل کی رفتار پر بھی لوگ حیران ہوئے تھے لیکن اب ایسے جہاز نکل آئے ہیں جو چھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑان کرتے ہیں بعض ایسے ہیں جو ایک ہی دفعہ پٹرول لے کر چھ چھ ہزار میل چلے جاتے ہیں۔ پھر گولیاں نکل آئیں۔ پہلے بندوقیں ایجاد ہوئیں جن میں ایک ایک گولی بھری جا سکتی تھی۔ لیکن بعد میں رائفلیں ایجاد ہوئیں جن میں سات سات دس دس گولیاں بھری جاتی ہیں۔ پھر ٹامی گنیں نکل آئیں جن کی چرخی پر سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو گولیاں چڑھا دی جاتی ہیں۔ پھر برین گنیں نکل

آ ئیں جو تین تین میل تک گولی پھینکتی ہیں ۔اور ایک منٹ میں تین تین سو چار چار سو فائر کر دیتی ہیں ۔ پھر ایسی توپیں نکل آ ئیں جو چلتے ہوئے ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو بھی تباہ کر سکتی ہیں ۔ پھر بم نکلا اور بم پھینکنے سے صرف قریب کے لوگوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا لیکن بعد میں ایسی رائفلیں نکل آ ئیں جن کے ساتھ وہی بم دور تک پھینکا جا سکتا تھا ۔ پھر توپوں کے ساتھ پھینکنے والے بم ایجاد ہوئے پھر ایٹم بم نکلا جو حجم کے لحاظ سے چھوٹے سائز کا ہوتا ہے ۔لیکن نقصان پہنچانے میں دوسرے بموں کو مات کر گیا ہے ۔ اور میلوں تک اثر کرتا ہے ۔اب H بم نکلا ہے اور کوبلٹ بم کے متعلق بھی معلوم کر لیا گیا ہے کہ وہ تیار کیا جا سکتا ہے ۔ پھر پہلے کوئی آدمی خندق میں چھپ جاتا تھا تو وہ بم کے اثرات سے بچ سکتا تھا ۔لیکن اب ایسے ذرائع معلوم کر لئے گئے ہیں کہ جن کی وجہ سے بموں کی گرمی اور اثر سال سال تک باقی رہتا ہے ۔اور خندق میں چھپا ہوا آدمی جب بھی نکلے گا موت کا شکار ہو جائے گا ۔غرض دنیا میں نت نئی ایجادیں ہوتی چلی جاتی ہیں پھر کیا خدا کا کلام ہی اتنا کمزور تھا کہ اس میں سے نئی چیزیں نہ نکل سکتیں ۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آ کر لوگوں کو بتایا کہ کلام الٰہی کے خزانے ختم نہیں ہو گئے بلکہ جس طرح قانونِ قدرت کے خزانے ختم نہیں ہوتے اسی طرح کلام الٰہی کے خزانے بھی ختم نہیں ہوتے ۔اور یہ خیال کر لینا سخت حماقت ہے کہ کوئی شخص اس کے نئے مطالب بیان نہیں کر سکتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے نئے نئے معانی اور مطالب نکلتے آ ئیں گے کیونکہ یہ مجید خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ کا مصداق ہے ۔ جب نئے معنوں میں یہ چیزیں پائی جاتی ہوں کہ قرآنی آیات ان کی مصدّق ہوں ۔فطرت انسانی ان کی تصدیق کرے اور پھر لغت عرب بھی ان کے خلاف نہ ہو تو وہ ٹھیک ہوں گے ۔ اگر ان کو غلط کہا جائے تو یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے کسی بیوقوف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ میں زخمی ہو گیا وہ بزدل تھا اسے باوجود زخمی ہونے اور خون دیکھنے کے یہ شک تھا کہ شاید زخم نہیں ہوا ۔وہ بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ یا اللہ یہ خواب ہی ہو ۔ یا اللہ ! یہ خواب ہی ہو ۔اب یہ کتنی حماقت کی بات ہے کہ زخم ہو چکا ہے اور اس سے خون بہہ رہا ہے ۔مگر وہ کہتا جاتا ہے کہ یہ خواب ہی ہو ۔اسی طرح قرآن کریم نے ہمیں چودہ سو سال پہلے سے بتا دیا ہے کہ قرآنی آیات کے نئے نئے معانی زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے نکلتے رہیں گے ۔ اگر وہ معنے لغت عرب کے مطابق ہیں اور دوسری قرآنی آیات اس کی مصدّق ہیں یا کم از کم اس کو ردّ نہیں کرتیں تو وہ غلط کیسے ہو سکتے ہیں ۔ہم نے تو یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ معیار پر ٹھیک اترتے ہیں یا نہیں ۔مثلاً کیا وہ عقل کے خلاف تو نہیں ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میں نے ہی عقل کو پیدا کیا ہے اور ایک ہی منبع سے نکلنے والی دو چیزیں متضاد

نہیں ہوسکتیں۔ پھر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ معنے دوسری قرآنی آیات کے خلاف نہ ہوں کیونکہ کلام الٰہی میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ عربی لغت ان کی تائید کرتی ہو۔ کیونکہ قرآن کریم نے خود یہ بیان کیا ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے پس لغتِ عربی اور دوسری آیات جن معنوں کی تائید کرتی ہوں وہ غلط نہیں ہوسکتے۔ ورنہ اپنے طور پر قیاس کر لینے سے تو اندھیر آ جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ''مِنَنُ الرَّحمٰن'' کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ عربی زبان تمام زبانوں کی ماں ہے۔ تو یہ بات سن کر بعض لوگ اسی بات میں لگ گئے کہ وہ ہر لفظ کو قرآن کریم سے نکلا ہوا ثابت کریں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک دوست سے کسی نے پوچھا کہ کیا قرآن میں مرچوں کا ذکر بھی ہے۔ انہوں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ میں مرجان مرچیں ہی تو ہیں۔ پھر ان دنوں ساؤتھ افریقہ میں لڑائی ہو رہی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ اس لڑائی کا قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے تو انہوں نے کہا۔ قَوْمًا بُوْرًا میں یہی لوگ مراد ہیں کیونکہ ساؤتھ افریقہ والوں کو بوئر کہتے ہیں۔ اس قسم کے معنے کرنا جائز نہیں اگر اس قسم کے معنے بیان کرنے شروع کر دیئے جائیں تو تباہی آ جائے۔ لیکن جو معنے لغتِ عربی کے مطابق ہوں۔ عقل ان کی تائید کرتی ہو۔ اور باقی قرآنی آیات بھی ان کی مخالف نہ ہوں۔ وہ آج نکلیں یا آج سے چار پانچ سو سال بعد نکلیں وہ درست ہوں گے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ اگر ایک ایک آیت کے سوسو۔ دو دو سو معنے بھی کئے جائیں تو وہ درست ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعے علوم کا ایک خزانہ ہمیں عطا فرمایا ہے اور اپنی مجد اور شان کے اظہار کے لئے اسے ایک گواہ بنایا ہے۔

اس زمانہ میں صرف بہائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآنی شریعت منسوخ ہوچکی ہے۔ مگر ان کا یہ دعویٰ تب سچا سمجھا جا سکتا تھا جب بہائی لوگ اس میں سے پندرہ بیس باتیں ایسی نکال کر پیش کرتے جن پر عمل نہ ہوسکتا۔ یا بہائیت کی تعلیم میں سے پندرہ بیس باتیں ایسی دکھاتے جو قرآن کریم میں موجود نہ ہوتیں اور اس کی تعلیم سے بہتر ہوتیں۔ مگر وہ آج تک کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکے۔

پس قرآن کریم نہ فیل ہوا نہ آئندہ کبھی فیل ہوگا۔ بلکہ یہ قیامت تک فیل نہیں ہوگا۔ زمین بدل سکتی ہے۔ آسمان بدل سکتا ہے۔ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آسکتی ہے۔ ایک حکومت مٹے تو اس کی جگہ دوسری حکومت آسکتی ہے۔ زبانیں مٹ سکتی ہیں لیکن قرآن کریم کبھی فیل نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ آخری قانون ہے۔ جو ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ فیل ہوگیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور ہم اب بھی اسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے چند ایسے احکام پیش کرے جو ناقابلِ عمل ہوں یا وہ کچھ باتیں ایسی پیش کرے جو نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ

کی تعلیمات پر مشتمل ہوں اور بہائیت میں ہوں قرآن کریم میں نہ ہوں۔ رنگون سے ایک دفعہ ایک بہائی نے ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے ذکر کیا کہ بہائیت نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیمات پر مشتمل ہے بہائیت کہتی ہے کہ عورت سے نیک سلوک کرو۔ لڑکیوں کو تعلیم دو۔ ظلم نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ جھوٹ نہ بولو۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ تم کوئی ایک ہی مذہب ایسا بتادو۔ جو کہتا ہو کہ عورت سے نیک سلوک نہ کرو۔ لڑکیوں کو تعلیم نہ دو۔ ظلم کرو۔ چوری کرو۔ جھوٹ بولو۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس قسم کی تعلیم دیتا ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ بہائیوں نے قرآن کریم کی تعلیم میں سے بعض پوائنٹ لے کر انہیں ایک علیحدہ تعلیم کے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ہر سچائی قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور پھر ان لوگوں کی اپنی حالت یہ ہے کہ جب عباس آفندی امریکہ سے واپس آیا تو اس نے لکھا کہ میں سب سے پہلے بہاء اللہ کی قبر پر نماز پڑھنے گیا اور میں نے وہاں سجدہ کیا۔ اس قدر شرک میں ملوث ہوتے ہوئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم فیل ہو گیا ہے اور اس کی جگہ بہائیت نے لے لی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس نے دنیا سے بت پرستی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ لیکن بہائیوں نے دوبارہ بت پرستی شروع کر دی ہے۔ کون عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ قبر کی مٹی پر سجدہ کرنا کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور کیا ایسا مذہب اسلام کے آگے ٹھہر سکتا ہے جس نے عرب سے شرک کو کلی طور پر مٹا دیا تھا اور جس کے بانی نے مرض الموت میں بار بار کہا کہ اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ ایسے عظیم الشان مذہب کے متعلق بہائیوں کا یہ کہنا کہ اسلام فیل ہو گیا ہے نہایت احمقانہ بات ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي

تو کہہ دے۔ میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ فیصلہ کرنے والا اللہ ہی کافی ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا

اور زمین میں ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اور جو لوگ باطل پر عمل کرتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) کے احکام کا انکار

بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۳﴾

کرتے ہیں وہی گھاٹے میں پڑنے والے ہیں۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ تو تمہارے سامنے قرآن کریم کے ذریعہ ایک بہت بڑا

نشان رحمت ظاہر کر چکا ہے۔لیکن اگر تم عذاب کا نشان ہی دیکھنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ وہ عذاب کا نشان بھی تمہیں دکھا دے گا اور جھوٹا فنا ہو جائے گا اور سچا فتح پا جائے گا۔اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والا امتیازی نشان جھوٹا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی ہر بات کو جانتا ہے۔پس اس کے عذاب سے وہی لوگ تباہ ہو سکتے ہیں جو جھوٹ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے نشانات کا انکار کرتے ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى

اور وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کی خواہش کرتے ہیں۔اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا

لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ

تو عذاب ان کے پاس آجاتا۔اور اب بھی وہ ان کے پاس ضرور (آئے گا اور) اچانک آئے گا اس حالت میں

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۴﴾

کہ وہ جانتے بھی نہ ہوں گے۔

تفسیر۔فرمایا۔یہ لوگ جو عذاب کے آنے کی جلدی کر رہے ہیں۔ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ عذاب دینے میں دھیما ہے۔اگر اس نے ایک وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو عذاب ابھی آجاتا۔اب بھی آئے گا تو سہی مگر اچانک آئے گا اور ایسی حالت میں آئے گا کہ وہ جانتے بھی نہ ہوں گے۔جیسے فتح مکہ ایسی اچانک ہوئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر مکہ کے پاس بھی پہنچ گیا۔اور مکہ والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔تاریخ میں لکھا ہے کہ جب اسلامی لشکر رات کو مکہ کے قریب پہنچا اور ہر سپاہی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت اپنے اپنے کھانے کے لئے علیحدہ علیحدہ آگ جلائی تو ابوسفیان اور اس کے بعض ساتھی جو مکہ والوں کی طرف سے پہرہ پر مقرر تھے انہوں نے دور سے اتنی بڑی روشنی دیکھی تو وہ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ اس پر پہلے تو ان کا خزاعہ کی طرف خیال گیا کہ شاید خزاعہ کے آدمی ہوں گے جو اپنا بدلہ لینے کے لئے آئے ہیں۔لیکن ابوسفیان نے کہا۔خدا کا خوف کرو خزاعہ تو اس کا دسواں حصہ بھی نہیں۔یہ اتنا بڑا لشکر ہے کہ خزاعہ کی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔انہوں نے کہا پھر فلاں قبیلہ ہوگا۔کہنے لگا۔آخر وہ کیوں آتا

اور پھران کی تعداد بھی اتنی نہیں ۔غرض اسی طرح وہ پانچ سات قبائل کے نام لیتے چلے گئے کہ فلاں ہوگا ۔فلاں ہوگا اور ہر بار ابوسفیان نے کہا کہ یہ غلط ہے ۔آخر انہوں نے کہا ۔یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لشکر ہوگا اور کس کا ہوگا ۔کہنے لگا بالکل جھوٹ ہے ۔میں تو انہیں مدینہ میں آرام سے بیٹھا چھوڑ کر آیا ہوں ۔ان کی تو لڑائی کی کوئی تیاری ہی نہیں تھی ۔یہ باتیں ابھی ہو ہی رہی تھیں کہ اسلامی لشکر کے چند سپاہی جو پہرہ پر متعین تھے وہ پہرہ دیتے ہوئے قریب پہنچ گئے ۔اور انہوں نے ابوسفیان کی آواز سنی ۔ان میں حضرت عباسؓ بھی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور ابوسفیان کے بڑے گہرے دوست تھے ۔اس وقت وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر پر سوار تھے ۔انہوں نے آواز سنی تو کہنے لگے ۔ابوسفیان! ابوسفیان نے کہا ۔عباسؓ! تم کہاں؟ حضرت عباسؓ نے کہا ۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کا لشکر لے کر آ گئے ہیں ۔تُو جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ اور خدا کے نام پر ان کی منتیں کر اور اپنی اور اپنی قوم کی معافی کے لئے درخواست کر ورنہ تباہی آ جائے گی ۔پھر خود ہی انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور خچر کے پیچھے بٹھا کر اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے ۔غرض فتح مکہ ایسی اچانک ہوئی کہ کفار ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اسلامی لشکر ان کے صحنوں میں اتر گیا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ

(اور) وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔اور جہنم کافروں کو

بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ۝۵۵

یقیناً تباہ کرنے والی ہے۔

تفسیر ۔فرمایا ۔یہ لوگ عذاب کے متعلق جلدی تو کر رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ جب وہ عذاب آئے گا تو وہ سب منکرینِ اسلام کا احاطہ کر لے گا ۔متواتر ایک مطالبہ کو آگے پیچھے بیان کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ ایک مطالبہ دنیوی عذاب کے متعلق ہے اور دوسرا مطالبہ اُخروی عذاب کے متعلق ہے ۔ایک مطالبہ سے یہ مراد ہے کہ ہم پر تیری پیشگوئیوں کے مطابق دنیا میں عذاب کیوں نہیں آ جاتا اور دوسرے مطالبہ سے یہ مراد ہے کہ کیوں ہم تیری مخالفت کی وجہ سے مر نہیں جاتے اور جہنم میں داخل نہیں ہوتے ۔چنانچہ دوسرے مطالبہ کے بعد جہنم کا بھی ذکر ہے جو پہلے مطالبہ کے بعد نہیں۔

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

(جس دن کہ جہنم کا عذاب کافروں کو گھیر کر تباہ کر دے گا) یہ وہ دن ہوگا کہ خدائی عذاب ان کے اوپر سے بھی انہیں

اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۶﴾

ڈھانک لے گا اور ان کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر بھی ان کو گھیر لے گا۔ اور (خدا) کہے گا اپنے عملوں کا نتیجہ چکھو۔

تفسیر۔ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب وہ عذاب آئے گا تو اوپر سے بھی آجائے گا اور نیچے سے بھی آجائے گا۔ یعنی سردارانِ مکہ بھی مکہ والوں کو چھوڑ دیں گے جیسا کہ عمرو بن العاصؓ اور خالد بن ولیدؓ نے چھوڑ دیا اور عوام الناس بھی اپنے سرداروں کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اب اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔

اسی طرح مِنْ فَوْقِهِمْ میں ہر قسم کا آسمانی عذاب، بیرونی حملے، حکومتِ وقت کی گرفت، بالا افسروں یا مذہبی پیشواؤں کی ناراضگی اور خاندان کے اکابر کا مختلف قسم کی مشکلات اور تکالیف میں مبتلا ہونا بھی شامل ہے اور مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ میں ہر قسم کے زمینی عذاب شامل ہیں۔ خواہ وہ ماتحت ملازمین کی طرف سے پیدا ہوں یا ماتحت افسروں کی طرف سے۔ اسی طرح فساد بغاوت اور تدابیر کا الٹ جانا بھی ایسے ہی عذاب ہیں جو خود انسان کے پاؤں کے نیچے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۷﴾

اے میرے مومن بندو! میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی عبادت کرو۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر ہماری طرف ہی تم (سب) کو لوٹایا جائے گا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا کہ کفار پر عذاب تو ضرور آئے گا۔ لیکن اس وقت انہیں اپنی طاقت اور جتھے پر غرور ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اپنے زورِ بازو سے کچل سکتے ہیں۔ سو ہم مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ

اگر تمہارا ملک تمہیں امن دینے کے لئے تیار نہیں تو تم غیر ممالک میں نکل جاؤ۔ اور گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں پھر کر خدائے واحد کی عبادت قائم کرو اور اگر دیکھو کہ کسی جگہ تمہاری تبلیغ میں روڑے اٹکائے جا رہے ہیں تو گھبراؤ نہیں۔ زمین کو خدا تعالیٰ نے بڑا وسیع بنایا ہے تم اس علاقہ کے ساتھ ملتے ہوئے دوسرے علاقوں میں تبلیغ شروع کر دو۔ اور اس بات سے مت ڈرو کہ اگر ہم نے تبلیغ کی تو دنیا ہماری دشمن ہو جائے گی۔ اور وہ ہمیں جانی اور مالی مشکلات میں مبتلا کر دے گی۔ تمہاری جانیں آخر کب تک سلامت رہیں گی۔ ہر انسان نے ایک دن مر کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پس اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے مر گئے تو کیا فائدہ؟ جاؤ اور دنیا کے کناروں میں پھیل جاؤ اور اسلام اور قرآن کی تبلیغ کرو۔ اس جہاد کے دوران میں اگر تمہیں موت بھی آ گئی تو وہ بڑی مبارک موت ہوگی۔ تم شہادت کا مرتبہ حاصل کرو گے اور خدا تعالیٰ کی جنت کے وارث ہو گے۔

آج تک دنیا میں جتنی بھی فاتح قومیں گذری ہیں انہوں نے پہلے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور اس کے بعد انہیں فتوحات نصیب ہوئیں۔ عربوں نے اپنے وطن کو چھوڑا۔ ترکوں نے چھوڑا۔ یہودیوں نے چھوڑا۔ آرین نسل کے لوگوں نے چھوڑا۔ اور وہ دور دور ملکوں میں پھیل گئے۔ اگر وہ اپنے وطنوں کو نہ چھوڑتے تو انہیں فتوحات بھی نصیب نہ ہوتیں اور وہ نئے نئے ملکوں کے وارث نہ بنتے۔ پس اگر مومنوں کو بھی خدا کے دین کی اشاعت کے لئے اپنے وطن چھوڑنے پڑیں تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ہجرت قومی ہوتی ہے اور ایک فردی ہوتی ہے۔ بیشک بعض افراد کی ہجرت قوم کے معیار کو بلند کر دیتی ہے۔ لیکن قومی زندگی اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب قوم کا ہر فرد خدا تعالیٰ کے دین کے لئے اپنے وطن کو چھوڑنے اور خدا تعالیٰ کی خاطر غیر ممالک میں نکل جانے کے لئے تیار ہو۔ اسی امر کی طرف زیر تفسیر آیت میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اور یہی حقیقت ایک دفعہ مجھے رؤیا میں بھی بتائی گئی۔ میں نے دیکھا۔ کہ میں اپنے گھر سے نکلا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے لئے کوئی مکان تلاش کروں۔ جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب جمونی کھڑے ہیں اور لوگ ان کے پاس مکانوں کے لئے آتے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس مکان ہیں انہوں نے وہ مکان انتظام کے لئے ان کے سپرد کئے ہوئے ہیں اور وہ آگے دوسروں کو دیتے ہیں۔ میں نے بھی ان سے ذکر کیا کہ مجھے اپنے لئے مکان کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھے ایک مکان دکھایا جس کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں مگر ان کمروں پر چھت نہیں اور کمروں کی دیواروں پر چھوٹے چھوٹے کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کپڑے کیسے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ان کمروں پر چھت نہیں اس لئے دھوپ کے وقت انہیں اوپر ڈال لیا جاتا ہے۔ میں اس وقت اپنے دل

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کمرے بیشک چھوٹے ہیں لیکن ہمارے کمرے تو اس سے بھی چھوٹے تھے۔ اس وقت مجھے ربوہ کے وہ کچے مکان یاد آتے ہیں جن میں ہم پہلے رہائش رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی میں کہتا ہوں کہ وہ کمرے روشن زیادہ تھے۔ پھر میں کہتا ہوں۔ وہ کمرے اس لئے روشن تھے کہ ان پر گیری کا سرخ رنگ لگا کر انہیں خوب چمکایا گیا تھا اور اندر سفیدی کی گئی تھی۔ جب ان پر بھی رنگ کیا جائے گا اور اندر سفیدی ہو جائے گی تو یہ بھی روشن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں نے کسی کو یہ کہتے سنا کہ

''جو قوم ہجرت کے لئے تیار رہتی ہے اور نو آبادی کا شدت سے اشتیاق رکھتی ہے وہ کبھی تباہ نہیں ہوتی''

جب میں نے یہ سنا تو مجھے خیال آیا کہ ہجرت کے لئے تیار رہنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ ہجرت پر خوش ہوتے ہیں۔ یا ہجرت کی اپنے دلوں میں خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواب میں ہی مجھے صحابہؓ کا خیال آیا کہ انہیں بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ مگر حدیثوں میں آتا ہے کہ مدینہ آ کر بعض صحابہؓ مکہ کی یاد میں رویا کرتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خوشی سے نہیں بلکہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے ہجرت کی تھی۔ پس جب اس نے یہ کہا کہ جو قوم ہجرت کے لئے تیار رہتی ہے اور نو آبادی کا شدت سے اشتیاق رکھتی ہے وہ کبھی تباہ نہیں ہوتی تو میں خواب میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ

''ہجرت تو وہ مجبوری سے کرتے ہیں مگر بعد میں ہجرت پر وہ رضاء بالقضاء کا جو نمونہ دکھاتے ہیں وہ بتاتا ہے کہ وہ ہجرت کے لئے تیار تھے۔ پس تیاری کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہجرت ہو۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اگر ہجرت کا وقت آئے تو وہ رضاء بالقضاء کا نمونہ دکھاتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو فوراً دوسری جگہ آباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

شہد کی مکھیوں کو دیکھو وہ شہد بناتی ہیں اور بناتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن انسان انہیں کھانے نہیں دیتا۔ وہ ان کے نیچے دھواں رکھ کر گرم پانی پھینک کر یا کوئی اَور ذریعہ اختیار کر کے ان کا چھ ماہ کا بنایا ہوا شہد اڑا کر لے جاتا ہے وہ مکھیاں دو منٹ کا بھی انتظار نہیں کرتیں۔ وہ اس جگہ کے چھوڑ دینے کے معاً بعد دوسری جگہ تلاش کر لیتی ہیں اور دوبارہ شہد بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد اگر انہیں آ کر دیکھو تو وہ قریب ہی کسی دوسری جگہ شہد بنانے میں مشغول ہوں گی۔ بعض دفعہ ان سے سالہا سال تک ایسا کیا جاتا ہے۔ مثلاً پالتو مکھیاں ہوتی ہیں۔ وہ جب بھی شہد بنا لیتی ہیں شہد اڑا لیا جاتا ہے اور انہیں اپنا بنایا ہوا شہد کھانے کا موقعہ نہیں ملتا۔ وہ شہد بناتی ہیں اور لوگ شہد لے جاتے

ہیں۔ اگر ایک مکھی شہد بناتی ہے اس لئے کہ لوگ لے جائیں اور اس سے بیماریاں دور ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (النحل:۷۰) اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ یا پھر ایک مکھی شہد بناتی ہے اور بناتی چلی جاتی ہے اور لوگ اس کے پاس شہد نہیں رہنے دیتے وہ ہمیشہ اڑا لے جاتے ہیں اور وہ مکھی پھر بھی شہد بنانا نہیں چھوڑتی۔ تو کیا انسان ہی ایسا ضعیف ہے کہ وہ اس طرح مایوس ہو جائے جو شخص اپنی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد ہمت چھوڑ بیٹھتا ہے وہ آدمی نہیں بلکہ وہ مکھیوں سے بھی بدتر ہے۔

دنیا کی فتح کوئی معمولی چیز نہیں۔ اس کے لئے بڑی بھاری قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جب آپؐ نے دیکھا کہ مکہ میں رہنا ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا تم کسی اور جگہ چلے جاؤ جہاں دین کے بارہ میں ظلم نہ ہو اور تم امن سے خدا تعالیٰ کا نام لے سکو۔ صحابہؓ نے آپؐ سے پوچھا۔ یا رسول اللہ وہ کونسی جگہ ہے۔ آپؐ نے حبشہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔ وہاں عیسائیوں کی حکومت ہے اگر تم وہاں چلے جاؤ تو تم پر دین کے بارہ میں کوئی سختی نہیں ہوگی۔

پس مومن کا فرض ہے کہ جہاں وہ خدا کے لئے اپنے وطنوں کو خیر باد کہنے کے لئے ہمیشہ تیار رہا کریں وہاں باہر جا کر روحانی نو آبادی قائم کرنے کے اشتیاق کا بھی پورا پورا مظاہرہ کریں تا کہ ان کا وجود ایک امت کی طرح ہو اور وہ ایک دو کو نہیں بلکہ امت کی امت کو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں داخل کریں۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ مِّنَ

اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں ہم ان کو جنت میں بالاخانوں میں جگہ دیں گے

الۡجَنَّةِ غُرَفًا تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ

(ایسی جنت میں) کہ اس کے (سایوں) تلے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ (یعنی مومن) ان جنتوں میں ہمیشہ کے لئے رہتے

نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ۖ ﴿۵۹﴾ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى

چلے جائیں گے اور اچھے عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہوتا ہے۔ ان (مومنوں) کا جو (اپنے عقیدہ اور عمل پر)

رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۶۰

جمے رہتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

تفسیر۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں بتاتا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لاتے ہوئے اسلام کی اشاعت کے لئے مناسب حال اعمال بجالائیں گے۔ یعنی اگر انہیں خدا کے لئے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو وطن چھوڑ دیں گے اور اگر جان قربان کرنی پڑی تو جان قربان کر دیں گے۔ ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اسلام اور قرآن کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ہم بھی دنیا اور آخرت میں ان کو بلند درجات عطا کریں گے اور بہتر سے بہتر مقامات ان کو رہائش کے لئے عطا کریں گے اور یہ عزت دنیوی عزتوں کی طرح عارضی یا فانی نہیں ہوگی بلکہ ایک غیر معلوم عرصہ تک جاری رہنے والی عزت ہوگی۔ اور یقیناً خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنے والے کبھی ضائع نہیں کئے جاتے۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان جنتیوں کو جو بالا خانے عطا کئے جائیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے باغات کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (البقرۃ:۲۶) ان باغوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور تیسری جگہ مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (الاعراف:۴۴) یعنی ہم جنتیوں کے سینہ میں سے ایک دوسرے کے متعلق ہر قسم کی کدورت نکال دیں گے اور نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی نہریں ہیں کہ باغ ہیں تو ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور مکان ہیں تو ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور آدمی ہیں تو ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ نہریں عام نہریں نہیں ہوسکتیں بلکہ کچھ اَور ہی شے ہیں کہ مکانوں کے نیچے بھی بہتی ہیں باغوں کے نیچے بھی بہتی ہیں اور آدمیوں کے نیچے بھی۔ پس جب نہر کے اصل معنے یہاں چسپاں نہیں ہوسکتے تو لازماً ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور نہر کے کچھ اَور معنے ہیں۔

اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پانی کی اس میں کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔ اول میل کچیل دور کرنا اور جسم کو پاک کرنا۔ جیسے فرمایا وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (الفرقان:۴۹) ہم نے بادلوں سے پاک وصاف کرنے والا پانی اتارا ہے۔ اور دوسرے زندگی بخشنا۔ جیسے فرمایا۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء:۳۱) ہم نے پانی

سے ہر چیز کو زندہ کیا ہے۔ پس ان آیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے یہ معنے ہوں گے کہ انہیں پاک وصاف رکھنے اور ہمیشہ کے لئے زندگی بخشنے کے سامان بڑی کثرت سے ملیں گے۔ کیونکہ اس جگہ صرف پانی نہیں بلکہ نہر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کریم میں جنت کی زندگی کی بھی دو ہی بڑی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اول دائمی زندگی جو انسانوں کو بھی عطا ہوگی۔ باغوں کو بھی عطا ہوگی اور غُرَف کو بھی عطا ہوگی۔ انسانوں کی دائمی حیات کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا (النساء: ۱۲۳) اور جنتی باغوں کے دوام کے متعلق فرماتا ہے کہ جَنّٰتُ عَدْنٍ (الرعد: ۲۴) اسی طرح فرماتا ہے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (الرعد: ۳۶) اور غُرَف کے دائمی ہونے کی طرف سورۃ زمر کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِیَّةٌ ۙ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ (الزمر: ۲۱) یعنی وہ لوگ جو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں انکو کئی منزل والے مکان عطا ہوں گے جن کے اوپر اور منزلیں مضبوطی کے ساتھ بنی ہوں گی۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ اللہ تعالیٰ کا ایک پختہ عہد ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو توڑا نہیں کرتا۔

اس جگہ مَّبْنِیَّةٌ کے معنے ہمیشہ رہنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں اس کی جڑیں گاڑ دی گئی ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر غُرفہ کی ہی بنیاد ہوتی ہے۔ غرض تینوں چیزوں کو قرآن کریم نے قائم رہنے والا بتایا ہے۔ نہ مکان ٹوٹیں گے نہ باغ اجڑیں گے نہ ساکن و منتفع مریں گے۔ دوسری طرف ان تینوں چیزوں کی نسبت فرمایا کہ ان کے نیچے نہریں ہوں گی۔ پس جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ کی آیت کے مطابق نہروں سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بکثرت ایسے سامان پیدا کئے جائیں گے جن کی وجہ سے نہ باغ سوکھیں گے نہ مکان ٹوٹیں گے نہ آدمی مریں گے۔

پانی کی دوسری غرض جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے مَیل کچیل سے صاف رکھنا ہوتی ہے۔ یہ خوبی بھی جنت میں پورے طور پر پائی جائے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا۔ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (الواقعۃ: ۲۶، ۲۷) یعنی مومن جنتوں میں نہ تو کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ گناہ کی کوئی بات ان کے کانوں میں پڑے گی۔ وہ صرف ایسی ہی باتیں سنیں گے جو سلامتی کی دعاؤں پر مشتمل ہوں گی۔ گویا ہر روحانی گند اور میل کچیل سے انہیں دور رکھا جائے گا۔ اسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ انسان جنت میں کھائے پیئے گا تو کیا پاخانہ پیشاب نہ ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کھایا پیا صرف

ہوا کی صورت میں نکلے گا جس میں مُشک کی خوشبو ہوگی۔ پس جب باغ سڑے گا نہیں اور پاخانہ پیشاب بھی نہ ہوگا تو جنت بھی پاک رہے گی اور اسی طرح مکان بھی کیونکہ اندر رہنے والے کو جب میل سے صاف رکھا جائے گا تو مکان کو صاف رکھ کر ہی ایسا کیا جا سکتا ہے۔

پس تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کے معنے قرآن سے صاف رکھنے اور قائم رکھنے کے ثابت ہو گئے اور یہی معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ ورنہ آدمیوں اور مکانوں کے نیچے نہروں کے معنے ظاہری رنگ میں چسپاں نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس کے کہ یوں معنے کئے جائیں کہ نہریں ان کے قبضہ و تصرف میں ہوں گی مگر اس صورت میں تینوں کے لئے الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ کہہ کر بتایا کہ یہ جزائے نیک ان کو اس لئے ملے گی کہ وہ ہر قسم کی مشکلات اور دشمنوں کی مخالفت کے باوجود اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم رہے اور انہوں نے اپنے رب پر سچا توکل رکھا۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖۗ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ ۖؗ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۱﴾

اس دنیا میں بہت سے جانور بھی ہیں جو اپنے ساتھ (انسانوں کی طرح) اپنا رزق نہیں اٹھائے پھرتے۔ اللہ ہی ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ بہت دعائیں سننے والا (اور) حالات سے خوب آگاہ ہے۔

تفسیر۔ ایک اَور مشکل جو بسا اوقات کمزور انسان کے قدم کو ڈگمگا دیتی اور اسے اپنے آپ کو قربانیوں کی آگ میں جھونکنے سے روکتی ہے وہ مالی مشکلات ہیں۔ ایک طرف دنیا اپنے پورے حسن کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کا دین اسے آواز دے رہا ہوتا ہے کہ آؤ اور میری مدد کرو۔ وہ دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہ اسے مال و دولت اور زیب و زینت کے ساتھ آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ اور دین کی طرف دیکھتا ہے تو وہاں اسے روپوؤں کی جھنکار سنائی نہیں دیتی۔ یہ دیکھ کر ایک کمزور انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے میں خدا کے لئے اپنی زندگی کو کس طرح وقف کروں۔ میں نے خدا کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔ میری بیوی بچے کیا کھائیں گے۔ ہم اپنا معیارِ زندگی کس طرح قائم رکھ سکیں گے۔ اور اگر یہ لالچ

اس کے دل میں غالب آ جاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اشرف المخلوق ہو کر زمین و آسمان کے خدا پر کتنی بدظنی کر رہے ہو۔ تم زمین کے چرندوں اور جنگل کے درندوں اور ہوا کے پرندوں کو دیکھو۔ کیا تم ان کے لئے رزق مہیا کرتے ہو یا خدا ان کو رزق بہم پہنچا رہا ہے۔ اگر تم کائنات عالم کے اربوں ارب کیڑے مکوڑوں اور جانداروں کے سامان معیشت پر ہی غور کرو تو تمہاری عقل دنگ رہ جائے اور تم پر علم و معرفت کا ایک نیا باب کھل جائے۔ دنیا علمی لحاظ سے بڑی بھاری ترقی کر چکی ہے مگر ابھی تک وہ یہ نہیں معلوم کر سکی کہ اِن اَن گنت جانوروں کے لئے کس طرح غذا مہیا ہوتی ہے۔ ایک موٹی تقسیم تو یہی ہے کہ کھیتی میں دانے پیدا ہوتے ہیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ جانوروں کے لئے بھوسہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت اونٹوں وغیرہ کی غذا ہیں تو نجاست بھیڑوں کے کام آجاتی ہے۔ مگر کروڑوں کروڑ جانور جو سمندروں اور دریاؤں میں رہتے ہیں یا غاروں میں بستے ہیں یا درختوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے ہیں یا ہواؤں میں اڑتے ہیں یا خون کے ایک ایک قطرہ میں خوردبین سے دکھائی دیتے ہیں ان سب کو کون رزق دے رہا ہے۔ کون سی سوسائٹی یا انجمن یا حکومت ہے جو ان کا بجٹ تیار کرتی اور انہیں تنخواہیں تقسیم کرتی ہے۔ یہ خدا ہی ہے جو اتنا بڑا کارخانہ چلا رہا ہے اور ان اربوں ارب جانوروں کو رزق مہیا کر رہا ہے۔ پھر انسان کیسا نادان ہے کہ جب اسے کہا جاتا ہے کہ آؤ اور خدا تعالیٰ کے دین کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرو تو وہ کہتا ہے میں آؤں تو سہی مگر میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں آ گیا تو کھاؤں گا کہاں سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں کائنات عالم کی اتنی بڑی مخلوق کو رزق پہنچا رہا ہوں۔ تو اگر تم میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے آئے تو کیا میں تمہیں بھوکا مرنے دوں گا۔ فرمایا۔ اس بدظنی کو اپنے دل سے نکال دو۔ تمہارا خدا سمیع اور علیم ہے۔ اگر تم سچے دل سے خدا تعالیٰ کو پکارو گے تو اس وجہ سے کہ وہ تمہارے حالات کو جانتا ہے وہ تمہاری دعاؤں کو قبول کرے گا اور تمہیں ہر قسم کی مشکلات سے نجات دے گا۔ پس ان وساوس میں اپنی زندگی مت بسر کرو۔ بلکہ نڈر اور بہادر بن کر خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے آگے بڑھو۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ

اور اگر تُو ان لوگوں سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو (بغیر مزدوری کے)

الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾

کس نے انسانوں کی خدمت میں لگایا ہوا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ نے۔ (پھر جب وہ یہ بات جانتے ہیں) تو کس طرف کو بہکے جا رہے ہیں۔

تفسیر۔ اشاعتِ اسلام کے راستہ میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پھر ان مذہبی مباحثات کی طرف لوٹتا ہے جن کا ذکر گذشتہ رکوع سے شروع ہے اور فرماتا ہے کہ جب تم باہر نکلو گے اور دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے وطنوں کی بھی قربانی کرو گے۔ اپنی جانوں کی بھی قربانی کرو گے۔ اپنے مالوں کی بھی قربانی کرو گے اور صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کا نمونہ دکھاتے ہوئے اسلام اور قرآن کی تبلیغ کرو گے تو تمہیں سب سے بڑا مقابلہ ان اقوام سے پیش آئے گا جو کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالیٰ کی توحید کی منکر ہیں۔ اس لئے تمہیں چاہیے کہ جب ان سے مذہبی گفتگو شروع ہو تو ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو کس نے بے مزد خدمت پر کس نے لگا رکھا ہے؟ وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام کارخانۂ عالم اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ پھر ان سے کہو کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنا بڑا کارخانہ پیدا کر دیا ہے۔ اور اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ڈور ہے تو تم خدا کو چھوڑ کر اور معبودوں کی طرف کیوں بہکے جا رہے ہو۔

پھر وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ جب تم توحید کی مخالف اقوام کے سامنے اسلام اور قرآن کا پیغام پیش کرو گے تو وہ اپنی طاقت اور سامانوں کی فراوانی کی وجہ سے تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کہیں گے تم کس طرح غالب آسکتے ہو تم تو کینیوٹؔ کی طرح سمندر کو پیچھے دھکیلنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ کینیوٹؔ ایک انگریز بادشاہ تھا جس کو خدا تعالیٰ نے بہت اقبال دیا تھا۔ ایک دن وہ سمندر کے کنارے بیٹھا تھا کہ اس کے درباریوں نے خوشامد کے طور پر کہنا شروع کیا کہ آپ کی حکومت تو زمین اور سمندر بھی مانتے ہیں وہ دانا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی کرسی سمندر کے کنارے بچھائی اور وہاں بیٹھ گیا۔ وہ وقت مد کا تھا جس وقت سمندر میں

جوش آتا ہے وہ میل میل خشکی پر چڑھ جاتا ہے۔لہریں اُٹھنے لگیں اور پانی کرسی کے گرد اونچا ہونے لگا کینیوٹ ؔ ظاہر میں غصہ کی شکل بنا کر لہروں کو حکم دیتا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔مگر پانی بڑھتا چلا گیا۔یہاں تک کہ بادشاہ کے ساتھیوں کو جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔اس وقت بادشاہ اٹھ کر خشکی کی طرف آیا اور درباریوں سے کہا کہ دیکھا تم کس قدر جھوٹ کہتے تھے۔جس طرح کینیوٹ ؔ بادشاہ کے حکم سے باوجود اس کے اقتدار کے سمندر پیچھے نہیں ہٹتا تھا اسی طرح یورپ کو ایشیائی طریق کا مسلمان بنانا مشکل نظر آئے گا۔مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند اور ستاروں کو ایسی طرز پر کام میں لگا رکھا ہے کہ لاکھوں سال کا زمانہ گزرنے کے باوجود وہ برابر اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں اور آسمانی اور زمینی نظام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ایسا کیا ہے۔پھر ان سے کہو کہ جس خدا نے بغیر ظاہری سامانوں کے بڑے بڑے وزنی سیارے اور ستارے آسمان میں قائم کر رکھے ہیں وہ خدا جب کسی قوم کو غالب کرنا چاہے تو اسے مادی سامانوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ ایسے باریک اور غیر مرئی سامانوں سے کام لیتا ہے جن کو انسانی آنکھ دیکھ بھی نہیں سکتی اور غالب مغلوب اور مفتوح فاتح بن جاتے ہیں۔اسلام کی بھی اس وقت یہی حالت ہے اس کی چھتیں ستونوں سے خالی دکھائی دیتی ہیں اور اس کی زمین بنجر اور سنگلاخ نظر آتی ہے۔لیکن زمین وآسمان کی تخلیق پر غور کرنے والا دماغ اس نکتہ کو فراموش نہیں کر سکتا۔کہ تمام طاقت خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جب وہ کسی کو غالب کرنا چاہے تو بغیر مادی سامانوں کے بھی غالب کر دیتا ہے۔دیکھو ٹائن بی ؔ جو اس وقت سب سے بڑا مؤرخ مانا جاتا ہے اور قریباً گبن ؔ کی پوزیشن اس کو ملنے لگ گئی ہے بلکہ بعض تو اسے گبن سے بھی بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسا مؤرخ کبھی نہیں گذرا۔اس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دنیا میں جو تغیر آیا کرتے ہیں وہ اخلاقی اقدار کی وجہ سے آتے ہیں۔جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی بڑی طاقت ہو تو اس کی وجہ سے تغیرات پیدا ہوتے ہیں یہ غلط بات ہے۔پھر اس نے لکھا ہے کہ عیسائیت کے ساتھ اب اسلام کی ٹکر ہوگی۔جس کے سامان نظر آ رہے ہیں اور مسلمانوں میں سے احمدیوں میں مجھے آئندہ لڑائی والی جھلک نظر آ رہی ہے۔اس ٹکر کے بعد یہ فیصلہ ہوگا کہ آئندہ تہذیب کی بنیاد اگلی صدیوں میں اسلام پر قائم ہوگی یا عیسائیت پر قائم ہوگی۔پھر اس نے ایک مثال دی ہے کہتا ہے ہم تو گھوڑ دوڑ کے شوقین ہیں۔ہمارے ہاں عام گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔ہم گھوڑ دوڑ والے جانتے ہیں کہ بسا اوقات جو گھوڑا سب سے پیچھے سمجھا جاتا ہے وہ آگے نکل جاتا ہے۔پس یہ مت خیال کرو کہ احمدی اس وقت کمزور ہیں۔کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پچھلا گھوڑا آگے نکل جاتا ہے۔اسی طرح اب تم کو یہ کمزور نظر آتے ہیں لیکن مجھے ان میں وہ ترقی کا بیج نظر

آ رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی وقت عیسائیت کے ساتھ ٹکر لیں گے اور شائد یہی جیت جائیں۔

دیکھو اتنا بڑا شخص جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے بڑا مؤرخ ہے اس کو بھی ماننا پڑا کہ احمدیت کے اندر وہ بیج موجود ہے جس نے عیسائیت سے ٹکر لینی ہے اور پھر ممکن ہے یہی جیت جائیں۔ وہ آخر مخالف ہے اس نے ممکن ہی کہنا تھا۔ یہ تو نہیں کہنا تھا کہ یقینی امر ہے کہ جیت جائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اسلام کا عیسائیت پر غالب آنا ایک یقینی امر ہے۔ وہ پہلے آسمان اور زمین کو بدل کر ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کردے گا اور ایک نیا نظام روحانی دنیا میں جاری ہو جائے گا۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ

اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق پھیلاتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اللہ (تعالیٰ) یقیناً ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں مخالفینِ اسلام کو انتباہ کیا گیا ہے کہ تم دنیا کی دولتوں اور حکومتوں پر کیوں فریفتہ ہو۔ تمام ترقیات اللہ تعالیٰ کے قبضہء قدرت میں ہیں۔ اور وہ کمزوروں کو طاقتور اور ناداروں کو امیر اور بادشاہوں کو فقیر بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ بیشک آج تمہیں اسلام ایک کمزور مذہب دکھائی دیتا ہے اور اس مذہب کے پیرووٴں کو تم ذلیل سمجھتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ عنقریب تم سے یہ نعمتیں چھین کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متبعین کو دے دے گا۔ اور اس طرح تمہارا وافر رزق تمہارے لئے تنگ ہو جائے گا اور مسلمانوں کی تنگی ان کی فراخی میں بدل جائے گی۔ پہلے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا اور اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسلام زندہ ہوگا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والے ترقی کریں گے۔ اور یورپ اور امریکہ اپنی ہر قسم کی ترقی کے باوجود اسلام سے شکست کھائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مسلمانوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور کفر اپنے آخری سانس لے رہا ہے اور جبکہ دونوں میں ترقی اور تنزل کی علامات ظاہر ہیں تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان ترقی نہ کریں اور کافر مغلوب نہ ہوں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ

اور اگر تُو ان سے پوچھے کہ بادل سے کس نے پانی اتارا ہے؟ اور پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے

الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ

بعد زندہ کیا ہے؟ تو وہ کہیں گے۔ یقیناً اللہ نے۔ تُو کہہ دے کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن ان

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۴ ع

(یعنی انسانوں) میں سے اکثر سمجھتے نہیں۔

تفسیر۔ اس میں بتایا کہ وہ اقوام جن سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ وحی والہام کی بھی منکر ہوں گی اس لئے تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کون پانی نازل کرتا اور مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں بے ساختہ یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تم کہو کہ الحمدللہ جو خدا ہمیشہ مردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندہ کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے اب بھی دنیا کی پکار سنی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی نجات کے لئے بھیج دیا۔ یہ کتنے بڑے شکر کا مقام ہے کہ تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک سورج چڑھا دیا۔ مردہ زمین کو زندہ کرنے کے لئے اس نے ایک بہت بڑا رحمت کا بادل بھجوا دیا جو اتنی شان سے برسا کہ پیاسی دنیا سیراب ہوگئی اور مردہ زمین نے بھی روئیدگی پیدا کرنی شروع کر دی۔ خدا تعالیٰ کے اتنے بڑے انعام اور احسان کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ دوڑتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس پہنچتے اور آپؐ کو قبول کر کے آسمانی بارش سے فیضیاب ہوتے اور اپنے حوضوں اور تالابوں کو بھر لیتے مگر انہوں نے عقل سے کام نہ لیا۔ مردار دنیا پر گر کر رہ گئے۔ اور دنیوی مال ومتاع انہیں اس دولت سے زیادہ اچھا دکھائی دینے لگا۔ گویا ٹھیکریوں کو تو انہوں نے لے لیا اور ہیروں اور جواہرات کو پھینک دیا۔

آسمان سے بارش نازل ہونے کی مثال دے کر کفار کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ جب آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے تو زمین اپنی ہر قسم کی روئیدگی کو ظاہر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مگر یہ روئیدگی یکساں نہیں ہوتی۔ کئی گھاس اور پودے صرف نصف انچ یا ایک انچ تک ہی رہ جاتے ہیں۔ اور کئی چھوٹی چھوٹی سبزیاں ترقی کر کے اتنا بڑا درخت بن جاتی ہیں کہ سینکڑوں آدمی اس کے سایہ کے نیچے آرام کر سکتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں وہ بالکل یکساں

ہوتی ہیں لیکن انتہائی حالت میں وہ بالکل مختلف ہوجاتی ہیں۔کوئی روئیدگی ایسی ہوتی ہے کہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ہی اس کا سارا جوش ختم ہوجاتا ہے۔اور کوئی سبزہ ایک مضبوط درخت بن جاتا ہے یا ایک چھوٹا سا پودا سینکڑوں سال کی عمر تک چلا جاتا ہے۔بعض پھول ایک یا دودن میں سوکھ جاتے ہیں۔لیکن انگور کا درخت ہزار سال تک کی عمر بھی پالیتا ہے۔بڑ کا درخت سینکڑوں سال تک چلا جاتا ہے۔اسی طرح جب آسمان سے روحانی بارش نازل ہوتی ہے تو کفر کی زمین بھی اپنی روئیدگیاں ظاہر کرنا شروع کردیتی ہے اور ایمان کی زمین بھی پھل اور پھول پیدا کرنا شروع کردیتی ہے۔لیکن کفر کا سبزہ صرف چند دن بہار دکھانے کے بعد سوکھ جاتا ہے اور رکوڑا کرکٹ بن جاتا ہے لیکن ایمان کا درخت اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کا مصداق بن جاتا ہے۔اس کی جڑیں پاتال تک چلی جاتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ پر تمہارے اندر جو ایک غیر معمولی حرکت پیدا ہوئی ہے اور تمہاری قوموں میں ابھار شروع ہوا ہے یہ اسی روحانی بارش کا نتیجہ ہے جو ہماری طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ بارش کے نتیجہ میں جس طرح اعلیٰ درجہ کا آم اور انگور ترقی کرتا ہے اسی طرح حنظل اور آک بھی ترقی کرتا ہے۔مگر یہ مت سمجھو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کامیاب ہوجاؤ گے۔کیونکہ تمہاری مثال اس گھاس کی سی ہے جو چند دنوں کے بعد ہی گل سڑ جاتا ہے اور پھر اس میں اتنی سڑاند پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنا رنگ بھی چھوڑ دیتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں اور وباؤں کا موجب بن جاتا ہے۔پس قانون قدرت کے اس نظارہ کو دیکھتے ہوئے تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں جلدی کرنی چاہیے تا کہ تم ایک پھلدار درخت بنو اور دنیا تمہارے وجود سے فائدہ اٹھائے۔تھوہر یا آک یا حنظل کا درخت مت بنو۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ

اور یہ ورلی زندگی صرف ایک غفلت اور کھیل کا سامان ہے اور اُخروی زندگی کا گھر ہی درحقیقت اصلی زندگی کا گھر

الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہلا سکتا ہے۔کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

تفسیر۔اس آیت میں دنیوی اور اخروی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے منکرین اسلام کو اس امر کی طرف

توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم سوچو اور غور سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ دنیا **لھو** اور **لعب** سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ یعنی دنیوی کاموں کی اگر تقسیم کی جائے تو ان کا ایک حصہ تو **لھو** قرار پائے گا اور دوسرا **لعب**۔ **لھو** سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو غفلت پیدا کرنے والی ہیں۔ اور **لعب** سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو اپنے اندر کھیل کود کا رنگ رکھتی ہیں۔ اور درحقیقت انسانی زندگی انہی دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی زندگی حرکت اور سکون کے ایک دور کا نام ہے جو یکے بعد دیگرے آتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں جسمانی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ گویا **لعب** حرکت کا وہ زمانہ ہے جس میں انسان مختلف طریق پر اپنی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اور **لھو** انسان کی وہ حالت ہے جس میں وہ آرام اور سکون حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کا ہر انسان محتاج ہے خواہ وہ روحانیت کے بڑے سے بڑے مقام پر بھی کیوں نہ پہنچا ہوا ہو۔ کیونکہ انسانی زندگی اگر ایک طرف حرکت کے ساتھ قائم ہے خواہ یہ حرکت سیر کے ذریعہ سے ہو یا چلنے پھرنے کے ذریعہ سے یا دنیوی مشاغل اور کاروبار میں حصہ لینے سے تو دوسری طرف کوئی انسان نہیں جو آرام اور سکون کا محتاج نہ ہو۔ اگر نیند کے ذریعہ سے دماغی اور اعصابی سکون حاصل نہ ہو یا خوشگوار مناظر اور خوشگوار آب و ہوا اس کے لئے سکون اور لذت کا موجب نہ ہوں تو وہ اپنی زندگی کو کسی صورت میں بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ غرض لہو اور لعب کے ساتھ ہی یہ دنیوی زندگی قائم ہے اگر ان دونوں کو انسانی زندگی میں سے نکال دو تو ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر فرمایا کہ اس **لھو** اور **لعب** کا اصل مقصد یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول کی کوشش کرو۔ گویا یوں سمجھ لو کہ تمہارے مقصدِ حیات کے مقابلہ میں جو اُخروی زندگی ہے اس دنیا کا مقام صرف لہو اور لعب کا سا ہے جس طرح ایک طالب علم کے لئے کھیل کود ضروری ہے اسی طرح تمہارے لئے بھی دنیوی مشاغل ضروری ہیں۔ کیونکہ اسلام بدھ مذہب کی طرح اپنے پیروؤں کو یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑ دو اور رات دن کسی جنگل میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہو بلکہ وہ لھو اور لعب کو بھی ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ اگر ہر وقت آخرت کا خوف ہی انسان کے ساتھ رہے تو وہ ہلاک ہو جائے۔ مگر لھو اور لعب میں ہر وقت مستغرق رہنا بھی انسان کے اصل مقصد کو تباہ کر دیتا ہے جس طرح کھیل تو ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے لیکن اگر وہ ہر وقت کھیل کود میں مشغول رہے تو وہ اپنی تعلیم کو نقصان پہنچائے گا اور کوئی بھی اس کے اس فعل کو مستحسن قرار نہیں دے گا۔ اسی طرح اسلام دنیوی لذات سے متمتع ہونے کی اجازت تو دیتا ہے۔ مگر وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان دنیا میں ہی مشغول ہو جائے اور آخرت کو نظر انداز کر دے۔

پس وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے منکرین اسلام کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ

ہم نے تو اس دنیا کو آخرت کے لئے ایک سیڑھی کے طور پر بنایا تھا اور چاہا تھا کہ تم اس دنیا کا اتنا ہی مقام سمجھو۔ جتنا ایک طالم علم کھیل کا مقام سمجھتا ہے۔ مگر تم نے اپنی نادانی سے دنیا کو ہی اپنا منتہٰی سمجھ لیا اور اسی کے لئے تم نے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ حالانکہ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ اصل زندگی تو دارِ آخرت کی زندگی ہی ہے۔ اس جگہ حَیَوَان کا لفظ حَیٰوۃ کے مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہتے ہیں زَیْدٌ عَدْلٌ یعنی زید کا انصاف کے ساتھ اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ زید ہی مجسّم انصاف ہے تو یہ بالکل جائز ہوگا۔ اسی طرح فرمایا کہ گو اس جہان میں بھی تمہیں ایک زندگی حاصل ہے لیکن چونکہ انسان حقیقی طور پر دار آخرت میں ہی زندہ ہوگا اور اصل زندگی وہی ہے جو اگلے جہان میں حاصل ہوگی۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ دار آخرت ہی حقیقی زندگی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ محض اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ کی تنقیص کی گئی ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ وہ زندگی جو خود خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اور جو تمام انبیاءؑ اور اولیاءؒ اور صلحاءؒ کو حاصل ہوتی ہے وہ بیہودہ اور فضول کس طرح ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بار بار فرماتا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں آؤ گے۔ اسی طرح وہ زمین و آسمان کی پیدائش کو بھی بڑی حکمتوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ پھر انسانی زندگی جو اسی پیدائش کا ایک حصہ ہے بے کار کس طرح ہوگئی۔ اگر یہ زندگی بے کار ہوتی تو اللہ تعالیٰ بار بار اپنے احسانات کیوں گنواتا۔ اور کیوں فرماتا کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو اور ان کا شکر ادا کرو۔ پس وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی مذمت نہیں کی بلکہ اسے اُخروی حیات کا ایک ضروری حصہ اور اس کا ابتدائی زینہ قرار دیا ہے جس پر قدم رکھے بغیر اخروی حیات کی صلاحیتیں انسانی روح میں پیدا نہیں ہوتیں۔

اس دنیوی زندگی کو لہو و لعب قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو توکل کا بھی شاندار سبق دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے سامان درحقیقت ایک کھیل کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح کھیل میں خواہ بادشاہ بن جاؤ یا فقیر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ بادشاہ بن کر انسان متکبر ہو جاتا ہے نہ فقیر بن کر رونے لگتا ہے اس طرح مومن سمجھتا ہے کہ میری اصل زندگی تو میرے خدا کے پاس اگلے جہان میں ہے۔ یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل ہے اور جب اس کا یہ نقطۂ نگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اگر اسے کروڑوں روپے بھی مل جائیں تو مال کی ناجائز محبت اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی اور اگر اسے فاقے بھی کرنے پڑیں تب بھی اسے خدا تعالیٰ کے متعلق کوئی شکوہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل چونکہ

کافر دنیا کو ہی اصل چیز سمجھتے ہیں۔اس لئے اگر انہیں کروڑوں مل جائیں تو وہ سرتا پا دنیا کے کیڑے بن جاتے ہیں اور اگر مال و دولت چھینی جائے تو ان پر موت آ جاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق شکوہ و شکایت کا باب کھول دیتے ہیں ۔گویا وہ کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضاء پر مطمئن نہیں ہوتے اگر انہیں اموال اور جائدادیں مل جائیں تو بجائے اس کے کہ ان کی خدا تعالیٰ کی طرف نظر اٹھے وہ انہیں اپنی لیاقت اور قابلیت کا نتیجہ قرار دے دیتے ہیں اور اگر ان سے مال چھن جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق شکوہ و شکایت کرنے اور اسے (نعوذ باللہ) ظالم قرار دینے لگ جاتے ہیں ۔غرض کافر کسی حالت میں بھی مطمئن نہیں ہوتا اور مومن کو ہر حالت میں اطمینان قلب نصیب ہوتا اور وہ رضاء بالقضاء کا نمونہ ہوتا ہے۔

اوپر چونکہ کفار کو مخاطب کیا گیا تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پھر انہیں اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم سمجھتے کہ دنیا دارِ آخرت کی تیاری کے لئے رکھی گئی ہے اور اس کی حیثیت لہو اور لعب کی سی ہے تو تم دنیا پر لات مار کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیتے اور سمجھتے کہ مادی ترقیات روحانی ترقیات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں ۔مگر تم نے تو دارِ آخرت پر دنیوی زندگی کو ترجیح دے دی اور چند کھوٹے پیسوں کے لئے آسمانی دولت کو رڈ کر دیا۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ۬

اور جب وہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنی عقیدت کو خالصۃً اللہ (تعالیٰ) کے لئے کر کے اس سے دعا مانگتے

فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۶۶﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ

ہیں ۔مگر جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دے کر پہنچا دیتا ہے تو اچانک پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں ۔تا کہ ہم

اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَ لِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس کا انکار کر دیں (اور اس انعام کو خدا کے سوا دوسرے شریکوں کی طرف منسوب کر دیں) اور اس (عارضی توبہ) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ ان کو چھوڑ دیتا ہے اور) وہ ایک عرصہ تک دنیوی سامانوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔پس (ایک دن یہ بخشش ختم ہو جائے گی اور) وہ (اپنی حقیقی جزا کو) دیکھ لیں گے۔

تفسیر ۔اس میں بتایا کہ لوگ دنیا سے اپنا دل تو لگاتے ہیں ۔لیکن انہیں اپنی زندگیوں میں ہی ایسے کئی

حوادث اور واقعات پیش آجاتے ہیں جن کے نتیجہ میں انہیں خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے ۔مگر بدقسمت انسان جب مشکلات سے نجات پاجاتا ہے تو وہ پھر خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اور یہ چکر اسی طرح چلتا چلا جاتا ہے ۔ درحقیقت اگر ہم غور سے کام لیں تو انسان پر دنیا میں کبھی تو ایسی حالت آتی ہے کہ وہ اپنی ساری ضرورتیں خود پوری کرلیتا ہے ۔اس وقت اس کی توجہ اپنی طاقت اور قوت کی طرف جاتی ہے اور وہ اپنی کوشش پر گھمنڈ کرتا ہے ۔لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا اور اپنی مدد کے لئے اپنے عزیزوں دوستوں اور رشتہ داروں کا محتاج ہوتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ رشتہ داری بھی اچھی چیز ہے ۔پھر ایک وقت اس کے اہل وعیال اور متعلقین بھی اس کے کام نہیں آسکتے اور اس کے ملنے والے اور دوست اس کی مدد کرسکتے ہیں ۔ایسے وقت اس کی نظر اپنے دوستوں پر پڑتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دوست احباب بھی دنیا میں مفید ہوتے ہیں جو آڑے وقت کام آتے ہیں ۔پھر کبھی ایسا زمانہ اس پر آتا ہے کہ دوست بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے ایسے اوقات میں وہ بعض دفعہ بعض نظاموں کی طرف توجہ کرتا ہے اور وہ سلسلہ یا جماعت جس سے وہ تعلق رکھتا ہے اس کی مدد کرتی ہے ۔ اس طرح جب اس کا کام بن جاتا ہے ۔تو اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ نظام سے تعلق اچھی بات ہے اور سلسلہ یا جماعت سے اس کی وابستگی بڑھ جاتی ہے ۔ پھر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کے اہل وعیال رشتہ دار ۔دوست احباب کوئی بھی اس کی مدد نہیں کرسکتے بلکہ نظام بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اس وقت حکومت جس کے ساتھ وہ تعلق رکھتا ہے اس کی مدد کرتی ہے ۔تب وہ محسوس کرتا ہے کہ حکومت بھی اچھی چیز ہے ۔پھر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ حکومت بھی انسان کا ساتھ نہیں دے سکتی ۔ایسے وقت میں عام انسانی ہمدردی اس کے کام آتی ہے تب اس کی نظر تمام دنیا پر پڑتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسانوں میں کیسا عجیب رشتہ قائم کیا ہے ۔لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کے اہل وعیال ۔دوست احباب ۔قوم یا نظام بلکہ حکومت اور انسانی ہمدردی کی مدد سے بھی اسے کامیابی ناممکن نظر آتی ہے ۔ایسی صورت میں کامیاب ہونے پر وہ سمجھتا ہے ۔میری کامیابی میں کچھ حصہ غیبی امداد کا بھی ہے اور جس حد تک اسے غیبی امداد کا یقین ہوتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ یہ کام خدا تعالیٰ نے کردیا ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کام اس نے خود کیا ۔رشتہ داروں اور دوستوں نے کیا ۔نظام نے کیا ۔قوم یا حکومت نے کیا یا عام انسانی ہمدردی نے کیا وہ بھی سب خدا تعالیٰ نے ہی کیا تھا ۔لیکن ان میں چونکہ ظاہری ذرائع موجود تھے خدا تعالیٰ کی طرف اس کی نظر نہیں اٹھی تھی ۔لیکن جب اسے کچھ غیبی امداد کا خیال ہوا ۔اس وقت اسے خدا تعالیٰ کا خیال آیا ۔بہرحال انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام انسانی تدابیر اس کے لئے باطل ہوجاتی

ہیں اور صرف خدا تعالیٰ ہی اس کے سامنے رہ جاتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون بیان فرمایا ہے کہ ایسے وقت مشرک اور دہریہ بھی بے اختیار ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی مثال دی ہے کہ جب طوفان پیدا ہوتا ہے تو مشرک بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں اس وقت انسان کا قلب اور احساسات پورے طور پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے ک طاقت نہیں رکھتا۔

۱۹۰۵ء کا زلزلہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئی کے مطابق آیا۔ اس وقت لاہور میڈیکل کالج میں ایک طالب علم تھا جو روزانہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق بحث کیا کرتا تھا۔ جب زلزلہ آیا اور اس نے محسوس کیا کہ اب چھت گر کے ہی رہے گی تو وہ بے اختیار رام رام کہتے ہوئے کمرہ سے بھاگ کر باہر آ گیا۔ اگلے دن اس کے دوستوں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس وقت کیا ہو گیا تھا اور تم نے کیوں رام رام کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ معلوم نہیں اس وقت کچھ عقل ہی ماری گئی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس نے صحیح عقل سے کام لیا۔ جب بچانے والے دنیوی اسباب اس کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے تو اسے ذاتِ باری کے سوا کوئی مددگار دکھائی نہ دیا۔ دراصل جب تک ایسے انسان کو دوسرے ذرائع نظر آتے رہیں وہ ادھر متوجہ رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی اَور ذریعہ نظر نہ آئے تو اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی اس کی نظر اٹھتی ہے۔

۱۹۱۸ء میں جب جرمنی نے اپنی ساری طاقت جمع کر کے اتحادی افواج پر حملہ کر دیا تو انگریزی فوج پر ایک وقت ایسا آیا کہ کوئی صورت اس کے بچاؤ کی نہ رہی۔ سات میل لمبی لائن تہ و بالا ہو گئی۔ کچھ حصہ فوج کا ایک طرف سمٹ گیا اور کچھ حصہ دوسری طرف اور درمیان میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ جرمنی کی افواج وہاں سے گذر کر پیچھے سے حملہ کر کے تمام فوج کو تباہ کر سکتی تھیں۔ اس وقت جرنیل نے کمانڈر انچیف کو اطلاع دی کہ یہ حالت ہے اور میرے پاس سپاہی اتنے نہیں کہ اس صف کو درست کیا جا سکے۔ یہ ایسی حالت تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ آج ہماری تمام فوج تباہ ہو جائے گی اور انگلستان اور فرانس کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے گا۔ انگریزی کمانڈر انچیف نے اس وقت وزارت کو تار دیا کہ یہ وقت انتہائی بے بسی کا ہے۔ ہماری صف ٹوٹ چکی ہے اور ہر لحظہ تباہی کا خطرہ لاحق ہے۔ جب یہ تار پہنچا تو وزیر اعظم دوسرے وزراء کے ساتھ مل کر کوئی مشورہ کر رہا تھا۔ اس وقت مادہ پرست یورپ جس کی نگاہ کبھی خدا تعالیٰ کی طرف نہیں اٹھتی اس کی ایک زبردست مادہ پرست حکومت کا سب سے بڑا سردار جو اپنی طاقت وقوت اور شان وشوکت کے گھمنڈ میں مست رہتا تھا اس نے بھی محسوس کیا کہ اس وقت کوئی ظاہری مدد نہیں جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ چنانچہ

وہ سارے کے سارے گھٹنوں کے بل جھک گئے اور انہوں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کر دیئے۔ کہ جرمن سپاہیوں کو خبر تک نہ ہو سکی کہ ان کے سامنے فوج کی صف ٹوٹ چکی ہے۔ اس وقت کمانڈر انچیف نے اپنے سٹاف کے ایک افسر کو بلایا اور اسے کہا کہ اس وقت یہ حالت ہے اور سوائے تمہارے مجھے کوئی ایسا افسر نظر نہیں آتا جو اس کا انتظام کر سکے۔ پس تم جاؤ۔ اور مجھ سے دوسرا سوال نہ کرو۔ ایسے موقعہ پر وہ کہہ سکتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے۔ فوج تو دی نہیں جاتی مگر کہا جاتا ہے دشمن کا مقابلہ کرو۔ مگر وہ افسر بھی سمجھ گیا کہ اس وقت فوج کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اس نے موٹر لی اور سیدھا اس مقام پر پہنچا جہاں باورچی۔ نانبائی۔ دھوبی۔ موچی۔ درزی اور مہتر وغیرہ تھے اور انہیں کہا کہ تمہارے دلوں میں حسرت پیدا ہوتی ہوگی کہ ہمیں ملک کے لئے لڑنے کا موقعہ کبھی نہیں دیا گیا۔ لیکن آج تمہارے لئے ایک موقعہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری صف ٹوٹ چکی ہے اور ملک کی نگاہ اس وقت تم پر پڑ رہی ہے کہ تم آگے بڑھو اور صف بندی کر دو۔ اس پر جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا لے کر چل پڑا اور جا کر صف بندی کر دی اور یہ نظر آنے لگا کہ فوج کھڑی ہے اس طرح چوبیس گھنٹے تک مقابلہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ دوسرے علاقوں سے فوج سمیٹ کر وہاں جمع کر دی گئی۔ یہ مادہ پرستوں کا ایک نظارہ ہے۔ جب خدا کے سوا انہیں کوئی مدد کرنے والا نظر نہیں آتا تو اس وقت وہ بھی خدا کے قائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ اور اس کامیابی کو اپنی تدبیر اور زور بازو کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا اسے بعض دیوتاؤں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ لوگ آخر کب تک ایسا کرتے چلے جائیں گے۔ بیشک ہم انہیں ایک عرصہ تک توبہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ دنیوی سامانوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ ان مواقع سے بھی محروم ہو جائیں گے اور پھر دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی جھوٹا معبود ان کی مدد نہیں کر سکے گا اور وہ عذاب کی طوفانی موجوں سے رہائی کی کوئی صورت نہیں پائیں گے۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ

کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہم نے حرم (یعنی مکہ) کو امن کی جگہ بنا دیا ہے۔ اور ان لوگوں کے اردگرد سے (یعنی مکہ کے

حَوۡلِہِمۡ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ یُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾

باہر سے) لوگ اچک لئے جاتے ہیں تو کیا وہ جھوٹ پر تو ایمان لاتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟

تفسیر۔ توحید باری تعالیٰ کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے تو فطرت انسانی کی شہادت کو پیش کیا تھا اور

بتایا تھا کہ مشرک لوگ خدا تعالیٰ کا انکار تو کرتے ہیں مگر جب مصیبت آتی ہے اور ان کے دل اور دماغ پر سے وہ پردے دور ہوتے ہیں جو قومی تعصب یا جہالت وغیرہ کے نتیجہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر جھک جاتے اور اس کو خلوص کے ساتھ پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ان کی یہ فطرتی پکار اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ ان کے دل خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی کبریائی کو محسوس کرتے ہیں ورنہ مصیبت کے وقت ان کی فطرت اس طرح عریان ہو کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنے پر کیوں مجبور ہوتی۔اب اللہ تعالیٰ اس توحید کے ثبوت کے لئے خانہ کعبہ کے وجود کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ عرب میں چاروں طرف لوٹ گھسوٹ اور قتل و غارت کا بازار گرم رہتا ہے۔اور کسی کی جان اور عزت و آبرو محفوظ نہیں سمجھی جاتی۔لیکن مکہ والوں کو حدود حرم میں رہنے کی وجہ سے اتنا بڑا امن حاصل ہے کہ کوئی ان پر انگلی تک نہیں اٹھا سکتا یہ عظیم الشان انعام آخر مکہ والوں کو کیوں حاصل ہوا؟ کیا اس میں ان کی کسی ذاتی قابلیت کا دخل ہے۔یا اس کے پیچھے صرف وہ دعائے ابراہیمی کام کر رہی ہے جو بیت اللہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت انہوں نے کی اور اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ رنگ میں التجاء کی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرة:۱۲۷) یعنی اے میرے رب! اس جگہ کو ایک پُر امن شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں انہیں ہر قسم کے پھل عطا فرما۔پھر جبکہ دعائے ابراہیمیؑ کی وجہ سے ہی انہیں امن میسر آیا اور دعائے ابراہیمیؑ کی وجہ سے ہی انہیں روزق ملا اور دعائے ابراہیمیؑ کی وجہ سے ہی انہیں عزت اور شہرت نصیب ہوئی تو انہیں سوچنا چاہیے کہ ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کیا اس لئے کی تھی کہ یہاں خدائے واحد کی بجائے تین سو ساٹھ بت رکھ دیئے جائیں اور انسان اپنی جبینِ نیاز رب العالمین کی بجائے پتھر کے بے جان بتوں کے آگے جھکا دے یا اس لئے کی تھی کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو حکم دیا تھا کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرة:۱۲۶) یعنی میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں۔اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمیشہ پاک وصاف رکھو۔ جب اس گھر کی تعمیر ہی خدائے واحد کی عبادت کا ایک مرکز بنانے کے لئے کی گئی تھی اور جبکہ انہی دعاؤں اور کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے مکہ والوں کو تمام عرب میں ایک نمایاں اعزاز حاصل ہوا تو یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا عظیم الشان نشان ان کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور بیت اللہ کی ایک ایک اینٹ انہیں خدائے واحد کی عبادت کی طرف متوجہ کر رہی ہے پھر بھی ان کی خطاکار پیشانی ہمیشہ باطل کے سامنے جھکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے احسان ناشناسی کا بدترین مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ معنے تو صرف مکہ والوں کی مناسبت کے لحاظ سے کئے گئے ہیں لیکن ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے اس آیت کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بیت اللہ کو جو توحید کا مرکز ہے امنِ عالم کے قیام کا ایک زبردست ذریعہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کو حقیقی امن صرف اسی صورت میں میسر آسکتا ہے جب وہ توحید کے اس مرکز سے تعلق رکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت اتنے مذاہب پائے جاتے ہیں اور ان مذاہب کی تعلیمیں آپس میں اس قدر مختلف ہیں اور ان مختلف مذاہب کے پیرو اپنے خیالات میں اتنا اختلاف رکھتے ہیں کہ بظاہر دنیا میں یکجہتی اور اتحاد پیدا ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے صرف ایک ہی نقطہ مرکزی ہے جس پر تمام مذاہب کا اتحاد ہوسکتا ہے اور وہ توحید باری تعالیٰ کا نقطہ ہے۔ جس طرح بھائی بھائی کا آپس میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن باپ پر سب کا اتحاد ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مذاہب کا آپس میں ہزار اختلاف سہی توحید باری تعالیٰ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے دنیا کا کوئی مذہب اختلاف نہیں کرسکتا اور یہی حقیقی مواخات پیدا کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جب تک دنیا یہ نہ سمجھے کہ زید اور بکر اور عمر اور خالد سب میرے رب کی مخلوق ہیں اور انہیں بھی اسی خدا نے پیدا کیا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اس وقت تک ایک دوسرے کی تحقیر اور عناد کا جذبہ دلوں سے مٹ نہیں سکتا۔ اسلام نے امن عالم کے قیام کے لئے سب سے پہلے اسی نقطۂ مرکزی کو لیا۔ اور توحید باری تعالیٰ کو دنیا میں قائم کیا اور انسانی قلوب میں یہ امر راسخ کیا کہ اسلام کا خدا رب العالمین ہے۔ یعنی وہ اسی طرح مسلمانوں کا خدا ہے جس طرح ہندوؤں اور عیسائیوں اور یہودیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کا خدا ہے۔ جب ایک عیسائی اور یہودی بھی ہمارے خدا کا ویسا ہی بندہ ہے جیسے ایک مسلمان تو ایک سچے مسلمان کے دل میں کسی ہندو یا عیسائی یا یہودی یا زرتشتی کا بغض کبھی پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ان سب کو اپنا بھائی تصور کرے گا اور اس کی محبت کا ہاتھ ان سب کی طرف اسی شوق کے ساتھ بڑھے گا جس شوق کے ساتھ ایک مسلمان کی طرف بڑھتا ہے۔

پس اسلام نے امن عالم کے قیام کے لئے توحید کا سبق پیش کیا اور پھر اس سبق کو ہمیشہ کے لئے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے اس نے مسلمانوں کو بیت اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ (اٰل عمران:۹۷) یعنی سب سے پہلا گھر جو تمام دنیا کے فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا گھر جو تمام دنیا کے اتحاد کا نقطۂ مرکزی تھا اسے وہ مذاہب نہیں بنا سکتے تھے جن کی نگاہ کبھی قومی حد بندیوں سے آگے نہیں گئی۔

ایسا گھر صرف خدا تعالیٰ کے الہام اور اسی کے منشاء کے مطابق تعمیر ہوسکتا تھا۔ سو خدا نے تمام دنیا کو ایک

نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کے لئے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی اور زمانہ ابراہیمؑ میں اس عمارت کی تجدید ہوئی اور دنیا کے سامنے پہلی دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اعلان کیا کہ یہ گھر اس لئے بنایا گیا ہے کہ یہاں لوگ آئیں۔ اس مقدس گھر کا طواف کریں۔ اس میں عبادت اور ذکر الٰہی کریں اور دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کریں۔

اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کی طرف زیر تفسیر آیت میں توجہ دلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ ہم نے بیت اللہ کے ذریعے امن عالم کے قیام کی کتنی زبردست تدبیر کی ہے اور کس طرح ہم نے عربی اور غیر عربی مشرقی اور مغربی۔ گورے اور کالے۔ سرخ اور زرد سب کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور پھر اس گھر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایسی پُرامن تعلیم عطا فرمائی ہے جس پر عمل کرنے والے کا نہ اپنا امن برباد ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کا امن برباد ہوتا ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیم کے ماتحت بیت اللہ سے سچا تعلق رکھنے والا وہی سمجھا جا سکتا ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان کے شر سے دنیا کا ہر شخص محفوظ ہو۔ گویا بیت اللہ کے ذریعہ نہ صرف ایک مدرسۂ امن کھول دیا گیا ہے بلکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہ بھی دنیا میں امن کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ بدظنی نہیں کرتے۔ وہ ظلم نہیں کرتے۔ وہ بے جا غضب سے کام نہیں لیتے۔ وہ لالچ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اور یہی چیزیں دنیا کا امن برباد کرنے والی ہوتی ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک سچا تعلق قائم ہو جانے کی وجہ سے انہیں اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ جبکہ باقی دنیا لالچ اور حرص کی آگ میں جل رہی ہوتی ہے۔ اور لوگوں کو نہ اپنے قلوب میں اطمینان نظر آتا ہے۔ اور نہ ان کے ساتھ تعلق رکھنے والے اپنے آپ کو مطمئن پاتے ہیں۔ اسی امر کی طرف وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ کعبۃ اللہ سے تعلق رکھنے والوں نے تو خدائے واحد کی تعلیم پر عمل کر کے ہمیشہ کا امن حاصل کر لیا۔ لیکن ان کے اردگرد جو اقوام بس رہی ہیں وہ اسلامی تعلیم کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے بدامنی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ان میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں جھگڑے اور فسادات بھی ہوتے ہیں ان کے مال و اسباب بھی لوٹے جاتے ہیں۔ غرض امن صرف انہی لوگوں کو میسر ہے۔ جو خدائے واحد پر ایمان لا کر بیت اللہ کے ساتھ سچا تعلق رکھتے ہیں۔ باقی سب دنیا میں بدامنی ہی بدامنی پائی جاتی ہے اور ہر دل بے چینی اور اضطراب کا شکار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نمایاں امتیاز کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب بیت اللہ کے ذریعے دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو کیا اس کے بعد بھی انہیں اپنی باطل سکیموں کی کامیابی پر یقین ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے اس عظیم الشان انعام کی ناقدری کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان کی بے چینی اور خلش کو دور کرنے کے لئے خود آسمان سے نازل فرمایا ہے۔ اگر وہ عالمگیر امن قائم کرنے کے خواہشمند ہیں تو اس کا طریق

یہی ہے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان لا کر بیت اللہ سے تعلق رکھنے والے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ کیونکہ سچا امن کبھی بھی روحانیت کے درست ہوئے بغیر دنیا میں قائم نہیں ہوسکتا۔

دنیا کوشش کر رہی ہے کہ ہتھیاروں کے ساتھ صلح کو قائم رکھے۔ قانون کے ساتھ صلح کو قائم رکھے یا عقل کے ساتھ صلح کو قائم رکھے۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ناقص ہیں گو اپنے اپنے دائرہ میں ضروری بھی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں جب تک روحانیت کے ساتھ نہ ملیں اس وقت تک امن قائم نہیں ہوسکتا۔ ہتھیاروں کے ساتھ اس لئے امن قائم نہیں رکھا جاسکتا کہ ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ عادت ایسی پڑ جاتی ہے کہ صلح کے بعد بھی صلح کرانے والی قومیں ہتھیار جمع کرتی چلی جاتی ہیں۔ جس طرح ایک مالدار بھرے ہوئے بٹوے کے بغیر سفر نہیں کرسکتا حالانکہ غریب آدمی چند پیسوں کے ساتھ سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہتھیار جمع کرنے والی قومیں ہتھیاروں کی ضرورت کے ختم ہونے کے بعد بھی ہتھیار جمع کرتی چلی جاتی ہیں کیونکہ اپنے ہمسایہ سے ڈرنے کی عادت انہیں پڑ جاتی ہے اور کافی ہتھیاروں کے بغیر ان کے دل اطمینان نہیں پاتے۔

قانون اس لئے امن قائم نہیں کرسکتا کہ قانون ظاہر پر حکومت کرتا ہے باطن پر نہیں۔ اور عقل اس لئے امن قائم نہیں کرسکتی کہ عقل اخلاق کے تابع نہیں ہوتی وہ یہ دیکھتی ہے کہ میرا یا میرے دوست کا فائدہ کس میں ہے وہ یہ نہیں دیکھتی کہ بعض ظاہری فائدے باطنی نقصان کا موجب ہوتے ہیں اور قریب کی دوستی بعید کو خراب کر دیتی ہے۔ لیکن روحانیت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو دائمی طور پر نیکی کی طرف مائل رکھتی ہے کیونکہ روحانیت نام ہے جذبات کے اخلاقی رنگ میں ڈھل جانے کا۔ اور جب جذبات اخلاقی رنگ میں ڈھل جائیں تو لازماً عقل بھی ان کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک ایسا دوام پیدا ہو جاتا ہے جس کو کوئی لالچ یا کوئی حرص یا کوئی خوف اپنے مقام سے ہلا نہیں سکتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ

اور جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھ کر افتراء کرتا ہے اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے؟ یا (اس سے) جو سچی

بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۹﴾

بات کو اس وقت جھٹلاتا ہے جب وہ اس کے پاس آجاتی ہے۔ کیا ایسے کافروں کی جگہ جہنم میں نہیں ہونی چاہیے؟

تفسیر ۔ فرمایا۔ اس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتا اور اس افتراء کی

جھوٹ پر بنیاد رکھتا ہے۔ اسی طرح اس شخص سے بڑھ کر اَور کون ظالم ہوسکتا ہے جو کسی سچائی کو اس وقت جھٹلاتا ہے جب وہ اس کے پاس آجاتی ہے۔

افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ پر افتراء تو کرتا ہے۔ مگر وہی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس کے الہام میں موجود ہوتی ہے گو اسے نہیں کہی جاتی۔ اور ایک اَور شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بات غلط طور پر منسوب کرتا ہے اور خدا تعالیٰ نے وہ بات کسی کتاب میں بھی نہیں کہی ہوتی۔ پس یہ شخص افتراء بھی کرتا ہے اور اس افتراء کی بنیاد بھی جھوٹ پر ہوتی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ منکرینِ اسلام کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تم میں دو عیب پائے جاتے ہیں جو انتہائی طور پر خطرناک ہیں۔ ایک یہ کہ تم خدا تعالیٰ پر افتراء کرتے ہو۔ اور افتراء بھی ایسا جس کی بنیاد کسی الہام پر نہیں بلکہ جھوٹ پر ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو کہ اِتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اپنا بیٹا بنالیا ہے حالانکہ یہ خدا تعالیٰ پر سراسر افتراء ہے اور اس کی بنیاد بھی کذب پر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کفار کے اس عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (الکھف:۶) یعنی انہیں اس بارہ میں کچھ بھی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کو اس بارہ میں کوئی علم تھا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف:۲۹) یعنی جب وہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر چلتے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد وہ ایک اور قدم آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ہی ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ تو کہہ دے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بری باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق جھوٹے طور پر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تم کچھ بھی نہیں جانتے۔

سورۂ انعام میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (الانعام:۱۰۱) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنّوں میں سے کچھ شریک مقرر کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اسی نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کے لئے جھوٹے طور پر بغیر کسی یقینی علم کے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرلی ہیں۔ خدا تعالیٰ ان تمام نقائص اور عیوب سے منزہ ہے اور جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں اس سے وہ بہت بلند اور ارفع ہے۔

غرض مشرک قوموں میں ایک خرابی تو یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتے ہوئے محض جھوٹے طور پر اس کی طرف بیٹے یا بیٹیاں یا بعض اور شریک منسوب کر دیتے ہیں۔اور دوسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ جو ایک طرف تو خدا تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہوئے نہ شرمائیں اور دوسری طرف سچائی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں وہ اگر اپنی کامیابی کا تصور کریں تو یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔کامیابی کا گُر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کیا جائے اور اس کی طرف سے آنے والی ہدایت کو قبول کیا جائے اور چونکہ یہ دونوں خوبیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں اس لئے اب الٰہی فیصلہ مسلمانوں کے حق میں صادر ہونے والا ہے اور کفر کے لئے ناکامی کی موت کے سوا اور کچھ مقدر نہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ

اور وہ (لوگ) جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہم ان کو ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق

لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۰﴾ؑ

بخشیں گے۔اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً محسنوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر ۔کفار کی ناکامی اور کفر و شرک کی تباہی کی پیشگوئی کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے حسن انجام کا ذکر فرماتا ہے جنہوں نے اس کی خاطر ہر قسم کے ابتلاؤں کو برداشت کیا۔مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔اور وہ خدا اور اس کے رسول کے لئے متواتر قربانیاں کرتے چلے گئے۔فرماتا ہے۔وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا وہ لوگ جو ہماری محبت میں محو ہو کر ہمارے قرب کے حصول کے لئے کوشش کرتے ہیں اور ہمارے دروازہ پر ہر وقت گرے رہتے ہیں لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ہمارا سلوک ان سے یہ ہوتا ہے کہ ہم انہیں یکے بعد دیگرے کامیابی اور عروج کے غیر متناہی راستوں کی طرف بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔گویا دشمن تو چاہتا ہے کہ ان پر ہر قسم کی ترقیات کے دروازے بند کر دے۔مگر خدا تعالیٰ کا سلوک ان سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن اگر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو خدا تعالیٰ ان کے لئے سو دروازے کھول دیتا ہے اور اس طرح نہ صرف انہیں اپنے دنیوی مقاصد میں کامیابی ہوتی ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔اور ان کا ہر قدم انہیں زیادہ سے زیادہ خدائی برکات

اورانوار کا مورد بنادیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ایک ایسا امید افزا پیغام دیا ہے جوان کے مردہ قلوب میں بھی زندگی کی لہر پیدا کرنے والا اورانہیں فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دینے والا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بہت سی ناکامیاں اس مایوسی کی وجہ سے ہوتی ہیں کہ انسان سمجھتا ہے میرے لئے اب ترقی کا کوئی امکان نہیں۔مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔یہ بات غلط ہے جولوگ ہماری محبت اور ہمارے وصال کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں انہیں ہم متواتر ان راستوں کا پتہ بتاتے چلے جاتے ہیں جو ہم تک پہنچنے والے ہیں۔مگر شرط یہ ہے کہ یہ جدوجہد اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نہ ہو بلکہ ہمارے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہو جس پر فِیْنَا کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔

پھر یہ آیت نہ صرف مسلمانوں کے لئے ایک عظیم الشان مژدہ کی حامل ہے بلکہ اس میں غیر مسلم دنیا کے لئے بھی ایک بہت بڑا زندگی بخش پیغام ہے۔بلکہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود پر بھی ایمان نہیں رکھتے انہیں بھی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کا خدا جو رب العالمین ہے اس نے اپنی محبت کے دروازے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے کھول رکھے ہیں پس ان کے لئے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔اگر ان کے دلوں میں سچائی کی تڑپ پائی جاتی ہے اوروہ چاہتے ہیں کہ اگر اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے توانہیں بھی اس کا پتہ لگ جائے۔اوروہ بھی شکوک وشبہات سے رہائی حاصل کرسکیں تواس کا طریق یہ ہے کہ وہ سچے دل سے یہ دعائیں کریں کہ اے خدا! اگر تُو ہے اور جس طرح تیرے ماننے والے کہتے ہیں تو غیر محدود طاقتوں کا مالک ہے توتُو ہم پر رحم فرمااور ہمیں بھی اپنی طرف ہدایت دے اور ہمارے دل میں بھی یقین اور ایمان ڈال دے تاکہ ہم تیری محبت سے محروم نہ رہیں۔اور تیرے وجود کے قائل ہوجائیں۔اگر اس طرح سچے دل سے کوئی شخص دعا کرے اور کم سے کم چالیس دن تک لگا تار کرتا چلا جائے تو خواہ اس کے دل پر کتنے بھی تاریک پردے پڑ چکے ہوں اور خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو رب العالمین خدا اس کو ضرور ہدایت دے گا۔اوروہ جلد دیکھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ایسے رنگ میں اپنا وجود ظاہر کرے گا کہ اس کے دل سے شکوک وشبہات کی تاریکی بالکل دور ہوجائے گی اوراس کی روح خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ناصیہ فرسا ہوجائے گی۔

پھر اس آیت کے ذریعہ تمام غیر مذاہب کے پیروؤں کو بھی یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ اگر مذاہب کے اختلاف کو دیکھ کر ان کے دلوں میں سچے مذہب کی جستجو کا احساس پیدا ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے حضور دعاؤں اور گریہ وزاری سے کام لیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کے سامان پیدا کردے گا اور کسی نہ کسی رنگ میں ان پر سچائی کے راستہ

کا انکشاف فرما دے گا۔

میں نے دیکھا ہے ہر سال کبھی کم اور کبھی زیادہ لیکن بہر حال اوسطاً آٹھ دس ایسے غیر احمدیوں کی چٹھیاں مجھے ضرور آجاتی ہیں جو لکھتے ہیں کہ ہم پہلے احمدیت کے شدید مخالف تھے مگر اللہ تعالیٰ نے رؤیا کے ذریعہ ہمیں بتایا کہ احمدیت سچی ہے۔ اس لئے ہم توبہ کرتے ہوئے احمدیت میں داخل ہوتے ہیں۔ پس جو شخص بھی سچے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت کے سامان پیدا فرما دیتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ اس میں سنجیدگی پائی جائے اور اس کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہو۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی رنگ میں اس کے لئے ہدایت کا راستہ ضرور کھول دیتا ہے۔

پھر اس آیت میں مومنوں کو بھی یہ عظیم الشان بشارت دی گئی ہے کہ اگر وہ سچے دل سے کوشش کرتے رہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب کے غیر متناہی راستوں پر چلاتا چلا جائے گا۔ اور ان کے دامن کو گوہرِ مقصود سے بھر دے گا اور انہیں اپنے الہام اور کلام سے مشرف فرمائے گا۔ اسی امر کی طرف میری ایک رؤیا بھی اشارہ کرتی ہے۔ جو کچھ عرصہ ہوا میں نے دیکھی۔ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں اور میں انہیں مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ مختلف مذاہب میں جو اللہ تعالیٰ کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ چنانچہ پہلے میں نے بدھ مذہب میں جو خدا تعالیٰ کا تصور پایا جاتا ہے وہ ان کے سامنے بیان کیا اور اس پر ایک تقریر کی۔ صبح کے وقت جب میں نے اس رؤیا پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے تصور کے الفاظ اختصاراً بولے گئے ہیں۔ ورنہ اس سے مراد خدا تعالیٰ سے ملنے کا تصور تھا چنانچہ میں نے ان کے سامنے جو تقریر کی وہ یہ تھی کہ دیکھو مچھلی پانی میں رہتی ہے لیکن اس پانی پر جو سورج کی شعاعیں گرتی ہیں یا دریا میں بہنے والی ریت کے ذرات سے جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ مچھلی پر ایسا اثر ڈالتی ہے کہ اس پر چانے پڑ جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ چانے اس لئے ہوتے ہیں کہ دیر تک اس پر ریت کی چمک اور سورج کی شعاعوں کا اثر ہوتا رہتا ہے اور آخر اس کے جسم پر بھی ویسی ہی چمک آجاتی ہے۔ اگر سنہری ریت ہو تو یہ چانے سنہری بن جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی مچھلیوں پر میں نے خود سنہری رنگ کے چانے دیکھے ہیں بلکہ بعض دفعہ ان پر سات سات آٹھ آٹھ رنگ کے چانے ہوتے ہیں اور بعض دفعہ تو ایسے نیلے رنگ کا چانہ ہوتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فیروزہ رکھا ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ دیکھو جسم جو ایک کثیف چیز ہے اگر اس اتصال کے نتیجہ میں دوسری چیزوں کا اثر قبول کر لیتا ہے تو روح جو ایک نہایت ہی لطیف چیز ہے وہ کیوں اثر قبول نہیں کرے گی۔ پھر میں دوسرے مذاہب پر اسلام کی فضیلت بیان کرتے

ہوئے کہتا ہوں کہ دیکھو بدھ مذہب نے صرف یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا ہوسکتا ہے۔ مگر اتصال پیدا کرنے کا طریق اس نے نہیں بتایا۔ اور جو بتایا ہے وہ اتنا لمبا ہے کہ انسان کے لئے اس پر عمل ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بدھ ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایک جنگل میں بانس کے درخت کے نیچے بیٹھا اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور ذکر الٰہی میں اتنا محو ہوا کہ اس کے نیچے سے ایک درخت نکلا جو اس کے جسم کو چیرتا ہوا سر سے نکل گیا۔ اور اسے پتہ تک نہ لگا۔ اب یہ ایک لایعنی سی بات ہے۔ جسے عقل قبول نہیں کرسکتی۔ لیکن اسلام نے نہ صرف وصال الٰہی کا تصور بیان کیا ہے بلکہ وہ راستہ بھی بتایا ہے جس پر چل کر انسان خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً بدھ مذہب نے دعا کی قبولیت پر کوئی زور نہیں دیا۔ صرف نروانا پر زور دیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو نکال دے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے قرب کی خواہش بھی تو ایک خواہش ہی ہے اگر وہ سب خواہشات کو نکالے گا تو یہ خواہش کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ پس بدھ نے متضاد بات کہی ہے۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وصال کے لئے کسی لمبے چوڑے مجاہدے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجائے اور وہ ہمہ تن التجاء بن کر دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب سے نوازے اور اس کے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھولے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا قرب عطا کردیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ:۱۸۷) جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا کو ضرور قبول کرتا ہوں۔ اب کجا یہ طریق کہ بدھ بانس کے درخت کے نیچے ساٹھ سال بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے نیچے سے ایک درخت نکلا جو اس کے سر کے پار ہوگیا۔ اور کجا یہ آسان طریق کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور وہ جھٹ مل گیا۔

غرض اسلام میں اللہ تعالیٰ نے وصال الٰہی کا راستہ ایسا آسان کردیا ہے کہ اگر مومن کے دل میں ذرا بھی محبت ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔ اسی طرح میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں لکھنؤ میں ہوں اور کچھ رؤساء شہر مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں اور ایک کمرہ میں جس میں قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا بیٹھ گئے۔ اس وقت ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ روح کے زندہ رکھنے کی کیا صورت ہے۔ میں نے انہیں جواب میں کہا کہ زندہ رہنے والی دو چیزیں ہوتی ہیں۔ جسم اور روح۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو نہ بول سکتا ہے نہ چل سکتا ہے نہ خود کوئی کام کرسکتا ہے۔ اسے زندہ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کیا سامان پیدا کیا ہے؟ یہی کہ اس کے اندر رونے کی طاقت پیدا کردی ہے۔ اس کی ماں ہر وقت تو اس کے پاس نہیں رہتی۔ کبھی کھانا پکا رہی ہوتی ہے کبھی کپڑے دھو رہی ہوتی ہے کبھی برتن مانجھ رہی ہوتی ہے۔ کبھی اپنی سہیلیوں سے باتوں میں مشغول ہوتی ہے اور کبھی اپنے خاوند سے چونچلے کر رہی ہوتی ہے۔

اس وقت کبھی بچہ کو کوئی مرض ستاتا ہے۔ کبھی بھوک لگتی ہے۔ کبھی کوئی اور خطرہ پیش آتا ہے تو وہ زور سے چلّاتا ہے اور روتا ہے تو اس کی ماں دوڑ کر اس کے پاس آجاتی ہے۔ یہ طریق خدا تعالیٰ نے جسم کو زندہ رکھنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ بعینہٖ ایسا ہی طریق روح کے زندہ رکھنے کے لئے اس نے تجویز کیا ہے۔ جب روح کمزور ہو اور اس پر مردنی طاری ہونے لگے۔ انسان سجدہ میں گر جاتا ہے۔ اور بچہ کی طرح خدا تعالیٰ کو رو رو کر پکارتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ بھی اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے اور اس کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس وقت میری تقریر میں جوش پیدا ہو گیا اور آواز بلند ہو گئی اور میں نے انگلی اٹھا کر اور اسے الٹا کر کے قالین پر مارا۔ اور کہا۔ یوں مصلیٰ پر سر رکھ کر جب روح کا بچہ روتا ہے اور وہاں اس کے آنسو گرتے ہیں تو اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اس کی تکلیف کو دور کرنے کے لئے اس کے پاس آتا ہے جس طرح ماں بچہ کے پاس آجاتی ہے۔ غرض رونا اور آنسو ہی جسم کو بچاتے ہیں اور رونا اور آنسو ہی روح کو بچاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جیسے ایک محبت کرنے والی ماں اپنے بچہ کی آواز پر دوڑتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اپنے بندے کی محبت کا جواب محبت میں دینے کے لئے دوڑتا ہے۔ اور اگر ان محبت کے تعلقات میں کبھی کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو بندے کی طرف سے ہوتی ہے ورنہ خدا تعالیٰ ایک محبت کرنے والی ماں سے بھی بڑھ کر چاہتا ہے کہ اپنے بندوں سے پیار کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں سے محبت کا سلوک کرے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بندے کو اپنی محبت بھری گود میں اٹھا کر اسے تسلی دے لیکن انسان وہ انسان جو مصائب میں مبتلا ہوتا ہے وہ انسان جو آلام کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے وہ انسان جو ہر وقت محتاج ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی مدد کرے اور اسے ان مصائب و آلام سے نجات بخشے اور وہ انسان جو ہر وقت محتاج ہوتا ہے اس بات کا کہ کوئی اس کا سہارا بنے اور اسے تسلی دے وہ محتاج اور کمزور انسان مستغنی بنا رہتا ہے مگر وہ مستغنی خدا عرش پر بے تاب رہتا ہے اس بات کے لئے کہ اس کا بندہ اس کی طرف آئے اور وہ اسے اپنے قرب میں جگہ دے۔

پھر اس آیت میں دعاؤں کی قبولیت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو لوگ ہم میں ہو کر اور ہم سے مدد مانگتے اور دعائیں کرتے ہوئے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم ان کے مقاصد کے حصول کے دروازے ان پر کھول دیتے ہیں اور ناممکن دکھائی دینے والی باتیں بھی ان کے لئے ممکن ہو جاتی ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کی طرف سرکاری سمن آیا جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ پر بعض لوگوں کی طرف سے ایک الزام لگایا گیا ہے اس کی جواب دہی کے لئے آپ فوراً حکومت کے سامنے حاضر ہوں۔ وہ یہ سن

کر حیران رہ گئے ۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے مگر چونکہ سرکاری سمن تھا وہ چل پڑے ۔ دس بیس میل گئے ہوں گے کہ آندھی آئی ۔ اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر بادل اُمڈ آئے اور بارش شروع ہوگئی ۔ وہ اس وقت ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے جس میں دور دور تک آبادی کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ صرف چند جھونپڑیاں اس جنگل میں نظر آئیں ۔ وہ ایک جھونپڑی کے قریب پہنچے اور آواز دی کہ اگر اجازت ہوتو اندر آ جاؤں ۔ اندر سے آواز آئی کہ آ جایئے ۔ انہوں نے گھوڑا باہر باندھا اور اندر چلے گئے ۔ دیکھا تو ایک اپاہج شخص چارپائی پر پڑا ہے ۔ اس نے محبت اور پیار کے ساتھ انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے اور آپ کس جگہ سے تشریف لا رہے ہیں ۔ انہوں نے اپنا نام بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ بادشاہ کی طرف سے مجھے ایک سمن پہنچا ہے جس کی تعمیل کے لئے جا رہا ہوں ۔ اور حیران ہوں کہ مجھے یہ سمن کیوں آیا ۔ کیونکہ میں نے کبھی دنیوی جھگڑوں میں دخل نہیں دیا ۔ وہ یہ واقعہ سن کر کہنے لگا کہ آپ گھبرائیں نہیں ۔ یہ سامان اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرے پاس پہنچانے کے لئے کیا ہے ۔ میں اپاہج ہوں رات دن چارپائی پر پڑا رہتا ہوں مجھ میں چلنے کی طاقت نہیں ۔لیکن میں نے اپنے دوستوں سے آپ کا کئی بار ذکر سنا ۔ اور آپ کی بزرگی کی شہرت میرے کانوں تک پہنچی ۔ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کیا کرتا تھا کہ یا اللہ قسمت والے تو وہاں چلے جاتے ہیں میں غریب مسکین اور عاجز انسان اس بزرگ کے قدموں تک کس طرح پہنچ سکتا ہوں تُو اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا فرما کہ میری ان سے ملاقات ہوجائے ۔ میں سمجھتا ہوں اس سمن کے بہانے اللہ تعالیٰ آپ کو محض میرے لئے یہاں لایا ہے ۔ ابھی وہ یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی ۔ بارش ہورہی ہے اگر اجازت ہوتو اندر آ جاؤں ۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور ایک شخص اندر آیا ۔ یہ سرکاری پیادہ تھا ۔ انہوں نے اس سے پوچھا آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں ۔ وہ کہنے لگا ۔ بادشاہ کی طرف سے مجھے حکم ملا ہے کہ فلاں بزرگ کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ آپ کو بلانے میں غلطی ہوگئی ہے دراصل وہ کسی اَور کے نام سمن جاری ہونا چاہیے تھا مگر نام کی مشابہت کی وجہ سے وہ آپ کے نام جاری ہوگیا ۔ اس لئے آپ کے آنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ بات سن کر وہ اپاہج مسکرایا اور اس نے کہا ۔ دیکھا ۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ محض میرے لئے یہاں لایا ہے ۔ سمن محض ایک ذریعہ تھا جس کی وجہ سے آپ میرے پاس پہنچے ۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

پھر وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ صرف اسلام کو قبول کر لینا اور منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ لینا کافی نہیں ۔ علم و عرفان اور قرب الٰہی کے راستے صرف ایسے ہی لوگوں پر کھولے

جاتے ہیں جو سچی محبت اور تڑپ سے کام لیتے اور اس کے لئے دیوانہ وار جدو جہد کرتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے یہ تو کہا ہے کہ جو ہماری طرف آتے ہیں ہم ان کی مدد کرتے ہیں لیکن اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ جو ہم سے بھاگتے ہیں ہم ان کو پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ جو ہم سے منہ پھیرتے ہیں ہم ان کو اپنی تائید سے نوازتے ہیں جو بیٹھنا چاہتے ہیں ہم ان کو جبراً کھڑا کرتے ہیں۔ جو گرنا چاہتے ہیں ہم ان کو زبردستی اٹھا لیتے ہیں۔ جو بے ایمان ہونا چاہتے ہیں ہم ان کو مجبور کر کے ایماندار بناتے ہیں۔ قرآن یہی کہتا ہے کہ جو بے ایمان ہونا چاہتا ہے ہم اسے بے ایمان بنا دیتے ہیں۔ اور جو ایمان دار ہونا چاہتا ہے ہم اسے ایمان دار بنا دیتے ہیں۔ بہرحال انسانی زندگی کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے اندر ایک پختہ عزم پیدا کرے اور اچھی چیز کو پکڑ کر اس طرح بیٹھ جائے جیسے شکاری کتا اپنے شکار کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے دانت ٹوٹ جائیں تو ٹوٹ جائیں مگر وہ اپنے شکار کو نہیں چھوڑتا۔ جب انسان اس نیت اور ارادہ کے ساتھ ایک راستہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اور اچھی چیز کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو پھر نیکیوں کی طرف اس کا قدم اٹھنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی نیکی نہیں جو اس سے اگلی نیکی کی توفیق نہیں دیتی۔ اگر کوئی انسان سچے دل سے صدقہ دیتا ہے تو ضرور ہے کہ اسے نماز کی بھی توفیق ملے اور زکوٰۃ کی بھی توفیق ملے اور روزہ کی بھی توفیق ملے اور اگر کوئی اخلاص کے ساتھ روزے رکھتا ہے تو ضرور ہے کہ اس نیکی کے نتیجہ میں اسے نماز اور زکوٰۃ اور حج کی توفیق ملے۔ کیونکہ ہر نیکی دوسری نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو کسی غریب سے ہمدردی کرتا ہے اس سے محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے اور دنیا داری کے خیالات کے ماتحت نہیں بلکہ سچے دل سے اسے کھانا کھلاتا ہے ایسے شخص کے پاس اگر امانت رکھی جائے تو وہ کھا جائے گا۔ یہ قطعاً ناممکن بات ہے۔ جس شخص کے دل میں دوسروں کا اتنا درد ہے اور جو ان کے لئے ہر وقت قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے مال میں خیانت کرے۔ اگر سب لوگ مل کر بھی کہیں گے کہ اس نے دوسروں کا مال کھایا ہے تو ہم کہیں گے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیونکہ جس کے دل میں اپنا مال قربان کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے مال کو کبھی کھا نہیں سکتا۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں خواہش پائی جاتی ہے کہ وہ خدا کے لئے بھوکا رہے کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا۔ وہ ایک دن نماز نہیں پڑھے گا دو دن نماز نہیں پڑھے گا تین دن نماز نہیں پڑھے گا مگر آخر اس کا نفس اسے کہے گا کہ احمق تُو خدا کے لئے بھوکا رہتا ہے اور پھر اس کی عبادت نہیں کرتا اور وہ مجبور ہوگا کہ نماز پڑھے اور جب وہ نماز پڑھنے لگ گیا۔ تو پھر اسے کوئی ہٹانا بھی چاہے تو وہ نہیں ہٹ سکتا۔ اسے قید کر دو تو وہ قید میں ہی نماز پڑھنے لگ جائے گا۔ چار پائی پر باندھ دو تو لیٹے لیٹے نماز پڑھتا رہے گا۔ کیونکہ ایک نیکی دوسری نیکی کی طرف لے

جاتی ہے۔ پس اصل گُر انسانی ترقی کا یہی ہے کہ جو چیز اسے اچھی نظر آئے اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ پہلے وہ اپنے دل میں فیصلہ کرلے کہ میں نے اچھی چیز کو لینا ہے اور پھر اسے چھوڑنا نہیں۔ اس فیصلہ کے بعد اسے جو چیز بھی اچھی نظر آتی ہو اسے اس نیت کے ساتھ پکڑ لے کہ اب میں نے اسے چھوڑنا نہیں۔ جب انسان اس مقام پر آجاتا ہے تو وہ ساری دنیا سے سبق حاصل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک بچے سے بھی سبق لے لیتا ہے ایک بوڑھے سے بھی سبق لے لیتا ہے۔ ایک پاگل سے بھی سبق لے لیتا ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز سے وہ فائدہ حاصل کرلیتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ تو بہت بڑے آدمی ہیں اور ساری دنیا آپ سے سبق لیتی ہے۔ کیا آپ نے بھی کسی سے سبق لیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بہت دفعہ لیا ہے اور سب سے بڑا سبق میں نے ایک چھوٹے سے بچے سے لیا ہے۔ اس نے کہا۔ کس طرح؟ انہوں نے کہا۔ وہ اس طرح کہ میں ایک دفعہ باہر جا رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ گذر رہا ہے اور تیز تیز قدم اٹھا رہا ہے۔ میں نے اسے تیز قدم اٹھاتے دیکھ کر کہا۔ بچے ذرا سنبھل کر چلو۔ کیچڑ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پھسل جاؤ۔ اس لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ امام صاحبؒ میرے پھسلنے کا فکر نہ کیجئے۔ آپ اپنا فکر کیجئیے۔ اگر میں پھسلا تو صرف میں پھسلوں گا۔ لیکن اگر آپ پھسلے تو ساری دنیا پھسل جائے گی۔ کیونکہ جب امام غلطی کرتا ہے تو اس کے ماننے والے بھی وہی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکا تو یہ بات کہہ کر چلا گیا مگر میں دیر تک کھڑا اس وعظ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ساری عمر میں نے اتنی کارگر اور مؤثر نصیحت کسی سے نہیں سنی۔ تو سیکھنے والا ایک بچہ سے بھی سبق سیکھ لیتا ہے۔ بلکہ اگر انسان سیکھنے کی نیت رکھے اور سوچنے کی عادت ڈالے تو زمین کی اینٹیں اور پہاڑوں کے درخت اور جنگلوں کی جھاڑیاں بھی انسان کے لئے قرآن اور حدیث کی تفسیر بن جاتی ہیں۔ اور اگر وہ سمجھنے کا ارادہ نہ کرے تو ایسے بدبخت انسان کو نہ قرآن فائدہ دیتا ہے نہ حدیث فائدہ دیتی ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائدہ دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں اطمینانِ قلب کے حصول کا نسخہ بھی بتا دیا گیا ہے جس کے لئے آج ساری دنیا مضطرب ہے۔ اور ہر شخص یہ سوال کرتا دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں دل کا اطمینان کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ اطمینان قلب درحقیقت دو ہی طرح حاصل ہوسکتا ہے (۱) یا تو اس طرح کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو پوری ہوجائے۔ (۲) یا اس طرح کہ تمام فضول اور لغو خواہشوں سے دل ہٹ جائے اور صرف ایسی خواہشات رہ جائیں جو اچھی بھی ہوں اور حاصل بھی ہوسکیں۔ جب کوئی اس مقام پر پہنچ جائے تو اسے اطمینان قلب حاصل ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اور پھر فرماتا ہے کہ

جو لوگ اس مقصد کے لئے سچی کوشش کریں ہم ذمہ وار ہیں کہ ان کو یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ گویا قرآن کریم اطمینان قلب کی ذمہ واری لیتا ہے۔

پہلی آیت میں تو وہ یہ ہدایت دیتا ہے کہ انسان کو یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں میری پیدائش کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کو میں اپنے اندر پیدا کرلوں۔ یا دوسرے لفظوں میں خدا تعالیٰ کے لئے آئینہ بن جاؤں جس میں اس کی صورت نظر آئے۔ اور دوسری آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں اگر سچی نیت سے کوئی کوشش کرے گا تو میں اس کو ضرور کامیاب کردوں گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ بات سمجھ جائے کہ میں فانی نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے فانی چیزوں کی خواہش اتنی نہیں کرنی چاہیے۔ صرف میرا جسم فانی ہے اس کے لئے میں کچھ فانی چیزوں کے لئے کوشش کرلوں تو کرلوں۔ میری روح فانی نہیں ہے اس کے لئے میں غیر فانی اخلاق کی جستجو کروں گا۔ اور پھر خدا کی مدد سے اس کی یہ جستجو پوری بھی ہو جائے تو چونکہ اس کی تمنا پوری ہو جائے گی اسے اطمینان قلب بھی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ بندر کی طرح درخت کی شاخوں پر ناچتا پھرے گا اور اپنی لا فانی ہستی کو بھول کر فانی جسم کے لئے فانی لذتوں کی تلاش میں لگا رہے گا۔ تو اتنی چیزوں کی خواہش اسے پیدا ہو جائے گی کہ وہ اسے پورا کرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اور ان چیزوں کی تلاش میں خدا تعالیٰ کی مدد بھی اسے حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے اس کی ناکامیوں کی تعداد کامیابیوں سے بڑھ جائے گی اور اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے دلی یکسوئی Concentration of mind کا بڑا حصہ پاتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی کوئی سیاسی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ کبھی تعلیمی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ کبھی تمدنی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور متواتر کوششوں سے کچھ کامیابیاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی ظاہری طور پر اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اطمینان قلب ایسا ہی ہوتا ہے جیسے بچہ کو کھلونا مل جانے سے ہوتا ہے۔ ان کے اطمینان قلب کی وجہ مقاصد عالیہ کا پورا ہونا نہیں ہوتا بلکہ مقاصد عالیہ کو بھلا دینا ہوتا ہے۔ وہ فکری افیون کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا دماغ انہیں فکری افیون کھلا دیتا ہے اور وہ درد کی موجودگی میں اس کے احساس سے محروم ہو جاتے ہیں۔

سُبُلَنَا کے متعلق بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (الانعام: ۱۵۴) یعنی یقیناً یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کی اتباع کرو۔ اور مختلف راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ ورنہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ کے راستہ سے ادھر ادھر لے

جائیں گے۔ گویا خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ ہے اور شیطان کے کئی راستے ہیں۔ مگر سُبُلَنَا میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے بھی کئی راستے ہیں۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ بلکہ جہاں هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ کہا گیا ہے۔ وہاں یہ مراد ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مختلف مذاہب کے قبول کرنے کی ضرورت نہیں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے اور سُبُلَنَا سے یہ مراد ہے کہ روحانی ترقیات کے غیر محدود راستے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا راستہ آجاتا ہے۔ جب مومن خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے ایک راستہ پر چلتے ہیں تو انہیں قرب کے اور راستے بتائے جاتے ہیں اور جب وہ ان پر بھی چلنا شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی ترقی کے اور مواقع پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح قدم بہ قدم وہ نیکی اور عرفان کے میدان میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپؐ کے احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں بلکہ ہندو عیسائی سکھ اور پارسی وغیرہ اپنے اپنے طریق پر چل کر بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صراحتاً فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! تُو لوگوں سے کہہ دے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ پس یہ ہرگز درست نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر بھی خدا مل سکتا ہیں۔ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ہدایت کا راستہ بتا دیتا ہے اور وہ ہدایت اس طرح ملتی ہے کہ یا تو رؤیا اور کشوف کے ذریعہ ایسے شخص پر اسلام کی صداقت کھول دی جاتی ہے اور یا پھر اس کے دل میں اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت پیدا کر دی جاتی ہے اور وہ آپ کو قبول کر کے اور آپؐ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کر لیتا ہے۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اسلام کی متابعت کے بغیر کبھی نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

آخر میں وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان تمام ابتلاؤں اور آفات کی طرف اشارہ فرما دیا جن کا اس سورۃ کے شروع سے ذکر چلا آرہا ہے اور بتایا ہے کہ تم پھونکوں سے ہنڈیا نہیں پکا سکتے۔ تم خلال سے پہاڑ نہیں کھود سکتے۔ تم تنکے پر بیٹھ کر دریا پار نہیں کر سکتے۔ تم اگر اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں ہر قسم کے امتحانوں میں ثابت قدم رہنا پڑے گا اور قربانیوں کی آگ میں متواتر اپنے آپ کو جھونکنا پڑے گا۔ اگر ایسا کر لو گے

تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائے گا۔اور وہ تمہارے لئے ایسی غیرت دکھائے گا کہ کوئی ماں اپنے بچے کے لئے بھی ایسی غیرت نہیں دکھا سکتی۔ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ تم خدا تعالیٰ پر سچا ایمان رکھو اور اس کے دین کی خاطر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔

مُحْسِن کے معنے عربی زبان میں اس شخص کے ہوتے ہیں جو حکم کو اس کی تمام شرائط کے ساتھ پورا کرے۔پس اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ اس پہلی بات پر پوری طرح عمل کریں گے جو ہم نے کہی ہے یعنی وہ پوری طرح جہاد کریں گے اور ہماری رضا کے حصول کی کوشش کریں گے ہم ان کے ساتھ ہوں گے۔اور ہر میدان میں ان کو کامیابی بخشیں گے۔پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش تو کریں مگر ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلے انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ خدائی قرب اور اس کی نصرت سے محروم ہیں۔گویا بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ پر الزام لگایا جائے اور کہا جائے کہ اس نے ہماری طرف توجہ نہیں کی ہمیں اپنی ذات پر الزام لگانا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ہم محسنوں والا کام نہیں کر رہے۔ورنہ خدا جھوٹا نہیں ہوسکتا۔وہ اپنے وعدوں میں سچا ہے اور وہ جو بات بھی کہتا ہے اسے پورا کر کے رہتا ہے۔جھوٹے ہم ہی ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی محبت کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر اس کے مطابق اپنے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے۔احادیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا۔یا رسول اللہ! میرے بھائی کو دست آرہے ہیں۔چونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شہد میں شفاء ہے (نحل ع ۹) اس لئے آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو شہد پلاؤ۔حالانکہ طبی طور پر شہد دست لاتا ہے۔انہیں بند نہیں کرتا وہ گیا اور اس نے جا کر شہد پلا دیا مگر اس کے بھائی کے دست اَور بھی بڑھ گئے۔وہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔یا رسول اللہ میرے بھائی کے دست تو اَور زیادہ ہو گئے ہیں۔آپؐ نے فرمایا جاؤ اور شہد پلاؤ۔وہ گیا اور پھر اس نے شہد پلا دیا۔جس پر اس کے اسہال اور بھی بڑھ گئے۔وہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔اور اس نے کہا یا رسول اللہ اس کو تو اور زیادہ دست آنے لگ گئے ہیں۔آپؐ نے فرمایا کہ تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اور خدا سچا ہے۔جاؤ اس کو اور شہد پلاؤ۔چنانچہ اس نے پھر شہد پلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اندر سے ایک بڑا سا سدّہ نکلا اور اس کے اسہال جاتے رہے۔اسی طرح اگر ہماری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو ہم اپنے متعلق کہیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں اور ہم نے وہ شرطیں پوری نہیں کیں جن کے پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوسکتا تھا ورنہ

خدا سچا ہے۔ اگر ہم اس کی بیان کردہ شرائط کو پورا کریں اور ابتلاؤں کے طوفانوں میں ایمان کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے ذریعہ اخلاص اور فدائیت کا نمونہ پیش کریں تو اللہ تعالیٰ یقیناً ہماری مدد کے لئے آسمان سے اترے گا اور وہ ہمیں ایک پیارے بچے کی طرح اپنی گود میں اٹھا لے گا۔

انڈیکس

جلد دہم

۞۞۞۞۞۞

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

آ

ب

مقامات

حل لغات

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ : سید عبدالحیٔ ایم۔اے

اسلام

حقیقت

ماضی۔حال۔مستقبل

تعلیم

اقتصادی نظام

اشاعت

ڈ

ذ

ز

س

غ

ف

☆☆☆☆☆

اسماء

گ

ل

م

☆☆☆☆☆

مقامات

حلّ اللّغات

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر الکشاف

تفسیر الدر المنثور

تفسیر ابن کثیر

تفسیر البحر المحیط

تفسیر الخازن

تفسیر القرطبی

تفسیر حسینی

کمنٹری آن دی قرآن از ریورنڈ وہیری

ترجمۃ القرآن از پادری سیل

معالم التنزیل

حدیث

جامع صحیح البخاری

صحیح مسلم

سنن الترمذی

سنن ابن ماجه

سنن ابی دائود

مشکاۃ المصابیح

الجامع الصغیر

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاء سلسلہ

اربعین

ایام الصلح

براہین احمدیہ ہر چہار حصص

براہین احمدیہ حصہ پنجم

برکات الدعا

سراج منیر

لُجَّۃ النور

نزول مسیح

نور الحق

انوار الاسلام

الوصیۃ

تذکرہ مجموعہ الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ملفوظات

نور الدین بجواب ترکِ اسلام مصنفہ حضرت مولانا

نور الدین خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ

سیرت و تاریخ

السیرۃ الحلبیۃ

السیرۃ النبویۃ لابن ھشام

لائف آف محمد از سر ولیم میور

سیرۃ عمر بن الخطاب لابن الجوزی

تاریخ الخلفاء للسیوطی

البدایۃ والنھایۃ

فتوح الشام مصنفہ ابو اسماعیل

الکواکب الدریۃ (جلد اول)

معجم البلدان

تقویم البلدان

تاریخ ملل قدیمہ مصنفہ سنیوبس مترجم سید محمود اعظم فہمی
تاریخ مصر مصنفہ جیمز ہنری بریسٹڈ
تاتاریوں کی یلغار
تاریخ اقوام کشمیر
تاریخ الخمیس
تاریخ الیعقوبی
- Historians History of the World
- The dwellers on the Nile by Sir E.A Wallis Budge
- The Nile and Egyptian Civilization by Alexandre Moret

جیوش لائف آف کرائسٹ

اسلامیات

کتاب العروس للسبکی شرح مختصر المعانی
اقتراب الساعۃ از نواب صدیق حسن خان

کتب اہل کتاب

بائبل
ہارپرز بائبل ڈکشنری از ملر
کنسائز تفسیر بائبل
ینابیع الاسلام از پادری کلیئر ٹسڈل

متفرق

ترکِ اسلام مصنفہ دھرم پال عبد الغفور
کلیات اقبال
اطلس القرآن
درثمین فارسی
شرح دیوانِ غالب
مکاتیب اقبال
- Introduction to Sociology
- Bahaullah and The New Era

رامائن اتھر کانڈ ارد

لغت

اقرب
القاموس المحیط
المفردات فی غریب القرآن
تاج العروس
انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا
جیوش انسائیکلوپیڈیا
نیلسنز انسائیکلوپیڈیا

اخبارات ورسائل

الحکم ۱۰/جون ۱۹۰۷ء
اہلحدیث ۲۶/جنوری ۱۹۱۲ء
ترجمان القرآن دسمبر جنوری ۱۹۴۲ء ، ۱۹۴۳ء
رسالہ نگار نیاز فتح پوری جنوری وفروری ۱۹۵۱ء
اخبار الایام الثانی

☆☆☆☆☆